نوآبادیاتی ہندوستان میں تعلیم نسواں کے فروغ میں بیگمات بھوپال کی ادبی خدمات

مقالہ برائے پی۔ایچ ڈی

مقالہ نگار

منزہ مبین

رجسٹریشن نمبر:45FLL/PHDURDU/F-14

نگران

ڈاکٹر حمیرا اشفاق

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو،

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

PhD
891.439871
ن ن م

تعلیم نسواں - ادبی خدمات

بسم الله الرحمن الرحيم

صداقت نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ منزہ مبین رجسٹریشن نمبر 45-FLL/PHDURDU/F14 نے اپنا مقالہ بعنوان

"نو آبادیاتی ہندوستان میں تعلیم نسواں کے فروغ میں بیگمات بھوپال کی ادبی خدمات"

برائے پی ایچ ڈی اردو میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے قبل کہیں اس طرح کا کام نہیں ہوا۔ یہ مقالے سرقے سے پاک ہے اور اپنے تحقیقی و تنقیدی معیار کے اعتبار سے اس قابل ہے کہ اسے بیرونی ممتحن کو بھیجا جا سکے۔

ڈاکٹر حمیرا اشفاق

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو (خواتین)

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ میں، منزہ مبین، رجسٹریشن نمبر 45-FLL/PHDURDU/F14 نے اپنا مقالہ بعنوان

"نوآبادیاتی ہندوستان میں تعلیم نسواں کے فروغ میں بیگمات بھوپال کی ادبی خدمات"

برائے پی ایچ ڈی اُردو ڈاکٹر حمیرا اشفاق کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے قبل کہیں اس طرح کا کام نہیں ہوا۔ یہ مقالہ سرقے سے پاک ہے۔

منزہ مبین

پی ایچ ڈی سکالر

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

فہرست ابواب

عنوان		صفحہ نمبر
پیش لفظ		الف-ج
باب اول:	نوآبادیاتی ہندوستان میں تعلیم نسواں کے فروغ کی کاوشیں اور ان میں بیگمات بھوپال کا کردار	۱-۷۱
باب دوم:	نواب سکندر جہاں بیگم کی تصانیف میں فروغ تعلیم نسواں کی کاوشیں: ایک مطالعہ	۷۲-۹۹
باب سوم:	نواب شاہجہاں بیگم کی تحریروں میں خواتین کی تعلیم کے فروغ کی کاوشوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ	۱۰۰-۱۷۶
باب چہارم:	نواب سلطان جہاں بیگم کی تصنیفات اور ذوق علمی کا تنقیدی مطالعہ	۱۷۷-۳۶۷
باب پنجم:	بیگمات بھوپال کی علمی و ادبی خدمات کے نتیجے میں بھوپال کی علمی و ادبی ترقی: تجزیاتی مطالعہ	۳۶۸-۳۸۳
مجموعی جائزہ		۳۸۴-۳۹۳
کتابیات		۳۹۴-۴۰۰
ضمیمہ جات		

تفصیل ابواب

باب اول: نوآبادیاتی ہندوستان میں تعلیم نسواں کے فروغ کی کاوشیں اوران میں بیگمات بھوپال کا کردار

پس منظر: برعظیم میں جدید دور کا آغاز۔۔۔ہندوستان کی سیاسی و سماجی تحریکوں کے اثرات۔۔۔ہندوستانی معاشرے میں تعلیم نسواں۔۔۔ تعلیم نسواں کی حمایت و مخالفت۔۔۔ تعلیم نسواں کی اہمیت۔۔۔طبقہ نسواں کی ترقی۔۔۔ سرسیداوران کے رفقاء(حالی۔ڈپٹی نذیراحمد۔ شیخ عبداللہ۔ مولوی ممتاز علی۔ شیخ اکرام)۔۔۔ تعلیم نسواں کے فروغ میں ادبی رسائل کا کردار۔۔۔انیسویں و بیسویں صدی میں خواتین کے نمایاں رسائل(رفیق نسواں۔پردہ نشین۔عصمت۔شریف بیبیاں۔مشیر مادر۔تمدن۔سہیلی۔امہات۔تہذیب نسواں)۔۔۔بھوپال میں طبقہ اناث کے لیے علمی وادبی کوششیں بالخصوص بیگمات بھوپال کا کردار۔۔۔

باب دوم: نواب سکندر جہاں بیگم کی تصانیف میں فروغ تعلیم نسواں کی کاوشیں: ایک مطالعہ

نواب سکندر بیگم کی تعلیم و تربیت۔۔۔نواب سکندر بیگم کی تعلیمی کوششیں۔۔۔اشاعت تعلیم میں دلچسپی و امداد۔۔۔سکولوں کا اجراء اور ان کا انتظام و انصرام۔۔۔مدرسہ صنعت و حرفت اناث۔۔۔تعمیر امداد مدرسہ سہیور۔۔۔مدرسہ ساگر کا معائنہ۔۔۔نواب سکندر بیگم کی تصنیفات اور ذوق علمی۔۔۔مذہبی، اخلاقی، تمدنی و تاریخی کتب کا مطالعہ۔۔۔ترتیب تفسیر العزیز۔۔۔آئین سکندری کی تالیف۔۔۔ترتیب سفر نامہ حج۔۔۔تدوین تاریخ سکندری۔۔۔اردوادب کی سرپرستی۔۔۔ مسلم لیڈیز کانفرنس کاافتتاح۔۔۔

باب سوم نواب شاہجہاں بیگم کی تحریروں میں خواتین کی تعلیم کے فروغ کی کاوشوں کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ

نواب شاہجہاں بیگم کی ولادت اور تعلیم و تربیت۔۔۔ نواب شاہجہاں بیگم کی تعلیمی کوششیں۔۔۔نواب شاہجہاں بیگم کی تصنیفات اور ذوق علمی۔۔۔دیوان تاج الکلام۔۔۔مثنوی صدق البیان۔۔۔تالیف تاج الاقبال۔۔۔ترتیب تہذیب النسواں اور ترتیب الانسان۔۔۔ خزینۃ اللغات۔۔۔ مطبع واخبار۔۔۔

باب چہارم: نواب سلطان جہاں بیگم کی تصنیفات اور ذوق علمی کا تنقیدی مطالعہ

نواب سلطان جہاں بیگم کی ولادت اور تعلیم و تربیت۔۔۔نواب سلطان جہاں بیگم کی تعلیمی کوششیں۔۔۔نواب سلطان جہاں بیگم کی تصنیفات (سبیل الجناں، سیرت مصطفی، عفت المسلمات، باغ عجیب، ہدیۃ الزوجین، افضل رحمانی، مہذب زندگی، مقصد ازدواج، اخلاقی سلسلہ، اسلام میں عورت کا مقام و مرتبہ، ہندوستانی معاشرت، ہندوستانی گھروں میں تیارداری)۔۔۔سلطان جہاں بیگم کے لیکچرز۔۔۔محمڈن کالج کی سرپرستی اور حمایت۔۔۔دارالمصنفین کی امداد۔۔۔انجمن ترقی اردو کی مالی و قلمی معاونت۔۔۔وظائف و امداد تعلیم۔۔۔مذہبی تعلیم۔۔۔تعلیم دایہ گری۔۔۔جبریہ تعلیم۔۔کتب خانہ حمیدیہ۔۔۔مدرسہ آصفیہ۔۔۔مدرسہ وکٹوریہ۔۔۔مدرسہ بلقیسیہ۔۔۔مدرسہ سلطانیہ۔۔۔مدرسہ سکندری۔۔۔مدرسہ حمیدیہ۔۔۔برجیسیہ کنیا پاٹ شالا (ہندو لڑکیوں کے لیے مدرسہ)۔۔۔علی گڑھ کالج کا قیام۔۔۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام۔۔۔ندوۃ العلما کی اصلاح۔۔۔چیفس کالجوں کی اصلاح۔۔۔آل انڈیا لیڈیز کانفرنس کی تحریک۔۔۔بھوپال میں پہلا مشترکہ اجلاس۔۔۔سلطانیہ گرلس اسکول۔۔۔

باب پنجم: بیگمات بھوپال کی علمی وادبی خدمات کے نتیجے میں بھوپال کی علمی وادبی ترقی: تجزیاتی مطالعہ

مجموعی جائزہ

کتابیات

ضمیمہ جات

پیش لفظ

مجھے شروع ہی سے اپنی تعلیمی قابلیت بہتر سے بہتر کرنے کا شوق رہا ہے۔اسی لیے ایم فل کے بعد پی ایچ ڈی میں داخلہ لیا۔ کورس ورک مکمل ہونے کے بعد تحقیقی مقالے کے موضوع کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو اس میں میری استاد ڈاکٹر حمیرا اشفاق (اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد) نے میری رہنمائی کی اور انہی کے تعاون و مشاورت سے میرے مقالے کا عنوان ''نوآبادیاتی ہندوستان میں تعلیم نسواں کے فروغ میں بیگمات بھوپال کی ادبی خدمات'' منظور کیا گیا۔ کام کے آغاز ہی سے مجھے اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ موضوع بہت وسیع ہے لیکن استاد محترم کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی سے یہ مقالہ اپنے تکمیلی مراحل تک پہنچا ہے۔

میں نے اپنے مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب ''نوآبادیاتی ہندوستان میں تعلیم نسواں کے فروغ کی کاوشیں اور ان میں بیگمات بھوپال کا کردار'' کے عنوان سے ہے۔اس باب میں سب سے پہلے اٹھارویں صدی میں برصغیر کا سیاسی و سماجی پس منظر بالخصوص سامراجی و نوآبادیاتی تناظر میں اس کا احاطہ کیا گیا ہے علاوہ ازیں ہندوستانی معاشرے میں تعلیم نسواں، تعلیم نسواں کی حمایت و مخالفت، سرسید اور ان کے رفقاء (حالی، ڈپٹی نذیر احمد، شیخ عبداللہ، مولوی ممتاز علی، شیخ اکرام) کی تعلیمی کوششوں، بھوپال میں طبقہ نسواں کے لیے علمی و ادبی کاوشوں اور ان میں بالخصوص بیگمات بھوپال کے کردار کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب دوم ''نواب سکندر جہاں بیگم کی تصانیف میں فروغ تعلیم نسواں کی کاوشیں: ایک مطالعہ'' کے عنوان سے ہے۔اس باب میں نواب سکندر بیگم کی تعلیم و تربیت، نواب سکندر بیگم کی تعلیمی کوششیں، سکولوں کا اجراء اور ان کا انتظام و انصرام، مسلم لیڈیز کانفرنس کا افتتاح، مدرسہ حرفت واناث وغیرہ کا قیام، نواب سکندر جہاں بیگم کی تصنیفات اور ذوق علمی، اردو ادب کی سرپرستی، سرسید احمد خاں کی حوصلہ افزائی وغیرہ کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ باب سوم ''نواب شاہجہاں بیگم کی تحریروں میں خواتین کی تعلیم کے فروغ کی کاوشوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' کے عنوان سے ہے۔اس باب میں

نواب شاہجہاں بیگم کی ولادت اور تعلیم و تربیت، نواب شاہجہاں بیگم کی تعلیمی کاوشیں، نواب شاہجہاں بیگم کی تصنیفات اور ذوق علمی کا جائزہ پیش کیا ہے۔ باب چہارم کا عنوان ''نواب سلطان جہاں بیگم کی تصنیفات اور ذوق علمی کا تنقیدی مطالعہ'' ہے۔ اس باب میں نواب سلطان جہاں بیگم کی ولادت اور تعلیم و تربیت، نواب سلطان جہاں بیگم کی تعلیمی کوششیں (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام، ندوۃ العلما کی اصلاح، آل انڈیا کانفرنس کی تحریک، انجمن ترقی اردو کی مالی و قلمی معاونت، محمڈن کالج کی سرپرستی۔۔۔)، نواب سلطان جہاں بیگم کی تصنیفات، لیکچرز، تقاریر کا طبقہ اناث کے تعلیمی سروکار کے حوالے سے جائزہ لیا گیا ہے۔ باب پنجم ''بیگمات بھوپال کی علمی و ادبی خدمات کے نتیجے میں بھوپال کی علمی و ادبی ترقی: تجزیاتی مطالعہ'' کے متعلق ہے۔ آخر میں موضوع ''نو آبادیاتی ہندوستان میں تعلیم نسواں کے فروغ میں بیگمات بھوپال کی ادبی خدمات'' کا مجموعی جائزہ لیا گیا ہے۔

میں اس بات کا دعوی تو نہیں کرتی کہ میں نے اپنے زیر بحث موضوع میں کوئی کمی و کوتاہی نہیں چھوڑی، لیکن میں نے کوشش ضرور کی ہے کہ ایک بہتر معیاری تحقیقی کام سامنے لایا جاسکے اور بیگمات بھوپال کی ادبی کاوشوں کی ایک مکمل تصویر قاری کے سامنے آجائے۔

مقالے کی تحریر و تسوید کے دوران مجھے قدم قدم پر اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا رہا۔ میں اللہ تعالی کی فیاضیوں کا شکر ادا کرتی ہوں جس کی توفیق سے میں یہ کام کر سکی۔ موضوع کی تحقیق و مقالے کی تدوین کے لیے مطلوب لوازمے کی فراہمی میں ڈاکٹر طیب منیر (سابق صدر شعبہ اردو) نے میری بہت مدد کی۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر نجیبہ عارف، ڈاکٹر عزیز ابن الحسن (صدر شعبہ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد) کی بھی ممنون ہوں جنھوں نے تعلیمی سیشن کے دوران قدم قدم پر میری حوصلہ افزائی کی۔ مقالہ لکھنے کی اس کوشش میں میری استاد ڈاکٹر حمیرا اشفاق (نگران مقالہ) کی احسان مند ہوں جنھوں نے نہایت خوش دلی اور خندہ پیشانی سے میری رہنمائی کی اور مقالے کو غیر ضروری مباحث سے پاک رکھنے کا ہنر سکھایا اس کے ساتھ ساتھ اخذ و انتخاب کے فن سے بھی روشناس کیا۔

اس مقالے کی تکمیل میں جن حضرات نے میری معاونت کی میں تہہ دل سے ان کی مشکور ہوں۔ سب سے پہلے میں جناب محمد موسی صاحب کی بہت زیادہ شکر گزار ہوں جنھوں نے موضوع سے متعلقہ مواد تک میری رسائی کو ممکن بنایا انہوں نے

ہر ممکن طریقے سے کتب کی فراہمی کے ساتھ ساتھ میری حوصلہ افزائی فرمائی ،ان کی اس شفقت اور مہربانی کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتی ہوں۔ معروف صحافی جناب طفیل اختر کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنھوں نے اس تحقیقی سلسلے میں مجھے قیمتی مشوروں سے نوازااور ہر ممکنہ معاونت کی۔ مقالے کو موجودہ ہیئت میں لانے کے لیے ڈیزائننگ ، ایڈیٹنگ اور ترتیب وتزئین کے لیے معروف شاعر، محقق اور مترجم ڈاکٹر نقیب احمد جانؔ کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جب بھی رہنمائی کے لیےان کے پاس گئی نہایت خندہ پیشانی سے پیش آئے اور اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا،ان کے ساتھ ساتھ اپنے اہل خانہ کی بھی شکر گزار ہوں جن کی دعاؤں اور محبتوں سے میرا حوصلہ بلند ہوااور یہ مقالہ تحریر کرنے میں کامیاب ہوئی۔ آخر میں میری گزارش ہے کہ میری اس کوشش کو حقیر کاوش سمجھ کر دیکھا جائے اور میری کوتاہیوں سے اغماض برتا جائے۔ شکریہ

منزہ مبین

۹جولائی۲۰۱۷ء

باب اول

باب اول

نو آبادیاتی ہندوستان میں تعلیم نسواں کے فروغ کی کاوشوں میں بیگمات بھوپال کا کردار

برصغیر پاک وہند کی تاریخ میں سولہویں اور سترھویں صدی مغلیہ سلطنت (۱۵۳۰۔۱۸۵۷ء) کے قیام اور عروج کا زمانہ تھا۔ مغل سلطنت ایک طویل عرصہ تک بہت عظیم الشان اور مضبوط سلطنت رہی لیکن کثیر پیمانے پر پھیلاؤ، علاقائی بنیادوں پر ابھرنے والی مخالف قوتوں نے جب زور پکڑا تو اٹھارویں صدی میں مغلیہ سلطنت زوال کا شکار ہوگئی تھی۔ مغل سلطنت کے زوال کے بعد افراتفری انتشار، بدامنی، ظلم وستم، جدال وقتال کا بازار گرم ہوا۔ اگرچہ ۱۷۰۷ء میں اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد اس زوال کا آغاز تو ہوگیا تھا لیکن سلطنت کے خاتمے کو تقریباً ڈیڑھ سو سال کا عرصہ لگا۔ انیسویں صدی میں انگریزوں کی آمد، سامراجی تسلط، معاشی بحران اور مغربی تہذیب و ثقافت ہندوستان میں بسنے والی دیگر قوموں، قبیلوں اور ذاتوں میں منقسم لوگوں اور بالخصوص ہندوؤں کے برعکس مسلمانوں کے لئے ایک نیا تجربہ ثابت ہوا تھا۔ انگریزوں کی آمد سے قبل مسلمان سیاسی اعتبار سے ہندوستان میں بہت بڑی قوت و طاقت کے مالک تھے۔ مسلمانوں نے ہمیشہ ہندوستان پر حکومت کی تھی اس لئے انہیں یہ قطعاً قبول نہ تھا کہ کوئی غیر قوم ان پر حکمرانی یا اپنا تسلط قائم کرے۔ ہندوستان کے تاریخی تناظر کے حوالے سے سید احمد تقی لکھتے ہیں کہ

> پہلے برصغیر میں صرف دو تہذیبیں متصادم ہو رہی تھیں ایک مسلم تہذیب اور دوسری ہندو تہذیب لیکن اس ڈیڑھ سو سال کے دوران ایک تیسری تہذیب بھی ابھری جسے یورپیوں اور خاص طور پر انگریزوں نے برصغیر میں متعارف کرایا تھا۔(۱)

یوں انگریز قوم ہندوستان کی حکمران بن بیٹھی، مسلمان، ہندو اور سکھ سب ان کے زیرنگیں ہوگئے اور تقریباً ڈیڑھ صدی تک سارا ہندوستان عملی طور پر انگریزوں کے زیرِانتظام رہا۔ جب بھی کوئی ملک، خطہ یا سرزمین نو آبادیات کا شکار ہوتی ہے تو اس سے نہ صرف سیاسی و سماجی، مذہبی و تاریخی استحصال کیا جاتا ہے بلکہ وہاں کی رعایا کو اپنے مقاصد کی خاطر مفلس بھی بنایا جاتا ہے۔ نو آبادکار، نو آبادیاتی باشندوں کی زندگی کے اصول و ضوابط متعین کرتا ہے۔ ہندوستان کو

نوآبادیاتی صورتحال کا شکار کرنے میں خود مغلوں کی اپنی سیاسی کمزوریاں تھیں۔ ہندوستان میں مسلم دورِ حکومت (مغل سلطنت) کے پس منظر کو اگر تنقیدی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو مغل سلطنت کے زوال، اسباب و محرکات اور ہندوستان میں برطانوی حکومت، سامراجی تسلط کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ انگریزوں نے ہندوستان پر یکدم تسلط نہیں جمایا بلکہ منضبط منصوبہ بندی کے تحت اپنے مفادات کے حصول کی خاطر رفتہ رفتہ قدم بڑھائے تھے۔ ڈاکٹر مبارک علی ہندوستان میں انگریزوں کے تجارتی مقاصد اور حکمت عملی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

> ۱۶۰۰ء میں ملکہ الزبتھ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک شاہی چارٹر سے نوازا۔ اس وقت یہ دستور تھا کہ جس کمپنی کو چارٹر دیا جاتا تھا، اسے ایک سے زیادہ ملکوں میں تجارت کی اجارہ داری دی جاتی تھی۔۔۔۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو ۲۱۸ تاجروں نے مل کر بنایا۔۔۔۔ تجارتی کمپنیوں کا طریق کار یہ تھا کہ وہ ہندوستان میں سہولتوں کی خاطر سرکاری عہدیداروں اور دربار کے امراء کو تحفے تحائف، اور رشوتیں دیا کرتے تھے۔ جب ٹامس رو ۱۶۱۵ء میں جہانگیر کے دربار میں آیا تو اس نے بادشاہ کو ایک بگھی بطور تحفہ پیش کی۔ (۲)

انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان باہمی افہام و تفہیم کی بنیاد پر تجارتی سرگرمیاں طے پانے لگیں تھیں۔ دوسری جانب مغل حکمران اورنگ زیب عالمگیر (۱۶۵۸ء۔ ۱۷۰۷ء) کی وفات کے بعد جانشینی کے حوالے سے ہونے والی خانہ جنگیوں سے نہ صرف سلطنت کمزور ہوئی بلکہ ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگی تھی۔ مرکز کی کمزوری، درباری سازشیں، ریاستی نظام میں بدامنی، انتشار اور افراتفری کی سنگین صورتحال میں قتل و غارت گری عام ہونے لگی تھی۔ پی۔ سی۔ جوشی مغل سلطنت کی اندورن خانہ جنگیوں کا احوال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

> عالمگیر کا بیٹا شاہ بہادر شاہ اول اپنے دو بھائیوں کو قتل کر کے بادشاہ بنا اور پانچ سال حکومت کے بعد وفات پائی تو معزالدین جہاں دار شاہ تخت نشین ہوا۔ یوں یکے بعد دیگرے مختلف بادشاہ تخت نشین ہوتے رہے ہیں۔ جب محمد شاہ کے عہد میں احمد شاہ نے پنجاب پر مکمل طور پر قبضہ کر لیا تھا اس دوران بنگال میں انگریزوں کا عمل دخل بڑھ گیا تھا۔ بنگال مغل سلطنت کے لئے ایک زرخیز صوبے کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہاں کا آخری بادشاہ نواب سراج الدولہ تھا۔ (۳)

ہندوستان میں بنگال ایک ایسا خطہ زمین تھا جو انگریزوں کے تجارتی مقاصد کے لئے موزوں ترین تھا۔ کمپنی نے بنگال کے مقامی تاجروں، ساہوکاروں اور بالخصوص درباریوں کو اپنے ساتھ ملا کر بادشاہ نواب سراج الدولہ کو پلاسی کی جنگ (۱۷۵۷ء) میں شکست دی اور بنگال پر مکمل طور پر قابض ہو گئے تھے۔ سید احمد تقی نے انگریزوں کی ان فتوحات کے متعلق کتاب ''ہندوستان کا پس منظر و پیش منظر'' میں لکھا کہ ''انگریزوں نے صرف یہیں تک اپنی فتوحات کا سلسلہ قائم نہ رکھا بلکہ دہلی میں عزیزالدین عالمگیر ثانی (۱۷۵۴ء۔۱۷۶۰ء) کو قتل کر کے شاہ عالم ثانی (۱۷۵۹ء۔۱۸۰۶ء) کی تخت نشینی کا اعلان کیا گیا، لیکن اس وقت شاہ عالم ثانی بنگال میں محصور تھا۔ مرہٹوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ۱۷۶۰ء میں دہلی پر قبضہ کیا۔ احمد شاہ درانی نے ۱۷۶۱ء میں برصغیر پر چوتھا حملہ کیا اور پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو شکست دے کر شاہ عالم ثانی کے دہلی (۱۸۰۳ء) میں آنے کے لیے راہ ہموار کی تھی۔''(۴) شاہ عالم ثانی دہلی میں جب دوبارہ اپنے عہدے پر فائز ہوئے تو شومئی قسمت اسی اثنا میں انگریزوں نے ۱۷۶۵ء میں بکسر کی لڑائی میں شاہ عالم ثانی کو بہت بڑی شکست دی اور مجبور کیا کہ وہ انگریزوں کے لیے سلطنت میں مزید مراعات کا اعلان کرے۔ یوں شاہ عالم ثانی ایک کٹھ پتلی بادشاہ کی حیثیت سے سامنے آئے جن کے تمام اختیارات انگریزوں کے ہاتھ میں تھے۔ کارل مارکس (Karl Marx) اس صورت حال کا تجزیہ کچھ اس طرح سے کرتے ہیں

> ہندوستان میں برطانوی اقتدار آخر کیسے قائم ہو گیا؟ مغل اعظم کے اقتدار اعلیٰ مغل صوبیداروں نے پاش پاش کیا۔ صوبیداروں کی قوت کو مرہٹوں نے توڑا، مرہٹوں کی قوت کو افغانوں نے ختم کیا اور اس وقت جبکہ سب ایک دوسرے کے خلاف جنگ آزما تھے برطانیہ جھپٹ کر پہنچ گیا اور وہاں سب کو زیر کر سکا۔ یہ ایک ایسا ملک تھا جو نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں میں بلکہ مختلف قبیلوں اور مختلف ذاتوں میں بھی تقسیم تھا، یہ ایک ایسا سماج تھا جس کا چوکھٹا ایک قسم کے توازن پر ٹکا ہوا تھا اور یہ توازن اس سماج کے تمام اراکین کے درمیان ایک عام باہمی تنفر اور بنیادی مغائرت کا نتیجہ تھا۔ ایسے ملک اور سماج کے مقدر میں بھلا مفتوح ہونا نہیں تو اور کیا لکھا تھا؟'(۵)

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ درست ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان میں برسر اقتدار مغل سلطنت جب بروقت اور درست فیصلے لینے میں ناکام رہی تو ایسے میں کسی بیرونی استعماری طاقت کا غلبہ پا لینا مشکل اقدام نہ

تھا۔ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام جو اول اول صرف تجارتی مقاصد پر مبنی تھا بعد ازاں برطانوی راج میں تبدیل ہونے لگا اور انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی فتوحات کا سلسلہ زور وشور سے جاری رکھا۔یوں یکے بعد دیگرے بڑی بڑی ریاستیں انگریزوں کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے لگی تھیں۔انگریز بنگال کے بعد میسور پر حملہ آور ہونا چاہتے تھے کیونکہ میسور ایک ایسا خطہ ہندوستان تھا جو ہر حوالے سے طاقت و قوت کا منبع تھا۔اس کا حکمران حیدر علی کا بیٹا ٹیپو سلطان(۱۷۶۱ء۔۱۷۸۲ء) تھا۔ٹیپو سلطان کے خلاف انگریزوں نے کافی بڑے پیمانے پر پروپیگنڈا کیا کیونکہ کمپنی کے لیے وہ خطرے کی علامت تھا۔ٹیپو سلطان کے حوالے سے پی۔سی۔جوشی کا کہنا ہے کہ

> ٹیپو نے انگریزوں کو مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن قرار دیا۔اس نے شاہ عالم سمیت تمام مغل حکمرانوں کو انگریزوں کے خلاف نئے جہاد میں شریک ہونے کی دعوت دی۔۔۔۔(۶)

۱۷۹۹ء میں انگریز میسور پر قبضہ کر چکے تھے اور اس کے بعد ان کی نظریں مرکز یعنی دہلی پر مرکوز ہو گئیں۔۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا اور مغل بادشاہ انگریزوں کا وظیفہ خوار بن کر رہ گیا۔آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر (۱۸۳۷ـ۱۸۵۸ء) کے دور میں انگریز سپاہیوں کی بغاوت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے برصغیر کے ہندو اور مسلمان حکمرانوں نے انگریزوں سے آزادی کی کوشش کی،لیکن شکست کھائی۔بالآخر ۱۸۴۳ء میں سندھ اور ۱۸۴۹ء میں پنجاب پر قبضہ کر کے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں اپنی سلطنت کو پھیلا کر وسیع بنیادیں فراہم کیں تھیں۔اس صورت حال پر ڈاکٹر مبارک علی تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

> ہندوستان میں انگریزوں نے مرحلہ وار قبضہ کیا۔۔۔۔ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی دور میں جب کہ اس کا اقتدار ابھی پورے ملک پر قائم نہیں ہوا تھا۔۔۔۔اس دور میں انہوں نے مغلوں کی بہت سی روایات اور انتظامی امور کو اختیار کیے رکھا تھا،یہاں تک کہ ابتدائی دور کے انگریز ہندوستانی تہذیب میں رچ بس گئے تھے لیکن جیسے جیسے وہ سیاسی طور پر طاقتور ہوتے چلے گئے اور فتوحات کے ذریعہ ہندوستانیوں کو شکست دے کر اپنا اقتدار قائم کرتے چلے گئے،اسی طرح سے ان کا رویہ بھی بدلتا رہا۔(۷)

نوآبادیاتی ہندوستان میں انگریزوں نے ۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک کئی جنگیں لڑیں اور مقامی لوگوں کو ہزاروں کی تعداد میں قید اور قتل کیا تھا۔ صرف چند ہزار برطانوی سپاہی کروڑوں پر مشتمل ہندوستانی آبادی کو اپنے زیر رکھے ہوئے تھے۔ ان کا رویہ ہندوستانیوں کے ساتھ بہت ہتک آمیز رہا کیونکہ وہ انہیں پستیوں میں ڈوبے ہوئے جاہل المطلق تصور کرتے تھے۔ انگریزوں نے ہندوستان کو غیر متمدن لوگوں کا خطہ قرار دیا اور اسی بنیاد پر وہ مقامیوں کے ساتھ راہ و رسم رکھنا گوارہ نہیں کرتے تھے۔ انگریزوں کی جانب سے اس تضحیک آمیز رویہ کو ناصر عباس نیر یوں بیان کرتے ہیں کہ "کتوں اور ہندوستانیوں کا داخلہ ممنوع ہے" کی تختی جگہ جگہ آویزاں ہوتی ہے۔(۸) ایسا رویہ صرف ہندوستانیوں کے ساتھ ہی نہیں دیکھنے میں آتا ہے بلکہ تاریخ میں جہاں جہاں بھی کوئی خطہ، سرزمین نوآبادیات کا شکار ہوئی وہاں نوآبادکار کا رویہ مقامیوں کے ساتھ ایسا ہی تضحیک آمیز و ہتک آمیز رہا ہے۔ نوآبادکار مقامیوں کو حیوانوں کی سطح پر نہ صرف سمجھتا ہے بلکہ اسی کے مطابق تفاعلی مرحلے طے کرتا ہے فرانز فینن (Frances Finan) نے اس حوالے سے کتاب افتادگان خاک میں لکھا ہے کہ ''نوآبادیاتی باشندے کے لئے جو اصطلاحیں نوآبادکار کا استعمال کرتا ہے وہ حیوانات کی اصطلاحیں ہیں''۔(۹)

مندرجہ بالا اقتباس سے اس عہد کے حالات کی درست عکاسی ہوتی ہے کہ اٹھارویں صدی برصغیر میں مختلف سیاسی قوتوں کے درمیان باہمی چپقلش اور آویزش کا دور ہے۔ برطانوی ثقافت نے آہستہ آہستہ اپنے قدم جمائے البتہ اٹھارویں صدی کا نصف سے زیادہ حصہ انہیں شمال میں جنگیں لڑتے ہوئے گزرا۔ ڈی۔آر گیڈ گل (D.R.Kaidgil) کا اس حوالے سے کہنا ہے کہ ''یوں تو زوال اٹھارویں صدی کے اختتام پر ہی شروع ہو چکا تھا لیکن انیسویں صدی کے وسط میں یہ نمایاں طور پر ظاہر ہوا۔''(۱۰)

۱۸۵۷ء میں مغلیہ سلطنت کے مکمل خاتمے کے بعد برطانوی حکومت اور ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس نئے عہد میں داخل ہونے کے ساتھ چیزوں کو دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے کا زاویہ اور نقطہ نظر بدل گیا تھا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال میں سب سے زیادہ جانشینی کا مسئلہ تھا کیونکہ مغلوں کے ہاں جانشینی کا کوئی واضح قانون اور اصول و ضوابط نہیں تھے اس لیے خانہ جنگیوں، سازشوں اور اور بغاوتوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اگر سیاسی بنیادوں پر مغل حکمرانوں اور انگریزوں کی حکمت عملی کا موازنہ کیا جائے تو مغل حکمران اپنی عیش پرستی، لاپرواہی اور غیر سیاسی حکمت عملی کی وجہ

سے انگریزوں سے شکست خوردہ ہوئے جو تعداد میں انتہائی کم تھے۔ ۱۸۵۷ء میں ہندوستانی معاشرے میں مختلف سطحوں پر ہونے والے تغیرات کے حوالے سے ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں کہ

> ۱۸۵۷ء نے ہندوستان کی تاریخ کو بدل کر رکھ دیا۔ اس کے بعد ایک جانب تو مغل بادشاہت کا خاتمہ ہوا، تو دوسری جانب کمپنی کی حکومت بھی اپنے انجام کو پہنچی اور ہندوستان کو تاج برطانیہ کے ماتحت کر کے اس کے انتظام کے لئے نئے اصول و قوانین بنائے گئے۔۔۔۔اس کے بعد سے ہندوستان دو حصوں میں بٹ گیا، ایک برطانوی ہندوستان، اور دوسرا ریاستوں کا ہندوستان کہ جس میں چھوٹی بڑی ریاستیں ملاکر تقریبا ۶۰۰ تھیں۔ یہ ریاستیں اپنے اندرونی معاملات میں آزاد تھیں، مگر دفاع اور غیر ملکی تعلقات میں ان کا کوئی دخل نہیں تھا۔ (۱۱)

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں دیکھا جائے تو انگریزوں کا سیاسی نظام مغلیہ نظام سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ ہندو مسلمان، سکھ سب حکمران مغل بادشاہوں کو ہی اپنے لیے مثال سمجھتے تھے اور یہی بنیادی وجہ تھی کہ مرکزی مغلیہ سلطنت کو مکمل طور پر ختم ہونے میں تقریباً ڈیڑھ سو سال کا عرصہ لگا تھا۔ پھر اگلے پچاس سال تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسران کے لیے بھی مغلیہ نظام ہی مثالی رہا ہے۔ انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں مرکزیت پسند رجحانات کی وجہ سے ان علاقائی ریاستوں کے سیاسی کردار کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی جا سکی تھی۔ مسلم فکر و ثقافت کے فروغ میں ان ریاستوں نے بہت اہم کردار ادا کیا اور یقیناً مسلم قومیت کے تصور کو تقویت بھی انہی اداروں سے ملی۔ تاہم اس عہد تک ریاست میں عام آدمی کا کوئی دخل نہیں تھا۔ شہری کا تصور موجود ہی نہیں تھا۔ سیاسی جوڑ توڑ اور دیگر اہم معاملات کے لیے باحیثیت امرا پر ہی انحصار کیا جاتا تھا۔ چنانچہ برصغیر کے بگڑتے ہوئے حالات کی درستی کے لیے شاہ ولی اللہ (وفات ۱۷۶۲ء) امرا کو ہی لکھتے تھے اور ہمسایہ حکمرانوں کو بھی اصلاح کی دعوت دیتے تھے۔ اٹھارویں صدی کے اکثر دانشوروں مثلاً شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالطیف بھٹائی اور مرزا ابو طالب کے ہاں ہندوستانی قوم کے سیاسی عروج و زوال کی وجہ اس عہد میں تعلیم و تدریس، علوم اور افکار کی تنزلی تھی، اس عہد کے نامور علما ادبا اور شعرا کی ایک مختصر فہرست ہی یہ تاثر دینے کے لیے کافی ہے۔

ہندوستان میں سیاسی تحریکوں اور ان کے اثرات کا جائزہ لیا جائے تو اس ابتدائی صورت حال میں ہمیں شاہ ولی اللہ کے حوالے سے اور اس عہد کی سیاسی فکر میں مسلمان دانشوروں کی سیاسی ذمہ داری کا اصول بہت شدت سے سامنے

آتا ہے۔ شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز نے مغلیہ سلطنت کے زوال کا سبب ان کے ہم عصر نظام میں بنیادی کمزوری یعنی انصاف کا فقدان اوران بھاری ناقابل برداشت ٹیکسوں کو قرار دیا کہ اسی لیے انگریز کامیاب ہو رہے ہیں۔ شاہ ولی اللہ بلاشبہ انیسویں صدی کے احیائے اسلام کے ممتاز محرکوں میں سے ہیں۔ جنھوں نے برطانوی حکومت کے خلاف پے درپے شورشوں کی تنظیم اور قیادت کی ہے۔ یوں دہلی میں تعلیم کا کام شاہ ولی اللہ اوران کے ورثا نے بذات خود جاری رکھا۔ غرض مسلمانوں کا یہ نظام تعلیم اپنے مفید نتائج کے لحاظ سے اس زمانے میں قابل ستائش تھا۔ اٹھارویں صدی کے برصغیر میں تعلیم وتدریس کے دو طریقے رائج تھے۔ ایک انفرادی تدریس کا طریقہ تھا جس میں طلبہ استاد کے پاس جاکر تحصیل علم کرتے تھے اور وہاں سے فارغ ہو کر دوسرے استاد کی خدمت میں حاضر ہو جاتے تھے۔ اور دوسرا مکاتب میں درس وتدریس کا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد انگریزوں کے قدم ہندوستان کی سرزمین میں مضبوطی کے ساتھ جم گئے تو مفکرین کو محسوس ہوا کہ اب سیاسی زوال وانحطاط کے ساتھ مسلمانوں کے دین ومذہب، تعلیم وتربیت اوران کی قومی زندگی کی بھی خیر نہیں ہے۔ کیونکہ تاریخ کی مسلسل شہادتوں کے مطابق جب کوئی قوم کسی ملک کو فتح کرتی اوراس ملک کے باشندوں پر سیاسی غلبہ پالیتی ہے تو فاتح قوم کا اثر ونفوذ صرف اقوام کے جسموں تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ ان کے دلوں اور دماغوں کو بھی تسخیر کرلیتی ہے مناظر احسن گیلانی نے اس نظریے کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> اوراس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مفتوحہ اقوام اپنے قومی خصائص وروایات اور ملی شعائر وعلامات کو نہ صرف یہ کہ نظرانداز کردیتی ہیں بلکہ ایک مدت تک عمل تجاذب کے مسلسل جاری رہنے کے باعث آخر کار وہ ان سے نفرت کرنے لگتی ہیں اوران کے لیے فاتح قوم کی نقالی اور کورانہ تقلید سرمایہ افتخار رہ جاتی ہے۔ ہندوستان کے بیدار مغز مسلمان ارباب فکر وعمل نے اس خطرہ کا اسی وقت احساس کرلیا اوراس کا سدباب کرنے کے لئے انہوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کی تعلیم کی طرف توجہ دی۔(۱۲)

تعلیم ہر دور میں یکساں اہمیت کی حامل رہی ہے۔ اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ مفکرین کا یہ قدم نہایت دوراندیشی پر مبنی تھا کہ سیاسی طاقت سے محروم ہو جانے کے بعد تعلیم کے سوا کوئی اور ایسی چیز نہیں رہی تھی جس کے ذریعے مسلمان بحیثیت ایک قوم زندہ رہ سکتے تھے۔ لیکن اس ایک ضرورت کے احساس میں شریک ہونے کے

باوجود خود مفکرین دو طبقوں میں تقسیم ہو گئے۔ایک طبقہ علما کرام کا تھا،اس نے اپنی تمام توجہ نصاب اور درس تعلیم پر مرکوز کر دی تھی۔اس مقصد کے لیے عربی مدارس قائم کیے گئے اور ان کے ذریعے مذہبی تعلیم یعنی تفسیر، حدیث، فقہ اور ان کے ساتھ عربی زبان سے متعلقہ بعض عقلی فنون کی تعلیم کا ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔آج کل عام اصطلاح میں اس طبقہ کو قدامت پسند طبقہ کہتے ہیں۔اس کے برخلاف دوسرا طبقہ متجددین کا تھا۔یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے مسلمانوں کی فلاح و ترقی اسی میں سمجھی کہ مسلمان انگریزوں کی زبان اور علوم و فنون سیکھیں اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ تہذیبی اور تمدنی لحاظ سے بھی انہیں کے رنگ میں رنگ جائیں۔اس طبقہ کو جدید تعلیم یافتہ طبقہ کہتے ہیں۔اور اس کی وجہ تسمیہ ظاہر ہے۔فکری سطح پر ان دونوں طبقات میں اختلافات پائے جاتے تھے۔بہر حال اس طرح مسلمانوں میں تعلیم کی دو قسمیں،ایک قدامت پسند اور دوسری جدت پسند ہو گئیں۔ان دونوں قسم کی تعلیم کے لیے درسگاہیں بھی الگ الگ قائم ہو گئیں۔سید مناظر احسن گیلانی تعلیمی نظام کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

> تعلیم جدید کی درسگاہ اسکول اور کالج کہلائی اور قدیم تعلیم کی درس گاہ کا نام مدرسہ رہا،اگرچہ یہ دونوں درس گاہیں مسلمانوں کی تھیں اور ان کی کسی ایک نہ ایک ضرورت کی تکمیل کرتی تھیں۔یہ امر نہایت افسوسناک تھا کہ دونوں میں ایک طرح کی رقابت اور چشمک زنی پیدا ہو گئی۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم تعلیم یافتہ حضرات کو جدید گروہ سے نفرت تھی اور اسی طرح جدید گروہ قدیم تعلیم کے اصحاب کی شکل دیکھنے کا روادار نہ تھا یوں یہ صورت حال ایک عرصہ تک قائم رہی۔(۱۲)

جب تحریک خلافت کا ہندوستان میں اثر و نفوذ بڑھا تو اس تحریک نے دونوں طبقوں کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کر دیا اور اس وجہ سے دونوں طبقوں کی باہمی کشمکش اور آویزش از خود کم ہونے لگی تھی۔علما کے آپس کے میل جول باہمی تبادلہ خیالات اور ملکی و بین الاقوامی سیاسیات، حالات سے واقفیت کی بناء ہر طبقہ میں اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔انیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں مختلف قسم کی انجمنیں وقتاً فوقتاً قائم ہوئیں جن کو بعد ازاں ثقافتی انجمنوں کا نام دیا گیا۔ان اداروں کے قیام کی بدولت معاشرتی اصلاح کا دائرہ کار تیزی سے بڑھنے لگا۔۔ان ثقافتی و تہذیبی اداروں میں بنارس کی ''مجلس مباحثہ'' کو اولیت حاصل ہے جس کا قیام ۱۸۶۱ء میں مہاراجہ وزیا گرم اور مہاراجہ بنارس کی بھرپور قیادت میں عمل میں آیا۔یہ مجلس اس عہد میں نہایت وقعت و اہمیت کی حامل تھی۔اس مجلس کے زیر

اہتمام ہفتہ وار اجلاس منعقد ہوتے، مختلف مسائل پر بحثیں اور تقاریر کی جاتیں تھیں۔ مجلس مباحثہ کی سرگرمیوں کے حوالے سے ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ

> گارساں دتاسی کا بیان ہے کہ مجلس، انسٹی ٹیوٹ آف فرانس کی طرح پانچ حصوں میں منقسم ہے۔ تعلیم، عمرانی ترقی، فلسفہ و ادب علوم و فنون، اس انجمن نے عورتوں کی تعلیم کے لیے مدرسے بھی قائم کیے اور اپنی تعلیمی واصلاحی خدمات کی وجہ سے خاصی شہرت حاصل کی۔ بنارس کے بعد دوسری انجمن شاہجہاں پور ۱۸۶۲ء میں قائم ہوئی۔ مختلف اصلاحی اور عالمی سطح کی انجمنوں میں حد امتیاز قائم کرتے ہوئے زیر نظر انجمن کو پہلی "عالمی انجمن" قرار دیا ہے۔ اس انجمن نے اصلاح معاشرہ کے لیے اور جدید علوم کی نشر واشاعت کے لیے ایک رسالہ "رفاہ خلائق" جاری کیا اور ایک محتاج خانہ، علوم مشرقیہ کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ اور لڑکیوں کے لیے تین مدارس قائم کیے۔ ان اداروں کے مقاصد و نظریات میں، تراجم وتالیفات کے ذریعے مغربی علم وفن کی تشہیر کر رہا تھا۔(۱۳)

قرون وسطی میں عورتوں کی تعلیم کے موضوع پر اگر غور کیا جائے تو اس زمانے میں نہ صرف مشرق بلکہ مغربی دنیا میں بھی، عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں بہت کم سہولتیں میسر تھیں۔ عورت معاشرے کا اہم حصہ ہے۔ عورت کے بنا اگرچہ تاریخ انسانی ادھوری ہے مگر جب سے تاریخ تحریری صورت میں سامنے آئی تو اس تحریری تاریخ پر مرد غالب نظر آتا ہے۔ ادھر دوسری طرف ہندوؤں کی برہمو سماج کے زیر اثر تعلیم نسواں کی تحریک بھی زور پکڑ رہی تھی۔ کیونکہ عورت معاشرے کا اہم حصہ ہے لیکن اس کی تعلیم و تربیت پر کوئی مناسب توجہ نہیں دی گئی تھی۔ اس لیے عورت کی وہی تصویر کشی کی جاتی ہے جو مردوں کی خواہشات کے عین تابع ہے۔ کائنات میں عورت اور مرد بنیادی اکائی کی صورت میں موجود ہیں۔ ابتداء میں عورت معاشرے کا فعال حصہ تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مردوں کے معاشرے کا لازم وملزوم جزو تھی۔ گورڈن چائلڈ(Gordon Childe) نے عورت کی حیثیت کے حوالے سے لکھا ہے کہ

> تہذیب کی ابتدا عورتوں نے کی۔ وہ اناج اگاتی تھیں۔ اسے پیستی تھیں۔ روٹی پکاتی تھیں۔ دھاگہ بنانے کے فن سے بھی انہیں واقفیت تھی۔ جس سے لباس تیار کرتی تھیں۔ برتن اور زیورات بھی تیار کرتی تھیں غرض ہر وہ کام کرتی تھیں جس سے

گھریلو خوبصورتی پیدا ہو۔ جبکہ ہر مرد زراعت کے لیے زمین تیار کرتا اور شکار کرتا
تھا ہتھیار بناتا تھا۔(۱۴)

انسانی شعور میں اس وقت بیداری پیدا ہوئی جب زراعت میں ترقی ہونے کے باعث زندگی کو محفوظ تصور کیا جانے لگا اور اس مرحلے پر ہی بچے کی پیدائش میں مرد کو اپنے کردار کا ادراک ہوا۔ چنانچہ اس نے بچوں کو اپنا نام دیا اور اپنا وارث بنایا، عورت کی اہمیت اب بھی قائم تھی۔ لیکن اب عورت دیوی نہیں رہی صرف مرد کے بچوں کی ماں تھی۔ اس حوالے سے کارل مارکس کے اس نظریہ کے درست ہونے کا اشارہ ملتا ہے کہ زرعی دور کے آغاز وارتقاء، باغ، کھیتوں کی ملکیت ہونے سے عورت کی پست و کمتر حیثیت کا بہت گہرا تعلق ہے۔ اسی تناظر میں مرد نے بچوں پر قانونی قبضہ کر کے عورت کو بالکل بے دست و پا کر دیا تھا اور اس کی حیثیت ایک دایہ اور خادمہ کی رہ گئی تھی۔ فہمیدہ ریاض اس تناظر میں لکھتی ہیں کہ

جب معاشرہ عورت کی عقل و دانش کی نفی کرتا ہے تو اسے فیصلہ سازی میں شامل نہیں کرتا۔ اسے اختیارات نہیں دیتا۔ ایسے معاشرے میں عورت کی حیثیت بھیڑ بکریوں اور گایوں کی ہوتی ہے جن کو انسان کچھ فائدہ اٹھانے کے لیے پالتا ضرور ہے لیکن انہیں وہ اپنا جیسا نہ سمجھ سکتا ہے اور نہ ان سے برابری کا سلوک کر سکتا ہے۔(۱۵)

جس لمحے مرد نے اپنے کردار اور حیثیت بالخصوص آزاد ہستی ہونے کا دعویٰ کیا اس لمحے عورت کی محکومی کے تصور نے جنم لیا۔ اس حوالے سے سائمن دی بوارن(Siman De Bovar)نے لکھا ہے کہ

یہی وجہ ہے کہ مذاہب اور قوانین کے ضوابط میں عورت کے ساتھ اس قسم کا معاندانہ رویہ رکھا گیا نظام یقینا قائم ہو چکا تھا، ضوابط مردوں کے ہی قائم کردہ تھے۔ ان کا عورت کو ایک محکوم حیثیت دینا فطری بات ہے۔ (۱۶)

چنانچہ مقدس سمجھے جانے والی عورت ناپاک و کمزور تصور کی جانے لگی اس طرح عورت کا عزت واحترام متاثر ہوتا چلا گیا۔ اپنی حیثیت منوانے کے لیے مرد نے تمام ماحول معاشرے اور انسانی ذہن کو بدلنے کی شعوری کوششیں شروع کر دیں۔ مذہب کا سہارا لے کر مرد نے معاشرے کی کایا پلٹ دی۔

کیتھولک عقائد کے مطابق عورت دوسرے درجہ کی مخلوق ہے اور اس عہد کے لوگوں میں عام تصور یہی پایا جاتا تھا کہ عورتوں کو اقتدار تو دور، کسی قسم کا اختیار بھی نہیں دینا چاہیے بلکہ ان کے مشاغل کو گھر کی چار دیواری تک محدود رہنا چاہیے۔ البتہ طبقہ امرا کی لڑکیوں کو پڑھانا لکھانا ضروری قرار دیا گیا تھا تا کہ وہ بڑی ہو کر اپنے علاقے کا انتظام و انصرام سنبھال سکیں۔ لیکن رئیسوں، ججوں، ڈاکٹروں، تاجروں، دستکاروں اور دوسرے معزز لوگوں کی لڑکیوں کے سلسلے میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ان کے لیے بہتر ہے کہ پڑھنا، لکھنا نہ سیکھیں۔ ڈاکٹر احمد شبلی نے کتاب "مسلمانوں کا نظام تعلیم "میں لانگڈن ڈیویز(Langdon Davis)کا حوالہ دیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ

> لانگڈن ڈیویز نے اپنی کتاب "عورتوں کی مختصر تاریخ "میں اس دور کی عورتوں کا کچھ ایسا ہی نقشہ پیش کیا ہے کہ بڑے بڑے سورماؤں کی عورتیں کس قسم کی زندگی بسر کرتی تھیں؟ بہت سی عورتیں برائے نام پڑھی لکھی ہوتی تھیں۔ بچپن میں کوئی اتالیق انہیں پڑھاتا یا پھر ابتدائی مدرسوں میں داخل کر دی جاتی جہاں انہیں پڑھنا لکھنا سکھایا جاتا ہے۔ یہ عورتیں ایسے قصے کہانیاں اور رومانی افسانے پڑھ سکتیں تھیں جو خانہ بدوش تاجروں سے خریدتی تھیں۔(۱۷)

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ نچلے طبقے کی عورتوں کو تعلیم میسر نہ تھی۔ صاحب ثروت لوگ بھی اپنے وصیت نامے میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے کچھ نہیں رکھتے تھے اس کے بجائے وہ شادی کے لیے جائیداد میں حصہ دیتے تھے۔ قرون وسطی میں لڑکیوں کی تعلیم کی یہی صورت حال تھی جس کو تحقیق کے بعد یورپی مصنفین نے پیش کیا ہے کہ اس عہد میں اگر لڑکیاں معمولی پڑھنا لکھنا سیکھ لیتیں اور گھریلو کام کاج اور امور خانہ داری سے مناسب واقفیت حاصل ہو جاتی تو والدین ان کی طرف سے مطمئن ہو جاتے تھے۔ مختلف مذاہب کے تقابل کے حوالے سے محمد حسن جان لکھتے ہیں کہ

> جین مذہب یہ تعلیم دیتا ہے کہ عورت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ ایرانی معاشرہ میں عورت کو کوئی مقام حاصل نہیں تھا یہاں تک کہ نوشیروان عادل کے زمانہ میں بھی اس سے انتہائی بے رحمی کا سلوک کیا جاتا تھا۔ یونان میں عورت تمام حقوق سے محروم تھی۔ اس کو محض خواہشات پورا کرنے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ روما میں

عورت کی زبان بندی کے لیے اس کے منہ پر تالا لگایا جاتا تھا جس کا نام موسیلر تھا۔ فرانس میں عورت کو تجارتی بنیاد پر بازار میں فروخت کیا جاتا تھا۔(۱۸)

تاریخ انسانی شاہد ہے کہ ظہور اسلام سے پہلے تمام مذاہب میں عورت کو مرد سے کمتر گردانا جاتا رہا ہے۔ عزت واحترام اور تمام آسائشیں صرف اور صرف مردوں کے لیے مخصوص تھیں۔ چاہے کوئی بھی معاشرہ ہو عورت کو کوئی اختیار اور حق حاصل نہیں تھا حتی کہ عورت کی گواہی بھی ناقابل قبول تھی۔ عورت کی زندگی کا مقصد اور کل حاصل صرف اور صرف عبادت وخدمت کرنا تھا۔

اب ہم مسلم خواتین پر نظر ڈالتے ہیں۔ بعض مورخین یہ تاثر پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ عورتوں میں تعلیم بہت عام تھی۔ یہ سچ ہے کہ بااثر خاندانوں کی کچھ عورتوں کو تعلیمی سہولیات میسر تھیں اور انہوں نے اس سے فائدہ بھی اٹھایا۔ یوں اگر مذہب اسلام کے ابتدائی دور کے حوالے سے جائزہ لیا جائے تو طلوع اسلام کے وقت صرف پانچ عورتیں لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ جن میں حفصہ ،بنت عمر،ام کلثوم،بنت عقبہ،عائشہ بن سعد، کریمہ بن المقداد شامل ہیں۔ الشفاوہ خاتون ہیں کہ جنہوں نے حضرت حفصہ کو تعلیم دی تھی کیونکہ جب حضور اکرم نے حضرت حفصہ سے عقد کیا تو اس کے بعد بھی آپ نے الشفا سے درخواست کی کہ وہ تدریس کا سلسلہ جاری رکھیں۔ پیغمبر اسلام کی دوازدواج یعنی عائشہ اور ام سلمہ پڑھنا جانتی تھیں لیکن لکھنا نہیں جانتی تھیں۔ الشفا نے جس طریقے سے حضرت حفصہ کو تعلیم دی اسے لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ایک بہترین نمونہ سمجھا جاتا تھا بقول ڈاکٹر احمد شبلی

> اسکا کوئی باقاعدہ ثبوت نہیں ملا کہ لڑکیاں مکتب (مدرسہ) جاتی تھیں یا یہ کہ عورتیں مردوں کے ساتھ پڑھتی تھیں۔ روایت ہے کہ کچھ عورتیں رسول اکرم ﷺ کے پاس تعلیم کے سلسلے میں گفتگو کے لیے گئیں اور درخواست کی کہ آپ عورتوں کی تعلیم کے لیے ہفتے میں ایک دن مقرر کریں۔ آپ ﷺ نے ایسا ہی کیا اور اس دن باقاعدگی سے عورتوں کو درس دیتے تھے۔ رسول اکرم ﷺ کے ارشاد کے مطابق کہ (طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة) مسلمانوں نے عورتوں کو کبھی تعلیم سے محروم نہیں رکھا۔(۱۹)

بہر حال نجی طور پر علم حاصل کر کے بہت سی عورتوں نے مضامین خصوصاً اصول فقہ میں بڑا کمال پیدا کیا تھا۔ رسول ﷺ کی زوجہ حضرت عائشہ ،انصاری عورتوں کی تعریف کرتی تھیں کہ وہ اس موضوع پر عبور پانے میں

شرم وحجاب سے کام نہیں لیتیں۔ تعلیم یافتہ مردوں کے مقابلے میں پڑھی لکھی مسلم خواتین کی تعداد بہت کم تھی۔ اگر مردوں سے موازنہ کیا جائے تو ان پڑھ عورتوں کے مقابلے میں خواندہ خواتین کا تناسب یقیناً بہت کم تھا۔ سوال یہ جنم لیتا ہے کہ اس کا سبب کیا تھا؟ کیونکہ مذہب اسلام میں جنس کو حصول تعلیم میں کبھی رکاوٹ نہیں سمجھا گیا۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو اس کی وجہ کسی حد تک یہ تھی کہ سفر حصول تعلیم کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہوا۔ ڈاکٹر احمد شبلی اس رکاوٹ کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

> میرے خیال میں اس کی وجہ وہ مشکلات ہیں۔۔۔۔ علم کے لیے سفر تقریباً ناگزیر تھا اور اکثر بڑے طویل سفر کرنے پڑتے تھے۔ عرب عورتیں اس مشقت کی عادی نہیں تھیں کیونکہ انہیں معاشرے میں ایک مقدس مقام حاصل تھا۔ مردوں کا فرض رہا کہ جنگ میں حصہ لیں اور اپنے لوگوں کی آخری دم تک حفاظت کریں اور عورتوں کو یہ شرف حاصل تھا کہ وہ محلوں میں آرام سے بیٹھی رہیں۔(۲۰)

ہندوستان میں مسلم دور حکومت میں سلطان التمش کی بیٹی رضیہ سلطانہ (۱۲۳۴ء۔ ۱۲۴۰ء) کو ملکۂ ہند کہا گیا۔ سلطان التمش نے تین بیٹوں کے ہوتے ہوئے اپنی غیر شادی شدہ بیٹی رضیہ کو سلطان بنایا کیونکہ اس کے بیٹے سلطنت کو سنبھالنے کے لئے نااہل تھے۔ رضیہ سلطان کا عورت ہونا اس اہم فیصلے کی راہ میں رکاوٹ نہ حائل کر سکا تھا۔ دوسری جانب دہلی کی عوام نے آخری وقت تک ہر موقع پر رضیہ سلطان کا ساتھ دیا کیونکہ وہ انتظام ریاست کے معاملات میں خوب مہارت رکھتی تھیں اور تمام فرمان ان کے قلم سے جاری ہوتے تھے۔ اس کا عہد حکومت تین سال چھ ماہ چھ روز پر مشتمل ہے۔ اس کے زمانے کے مورخ منہاج سراج نے لکھا جس کا ذکر ڈاکٹر مبارک علی نے اپنے کتاب میں کچھ اس طرح سے کیا ہے کہ "اس کے اندر وہ تمام قابل تعریف خوبیاں موجود تھیں جن کا بادشاہوں کے اندر پایا جانا ضروری ہے۔"(۲۱)

ہندوستان کی تاریخ میں دوسرا اہم نام چاند بی بی (پ ۱۵۴۷ء) کا ہے۔ جن کی جرات و ہمت کے قصے ہندوستان کی تاریخ میں مقبول ہیں۔ چاند بی بی کی والدہ خدیجہ سلطانہ نے اپنی بیٹی کی اعلی درجے کی تعلیم و تربیت کی اور اسی تربیت کی بنا چاند بی بی میں وہ تمام خوبیاں اور اعلی اوصاف پیدا ہوئیں جو ایک شاہی خاتون اور بالخصوص سلطنت کی حکمران کے لیے ضروری قرار دیئے جاتے ہیں۔ چاند بی بی ماہر اور ایک بہترین جری سپہ سالار و شہسوار تھیں۔ ان کی جرات وہمت کو ڈاکٹر راحت ابرار نے کچھ اس طرح سے بیان کیا ہے کہ

اپنے شوہر کی زندگی میں اور اس کی وفات کے بعد میدان جنگ میں گئی، مختلف زبانوں
کی ماہر تھی۔ فارسی، عربی وغیرہ میں دستگاہ وافر رکھتی تھی اور تیلگو، تمل، مراٹھی
زبانوں میں بے تکلف گفتگو کرتی تھیں۔ علم و فن کی بڑی قدر دان تھی اور اپنے حلقے
میں ہر فن اور علم کی جاننے والی عورتیں رکھتی تھیں۔ (۲۲)

مغلیہ دور حکومت میں معروف اور اہم نام گلبدن بیگم (۱۶۰۱ء۔ ۱۵۲۲ء) کا ہے۔ جو مغلیہ خاندان کے پہلے حکمران ظہیر الدین بابر کی بیٹی تھیں۔ بابر کی وفات کے بعد ہمایوں جو کہ گلبدن کا بھائی تھا امور سلطنت میں بہن سے مشورے لیا کرتا تھا۔ علاوہ ازیں گلبدن کو شعر و شاعری اور تصنیف و تالیف کا بھی بہت زیادہ شوق تھا۔ بقول ڈاکٹر راحت ابرار ''ہمایوں کے نامور بیٹے جلال الدین محمد اکبر کی فرمائش پر گلبدن بیگم نے ہمایوں نامہ لکھا جس کا مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ (۲۳)

مغلیہ بادشاہ جہانگیر کی بیگم نور جہاں کو جو مقام حاصل ہوا وہ مغلیہ سلطنت میں کسی ملکہ کو نصیب نہیں ہوا۔ اپنی ذہانت و لیاقت کے بل بوتے پر بہت مقبول تھیں۔ بادشاہ ان کی مرضی کے برخلاف کوئی قدم نہیں اٹھاتا کیونکہ نور جہاں کا حکم قانون کا درجہ رکھتا تھا۔ شاہی فرمان پر ان کے دستخط ہوتے تھے۔ سکے پر بادشاہ کے نام کے ساتھ اس کا نام کندہ ہوتا تھا۔ نور جہاں بیگم نے پہلی بار گلاب کا عطر ایجاد کیا تھا۔ شعر و سخن میں مہارت رکھتی تھی۔ مغلیہ سلطنت کی سب سے مشہور و معروف ملکہ ممتاز محل (۱۵۹۳ا۔ ۱۶۲۲ء) (اصل نام ارجمند بیگم) جنہوں نے اعلی درجہ کی تعلیم و تربیت حاصل کی تھی۔ شاہجہاں سے شادی کے بعد اسے ممتاز محل کا خطاب دیا گیا، ممتاز محل کے انتقال کے بعد شاہجہاں نے اس کی یاد میں مقبرہ تعمیر کرایا جو تاج محل کے نام سے معروف ہے۔ شاہجہاں کی بیٹی جہاں آراء بیگم (پ ۱۶۱۴ء) بڑی عالم فاضل خاتون تھیں۔ وہ ایک ممتاز شاعرہ اور خطاطی میں بھی کامل مہارت رکھتی تھیں۔ ان کا لکھا ہوا قرآن پاک کا نسخہ مولانا آزاد لائبیری میں محفوظ ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے خواجہ معین الدین چشتی اور ان کے خلفاء پر ایک تصنیف چھبیس سال کی عمر میں لکھی تھی۔ زیب النساء مخفی (پ ۱۶۳۹ء) اورنگزیب عالمگیر کی بیٹی بہت بڑی عالم و فاضل اور صاحب دیوان شاعرہ تھی۔ ان کے علم و دانش اور دور اندیشی سے تمام لوگ واقف تھے۔ زیب النساء کا زیادہ تر وقت علمی و ادبی سرگرمیوں میں صرف ہوتا تھا۔ وہ اعلی شعری صلاحیتوں کی مالک تھیں اور ان کی علمی و ادبی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر راحت ابرار لکھتے ہیں کہ

> اس کے پاس ایک ایسا کتب خانہ بھی تھا جس میں تمام علوم کی کتابیں موجود تھیں،وہ اہل علم و فن کی قدردان تھی۔ چنانچہ اس کے ملازمین میں زیادہ تعداد ایسے اشخاص کی تھی جو اس زمانے میں علم و فضل میں خصوصیت کے ساتھ ممتاز سمجھے جاتے تھے۔اس کے زمانے میں ایک تفسیر زیب التفاسیر تیار ہوئی جو اس کے نام سے منسوب ہے۔یہ ترجمہ قرآن کی مشہور تفسیر تفسیر کبیر کا ہے جو امام رازی کی نامور تصنیف ہے۔وہ صاحب دیوان شاعرہ تھی۔(۲۴)

اکبر بادشاہ نے ہندوستانی علوم وفنون کو بہت زیادہ ترقی دی تھی۔اس مقصد کی خاطر انہوں نے دارالترجمہ بھی قائم کیا اور ہندوستانی اہم کتابوں مثلاً مہابھارت،رامائن،گیتا وغیرہ کے فارسی میں ترجمے کروائے۔علاوہ ازیں اکبر نے فتح پور میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے الگ سے جگہ بھی مختص کی تھی۔اورنگزیب عالمگیر نے بھی مذہبی تعلیمات کے پیش نظر تعلیم وتدریس کو بہت اہمیت دی تھی۔تعلیم نسواں کی جانب بھی بہت زیادہ توجہ مبذول کروائی تاکہ ان کے خاندان کی خواتین بھی تعلیم سے فیض یاب ہو سکیں۔اپنی بیٹیوں کو اورنگزیب عالمگیر خود تعلیم دیتے تھے۔یوں مغلیہ دور حکومت میں تعلیم نسواں کا چرچا ہو چکا تھا۔ابتداً مالدار ہندو اور مسلمان اپنی خواتین کو گھروں میں ہی تعلیم دیتے تھے۔مندرجہ بالا عمومی جائزے سے ان تصورات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں خواتین کی تعلیم صرف محلات میں موجود ملکاؤں کے لیے یا درباروں سے منسلک امراء و روساء کی خواتین تک محدود تھی۔عام رعایا اس حق سے محروم نظر آتی ہے کیونکہ ہندوستانی معاشرے میں بھی مردوں کو اولیت حاصل تھی۔عورت دوسرے درجے کی مخلوق تھی۔عورت کا واحد مقصد نسل انسانی کا فروغ قرار پایا تھا۔گھر کے دریچے سے باہر جھانکنا بھی اس کے لیے ناممکن تھا حتیٰ کہ معاشی طور پر بھی وہ مرد کے نان ونفقے کی محتاج تھیں اور ان کے عمل کا دائرہ بھی مرد معاشرے کے اخلاقی معیاروں کے مطابق تھا۔جب ہندوستانیوں کی تعلیم انگریز حکومت کی ذمہ داری ٹھہری تو آہستہ آہستہ اس کا دائرہ بڑھنے لگا۔خوش قسمتی سے اس وقت حکومتی سطح اور تعلیمی نظام کچھ ایسے انگریزوں کے ہاتھ میں تھا جو علوم وفنون کی اشاعت اور اردو زبان کی ترقی کے لیے خلوص دل سے جدوجہد کر رہے تھے۔اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے اصلاحی تحریکوں نے خاص طور پر کام کیا۔یوں مردوں کے ساتھ عورتوں کی تعلیم کا رواج ہونے لگا اس حوالے سے افتخار احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ

> حقیقت یہ ہے کہ انگریزی حکومت کی پوری تاریخ میں علم دوست، معارف پرور اور اردو نواز حکام کا ایسا اجتماع پھر کبھی ممکن نہ ہوا۔ پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر سرڈی۔ میکلوڈ خود عالم مستشرق اور علوم مشرقیہ کے حامی تھے۔ ان کی رہنمائی میں ناظم تعلیمات میجر فلر اور ان کے جانشین کیپٹن ہالرائڈ (Hellraid) نے اردو کو علمی وادبی حیثیت سے ترقی دینے میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔ (۲۵)

۱۸۱۹ء میں مشنریوں نے تعلیم نسواں کے لیے راہ ہموار کی لیکن یہ سلسلہ کافی تگ و دو کے بعد بھی زیادہ دیر تک نہ چل سکا کیونکہ کچھ سماجی، سیاسی اور مذہبی وجوہات آڑے آئیں۔ ہندو اور مسلمان اپنی بیٹیوں کو مشنریوں کے بنائے ہوئے اسکولوں میں بھیجنا ناپسند کرتے تھے۔ انگریز حکام بہت اچھی طرح جانتے تھے کہ ہندوستانی معاشرے میں تعلیم نسواں کے خلاف تعصب کی جڑیں بہت گہری اور مضبوط تھیں۔ ہندوستانی معاشرہ مغربی تہذیب اور تعلیم کے جدید طریقوں کو موزوں نہیں تصور کرتا تھا۔ اس تعصب کا نتیجہ جہالت اور غلامی کی صورت میں بعد ازاں معاشرے پر اپنے اثرات مرتب کرنے لگا تھا۔ البتہ تعلیمی پروگرام کے تحت انگریز حکام کی کوششوں سے نہ صرف علمی تصانیف کے ترجمے ہوئے اور مدارس کے لیے درسی کتابوں کے نئے سلسلے مرتب کیے گئے بلکہ تعلیم نسواں کے فروغ کی غرض سے خاص قسم کی کتابیں لکھوائی گئیں۔ افتخار احمد صدیقی مسٹر ایم۔ کیمپسن (M.Campson) اور سر ولیم مور (Sir William More) کی علم دوستی کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "سر ولیم مور اور مسٹر کیمپسن ادبی ذوق کے حامل اور اردو کے ادیب و مصنف بھی تھے۔ سر ولیم مور اور مسٹر کیمپسن دونوں کو اس بات کی فکر تھی کہ ایسی کتابیں ہوں جو سرکاری مدارس میں پڑھائی جا سکیں اور ایسی کتابیں بالکل نایاب تھیں جو لڑکیوں کے سکولوں میں پڑھائی جا سکیں۔" (۲۶) اس تناظر میں ولیم مور کا ڈپٹی نذیر احمد کے ناول توبۃ النصوح پر کیے گئے تبصرہ کو مد نظر رکھنا ازبس ضروری ہے۔ کیونکہ ولیم مور جیسا نظام تعلیم چاہتے تھے اس کے مرتب کرنے میں انہیں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ لہذا اپنے تبصرہ میں انہوں نے جن خامیوں اور کوتاہیوں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ قابل غور ہیں

> ہندوستان کی دیسی زبانوں میں ایسے صحت مند ادب کی نمایاں طور پر کمی محسوس ہوتی ہے جو مفید بھی ہوں اور دلچسپ بھی سبق آموز اور دلکش کہانیوں پر مشتمل کتابیں جو نو عمر طلبا یا خواتین کے مطالعے کے لیے موزوں ہوں۔ گویا نہ ہونے کے

برابر ہیں۔اچھی کتابوں کی نایابی، تعلیم اور بالخصوص لڑکیوں کی تعلیم کی راہ میں
ایک بہت بڑی روکاوٹ ہے۔(۲۷)

بحیثیت مجموعی اگر دیکھا جائے تو ان کے نزدیک لڑکیوں کی تعلیم کی راہ میں بڑی روکاوٹ اچھی کتابوں کی عدم دستیابی تھی۔ تعلیم نسواں کی تحریک کو چونکہ خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔اسی تناظر میں انیسویں صدی کے وسط میں جب انگریزوں نے مختلف صوبوں میں جدید نظام تعلیم کو پوری توجہ سے رائج کرنا شروع کیا تو اس شعبے کی مختلف اصلاحی کوششوں میں تعلیم نسواں کی ترویج واشاعت کا پروگرام بھی شامل تھا۔کیونکہ یورپین کی آمد سے قبل ہندوستان میں تعلیم نسواں کی جانب دیگر ایشیائی ممالک کی طرح بھرپور توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ہندوستانی رعایا میں بیداری شعور کی خاطر حکومت نے تعلیم نسواں کی جانب مطلق توجہ صرف کی تھی۔گارساں دتاسی نے اپنے اٹھارویں خطبے دسمبر ۱۸۶۸ء میں لکھا ہے کہ

حکومت کی طرف سے اس کا انتظام کیا گیا کہ تقاریر کے ذریعے تعلیم نسواں کی
تحریک کو فروغ دیا جائے۔چنانچہ ۱۸۵۱ء سے جب سے حکومت نے اس جانب توجہ
کی ہے عورتوں میں تعلیم کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔حکومت اپنے خرچ سے معلمات
کے لیے نارمل اسکول قائم کرا رہی ہے۔(۸۷)

مندرجہ بالا اقتباس کے تناظر میں دیکھا جائے گارساں دتاسی نے اس صورت حال کی وضاحت کی ہے کہ ہندوستان میں تعلیم نسواں انگریزوں کی وجہ سے باقاعدہ تحریک کی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔ تعلیم نسواں کے بارے میں سرولیم میور کی خوشی کا اظہار، ان کی ایک تقریر کے ذریعے زیادہ واضح طور پر سامنے آتا ہے۔ تقریر کا اقتباس جس کا اندراج افتخار احمد صدیقی نے کتاب میں کچھ اس طرح سے کیا ہے کہ

جب تمہاری عورتیں تعلیم حاصل کر لیں گی اور حقیقت میں تمہاری شریک زندگی
اس طرح بنیں گی کہ انہیں بھی وہی مرتبہ حاصل ہو جائے گا۔جو تہذیب یافتہ
ممالک میں عورتوں کو حاصل ہے تو ان کا فیض ہندوستان میں اس طرح پھیلے گا جیسے
ہمالیہ۔۔۔۔"(۲۹)

متذکرہ بالا صورتحال کا تنقیدی جائزہ لیں تو ظاہر ہے کہ جب ارباب اختیار حکام تعلیم نسواں کی تحریک کے پر جوش حامی تھے تو یہ تحریک کیوں نہ ترقی کرتی اور پھلتی پھولتی، کیونکہ حکمرانوں کی سرپرستی سے ہر شعبہ زندگی ترقی کرتا

ہے۔ہندوستان میں طبقہ اناث کو ترقی وخوشحالی دینے کی خاطر انگریز حکام کی کوششیں نمایاں ہیں۔وہ خواتین کو مردوں کے شانہ بشانہ اور ایک دوسرے کا مونس و غم خوار دیکھنا چاہتے تھے تاکہ ہندوستان بھی دیگر ترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل ہو سکے۔

> صوبہ شمال مغربی کے ناظم تعلیمات مسٹر کیمپسن کی پرجوش مساعی کی بدولت وہاں بھی تعلیم نسواں کو برابر ترقی ہوتی رہی ہے۔اس وقت صرف بریلی میں لڑکیوں کے پندرہ مدرسے ہیں۔(۳۰)

تعلیم نسواں کے حوالے سے ہونے والی تحریکات سے مسلمان بھی خاصے متاثر تھے۔ریاست بلرام پور کے مسلمان رئیسوں نے اپنے اپنے علاقوں میں لڑکیوں کے مدارس قائم کیے۔نواب بلرام پور نے تعلیم نسواں پر متعدد کتابیں لکھوائیں اور انہیں عوام میں تقسیم کرایا۔دہلی میں مسلمان لڑکیوں کے لیے متعدد مدارس کھولے گے اور اودھ کے چیف کمشنر نے حکومت سے درخواست کی کہ لکھنو میں شرفاءروساء کی بچیوں کے لیے ایک مخصوص درس گاہ قائم کی جائے۔ ۱۸۵۷ء میں جب اہل ہند کو ان کی جنگ آزادی میں شکست اور انگریزوں کو فتح حاصل ہوئی تھی۔یوں سلطنت برطانیہ کی باقاعدہ حکومت قائم ہوگئی اور اس وقت مسلمانوں کی تباہی و بربادی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔۱۸۳۴ء میں گورنر جنرل کونسل میں میکالے(Thomas Macaulay)کی رپورٹ کو شامل کیا گیااس کی رائے تھی کہ انگریزی تعلیم حکومت کا ایک مستقل فرض ہے۔اس کے مطابق ایک ایسا طبقہ پیدا کرنا تھاجو رنگ، نسل کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہو لیکن ذہناً انگریز ہوں اور حکومت کرنے میں معاون ثابت ہوں۔ مسلمانوں نے عموماً انگریزی کی طرف توجہ نہ کی لیکن جس وقت حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ جو وظائف طلبا کو دیئے جاتے ہیں، بند کر دیے جائیں اور کل روپیہ تعلیم انگریزی کی اشاعت پر صرف کیا جائے تو اس سے سماج میں شدت پیدا ہوگئی۔اس تعلیمی منصوبے کے حوالے سے ڈاکٹر ناصر عباس نیر لکھتے ہیں کہ

> میکالے کی تعلیمی رپورٹ ہندوستان کے برطانوی، تعلیمی نظام کے بنیادی خاکے کو سمجھنے میں مدد ہی نہیں دیتی بلکہ نوآبادیاتی پراجیکٹ کی تکمیل کے لیے مقامی معاونین کی تخلیق کالائحہ عمل بھی طشت ازم بام کرتی ہے۔(۳۱)

مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ مشرقی و مغربی تمدن کا تصادم شروع ہوا۔فارسی کی جگہ انگریزی کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔پرانی قدریں ایک ایک کر کے مٹنے لگیں اور نئی قدریں جڑ پکڑنے لگیں۔نئے علوم و فنون

کی مانگ بڑھتی گئی اور پرانے علم و فن کی قدر و قیمت گھٹتی گئی۔ غرض پرانا سماجی نظام اور پرانا تعلیمی ڈھانچہ سب بے جان نظر آنے لگا۔ یوں ۱۸۵۲ء تک اشاعت تعلیم میں مشنریوں کا کافی اثر ور سوخ رہا جس سے بدگمانی شدت سے پھیلتی گئی تھی۔ اس عرصہ میں کلکتہ، مدارس اور بمبئی کی یونیورسٹیاں بھی قائم ہو گئیں تھیں۔ تعلیم نسواں کے حوالے سے بہت خدشات تھے اور ممکنہ مسائل کے حل کے لئے کوششیں کی گئی تھیں۔ یوں اس صورت میں ایک اور پہلو سامنے آیا کہ لڑکیوں کو مخلوط نظام تعلیم سے دور رکھا جائے تاکہ معاشرہ اخلاقی و تہذیبی زوال کا شکار نہ ہو۔ اسی حوالے سے سر راس مسعود کا کہنا ہے کہ

> حقیقت میں ہم اس سوال کا جواب کہ ہماری قومی زندگی کی اساس کس قسم کے کلچر پر ہو اس وقت تک نہیں دے سکتے جب تک ہم یہ طے نہ کر لیں کہ ہمارے معاشرے میں ہماری خواتین کی کیا حیثیت ہو گی۔ اور جب تک یہ بات صاف نہیں ہو جاتی کوئی قطعی نظام تعلیم قائم نہیں کیا جا سکتا جو آنے والے دشوار گزار راستوں میں قوم کی رہنمائی کرے۔ (۳۲)

انیسویں صدی کے اوائل میں خواتین کی تعلیمی حالت بہتر نہ تھی، یہ صورت حال مسلمان اور ہندو دونوں فرقوں میں یکساں تھی۔ دونوں قومیں مذہبی تعصبات کا شدید شکار تھے اس لئے تعلیمی معاملات میں ہمیشہ پیچھے رہے تھے۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں قائم ہوئی تو وہاں کے افسران نے حتی المقدر کوشش کی کہ عورتوں کی حالت زار کو بدلا جائے اور انہیں جہالت کی پستیوں سے نکالا جائے۔ ہندوستانی معاشرت اور بالخصوص مشرقی روایات کو مد نظر رکھتے ہوئے انگریزوں نے محض مردوں کی تعلیم پر توجہ اس لیے بھی دی کہ ان کے مطابق یہاں کے لوگ خواتین کی تعلیم بالخصوص جدید تعلیم کے حق میں قطعاً نہیں تھے۔

ہندوستان میں جمہوریت، آزادی، مساوات انسان دوستی، اقتدار اعلیٰ اور قومیت پرستی جیسے تصورات مغربی کے زیر اثر ہی ابھرے۔ اصلاحی تحریکوں اور انجمنوں کا قیام عمل میں لایا گیا یوں غور و فکر کا دائرہ وسیع ہوا۔ کیونکہ اس زمانے میں عورت کی حالت معاشرتی سطح پر ہر لحاظ سے ناگفتہ بہ تھی۔ مذہبی، معاشرتی، اخلاقی استحصال نے اس کو اپنے وجود سے قطعاً بے خبر کر رکھا کیونکہ اسے اس کی حیثیت سے روشناس ہونے کا موقع ہی نہیں دیا گیا تھا۔ مذہب کی آڑ میں پردہ اور پردے کی آڑ میں زندگی کے دروازے عورت پر بند تھے۔ تعلیم کے نام پر وہ محض کتابیں پڑھنا جانتی تھی باہر کی دنیا سے اس کا تعلق نہ ہونے کے برابر تھا۔ فضول رسم و رواج نے معاشرتی زندگی کا دم گھونٹ رکھا تھا۔ لڑکیوں کو کم

عمری میں رشتہ ازدواج میں منسلک کرنا، نامناسب اور غیر موزوں جیون ساتھی کے انتخاب کا رواج تھا۔ انتخاب کا حق نہ ہونے کے باعث مرد و زن دونوں ہی کے لیے ایک دوسرے کی سنگت مشکل تھی۔ حتیٰ کہ بچیوں کی تعلیم و تربیت پر مناسب توجہ دینے کا تصور بھی نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب گھر بار کی ذمہ داری اٹھاتیں تو گھریلو زندگی بد نظمی کا شکار ہو جاتی تھی۔ جب اصلاح کا زور ہوا تو بہت سی تحریکوں نے عورتوں کی اصلاح اور تعلیم و تربیت کو اپنا اولین ہدف بنایا اور عورت کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی جو اس وقت معیوب سمجھی جاتی تھی۔ رشندی دیوی (۱۸۰۹۔۱۸۹۸ء) نے اپنی خودنوشت میں لکھا جس کا ذکر زاہدہ حنا نے اپنی کتاب میں یوں کیا ہے

> اپنی اس خواہش پر میں خود کو برا بھلا کہتی، سوچتی کہ شریف بہو بیٹیاں بھی کہیں پڑھتی یا لکھتی ہیں؟ لوگ پڑھی لکھی عورتوں کو برا سمجھتے۔ بڑی بوڑھیاں کسی لڑکی یا عورت کے ہاتھ میں کاغذ کا کوئی ٹکڑا دیکھ لیتیں تو ہاہاکا شور مچا دیتیں۔(۳۳)

اگر بغور نظر دیکھا جائے تو مذہب اسلام نے علم کو اللہ کا نور اور تعلیم کو ایک روحانی سکون قرار دیا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ نصف آبادی کو محروم رکھا جائے۔ موجودہ زمانہ کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو صاف عیاں ہے کہ قومی بیداری کی ترقی اور اعتماد نفس کی روح پھونکنے کے لیے اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ کل آبادی تعلیم یافتہ ہو۔ اگر ہندوستان کو تہذیب و تمدن کے میدان میں آگے بڑھنا ہے تو عوام کی ایک ہمہ گیر تعلیم نہایت ضروری اور قطعاً ناگزیر ہے۔ اس میں جنس کی قید نہ ہو۔ اس ضمن میں شاہ محمد سلیمان کہتے ہیں کہ

> ہمارے اس عجیب و غریب ہندوستانی رواج کی بناء پر کہ عورتوں کو ایک گوشے میں بیٹھا دیا جاتا ہے خود عورتوں کی طرف سے زنانہ تعلیم پر زیادہ زور نہیں دیا گیا۔ اس نتیجہ یہ ہوا کہ سرکار کی طرف سے زنانہ تعلیم پر اتنا روپیہ نہیں صرف کیا گیا جتنا لڑکوں کی تعلیم پر ہوا ہے۔۔۔۔(۳۴)

خواتین کو کسی بھی قوم کی روایات کا بہترین محافظ تصور کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں کوئی قوم ایسی نہ تھی جو اپنی لڑکیوں کی تعلیم کے لیے آمادہ اور اس کی خواہشمند نہ ہو لیکن ایسی تعلیم گھروں پر دی جاتی تھی۔ لڑکیوں کو جو تعلیم پانچ صدیوں سے دی جا رہی تھی اسے موجودہ زمانے اور عہد کے تقاضوں کے مطابق ہونا چاہیے تھا۔ وہ تعلیم بجائے گھروں کے لڑکیوں کو مدارس میں دی جانی چاہیے تھی تاکہ وہاں وہ زمانہ حال کے تحت تربیت حاصل کر سکیں۔ تعلیم نسواں کے حوالے سے دیکھا جائے تو بعض لوگ اس تعلیمی نصاب کے قائل ہیں کہ لڑکیوں کو ایسی تعلیم دی جائے جو

ان کی ازدواجی زندگی میں کارآمد اور مفید ثابت ہو۔ ساتھ ہی ساتھ اس کا موقعہ رہتا ہے کہ وہ ذاتی کوشش سے گھر کی چار دیواری کے اندر اپنے فرائض منصبی سے سبکدوش ہو کر اپنے دائرہ معلومات کو وسیع کرسکیں۔ ابوالقاسم فضل الحق خواتین کی تعلیمی صورتحال کے حوالے لکھتے ہیں کہ

> لڑکیاں خواہ ابتدائی تعلیم حاصل کریں خواہ تعلیم کی ابتدائی منزل کو پہنچ جائیں ان کو آبرو کے ساتھ ازدواجی زندگی بسر کرنی ہے۔ ایسی ڈگریاں تو حاصل کرلیں، ہیت و فلسفہ میں دستگاہ پیدا کرلیں۔ لیکن امور خانہ داری سے ناواقف ہوں تعلیم کہلانے کی مستحق نہیں۔(۳۵)

مندرجہ بالا اقتباس کو اگر تنقیدی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ان کے نزدیک دراصل امور خانہ داری ایک چھوٹے پیمانے پر انتظام سلطنت کے مترادف ہے۔ جس میں شعبہ مالی، شعبہ تعلیمی، شعبہ حفظان صحت وغیرہ تمام شعبے ہوتے ہیں۔ عورت کو اپنے خاوند کی آمدنی خوش اسلوبی، کفایت شعاری اور دوراندیشی کے ساتھ خرچ کرنا اور اپنے شوہر کو سکون مہیا کرنا اہم ہے۔ گھر میں رہنے والے اور مہمانوں کا خیال رکھنا ضروری ہے لہذا اس کی تعلیم ایسے اصولوں پر مبنی ہونی چاہیے بقول ابوالقاسم فضل الحق

> جب وکیل کو قانون کی اور ڈاکٹر کو علم ادویہ اور علم تشریح کی تعلیم دی جاتی ہے تو وکیل وکیل اور ڈاکٹر 'ڈاکٹر ہوتا ہے اگر وکالت کے طالب علم کو علم الادویہ اور ڈاکٹری کے طالبعلم کو قانون پڑھایا جائے تو نہ ڈاکٹر، ڈاکٹر ہوگا۔ نہ وکیل وکیل، اسی اصول پر اگر گھر والی کو امور خانہ داری میں ماہر ہونا چاہیے۔ میرا یہ نظریہ کسی تعصب یا تنگ خیالی پر مبنی نہیں۔۔۔۔ عورتوں کا پہلا فرض انتظام امور خانہ داری ہے کیونکہ ان کا یہ تلخ تجربہ ہے کہ عورتوں اور مردوں کو ایک ہی قسم کی تعلیم دینے کا یہ نتیجہ نکلا کہ عورتیں نہ فقط انتظام خانہ داری سے نابلد بلکہ اس سے متنفر بھی ہوگئی ہیں۔ انجام یہ ہوا کہ مردوں کی جنگی زندگی کا جو روشن پہلو تھا۔ وہ رفتہ رفتہ تاریک ہو کر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔(۳۶)

لہذا ان چند رجحانات کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا کہ وہ خواتین جنھوں نے تعلیم حاصل کرنے کی غلطی کی اسے مغربی تعلیم کہا گیا اور یہ کہ اس کے باعث وہ لڑکیاں اپنے اس ثقافتی ورثہ کو جو انہیں اپنے آباؤاجداد سے ملا حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں اور ان کے رویوں سے اس جذبہ حقارت کا اظہار ہوتا ہے۔ جب کہ حقیقتاً ایسا کوئی عنصر دیکھنے میں نہیں آتا یہ

صرف اور صرف سماج کی جانب سے معتصبانہ رویہ تھا جو نہیں چاہتے تھے خواتین تعلیمی میدان میں آگے بڑھیں۔ تعلیم نسواں کی تحریک کو بنگال میں برہمو سماج کی کوششوں سے اور بمبئی کے علاقے میں پارسی قوم کی روشن خیالی اور ترقی پسندی سے زیادہ فروغ حاصل ہوا تھا۔ شمالی ہند، بالخصوص پنجاب اور صوبہ شمال مغربی (یو۔پی) میں بھی یہ تحریک رفتہ رفتہ زور پکڑنے لگی۔ اس وقت مسلم قوم کے لئے سرسید احمد خاں مسیحا بن کر نمودار ہوئے تھے۔ انھوں نے مسلم قوم کی مدد کی جب ان کی ناؤ سخت طوفانوں میں گھری ہوئی تھی۔ سرسید کو انگریزوں سے مقابلہ کرنے کے لیے تعلیم کو اپنا ہتھیار بنانا پڑا۔ انہوں نے قوم کی بقا کے لیے انگریزی تعلیم کو ضروری سمجھا۔ مسلمانوں کو جب یہ پتہ چلا کہ سرکاری اسکولوں میں انگریزی تعلیم کا بندوبست ہوگا تو آٹھ ہزار علماء کے دستخطوں سے گورنر جنرل کو ایک میمورنڈم کے ذریعہ انگریزی تعلیم کی مخالفت کی تھی۔ سرسید احمد خاں جو ہر چیز کو عقل و استدلال کی کسوٹی پر پرکھتے تھے۔ وہ مذہب اور سائنس میں مطابقت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ وہ قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ سے بھی واقف تھے کہ ایک زمانے تک اسلام حکمت، سائنس اور روشن خیالی کا سرچشمہ تھا اور جب سے مسلمانوں نے علم و سائنس، شعور و آگہی سے اپنا ناطہ توڑا تبھی سے وہ زوال پذیر ہوتے چلے گئے۔ اگرچہ اس وقت سرسید کو شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ لیکن اگر زمانے کے حالات کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ اس وقت اس نظام تعلیم کو قبول کرنا لازم تھا کیونکہ ہندوستان کی دیگر اقوام حکمران قوم سے تعاون کر کے تعلیمی میدان میں آگے بڑھ چکی تھیں۔ سرسید کے تعلیمی نظریات کے حوالے سے ڈاکٹر راحت ابرار لکھتے ہیں کہ

> سرسید کا اصل مقصد ہندوستانی مسلمانوں کو ذہنی، معاشرتی اور اخلاقی پستی سے نکالنا تھا۔ سرسید یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ خواب اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک مردوں کے ساتھ عورتوں کی تعلیم و اصلاح اور مذہبی عقائد و رسومات کو درست نہ کیا جائے۔(۳۷)

مندرجہ بالا مقصد کے حصول کی خاطر سرسید نے ۱۸۷۰ء سے تہذیب الاخلاق میں عورتوں کی تعلیم اور کثرت ازدواج اور رفاہ عام وغیرہ عنوانات پر کئی مضامین لکھے۔ سرسید تحریک کے اثر سے بہت جلد ایک معقول اور روشن خیال مسلمان حلقہ بن گیا جس نے عام مسلمانوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم و اصلاح پر بھی خصوصیت کے ساتھ زور دیا۔ علی گڑھ میں ۱۹۰۴ء میں عورتوں کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی جس کے بانی شیخ عبداللہ

تھے جس میں عورتوں کی آزادی اور تعلیم کے سلسلے میں بہت سے فیصلے کیے گئے۔ تعلیم نسواں سے سرسید کی دلچسپی کا سراغ ہمیں ان کے خاندان کی روایات میں ملتا ہے۔ اگر ۱۸۵۷ء کا غدر نہ ہوتا اور سرسید کی والدہ کو ان حالات کا مقابلہ نہ کرنا پڑتا تو شاید وہ تعلیم پر توجہ نہ کرتے اور ایک ادیب کی حیثیت سے تصنیف و تالیف میں مگن رہتے اور خوش و خرم زندگی بسر کر سکتے تھے۔ سیرت فریدیہ میں سرسید نے اپنی والدہ کے ساتھ گزرے ہوئے تلخ حالات کا بہت گہرا اثر لیا تھا۔ جس نے ان کے جسم و جاں کو جھنجھوڑ دیا تھا۔ سرسید کے والد محمد متقی ایک صوفی انسان تھے اور جب شاہ غلام علی کے مرید ہو گئے تو ان میں گھر سے بے تعلقی پیدا ہو گئی تھی۔ اس لئے سرسید کی تربیت اور ان کے اخلاق و عادات میں ان کی والدہ کا بہت بڑا ہاتھ تھا بقول اصغر عباس

> ۔۔۔۔ سرسید کا قلم بے اختیار ان کے حسن کردار اور ان کی شفقت پر محبت کے غیر فانی پھول نچھاور کرنے لگتا ہے۔ یہی وہ ذات تھی جو بیٹے کے لئے تعلیم و ہدایت اور تالیف قلب کا مصدر تھی وہ بے حد سلیقہ شعار اور نہایت دانشمند خاتون تھیں۔ دہلی کی اشرافیہ کی رکن رکین ہونے کے باوجود ان کا دل زر و زیور سے اتنا خوش نہ ہوتا جتنا ضرورت مندوں کی حاجت روائی سے۔"(۳۸)

سرسید کی والدہ میں بہ نسبت دیگر خواتین کے غیر معمولی قابلیت موجود تھی۔ فارسی زبان میں بھی کامل مہارت رکھتی تھیں۔ سرسید نے ابتدائی تعلیم اپنی ماں سے ہی حاصل کی تھی۔ ان کے محلے اور خاندان کی لڑکیاں بھی ان کی والدہ سے پڑھتی تھیں۔ سرسید کی بہن صفیۃ النساء بیگم قابل خاتون تھیں۔ مندرجہ بالا بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ سرسید عورتوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں انہی خیالات کے حامی تھے۔ سرسید ایسی ہی تعلیم و تربیت کو مشرقی خاتون کے لیے ضروری خیال کرتے تھے۔ سرسید ہندوستان میں عورتوں کی زبوں حالی اور ان کے ساتھ امتیازی سلوک پر سخت نالاں رہتے تھے۔ انیسویں صدی کے ہندوستان میں دختر کشی اور بیوہ کے ستی ہونے کی رسم عام تھی نیز کئی کئی شادیاں کرنے کا رواج بھی تھا۔ اس زوال کی سب سے بڑی وجہ عورتوں کی تعلیم کو نظر انداز کرنا تھا۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو برطانوی خاتون مسز اینی بیسنٹ (Anni Besent) عورتوں کو قومی دھارے سے الگ رکھنے کی بہت شدید مخالفت کرتی تھیں۔ کیونکہ وہ ہندوستان اور بالخصوص ہندوستانی سماج کی بقاء اسی میں سمجھتی تھیں کہ مردوں اور عورتوں کو یکسانیت کی بنیاد پر برابر حقوق دیے جائیں۔ مثلاً اینی بیسنٹ ایک مقام پر لکھتی ہیں کہ

> For India's upliftment, the women must have open field, unfettered Hands, and un-impeded activity.The two sexes were not involved that one should enslave the others, but they should utilize the fuller life, the differences which pertain two sexes .(39)

سر سید نے تعلیم کے حوالے سے اصلاح معاشرہ کا بیڑا اٹھایا تھااور سب سے پہلے انہوں نے عورتوں سے متعلق فرسودہ رسومات کی قلع قمع کے لئے آواز بلند کی۔دیکھا جائے تواسی سال ''انجمن آگرہ''اور سر سید کی ''سائنٹفک سوسائٹی'' قائم ہوئی۔وہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کا مشن اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک کہ مردوں کے ساتھ عورتوں کی اصلاح نہ کی جائے اور ان کے مذہبی عقائد ورسومات کو درست نہ کیا جائے۔اصغر عباس اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ

> غدر کے بعد جب سر سید نے سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ سے اخبار انسٹیوٹ گزٹ کا اجراء کیا تو ہم عصر تمام اردو اخبارات میں سب سے پہلے غالباً سب سے زیادہ عورتوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں اور ان کے انحطاط کی تشویش کا اظہار ملتا ہے۔۔۔۔سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کی خبروں اور مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عورتوں کی حیثیت اور مرتبہ پر جو دھوئیں کے بادل چھائے ہوئے تھے انہیں بتدریج ہٹانے میں علی گڑھ گزٹ اور اس کے معاونین کی نگارشات کا اہم رول رہا ہے۔۔۔۔سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کے ہال میں سر سید نے جو پہلا توسیعی لیکچر دیا اس میں عقد بیوگان اور تعداد زوجات کے سلسلے میں مروجہ رسموں کو دور کرنے پر زور دیا گیا تھا۔۔۔۔اس خیال کو باطل قرار دیا گیا تھا کہ طبقہ اناث کا ذہن مردوں کے مقابلے میں کم تر ہے۔(۴۰)

سر سید نے تعلیم نسواں کے سلسلہ میں متعدد مضامین اور اداریوں میں اظہار خیال کیا اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے متعدد شمارے اس کاوش کے بہترین عکاس تھے۔وہ عورت اور مرد کو ایک دوسرے کا رفیق کار سمجھتے اور عورت کی تعلیم و تربیت کی کوشش کو معاشرے کی بہتری کا اولین قدم قرار دیتے تھے۔دنیا بھر میں مختلف قسم کے قبیلے ،اور سرداری نظام مشہور رہے ہیں اور اس جاگیر دارانہ نظام نے خواتین کو اپنا ماتحت بنا رکھا تھا۔اس سلسلے میں

تعلیم خواتین کو کنڑول کرنے کا بنیادی ذریعہ یا حربہ سمجھی جاتی رہی ہے۔ معاشرے میں عورت کا مقام بالخصوص تعلیمی لحاظ سے ،اور کسی قوم کی معاشی ترقی کا آپس میں بہت گہرا تعلق ہے، صنعتی بنیادوں پر تعلیم میں امتیاز ناشائستہ اقدام رہا ہے۔ یہ بات مسلمہ ہے کہ تعلیم افراد کی نشوونما اور ارتقا کے لئے انتہائی اہمیت کی حامل ہے اور وہ قوموں کی ترقی اور پیش رفت کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔اسی سلسلے میں سرسید کے کئی دوست تعلیم نسواں کے حمایتی بن کر سامنے آئے اور اس مشن میں ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ رفقائے سرسید کے حوالے سے ڈاکٹر راحت ابرار کچھ اس طرح سے رقمطراز ہیں کہ

> خود سرسید کے رفقاء میں ڈپٹی نذیر احمد نے لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ماحول سازی کا کام انجام دیا اور عورتوں کے مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنی تحریروں میں تعلیم نسواں کی پرزور حمایت کی اور اپنی شاعری میں یہ اعلان کیا کہ "اے ماؤں، بہنوں، بیٹیوں۔۔۔۔دنیا کی عزت تم سے ہے۔ محسن الملک نے اس خیال کا اظہار کیا کہ "بغیر تعلیم نسواں کے قوم کی زندگی مہمل رہے گی"۔۔۔۔(۴۱)

اس تناظر میں اگر عہد سرسید کا جائزہ لیا جائے تو سرسید کے عہد میں لڑکیوں کی تعلیم ایک تہذیبی ضرورت تو تھی مگر اقتصادی ضرورت نہ تھی۔ لڑکیاں گھر میں ہی تعلیم حاصل کر کے اس دور میں مسلم معاشرے کی تہذیبی ضرورت پورا کرتی تھیں۔ اگر خواتین اس نعمت سے محروم رہیں گی تو جو خوشحالی تعلیم یافتہ عورتوں کی وجہ سے ہوتی ہے وہ نہیں ہو گی۔ عورتوں کو تعلیم سے دور رکھنا ماسوائے ظلم کے اور کچھ نہیں ہے۔ ڈاکٹر راحت ابرار نے اپنی کتاب مسلم تعلیم نسواں کے سو سال میں سرسید کے حوالے سے لکھا کہ سرسید نے اپنے افکار و نظریات کی وضاحت کرتے ہوئے سید ممتاز علی کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

> میری دلی آرزو ہے کہ عورت کو بھی نہایت عمدہ اور اعلی درجے کی تعلیم دی جائے مگر موجودہ حالت میں کنواری عورتوں کو تعلیم دینا ان پر سخت ظلم کرنا اور رنج و مصیبت و مبتلا کر دینا ہے۔ عورت کی تعلیم قبل مہذب ہونے مردوں کے نہایت ناموزوں اور عورتوں کے لئے آفت بے درماں ہے یہی باعث ہے کہ میں نے آج تک عورتوں کی تعلیم کے لئے کچھ نہیں کیا۔"(۴۲)

تعلیم نسواں ہر وقت اور ہر دور کی ضرورت ہوا کرتی ہے کیونکہ اچھی مائیں اچھے بچے جنیں گے اور اچھے بچے بڑے ہو کر اچھا معاشرہ تشکیل دیں گے۔ایک مغربی سکالر نپولین (Napoleon) نے کہا کہ آپ مجھے اچھی مائیں دیں میں تمہیں اچھی قوم دوں گا کیونکہ ماں کی گود بچے کی پہلی درسگاہ ہے۔اگر ماں جاہل ہو تو بچے بھی علم سے عاری ہوں گے بقول علامہ اقبال

بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسہ زن
ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت (۴۳)

سرسید کی تحریروں اور تقریروں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ تعلیم نسواں کے مخالف نہیں تھے مگر اس وقت کے حالات ان کو اس بات کی اجازت نہیں دے رہے تھے کہ تعلیم نسواں کا آغاز کر کے وہ علماء کے سامنے ایک نیا محاذ کھولیں۔سرسید کے سامنے پوری دنیا کی مہذب قوموں کی تاریخ بھی تھی اور انہیں اس بات کا مکمل یقین تھا کہ لڑکوں کی تعلیم کے بعد لڑکیوں کی تعلیم بھی عام ہو جائے گی اس لئے انہوں نے اپنی تمام تر توانائی لڑکوں کی تعلیم پر مرکوز کی۔۱۸۸۲ء کو ڈبلیو ایچ ہنٹر (W.H hunter) کی سربراہی میں ایجوکیشن کمیشن کے سامنے جو گواہی دی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ سرسید نے ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے تعلیم نسواں کے تمام پہلوؤں پر کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔سرسید کے نزدیک گورنمنٹ کو تعلیم نسواں کے سلسلے میں بہت زیادہ جدوجہد کرنی پڑے گی اور اس کے لیے اس وقت عملاً کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی جس سے مسلمان اپنی بہو بیٹیوں کو تعلیم دلانے کے واسطے گورنمنٹ کے سکولوں میں بھیجیں اور نہ ہی ایسا کوئی سکول بنا سکتی ہے جہاں یہ لوگ بے فکر ہو کر بچیوں کو بھیجیں گے۔سرسید کے نزدیک اس کے بہت سے اسباب تھے بقول الطاف حسین حالی

> میں مسلمانوں پر یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ وہ اپنی لڑکیوں کو ان اسکولوں میں نہیں بھیجتے اور یقیناً کوئی اشراف یوروپین بھی، گو وہ کیسا ہی تعلیم نسواں کا شوقین ہو، مسلمانوں پر ایسا الزام نہیں لگا سکتا، بشرطیکہ وہ اس ملک کے مدرسوں کی حالت سے واقف ہو۔۔۔۔جس حیثیت اور واقفیت کے مدارس نسواں ہندوستان میں ہیں اگر ایسے مدرسے انگلستان میں فرض کئے جائیں تو کیا اشراف خاندانوں کے انگریز اپنی لڑکیوں کو ان مدرسوں میں تعلیم کے لئے بھیجنا پسند کریں گے؟ ہرگز نہیں (۴۴)

۱۸۷۷ء میں ایم اے او کالج کی بنیاد پڑی۔اگرچہ سرسید مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے انگریزی تعلیم ضروری سمجھتے تھے لیکن وہ مذہبی تعلیم اور اسلامیات کو بھی نصاب تعلیم کا ضروری جزو خیال کرتے تھے ان کی دلی خواہش تھی کہ مسلمان اگرایک طرف مغربی علوم اور مغربی لٹریچر سے بخوبی واقف ہوں تو دوسری طرف اسلامی علوم و معارف میں بھی بہترین دستگاہ رکھتے ہوں۔ حکومت نے ذریعہ تعلیم انگریزی زبان مقرر کی تھی۔اور سرسید اشاعت تعلیم میں انگریزی زبان کو ضروری سمجھتے تھے۔اگرچہ جدید طرز تعلیم میں مذہبی تعلیم کی گنجائش نہ تھی اور علی گڑھ کا نصاب و نظام پوری قوم کی ضروریات کو کافی نہ تھا۔اس لیے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ۱۸۹۲ء میں نواب وقار الملک نے یہ تجویز پیش کی کہ

> ہر مقام کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ جو مسلمان طالبعلم گورنمنٹ کالجوں اور اسکولوں میں پڑھتے ہیں ان کی مذہبی تعلیم کا کوئی مناسب اور مستحکم بندوبست کریں اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہماری مستورات اس قابل ہیں کہ اپنے بچوں کو تعلیم کو دے سکیں جو ہم ان کو دینا چاہتے ہیں۔۔۔۔عورتیں ہمیشہ ویسی ہی رہیں ہیں اور رہیں گی، جیسا انکو مرد بناتے ہیں۔۔۔۔(۴۵)

نواب وقار الملک کی اس تجویز کو بہت سراہا گیا کیونکہ اگر دیکھا جائے تو خواتین جو ہمارے مذہب اسلام میں کبھی امت الرجال کہلاتی تھیں اب ہم انہیں کیا وہی نام دوبارہ دے سکتے ہیں ؟اس لئے ضروری ہے کہ اگر ہم دنیا کی مہذب قوموں کی صف میں شامل ہونا چاہتے ہیں تو ہمیں عورتوں کو بھی ہر میدان میں ساتھ ساتھ لے کر چلنا ہوگا انہیں وہی مقام دینا ہوناگا جو انہیں پہلے حاصل تھا۔نواب وقار الملک کی تجاویز کا اگر موازنہ دیگر ممالک سے کیا جائے تو روم و مصر میں اس وقت تک بڑے بڑے مدارس لڑکیوں کی تعلیم کے لیے بنائے جا چکے تھے ورانہیں ترقی دینے کی غرض سے جدوجہد کر رہے تھے۔ مسلمان عورتوں کو پھر معاشرے میں وہی درجہ دینے کے لیے متحرک تھے جو اسلام کے عروج کے زمانے میں حاصل تھا۔بغیر کسی جنسی رکاوٹ کے لڑکیوں کو لڑکوں کی تعلیم کے متوازی چلنے اور معاشرتی ترقی پر اس کا سودمند اثر پڑنے کے حوالے سے سید امیر علی لکھتے ہیں کہ

> جب تک ترقی کے دونوں جزو برابر تناسب سے نہ ہوں گے کوئی عمدہ نتیجہ نہیں ہو سکتا ایک کو تعلیم دینا اور دوسرے کو جاہل رکھنا ضرر رساں نتائج پیدا کرے گا۔اگر سوسائٹی کا ایک فرد تعلیم یافتہ حصہ اپنی دلچسپی کے لئے بداخلاقی صحبتیں ڈھونڈنے گا

یا اپنی حالت کو نہایت نیچے درجہ پر رکھے گا۔ انتھیس کی حالت اور اسلام کے قبل
مکہ کی کیفیت میری دلیل کا ثبوت ہیں۔ انتھیس کے قدیم باشندے اپنے نوجوانوں
کو تعلیم دیتے تھے مگر عورتوں کو بالکل جاہل رکھتے تھے۔(۴۶)

اس عہد میں اسکولوں میں تعلیم کے سلسلے میں سب سے بڑی رکاوٹ پردے کی رسم تھی۔ انیسویں صدی میں یہ اندیشہ بہت سے دلوں میں اجاگر ہو رہا تھا کہ عورتوں کی آزادی سے اخلاقی معیاروں میں انتشار پیدا ہوگا۔ سرسید نہ صرف شرعی پردہ بلکہ مروجہ پردے کے حامی تھے۔ اور ان کے اس زاویہ نگاہ میں آخری عمر تک کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ سرسید کے افکار و نظریات کے حوالے سے مشہور زمانہ شاعر اکبر الہ آبادی کو کہنا پڑا بقول ڈاکٹر اصغر عباس

پردہ کا مخالف جو سنا بول اٹھیں بیگم
اللہ کی مار اس پہ علی گڑھ کے حوالے (۴۷)

ایک اور شعر میں کچھ اس طرح سے لکھتے ہیں کہ

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے(۴۸)

اس زمانے میں پردہ کی سختی کا یہ حال تھا کہ بعض گھرانوں میں خواتین کے کپڑے اس خوف سے دھوبی کو نہیں دیے جاتے تھے کہ خدانخواستہ کپڑوں کو نامحرموں کی انگلیاں چھو نہ لیں اور خاندان کی عزت داغ دار نہ ہو جائے۔ اخبار تہذیب نسواں جو عورتوں کے لئے تہذیب الاخلاق جیسی خصوصیات کا حامل تھا اس کے سرورق پر مدیرہ محمدی بیگم (وفات ۱۹۰۸ء) کا نام نہیں لکھا ہوتا بلکہ صرف اتنا درج ہوتا تھا کہ تہذیب نسواں ہر ہفتہ کو ایک شریف بی بی کے زیر نگرانی لڑکیوں کے لئے شائع ہوتا ہے۔ تعلیم نسواں کے حوالے سے سرسید اور ان کے رفقاء کے مضامین جرائد اور صحافتی سطح پر ایک زوردار طاقت اور نسائی تحریک کی شکل میں ابھرے اور اسی تناظر میں اصغر عباس لکھتے ہیں کہ

رفقائے سرسید میں چراغ علی، عبدالحلیم شرر اور سید ممتاز علی مروجہ پردہ کے
مخالف تھے۔ چراغ علی کا خیال تھا کہ شریعت موسوی اور عہد نامہ جدید نے
عورتوں کی سماجی اور اخلاقی سربلندی کے لئے کیا کچھ نہیں کیا اس کے برعکس اسلام

نے عورت کے ساتھ احترام کا سلوک کیا ہے۔عبدالحلیم شرر، سرسید کی دینوی برکتیں کے عنوان سے رسالہ لکھ چکے تھے۔۔۔۔انہوں نے اپنے کتاب حقوق نسواں میں لکھا کہ وہ اس رسم کو قانون فطرت کے خلاف ہی نہیں خلاف مذہب کے بھی سمجھتے ہیں۔۔۔۔(۴۹)

یوں سرسید اوران کے رفقاء کی حتی المقدور یہی کوشش رہی کہ خواتین کو معاشرے کے فعال رکن کے طور پر ثابت کریں۔مولانا حالی نے اس تحریک کے ابتدائی دنوں میں مجالس النساء لکھی جس سے عائلی زندگی کی ان تمام جزئیات کو قصے کے پیرائے میں بیان جس سے گھر خوشحالی کا ضامن بن سکتا ہے۔حالی نے عورتوں کی پاسداری کے حوالے سے نظم چپ کی داد لکھی تھی۔اس نظم کو پہلی بار ایجوکیشنل کانفرنس کے صیغہ نسواں کے اجلاس میں پڑھا تھا۔اور اس کا حق تصنیف 'علی گڑھ گرلس کالج' کو دے دیا تھا۔اس نظم میں حالی نے عورتوں کی عظمت اور سماج و مذہب میں ان کا مقام دکھایا ہے۔عورت ذات کے لئے تعلیم اور ہنر بے کار تصور کیے گئے اور صرف مرد ذات کے لئے علم وہنر لازمی اور مخصوص تصور کیا جانے لگا۔ہندوستانی معاشرے میں عورت کے مقام و مرتبے کا بھرپور اظہار حالی کی درج ذیل اس نظم میں ملتا ہے۔ان تمام ہونے والی سماجی ناانصافیوں کے متعلق حالی نے کچھ اس طرح شاعرانہ پیرائے میں لکھا ہے کہ

اے ماؤ بہنو،بیٹیو! دنیا کی عزت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمہی قوموں کی عزت تم سے ہے
فطرت تمہاری ہے حیا طینت میں ہے مہرووفا
گھٹی میں ہے صبر و رضا انسان عبارت تم سے ہے
گاڑی گئیں تم مدتوں مٹی میں جیتی جاگتی
حامی تمہارا تھا مگر کوئی نہ جز ذات خدا
بیاہی گئیں اس وقت تم،جب بیاہ سے واقف نہ تھیں
جو عمر بھر کا عہد تھا وہ کچے دھاگے سے بندھا
بیاہا تمہیں ماں باپ نے اے بے زبانو! اس طرح
جیسے کسی تقصیر پر مجرم کو دیتے ہیں سزا
جب تک جیو تم علم و دانش سے رہو محروم یاں

آئی ہو جیسی بے خبر ویسی ہی جاؤ بے خبر
جو علم مردوں کے لیے سمجھا گیا آب حیات
ٹھہرا تمہارے حق میں وہ زہر ہلاہل سر بسر(۵۰)

مندرجہ بالا نظم کے علاوہ اسی پیرائے میں حالی نے ایک نظم مناجات بیوہ لکھی تھی۔اس نظم کے حوالے سے بابائے مولوی عبدالحق نے مہاتما گاندھی سے کہا تھا کہ اگر آپ اس زبان کا نمونہ دیکھنا چاہتے ہیں جو سارے ہندوستان میں بولی جاتی ہے تو حالی کی مناجات بیوہ پڑھیے۔مناجات بیوہ سے عورتوں کے مسائل کے حل کے لئے کمیٹیاں بنیں، مختلف خواتین کے گروہوں نے اپنی اپنی محفلوں میں اس کو پڑھا اور پڑھایا۔مناجات بیوہ میں ہمارے معاشرے کی فضا اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ ہر بات کو کھلے عام یا ہر جذبے کا اظہار کیا جائے۔اس نزاکت کو جانتے ہوئے حالی نے اس نظم کو اشاروں، علامتوں، محاوروں، استعاروں اور تشبیہوں سے ذکر کیا ہے۔نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

چین سے جاگی اور نہ سوئی
میں نہ ہنسی ، جی بھر کے نہ روئی

گھر پر برہا پیا بدیسی

آئیو برکھا کہیں نہ ایسی

اپنے پرائے کی دھتکاری

میکے اور سسرال پہ بھاری

دن بھیانک اور رات ڈراؤنی

یوں گزری ساری یہ جوانی

گر سسرال میں جاتی ہوں میں

نحس قدم کہلاتی ہوں میں

میکے میں جس وقت ہوں آتی

رو رو کر ہوں سب کو رلاتی

اڑ گئیں دل کی سب وہ ترنگیں
چاؤ رہے باقی نہ اُمنگیں
یوں نہ بری اس جان پہ بنتی
ماں مجھ کو اے کاش نہ جنتی(۵۱)

ان نظموں نے حالی کو ان عظیم شعراء کی صف میں کھڑا کر دیا ہے جنھیں عورتوں کے ساتھ بے انصافیوں کا شدید احساس ہے۔ سر سید کا تہذیبی پروگرام جس زمانے میں نوجوانوں کی دلوں کی بلند امیدوں کا مرکز بنا ہوا تھا وہ یہاں کی عورتوں کے مقدر میں بھی تبدیلی کا امکان ثابت ہوا تھا۔ مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین کو بھی آگے بڑھنے کے مواقع ملے۔ ہندوستان کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی عورتوں کے حقوق کو تسلیم کیا گیا اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے اقدامات کیے گئے۔ عورتوں کی تعلیمی ترقی کے لیے اخباروں اور رسائل میں مضامین شائع کیے جانے لگے۔ کانفرنسوں اور زنانہ اجلاس کا قیام عمل میں لایا۔ جس سے خواتین کی ذہنی بیداری مقصود تھی۔ سر سید نے خواتین کے ساتھ ساتھ مردوں کی تعلیم و تربیت پر یکساں توجہ دی۔ سر سید کے نظریے کے حوالے سے غزل یعقوب اپنے مقالے ماہنامہ اشاریہ عصمت میں لکھتی ہیں کہ

> انہیں اس بات کا احساس تھا کہ جب تک مرد تعلیم یافتہ نہیں ہوں گے، عورتوں کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں کی جاسکتی اور حقیقت بھی ہے کہ دنیا میں کوئی مثال نہیں ملتی کہ مرد تعلیم یافتہ نہ ہوں اور عورتیں تعلیم یافتہ ہو جائیں۔ چنانچہ جب سر سید کی تعلیمی تحریک کے زیر اثر مردوں کا ایک گروپ لکھ پڑھ کر تیار ہوا تو عورتوں کی جہالت اور ان کے فرسودہ خیالات کے خلاف تحریک شروع ہو گئی۔(۵۲)

مختصر یہ کہ اس زمانے میں ''اصلاح، ترقی، تعلیم نسواں''کی جانب بھرپور توجہ مرکوز کی گئی۔ حکومت کی طرف سے جہاں شعبہ تعلیم کے لیے نئی کتابیں لکھوائی جا رہی تھیں، وہاں خواتین کے لیے بھی درسی کتابوں کی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ مصنفوں، ادیبوں نے اصلاحی نقطہ نظر سے آسان زبان میں دلچسپ کتابیں مرتب کرنے کی کوشش کی مگر ان شخصیات کی حوصلہ افزائی کے لئے حکومت کی طرف سے کوئی انعام مقرر نہیں کیا گیا یوں پھر اس ضمن میں بیشتر کتابیں محکمہ تعلیم سے متعلقہ افراد نے محکمانہ ضروریات کے تحت لکھیں۔ ادبی انعام کی تحریک

سب سے پہلے سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی کی طرف سے پیش کی تھی۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی اس تناظر میں لکھتے ہیں کہ

> دتاسی نے محکمہ تعلیم کی بعض اور مفید کوششوں کا ذکر بھی کیا ہے مثلاً ۱۸۶۴ء میں محمد اسماعیل نے لڑکیوں کے مدارس کے لیے ایک کتاب "نیرنگ نظر" لکھی۔ اسی سال مسٹر ایم۔ کیمپسن ڈاکٹر سررشتہ تعلیمات نے ایک سبق آموز قصہ "داستان جمیلہ خاتون" کے نام سے تصنیف کیا۔ دتاسی نے ۱۸۶۵ء کے خطبے میں اس داستان کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس کا پلاٹ قدیم داستانوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ (۵۳)

دوسری جانب سرسید کے رفقاء عورتوں کی حمایت میں سرگرم اراکین کی حیثیت سے ابھرے اور یوں بات عورتوں کی تعلیم سے نکلی تو ان کے حقوق کی فراہمی تک جا پہنچی۔ شادی کی عمر مقرر ہوئی، ستی کی رسم مذموم ہوئی۔ بیوہ کی شادی کو رواج دیا جانے لگا۔ عورت محض نسل انسانی کے فروغ کے لیے ہی نہیں بلکہ ان کی تربیت کی بھی ضامن قرار پائی۔ اسی سوچ اور اصلاح نسواں کے خیالات کی ابتدا مولوی وزیر علی، نذیر احمد پھر ان کے پیش رو مصنفین نے اپنایا اردو ناول کی ابتدا انہی خیالات سے ہوئی۔

مولوی وزیر علی نے (۱۸۶۳ء۔ ۱۸۶۴ء) میں واقعاتی اور اصلاحی کہانیوں کا ایک مجموعہ مراۃ النساء کے نام سے مرتب کیا اور پھر اسے فاطمہ کے فرضی نام سے چھپوایا تھا۔ جو چھ طویل کہانیوں اور ۳۴ حکایات (مختصر کہانیوں اور چند مذہبی خطبات) پر مشتمل ہے۔ مذکورہ بالا دیسی قصوں کے برخلاف مراۃ النساء کی تمام کہانیاں اسلامی معاشرے سے متعلق ہیں۔ افتخار احمد صدیقی مصنف کے حوالے سے تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

> مولف حیات نذیر نے مولوی وزیر علی کے نام "مراۃ النسا" کو ان کتابوں میں شمار کیا جو "مراۃ العروس" کے اتباع میں لکھی گئیں (حیات، ص ۱۶۲) لیکن اس سلسلے میں ان کے دیگر بیانات کی طرح یہ بیان بھی غلط ہے۔ اگرچہ "مراۃ النساء" کا سنہ اشاعت ۱۸۷۰ء ہے لیکن مصنف "مراۃ النسا" کے اس بیان میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں کہ یہ کتاب ۱۸۷۰ء میں تصنیف ہوئی۔ مصنف نے یہ کتاب "فاطمہ" کے فرضی نام سے چھپوائی تھی۔ طبع اول کے محض آخری صفحے (۲۱۸) پر ان کا نام "حسب فرمائش" کے الفاظ کے ساتھ درج ہے۔ جس

مصنف کے اخلاص وایثار نفس کا یہ عالم ہو، وہ سنہ تصنیف کیوں غلط درج کرے
گا؟(۵۴)

مولوی وزیر علی کے پیش نظر اول تو مسلمانوں کی خانگی زندگی اور بالخصوص طبقہ نسواں کی اصلاح ہے۔ جاہل عورتوں کی بدمزاجی اور بدمزاج شوہروں کی زیادتی سے باہمی تعلقات میں جو الجھنیں پیدا ہوتی ہیں ان کا تجزیہ، ان کی کہانیوں، میں بڑی خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ان کہانیوں کا تاریخی پس منظر انتزاع سلطنت اودھ ۱۸۶۵ء سے کچھ پہلے کا زمانہ ہے جب دربار، محلات مکمل طور پر عیش پرستی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ مولوی وزیر علی کو اس معاشرے سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا لہذا مراۃ النسا میں محلاتی زندگی کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ ان قصوں کے تمام کردار قصبات و دیہات کے عام مسلمان زمیندار، کسان اور مزدور ہیں۔

اس عوامی معاشرے کی تمام روایات اور تمدنی خصوصیات، بعض سطحی تبدیلیوں کے سوا اب تک باقی ہیں اور اس علاقے کے لوگ ان کہانیوں کو پڑھتے ہوئے آج بھی یہ روایتی انداز محسوس کرتے ہیں۔ نسوانی کرداروں کے ناموں میں جہاں مریم، کلثوم، آسیہ، آمنہ اسلامی نام ہیں۔ وہاں منی، شبراتن، حفیظن وغیرہ خالص عوامی اور دیہاتی وضع کے نام بھی ہیں جو سیرت سے مناسبت رکھتے ہیں لیکن مراۃ النسا کی کہانیوں میں کوئی نام ایسا نہیں جسے کردار کی رعایت سے علامتی کہا جا سکے۔ بقول افتخار احمد صدیقی

> مولوی وزیر علی اس دور کے ادیبوں کی طرح رعایت لفظی کے دلدادہ نہیں ورنہ شاید وہ بھی اصغری اور اکبری جیسے نام تجویز کرتے۔ ان کا اسلوب تحریر بھی انشا پردازی کے تکلفات سے عاری ہے۔ مولوی وزیر علی کو عورتوں کی زبان اور گلہ شکوہ، طنز کے مخصوص نسوانی لہجے پر پورا عبور حاصل ہے۔ عورتوں کی رزم آرائیوں کا جہاں ذکر آتا ہے تو نفرت اور غصے کے اظہار کے لیے وہی الفاظ و محاورات استعمال کیے ہیں جو ان موقعوں پر اکثر بولے جاتے ہیں، مثلاً نگوڑی، مونڈ مونڈی، ڈاڑھا لگے، گا جپڑے وغیرہ۔(۵۵)

اگرچہ مولوی وزیر علی کا اصلاحی تحریک سے براہ راست کوئی ناطہ تھا، اور نہ ہی وہ نذیر احمد یا تعلیم نسواں کے دیگر علمبرداروں کی طرح ترقی پسند نظریت کے حامی تھے اور نہ ہی انہیں اس دور کے ادیبوں کی صف میں کوئی نمایاں

مقام حاصل ہے۔ لیکن اسلامی معاشرے کی فلاح و بہبود اور خصوصاً اصلاح نسواں کے حوالے سے جو افسانوی ادب تخلیقی سطح پر نمودار ہوا۔ اس میں مراۃ النسا کی اولیت واہمیت کا اعتراف لازماً کرنا پڑتا ہے۔

سرسید کے رفقاء میں سے ڈپٹی نذیر احمد نے تقریباً نصف صدی تک خواتین کی پس ماندگی کے خلاف جہاد کیا اور ان کی تحریروں کو اس زمانے میں بڑے ذوق وشوق سے پڑھا گیا۔ نذیر احمد کے ناولوں کا محرک قومی اصلاح، فلاح و بہبود کا جذبہ تھا کیونکہ ان کی مقصدیت اس دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ ان کے تمام ناولوں میں مقصدیت اور اصلاحی پہلو بہت زیادہ نمایاں ہے۔

> لیکن نذیر احمد کی مقصدیت کو عموماً ان کی مولویت کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ توجیہہ درست نہیں۔۔۔ مراۃالعروس اور بنات النعش کی تصنیف براہ راست تعلیم نسواں کی اس تحریک سے وابستگی کا نتیجہ ہے جو انگریز حکام اور محکمہ تعلیم کے ارکان کے تعاون سے شروع ہوئی تھی۔(۵٦)

نذیر احمد محکمہ تعلیم کی سابقہ ملازمت کی وجہ سے درسی ضروریات سے آگاہی رکھتے تھے۔ اپنے گھر میں موجود خواتین کے لیے موزوں کتابوں کی تلاش میں سرگرداں تھے کیونکہ اس زمانے میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے مناسب اور موزوں کتب کمیاب تھیں۔ مولوی نذیر احمد بحیثیت باپ، بحیثیت مصلح، مسلم معاشرے میں عورتوں کی دردناک حالت دیکھ کر پریشانی کا شکار تھے۔ چنانچہ مراۃالعروس کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں بقول افتخار احمد صدیقی

> عام دستور کے موافق ہم عورتوں کی کچھ قدر نہیں دیکھتے۔۔۔ خانہ داری کے برتاؤ میں دیکھو تو گھر کی ٹہل خدمت کے علاوہ دنیا کا کوئی عمدہ کام بھی عورتوں سے نہیں لیا جاتا یا کسی عمدہ کام کی صلاح یا مشورے میں عورتیں شریک ہوتی ہیں۔۔۔(۵۷)

انہیں معلوم تھا کہ عورتوں کا معاشرے میں بے وقعت ہونے کا سبب جہالت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ تعلیم اور جہالت، ہنر مندی و بے ہنری کے نتائج معاشرتی زندگی میں قوم کے سامنے پیش کرنے کی غرض سے نذیر احمد نے اکبری اور اصغری کی زندگیوں کے دو مثالی نمونے پیش کیے تھے۔ تعلیم نسواں کے حوالے سے نذیر احمد کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اتنی تعلیم ہر عورت کے لیے ضروری ہے جس سے وہ اپنے امور خانہ داری کے فرائض کو منضبط طریقے سے سرانجام دینے کے قابل ہو سکے۔ اس تعلیم میں سینا پرونا، کھانا، پکانا، پڑھنا، لکھنا، حساب کتاب وغیرہ بنیادی نوعیت و اہمیت کی

چیزیں شامل ہیں، لیکن نذیر احمد کے نزدیک عورت کا دائرہ عمل صرف خانہ داری کے معمولی انتظامات تک محدود نہیں رہا ہے بلکہ وہ اسے اپنے شوہر کی مونس و غمخوار اور زندگی کے ہر نوعیت کے چھوٹے بڑے معاملات میں بہترین مشیر و معاون کے دیکھنا چاہتے تھے۔ اس تناظر میں افتخار احمد صدیقی رقمطراز ہیں کہ

> اے عورتو! تم مردوں کے دل بہلاؤ، ان کی زندگی کا سرمایہ، عیش اور ان کی آنکھوں کی باغ و بہار۔۔۔۔بنو اگر تم سے مردوں کو بڑے کاموں کے انتظام کا سلیقہ ہو تو۔۔۔۔ تم سے بہتر انکا غمگسار، تم سے بہتر ان کا اصلاح کار، تم سے بہتر ان کا خیر خواہ اور کون ہے۔(۵۸)

نذیر احمد کا ناول توبۃ النصوح جس کا موضوع اولاد ہے۔ ان کے نزدیک ماں کی آغوش بچے کی پہلی درسگاہ ہوتی ہے۔ ماں کی حیثیت سے اولاد کی تربیت بھی اسکا اہم فریضہ ہے۔ چھوٹے بچوں کی تعلیم مدرسے کی نسبت گھر میں بہت بہتر ہو سکتی ہے۔ ماں اپنے بچوں کو وہ سب اہم باتیں سکھا سکتی ہے جو استاد برسوں کی تعلیم میں بھی نہیں سکھا سکتا ہے۔ جو کہ ظاہر ہے ادنی درجے کی تعلیم سے نہیں ہو سکتی ہے۔ طریقہ تدریس کے حوالے سے ڈاکٹر محمد اختر لکھتے ہیں کہ

> توبۃ النصوح (۱۸۷۷ء) نذیر احمد کا مشہور ناول ہے۔ اس ناول کا موضوع تربیت اولاد ہے۔ یعنی ان کی پرورش و پرداخت، تہذیب و تربیت، اخلاق کی درستگی، خیالات اور معتقدات کی اصلاح والدین کی ذمہ داری ہے۔(۵۹)

خواتین کے نصاب میں امور خانہ داری کے علاوہ جغرافیہ، تاریخ، حفظان صحت کے اصول، اور ابتدائی سائنس کا شامل ہونا بھی از بس لازمی تھا تاکہ ان کی معلومات میں وسعت پیدا ہو سکے اور وہ دنیا کے حالات سے اور زمانے کی رفتار سے ہمہ وقت باخبر رہیں۔ اس ضمن میں ناول بنات النعش کا خاص موضوع علمی معلومات ہیں۔ چونکہ اس زمانے میں تعلیم نسواں کا رواج مسلمانوں میں عام نہیں ہوا تھا۔ اس لیے نذیر احمد نے اس کتاب میں واقفیت عامہ اور ابتدائی سائنس سے متعلق ضروری معلومات اکٹھی کر دی ہیں۔ تاکہ یہ کتاب اس تعلیمی کمی کو پورا کر سکے جو ایک مدت سے مدارس میں محسوس کی جا رہی تھی۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ طویل عرصہ تک قصباتی و دیہاتی گھرانوں کی تاریک فضا نذیر احمد کی ان کہانیوں سے مستفید ہوتی رہی، بلکہ شہری گھرانوں کی خواتین میں بھی یہ کتابیں اعلیٰ تعلیم کا کامل نمونہ ثابت ہوئیں تھیں۔ تعلیم نسواں کے حامی ہونے کے علاوہ نذیر احمد ایک خالص اسلامی

تحریک یعنی سید احمد شہید (۱۷۸٦۔۱۸۳۱ء) اور شاہ اسماعیل شہید (وفات ۱۸۳۱ء) کی تحریک اصلاح رسوم وعقائد سے بھی گہری وابستگی رکھتے تھے۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ

> یہ تحریک شاہ ولی اللہ کی انقلاب آفریں تعلیمات کے زیر اثر ۱۹۱٦ء کے قریب شروع ہوئی۔ سید احمد شہید اور ان رفقاء نے تبلیغی دورے کر کے اس تحریک کو شمالی ہند کے تمام مرکزی مقامات میں پھیلا دیا۔ ان کی پر تاثیر تقریروں اور تحریروں سے علما کا ایک گروہ مذہبی و معاشرتی اصلاح پر کمربستہ ہو گیا لیکن تحریک جہاد کے زور شور میں اصلاح رسوم کی تحریک دب کر رہ گئی۔۔۔۔ نذیر احمد کا مذہبی شعور حضرت شاہ ولی اللہ کے مکتبہ فکر سے وابستہ تھا۔ (٦۰)

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے اصلاحی قصوں میں ان تمام لایعنی رسوم، توہمات جو عورتوں کی شریعت میں دین وایمان کا درجہ رکھتی تھیں ان کو مزاح کا نشانہ بنایا ہے۔ غرض عقائد کا کوئی پہلو ایسا نہیں مثلاً پیدائش سے لے کر موت تک تمام رسمیں، قبر پرستی، نذر نیاز، منت مراد، تعویز، جھاڑ پھونک وغیرہ جس پر نذیر احمد نے تنقید نہ کی ہو۔ انہوں نے اپنی اصلاحی مہم میں وعظ و نصیحت کے بجائے دلچسپ مکالموں اور طنز و مزاح سے کام لیا ہے۔ جبکہ دیکھا جائے تو دوسری جانب واعظوں اور معلموں کا طبقہ خطابت ہی کرتا رہ گیا اور نذیر احمد نے عورتوں کے دل و دماغ کو جاہلانہ توہمات اور ان کی مضبوط جڑوں کو کاٹ کر معاشرے میں پاک کر دیا تھا۔ نذیر احمد پردے کے زبردست حامی ہونے کے باوجود عورتوں پر بے جا قید و بند کے مخالف تھے۔ بنات النعش میں شہری و دیہاتی معاشرت کا مقابلہ کرتے ہوئے انہوں نے دیہاتی پردے کی صورت حال پر کچھ اس طرح سے تنقید کی ہے۔

> عورتوں پر کچھ اس طرح کی سختی اور قید ہے کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ آٹھ آٹھ دس برس کی بیاہی ہوئی اور تین تین چار چار بچوں کی مائیں گھونگھٹ کا تو بڑا چڑھا ہوا ہے۔ بات چیت سے معذور، گفت و شنود سے محروم۔ غرضیکہ شرعی پردہ داری کے ساتھ جو آزادی عورتوں کو حاصل ہونی چاہیے۔ دیہات میں میسر نہیں۔ غلامی کی حالت میں بیچاریوں کی زندگی بسر ہوتی ہے۔ (٦۱)

شادی بیاہ کے معاملے میں اسلام نے عورتوں کو اظہار رائے کی آزادی، خلع کا حق اور عقد ثانی کی اجازت دی ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں عورت ان تمام حقوق سے محروم کر دی گئی ہے۔ نذیر احمد نے اپنے قصوں میں جابجا

اس زیادتی کے خلاف احتجاج کیا ہے۔بنات النعش میں ایک دو ضمنی حکایتیں ہیں جہاں اس مسلے کو مؤثر پیرائے میں چھیڑا گیا ہے۔ایک جگہ عربوں کے معاشرے کی تصویر کشی اور جھلک دکھاتے ہوئے عرب عورتوں کی آزادی کے مقابلے میں ہندوستانی عورتوں کی حق تلفیوں کا اور زیادتیوں کا ذکر ہے تو دوسری جگہ ایک انگریز میم کی زبان سے طنزیہ کہلوایا گیا ہے کہ

> ہم لوگوں میں یہ بہت اچھا ہے کہ شادی لڑکا لڑکی کی رضامندی سے ہوتی ہے۔میں نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ رضامندی اب لوگوں کے مذہب میں بھی شرط ہے مگر دیکھا کہ اس کا برتاؤ کچھ بھی نہیں ہوتا۔(۶۲)

مراۃ العروس میں خانہ داری کی اصلاح مقصود ہے اور اس میں سلیقہ مندی اور کفایت شعاری کو مادی خوش حالی کا باعث قرار دیا گیا ہے۔ڈپٹی نذیر احمد نے پورے واقعے پر روشنی ڈالنے کے لئے اصغری اکبری کے کردار تخلیق کیے ہیں۔اصغری اپنے حسن انتظام سے ایک مقروض ،بدحال خاندان کو قرض کی لعنت سے چھڑایا تھا۔اس کفایت شعاری نے اجڑے ہوئے گھر میں گرہستی کا سارا ساز و سامان مہیا کیا۔وقت اور دولت کے بے جا اسراف کی نحوستیں دور ہوئیں تو نظم وضبط کا اظہار واضح بنیادوں پر ہونے لگا۔بقول ڈاکٹر خالد محمد اختر

> "مراۃ العروس"۱۸۶۹ءاردو کا پہلا باقاعدہ اصلاحی ناول کہا جا سکتا ہے۔جس کا موضوع خانگی سکون و مسرت اور امور خانہ داری ہے۔خانگی زندگی میں عورت کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی جیسی ہے۔شادی کے بعد عورت کے فرائض اور اس کی ذمہ داریاں دو چند ہو جاتی ہیں۔۔۔۔سلیقہ شعار عورت گھر کو جنت بنا دیتی ہے۔(۶۳)

اسلام میں کفایت شعاری کی تلقین اسی لیے کی گئی ہے کہ انسان ذاتی مصارف سے بچا کر معاشرتی بہبود اور خدمت خلق کے کاموں میں کچھ رقم صرف کر سکے۔نذیر احمد نے اپنے قصے میں کفایت شعاری کے اس عمرانی پہلو پر خاص زور دیا ہے۔اصغری کی خوش انتظامی کا ایک مفید نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ جس گھر سے فقیر کو کبھی ایک چٹکی آٹا بھی نہ ملتا،اب اسی گھر سے دونوں وقت محتاجوں کو کھانا بھیجا جانے لگا۔اصغری کسی معاوضے کے بغیر محلے کی لڑکیوں کو علم و تہذیب کے زیور سے آراستہ کرنے لگی۔جب اسے مزید توفیق ہوئی تو رفاہ عامہ کے بڑے بڑے کام کیے مثلاً مسجد تعمیر کرائی،لنگر خانے جاری کیے جس سے بیس مسافروں کو روز کھانا تقسیم ہوتا تھا،سرائے بنوائی سردیوں میں کمبل تقسیم

کیے جاتے تھے۔ خدمت خلق کے یہ کارنامے ایثار نفس کے بغیر انجام نہیں دیے جا سکتے، اس لیے نذیر احمد نے کفایت شعاری کو صالح معاشرے کا بنیادی وصف قرار دیا۔ بقول ڈاکٹر خالد محمد اختر

> آج کے تناظر میں اگر ہم اس ناول کو دیکھیں، جب ملک کی سماجی، سیاسی اور اقتصادی حالت غیر معمولی طور پر متزلزل ہو رہی ہے ہر شے، بحرانی دور سے گزر رہی ہے۔ اس صورت حال میں ایک سلیقہ مند اور باشعور عورت کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ وہ اپنی داخلی و خارجی قوتوں کو منظم کر کے زندگی کی کشتی کو منجدھار سے بچا سکتی ہے۔ (۶۴)

ڈپٹی نذیر احمد کے ان قصوں کے عمیق مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نذیر احمد کے عمرانی نظریات، اسلامی نظریہ عدل سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ ان کا مقصد منضبط خانہ داری کے لیے ایک بہترین اور کامل نمونہ پیش کریں۔ اس مقصد کو تضاد و تقابل سے نمایاں کرنے کے لیے اول انہوں نے اصغری کو پیش کر کے اس کے کارنامے بیان کیے ہیں۔ ریاست کے انتظام میں اصغری اس کی وزیر بن گئی اور اس حیثیت سے کام اس عورت نے کیے وہ ہر عہد اور ہر زمانے میں یاد رکھے جائیں گے۔ زیر نظر ناول کو بغور نظر پڑھا جائے تو نذیر احمد کا تصور تعلیم واضح ہو جائے کہ بقول ڈاکٹر خالد محمد اختر ''وہ لڑکیوں کو فرض شناسی اور امور خانہ داری تک محدود نہیں رکھنا چاہتے تھے، بلکہ وہ ان کو جملہ علوم وفنون کے زیور سے آراستہ کرنا چاہتے تھے۔'' (۶۵)

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں دیکھا جائے تو نذیر احمد کی سوچ بالکل درست تھی کیونکہ اس معاشرے میں عورت اپنے تمام حقوق سے محروم ہو کر اسیری اور غلامی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ لہٰذا نذیر احمد نے اس کے احساس خودی کو بیدار کرنے کے لیے اصغری کو مردانہ ہمت، فراست اور فعالیت کا مثالی پیکر بنا کر پیش کیا تھا۔ اس کی سلیقہ مندی، کفایت شعاری جزرسی، ذہانت و فراست، تمام عورتوں کے لیے قابل رشک اور قابل تقلید ہے۔

بنات النعش ڈپٹی نذیر احمد کا دوسرا ناول ہے جسے مراۃ العروس کا ضمیمہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس ناول میں جہاں تعلیم نسواں پر زور دیا گیا ہے وہیں مغربی تعلیم اور طرز زندگی کے نقصانات سے بھی خواتین کو آگاہ کیا گیا ہے۔ انیسویں صدی کے ہند اسلامی معاشرے میں لڑکیاں ان ثقافتی عوامل سے ناآشنا تھیں جو مغربی معاشرے کی خواتین میں عام ہو چکے تھے۔ خود ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی کتابوں کے ظہور میں آنے کی وجہ تسمیہ جو بیان کی ہے اس تناظر میں ڈاکٹر خالد محمد اختر لکھتے ہیں کہ

میں اپنے بچوں کے لئے کتابیں چاہتا تھا، کہ وہ ان کو چاؤ سے پڑھیں ۔۔۔۔۔ڈھونڈھا، تلاش کیا، کہیں پتہ نہ لگا، ناچار میں نے ہر ایک کے مناسب حال کتابیں بنانی شروع کیں۔ بڑی لڑکی کے لیے مراۃ العروس چھوٹی کے لئے منتخب حکایات ۔۔۔۔۔یوں کتابوں کا پہلا گھان تیار ہوا۔(۶۶)

محترمہ رشید النساء جنھوں نے ۱۸۱۸ء میں نذیر احمد کی تقلید میں اصلاح النساء نام سے ایک قصہ لکھا تھا۔اپنی کتاب کے آخری صفحات پر لکھتی ہیں کہ اصغری کے مثالی کردار کے زیر اثر، شریف گھرانوں کی پڑھی لکھی عورتیں، اگر سب اصغری نہیں تو ان کے اندازے کے مطابق سو میں بچھتر فیصد تو اصغری ہو گئیں۔ مولوی نذیر احمد کی کتاب نے سینکڑوں جاہل عورتوں کو پڑھی لکھی اور فضول خرچ کو منتظم، بدسلیقہ کو سلیقہ مند بنا دیا۔اسی حوالے سے ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں کہ

ہماری معاشرت میں منزلی زندگی کو پر اطمینان بنانے کے لیے جدید سیرتوں سے نذیر احمد کی مثالی سیرتیں آج بھی زیادہ کامیاب ہیں۔اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ مغربی تصورات میں پلی ہوئی بخود مشغول اور خود نگر خواتین مردوں کی مشکلات میں اس طرح تعاون نہیں کر سکتیں۔ جس طرح وہ خواتین جن کے نقشے نذیر احمد نے ہمارے سامنے پیش کیے ہیں۔(۶۷)

مثل مشہور ہے کہ اگر ہم ایک مرد کو تعلیم دیتے ہیں تو ایک فرد کو تعلیم دی اور اگر ایک عورت کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا تو پورے ایک خاندان کو دولت سے ہمکنار کیا۔اس لیے یہ بات ناگزیر ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم کے لیے مناسب انتظام کی فکر کی جائے اور شرح خوندگی بڑھانے کے لیے تعلیم نسواں کو زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کیے جائیں۔ جہاں تک عورتوں کی اور مردوں کی روحانی، دماغی اور اخلاقی نشو و نما کا تعلق ہے عورتوں اور مردوں کی تعلیمی ضروریات میں یہاں کہیں کوئی مطلق فرق نہیں ہے۔ حتیٰ کہ جسمانی تربیت کے معاملے میں بھی ان کی ضروریات اکثر پہلوؤں میں مشترک ہیں۔ صاحبزادہ احمد خاں کے بقول

تعلیم اناث کا مقصد محض نیک بیبیاں اور اچھی مائیں پیدا کرنا نہ ہونا چاہیے بلکہ اصلی غرض یہ ہونا چاہیے کہ آبادی کے بہتر نصف کی دماغی اور جسمانی تربیت و نشو و نما کامل طور پر ہو۔اگر بہتر حصے دماغ اور جسم غیر نشو و نما اور غیر تربیت یافتہ ہوں تو ہماری روحانی، دماغی، اخلاقی اور جسمانی دولت کا قومی سرمایہ ان قوموں اور ملکوں

> کے معیار تک پہنچ سکتا ہے، جہاں مرد یا عورت کے ہر فرد کے لیے بہترین امکانی
> تعلیمی آسانیاں مہیا ہیں۔(۶۸)

مندرجہ بالا اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ اس قسم کی کوئی بلا وجہ حد بندی نہیں ہونی چاہیے کہ ہماری عورتوں کو کس قسم کی تربیت اور تعلیم ملے۔نذیر احمد نے حقیقی کرداروں کو پہلی بار اردو نثر میں متعارف کروایا۔انہوں نے سب سے پہلے تعلیم نسواں کے مسئلے کو سنجیدگی سے محسوس کیا اور اس کو اپنا موضوع بنایا۔نذیر احمد کے ہاں عورت کو ایک اعتبار سے مرکزی حیثیت حاصل ہے وہ جس قسم کے معاشرے کی تعمیر کے خواب دیکھ رہے تھے اس میں خانگی تربیت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔اس حوالے سے انیس ناگی لکھتے ہیں کہ

> نذیر احمد کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی بساط کے مطابق اپنے عہد کے ہر اہم مسئلہ
> سے دست و گریباں ہو کر اس کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی۔۔۔۔اور جس
> کے لیے متوازن خانگی تربیت ایک اہم شرط تھی۔(۶۹)

سرسید کی رفاقت و دوستی اور تعلیم کی اہمیت و ضرورت نے نذیر احمد سے ناول لکھوائے، سرسید کی طرح مولوی نذیر احمد بھی اسی علم و ادب کو مفید سمجھتے ہیں جو معاشرتی اصلاح کا ضامن بھی ہو اور عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق بھی ہو۔علی گڑھ تحریک سے پہلے اردو شاعرات کے تذکرے بھی تالیف کیے گئے تھے۔اولین تذکرہ نگار حکیم فصیح الدین رنج میرٹھی نے ۱۸۶۴ء میں پہلا تذکرہ بہارستان ناز منظر عام پر لایا۔یہ تذکرہ دوسری مرتبہ میں ۱۸۶۹ء میں اور پھر تیسری اور آخری مرتبہ ۱۸۸۲ء میں شائع ہوا۔اس حوالے سے ڈاکٹر راحت ابرار لکھتے ہیں کہ

> رنج نے تعلیم نسواں کو اس کی وجہ تصنیف قرار دیا جب عورتوں کی تعلیم کی طرف
> بہت کم توجہ دی جاتی تھی، ان کی حیثیت اور مرتبہ کو نظر انداز کیا گیا اور ان کو دنیا کی
> نگاہ سے اوجھل رکھنا سوسائٹی کے وقار کے لئے ضروری تصور کیا گیا تھا۔(۷۰)

اسی دور میں اردو شاعرات کے دو اور تذکرے بھی شائع ہوئے۔اس کے بعد درگاہ پرشاد نادر کا چمن انداز ۱۸۷۸ء میں اور مولوی عبدالحیٔ صفا بدایونی کا شمیم سخن ۱۸۸۲ء میں شائع ہوا۔اور شاعرات کی تعداد بھی ۱۵۱ تک ہو گئی۔ان تینوں تذکرہ نگاروں نے تعلیم نسواں کے فروغ کو اپنی تالیفات کی وجہ قرار دیا تھا۔

مسلم خواتین کے شعور کو بیدار کرنے اور انہیں عصر حاضر کے تقاضوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اردو صحافت نے بھی بنیادی اور اہم کردار ادا کیا۔خواتین کی دلچسپی اور ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر مخصوص اخبارات و رسائل کا

اجراء بھی انیسویں صدی کے اواخر سے شروع ہوتا ہے۔خواتین کی تعلیم و ترقی کے لئے بہت سے کام ہو رہے تھے جس کی مثال خواتین کے لیے ادبی جرائد کی صورت میں ملتی ہے،اس حوالے سے مختلف اوقات میں ہندوستان میں مختلف علاقوں سے خواتین کے لیے ادبی رسائل جاری کے گئے۔ جن کی ترتیب کچھ یوں ہے۔ صحافت نسواں کا اولین علمبردار ۱۸۸۰ء میں لکھنو سے رفیق نسواں کے نام سے پہلا رسالہ جاری ہوا۔اس کی مدیرہ حمیدہ خانم قریشی تھیں۔ ۱۸۸۴ء میں سید احمد دہلوی مولف فرہنگ آصفیہ نے دہلی سے اخبار النساء جاری کیا جو آٹھ صفحات پر مشتمل تھا اور قیمت چھ روپے سالانہ تھی۔ مطبع ارمغان میں چھپتا تھا۔اس اخبار کے مالک آغا مرزا بیگ تھے۔بقول ڈاکٹر طاہر مسعود

> ان کے بھائی مولوی عبدالرزاق جو دہلی کے ایک سرکاری اسکول میں مدرس تھے،اخبار کی طباعت و اشاعت میں ان کا ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔اخبار کی صدارت سید احمد کے سپرد تھی۔وہ بھی دہلی کے گورنمنٹ اسکول کے استاد تھے۔ان کا تبادلہ جب شملہ ہو گیا تو وہیں سے یہ اخبار مرتب کرنے لگے۔"اخبار النساء"عورتوں کی تعلیم اور ان کے حقوق کی وکالت میں پیش پیش رہتا تھا۔معیاری اخبار تھا۔اشاعت ۳۵۰ تھی۔(۷۱)

لاہور سے محبوب عالم نے شریف بیبیاں کا اجراء کیا۔۱۸۹۸ء میں مولوی ممتاز علی نے ہفت روزہ تہذیب نسواں لاہور سے جاری کیا اس کی ادارت ان کی اہلیہ محمدی بیگم (وفات نومبر ۱۹۰۸) کرتی تھیں۔ہفت روزہ کا اجراء خاص طور پر خواتین میں سماجی، مذہبی، تہذیبی اور ادبی شعور بیدار کرنے کے لیے کیا تھا۔یہ پہلے آٹھ ماہ کے لیے، پھر سولہ اور پھر چوبیس صفحات پر نکلنے لگا تھا۔سالانہ چندہ تین روپے چار آنے تھا۔تہذیب نسواں نے خواتین کے قلم کو خصوصی اعتماد عطا کیا اور ثابت کر دیا کہ اعلیٰ درجے کی انشاپردازی صرف مردوں کا خاصہ نہیں بلکہ اس میں خواتین بھی اپنا تخلیقی کردار خاطر خواہ طور پر سرانجام دے سکتی ہیں۔اس حوالے سے نذر سجاد حیدر، محمدی بیگم، حجاب امتیاز علی تاج، زبیدہ زریں، جمیلہ بیگم، سنجیدہ اشرف علی اور اصغر ہمایوں کے مضامین خصوصی اہمیت کے حامل ہیں بقول طاہر مسعود

> سرورق پر یہ عبارت درج ہوتی تھی "تہذیب نسواں محترمہ محمدی بیگم نے لڑکیوں کے فائدے کے لیے ۱۸۹۸ء میں جاری کیا۔اسکے مقاصد مستورات کے لیے اخلاق و خانہ داری اور تربیت اولاد کے متعلق مضامین چھاپنا تھے۔(۷۲)

اس رسالے کے ہر صفحے پر دو کالم ہوتے تھے۔ایک کالم "خبریں اور نوٹ" کے عنوان سے ہوتا تھا جس میں دنیا بھر کی دلچسپ معلوماتی خبریں چھپتی تھیں،دوسرا کالم "محفل تہذیب" کا ہوتا تھا۔اس میں عورتوں کے مسائل اور شکایات کا قارئین کی جانب سے جواب دیا جاتا تھا بسا اوقات نہایت نجی قسم کے ہوتے تھے۔مضامین مختصر ہوتے تھے۔تہذیب نسواں میں خواتین کے انفرادی و اجتماعی مسائل کے حل کے لئے بحث و مباحثے بھی کیے جاتے تھے۔بچوں کی تعلیم و تربیت کے علاوہ ایسے مسائل کی جانب بھی توجہ دی گئی جو خواتین کے لئے باعث نمونہ ثابت ہوں۔عورتوں کی دلچسپی کے کام مثلاً کشیدہ کاری، سلائی کڑھائی، خانہ داری کے متعلق تمام امور کا بیان ہوتا تھا۔ہر ہفتے آئندہ شمارے کے مضامین کا بھی اعلان کر دیا جاتا تھا اور ناقابل اشاعت مضامین کی فہرست بھی دی جاتی تھی۔

۱۹۰۴ء میں شیخ عبداللہ نے علی گڑھ سے ماہنامہ خاتون کا اجرا کیا۔جس کے مدیر شیخ عبداللہ تھے۔بیسویں صدی کے اوائل میں شیخ عبداللہ تحریک نسواں کے علمبردار تھے۔اس کام میں انہیں کئی صعوبتوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا اس سے مخالفین کی بڑی تعداد سامنے آئی۔لیکن کوئی بھی مزاحمت ان کے حوصلے پست نہ کر سکی۔اور مخالفین بھی زیادہ دیر ٹکے نہ رہ سکے۔انہی کی کاوشوں سے تحریک پلی بڑھی اور خواتین میں خاصا شعور پیدا ہوا۔شیخ عبداللہ سرسید کے رفقا میں سے تھے۔اس ماہنامہ کا مقصد بھی دیگر جرائد کی طرح خواتین میں علمی و ادبی شعور کی بیداری تھا۔خاتون میں خاص طور پر ایسے مضامین کی اشاعت کی گئی جس سے خواتین میں تعلیمی میدان میں آگے بڑھنے کا جذبہ اور ادبی ذوق پیدا ہوا۔شیخ عبداللہ نے لڑکیوں کی تعلیم کا بیڑا اس وقت اٹھایا جب لوگ لڑکوں کو جدید تعلیم دینے کے بھی مخالف تھے۔حالات کی سختی کے باوجود علی گڑھ میں لڑکیوں کے مدرسے کی بنیاد ڈالی اس سلسلے میں ان کی بیگم نے بہت مدد کی۔اور اسے کالج کے درجہ تک پہنچا دیا۔اس ادارے کی تاسیس سے شیخ عبداللہ کے کیا مقاصد تھے اس کا اندازہ اس گفتگو سے ہوتا ہے جو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسے میں کسی نے لڑکیوں کی تعلیم کے سلسلے میں کہا کہ "میں مسلمان بچیوں کو اچھی مائیں اور اچھی بیویاں بنانا چاہتا ہوں۔ (۷۳)اسی سلسلے میں شیخ عبداللہ نے اپنے مقاصد کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ

> میں نے کسی کو یہ کہتے نہیں سنا کہ لڑکوں کی تعلیم کا مقصد اچھے باپ اور بیٹے پیدا کرنا ہے۔پھر لڑکیوں کی تعلیم کا یہ محدود مقصد کیوں بنایا گیا ہے۔لڑکیوں کی تعلیم سے ہمارا یہی مقصد ہے کہ اچھے انسان بنائے جائیں۔(۷۴)

۱۹۰۰ء میں عبدالحلیم شرر نے ماہوارپردہ عصمت جاری کیا تھا۔۱۹۰۸ء میں ماہنامہ عصمت کا اجرا ہوا۔عصمت کا بنیادی اور اہم ترین مقصد تعلیم نسواں کی ترقی تھا۔اس سے پہلے تعلیم نسواں سے متعلقہ اقدامات نہ ہونے کے برابر بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ بالکل نہیں تھے،ایسے افراد کی کمی نہ تھی جو خواتین کی تعلیم کے بالکل حامی نہ تھے۔سو عصمت نے جہاں خواتین کی ترقی کے لیے راہ ہموار کی وہاں تعلیم نسواں کی مکمل حمایت بھی کی۔جس سے علم وادب کی ترقی مقصود تھی،اس ضمن میں شیخ اکرام لکھتے ہیں کہ

> زنانہ لٹریچر کو وسعت دینااور ملک کے مشہور اہل قلم سے کنواری اور بیاہی لڑکیوں کے لیے مفید اور ضروری کتابیں تصنیف کرانا عصمت کے مقاصد میں شامل ہو گا۔(۷۵)

منشی محبوب عالم کی نگرانی میں ۱۹۰۹ء میں لاہور سے ماہنامہ شریف بیبیاں کا اجرا ہوا۔جس میں خواتین کے لیے آسان زبان میں سہل،سادہ اور مؤثر مضامین شائع کیے گئے۔۱۹۱۴ء میں مسز خاموش کے قلمی نام سے بیگم احتشام نے رسالہ پردہ نشین آگرہ سے جاری کیا۔ہفتہ وار سہیلی کاااجرا۱۹۱۵ء میں راشدالخیری کی ادارت میں ہوا۔صغری بیگم حیا نے ۱۹۱۹ء میں دکن سے ماہنامہ النسا جاری کیا۔قاری عباس حسین نے ۱۹۱۹ء میں دہلی سے پندرہ روزہ نسانی کا اجرا کیا۱۹۲۰ء قمر النسا بیگم نے رسالہ امہات بھوپال سے جاری کیا جو خالصتاً خواتین کی ادبی تحریروں سے متعلق مجلہ تھا۔زیب النسا خواتین کے رسائل میں خاص اہمیت کا حامل تھا۔درج بالا تمام رسائل میں خواتین کے متعین کردہ حقوق وفرائض پر بات کی اور خواتین کے حقوق کی حمایت پر مضامین لکھے گئے۔

اب ہم بھوپال میں تعلیم نسواں کے حوالے سے ہونے والی کوششوں کا جائزہ لیں گے لیکن اس سے قبل ضروری ہے کہ ریاست بھوپال کی تاریخ کا مختصر جائزہ لیا جائے اس سے صورتحال مزید واضح ہو جائے گی۔ریاست بھوپال کی بنیاد سردار دوست محمد خاں(۱۶۵۷ء۔۱۷۲۸ء) نے رکھی تھی۔دوست محمد خان تراہ ملک افغانستان کے رہنے والے تھے۔وہاں کے باشندے بہت بہادر،دلیر اور جنگجو مشہور تھے۔اورنگزیب عالمگیر(۱۷۰۷ء)عہد کے میں ہندوستان آئے اور مغلیہ فوج میں شامل ہو گئے۔عالمگیر کی وفات کے بعد جب ریاست میں بدنظمی اور افراتفری پھیلی تو سردار دوست محمد خان نے فوج کی ملازمت چھوڑ دی اور صوبہ مالوہ کی طرف رخ کر لیا تھا۔مالوہ وسیع وعریض اور پرامن خطہ تھا جس کی زرخیزی کے چرچے چہار سو پھیلے ہوئے تھے۔قدیم تقسیم کے مطابق یہ ریاست تین حصوں مغربی حصہ

مالوہ، مشرقی حصہ گونڈوانہ، شمالی حصہ بندیل کھنڈ میں منقسم تھی جب کہ دوسری جانب ہندوستان میں حصول اقتدار کی خاطر سازشوں، شورشوں کے جال بنے جارہے تھے۔ ہر چھوٹا، بڑا سردار اپنی طاقت کے بل بوتے پر بڑے بڑے خطے کا مالک بننا چاہتا تھا۔ اسی طرح سردار دوست محمد خاں نے مالوہ میں مختلف مقامات پر قسمت آزمائی کی یوں مغربی اور شمالی حصوں مثلاً بیرسیہ، جگدیش پور، بھلسیہ، پاراسون وغیرہ پر قبضہ کر کے اپنی سلطنت کو وسعت دی۔ مشرقی حصہ کے حوالے سے محمد امین زبیری لکھتے ہیں کہ

> بھوپال جہاں اس خاندان کا آفتاب اقبال تاباں ہوا ہے ایک رانی کی پیشکش ہے جو وحشی گونڈوں کے سردار کی بیوی تھی جس کا نام کملاپتی تھا جو اپنے حسن نزاکت کے لحاظ سے اس وقت ضرب المثل اور مشہور روزگار ہے۔ جب اوس کے خاوند نظام شاہ کو ایک دوسرے گونڈ سردار نے زہر دے کر ہلاک کیا اور اس کے یتیم بچے کو قلعہ کے اندر محصور کیا تو اس نے سردار دوست محمد خاں سے امداد و اپنے شوہر کے انتقام کی درخواست کی اور جب وہ درخواست پوری ہو گئی تو اور رانی نے اپنی جائیداد حاصل کر لی تو یہ جگہ جو اس وقت گاؤں کی حیثیت رکھتی تھی اس امداد کے شکریہ میں نذر دی۔(۷۶)

سردار دوست محمد خاں نے وسیع و عریض جگہ قبضہ میں آنے کے بعد مضبوط قلعہ بنانے کی جانب توجہ مبذول کی تھی۔ انہوں نے اپنی بیوی فتح بی بی کی خواہش کے مطابق تال کے کنارے بھوپال کی ایک پہاڑی پر قلعہ کی تعمیر کا ارادہ کیا اور پھر اس قلعہ کی سنگ بنیاد کا پہلا پتھر قاضی محمد معظم نے اور دوسرا پتھر فتح بی بی نے رکھا تھا۔ فتح بی بی منگل گڑھ کی رہنے والی تھیں اور سردار دوست محمد خاں کی دوسری بیوی تھیں۔ پہلی بیوی سے چھ بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں۔ نواب دوست محمد خاں نے بیرسیہ میں سکونت اختیار کرنے کے بعد فتح بی بی سے شادی کی تھی۔ فتح بی بی کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ ان سے نکاح کے بعد ہی دوست محمد خاں نے کامیابی کی منازل طے کرنا شروع کیں اس لیے فتح بی بی انہیں بہت عزیز تھیں۔ ان کی خوشگوار ازدواجی زندگی کے متعلق محمد امین زبیری لکھتے ہیں کہ

> یہ ایک نہایت اولوالعزم اور جمیل و عقیل خاتون تھیں۔۔۔۔ فتح بی بی ان کے لیے روحانی تسکین تھیں۔۔۔۔ بلکہ ان کا عقیدہ تھا کہ اون کے کے نام میں ان کی ذات میں برکت ایزدی کا ظہور ہے۔۔۔۔ ریاست بھوپال کا فوجی نشان بھی فتح نشان سے

مشہور ہے کیا عجب ہے یہ نشان بھی فتح بی بی کے نام سے منسوب ہو۔ اس نشان کا پرچم بھی آج تک افواج بھوپال پر لہرایا اور کبھی کسی غنیم کے قبضہ تصرف میں نہیں آیا۔(۷۷)

ریاست بھوپال کی تاریخ کو بنانے اور وقار بخشنے میں ریاست کی بیگمات اور خواتین کا بڑا حصہ رہا ہے۔ بھوپال ریاست کے ابتدائی منظر نامے پر ابھرنے والی خاتون فتح بی بی تھیں۔ ریاست کے آغاز سے ہی بھوپال کی خواتین نے ہمت و شجاعت کا مظاہرہ کیا اور اپنی ریاست کو دشمنوں سے بچانے میں فوج کی مدد کی۔ ایک مرتبہ دشمن کے ہاتھوں نواب صاحب دوران جنگ گرفتار ہو گئے اور کاٹھیاواڑ قیدی بنا کر بھیج دیئے گئے اس حوالے سے وھاج الدین چشتی لکھتے ہیں کہ

فتح بی بی نے نہ صرف یہ کہ ریاست کے نظم و نسق کو سنبھالا، دشمنوں کی یلغار کو روکا بلکہ انتہائی تدبر اور فہم فراست سے سردار دوست محمد خاں کو دشمن کی قید سے آزاد کرا کے دم لیا۔(۷۸)

ان خواتین کی بہادری نے ریاست کے قیام سے لے کر تقسیم ہندوستان تک ہر دور میں بالواسطہ و بلاواسطہ فرمانروا ہو کر یا پھر شوہر و نوابین کے ساتھ بطور مشیر مل کر اہم کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ بیگمات بھوپال کی فرمانروائی کی اولیت کے حوالے سے دیکھا جائے تو عالمی منظر نامے پر ہمیں خواتین کی حکومت نظر نہیں آتی ہے۔ محمد امین زبیری اپنی تصنیف بیگمات بھوپال میں لکھتے ہیں کہ

میں نے دو سو چھتیس سال کے زنانہ اقتدار حکومت کی یہ دلچسپ تاریخ جو غالباً سلسلہ حالات کے لحاظ سے تاریخ عالم میں نظیر نہیں رکھتی ان جذبات کے ساتھ لکھی ہے جو ایشیائی اور مسلمانوں کے دل میں ایسی مثالیں موجود ہوں لیکن جب سے کہ تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ اس کا یہ عجیب و غریب نظارہ صرف افق بھوپال پر نظر آسکتا ہے۔(۷۹)

سردار دوست محمد خاں کے بعد ان کے بڑے بیٹے یار محمد خاں (۱۷۰۹ء۔ ۱۷۴۲ء) ریاست کے حکمران مقرر ہوئے۔ سردار دوست محمد خاں سردار کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے جبکہ نظام الملک نے یار محمد خاں کو "نواب" کا خطاب دیا تھا۔ اس لئے یہی بھوپال کے پہلے نواب کہلائے جاتے ہیں۔ رامپورہ، برکھمیاں، کرود کے علاقہ میں جنگ کے بعد بہت مال غنیمت کے ساتھ ساتھ ایک نوجوان لڑکی بھی غلامی میں آئی۔ جس کو بعد ازاں مسلمان کر کے اس کا نام مولہ

بی بی (۱۷۱۵۔۱۷۹۵ء) رکھااور ان سے نکاح کر لیا۔ یہ تاریخ بھوپال میں ماجی مولہ کے نام سے یاد کی جاتی ہیں۔ نیک سیرت و کردار کی بنیاد پر "ماں جی" کے لقب سے مشہور تھیں۔ حکومت کے انتظام میں ان کو پورا دخل تھا کیونکہ نواب صاحب ان کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ تیرہ سال حکومت کرنے کے بعد نواب یار محمد خاں انتقال کر گئے تھے۔ ان کے بعد ان کے انتہائی کمسن بیٹے نواب فیض محمد خاں (۱۷۴۲ء۔۱۷۷۷ء) فرمانروا مقرر کیے گئے۔ نواب فیض محمد خاں ماجی ممولا کے سوتیلے بیٹے تھے لیکن ان کی پرورش ماجی نے بذات خود کی تھی۔ ماجی ممولہ کی اپنے سوتیلے بیٹے سے بے لوث محبت کے حوالے سے وحاج الدین چشتی لکھتے ہیں کہ

> ماجی ممولا نے نواب فیض محمد خاں کے کمسن ہونے کی وجہ سے براہ راست انتظام حکومت سنبھال لیا اور جنگ و امن کی ہر منزل میں کامیابی و کامرانی کے پائیدار نقوش قائم کر دیئے۔ یہ وہ دور تھا جب ہر طرف مرہٹے تباہی مچائے ہوئے تھے۔ اور ان کی حریصانہ نگاہیں بھوپال پر مرکوز تھیں۔۔۔۔ ماجی ممولا کی ذہانت اور ان کے تدبر کا کارنامہ ہے کہ انہوں نے بڑی جرات سے ایک طرف تو شہر کے اندر بغاوت کا خاتمہ کیا۔۔۔۔ مرہٹوں کا یہ طوفان پہلی بار جنگ کے بغیر ٹل گیا۔(۸۰)

ماجی ممولا بھوپال ہی کے مسلمانوں میں نہیں بلکہ ہندوؤں میں بھی ہر دلعزیز تھیں۔ بیگمات بھوپال میں یہ پہلی فرمانروا بیگم تھیں۔ اس زمانے کے ایک معروف بزرگ سید غوث ابن سلیمان گیلانی نے ماجی ممولا کو "قدسیہ" کا خطاب دیا تھا جس کی توثیق میں شاہ عالم بادشاہ دہلی نے بھی فرمان جاری کر کے دی تھی مگر یہ خطاب ان کے نام کے ساتھ زیادہ معروف نہ ہو سکا کیونکہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اس قدر ہر دلعزیز شخصیت تھیں کہ تمام لوگ انہیں محبت سے ماجی ہی کہتے تھے۔ ۱۷۹۵ء میں ماجی ممولا نے وفات پائی۔ ان کی اعلیٰ مدبرانہ صلاحیتوں کا اعتراف صرف اپنوں ہی نے نہیں بلکہ غیروں نے بھی کیا ہے۔ انگریز مورخ سر جان مالکم (Sir Jhon Malcom) اور میجر ولیم ہاگ (William Huge) کی لکھی ہوئی تاریخوں میں ماجی کو جو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ سر جان مالکم (۱۷۶۹ء۔۱۸۳۳ء) نے ۱۸۱۸ء میں جب وہ مرکزی ہندوستانی حکومت وسط ہند کے لئے پولیٹیکل ایجنٹ ہو کر آیا تھا اس نے اپنی کتاب "اے ممائر آف سینٹرل انڈیا" (A Memoir Of Central India) ۱۸۲۳ء میں لکھتا ہے

اس عالی دماغ رئیسہ کی تاریخ حیرت انگیز ہے اس نے اسّی سال کی عمر میں وفات پائی اور نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک بھوپال کی کونسل پر اپنا اثر ورسوخ قائم رکھا۔ اس رئیسہ کا نام ممولا تھا یہ شمالی ہند سے آتی تھی۔۔۔۔ اس کا زمانہ حیات ایک ایسا نمونہ تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ظلم وابتری کے دور میں بھی نیکی اور راست بازی کو احساس اور جوش کے ساتھ ان ہی قدروں کے ساتھ برقرار رکھا جا سکتا ہے۔(۸۱)

شومئ قسمت سے ماجی ممولا کی پیدائش اور ابتدائی زندگی کے حالات دستیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ ان کی بھرپور اور دل آویز شخصیت کے حوالے سے میجر ولیم ہاگ نے جو اس زمانہ میں بنگال کی فوج کا افسر تھا۔ ایک تاریخی کتاب جو اس نے ذاتی تحقیق سے لکھی، اس نے ماجی ممولا کے حالات تفصیل سے لکھے تھے مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں

اس بیگم کی تاریخ جو اسی سال تک زندہ رہی اور جس نصف صدی تک حکمرانی نہیں کی تو کم سے کم حکومت پر اپنا اثر ڈالتی رہی غیر معمولی طور پر دلچسپ ہے۔۔۔۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں خطرہ اور مصیبت کے موقع پر بھی نیکی اور صداقت کو جوش اور دانشمندی کے ساتھ قائم رکھا۔۔۔۔ ماجی کے انتخابات کی بھی تعریف کی ہے جس سے وہ عہدیداران ریاست کے انتخاب کا کام لیتی تھیں۔(۸۲)

بھوپال کی پوری تاریخ یہاں کی بیگمات ماجی ممولا کی طرح کی اولوالعزم مساعی سے بھرپور ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ جب بھی عورت کو اپنا ہنر، صلاحیتں منوانے کا موقع ملا ہے وہ اپنی جگہ مکمل ثابت ہوئی ہے۔ بالخصوص عورت نے جب بھی اسلامی تعلیمات کو صحیح طور پر اپنایا ہے کامیابی کے ساتھ ساتھ اس کے کردار میں مکمل نکھار بھی پیدا ہوا ہے۔ محمد امین زبیری اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ

بیگمات بھوپال کی تاریخ اس دعوی کا یقیناً بین ثبوت ہے جنہوں نے بھوپال کی ابتدائی جنگجویانہ اور بعد کی پرامن تاریخ میں بہادری اور استقلال سے اپنا حصہ کامیابی کے ساتھ ادا کیا ہے اس بینظیر مثال سبق آموز تاریخ کی ابتداء فتح بی بی سے شروع ہوئی۔(۸۳)

ماجی ممولا کے کردار نے بھوپال کی خواتین پر جو عکس ڈالا تھا اس کا اثر ان کی زندگی میں بھی اور ان کے بعد بھی جاری و ساری رہا کیونکہ ماجی ممولہ جیسی شخصیت خواتین کے لیے ایک بہترین مثال تھی کہ عورت اپنی ذہانت، ہمت و طاقت کے بل بوتے پر کیسے کیسے عظیم کارنامے سرانجام دے سکتی ہے۔ نواب فیض محمد خان کے انتقال کے بعد ان کی بیوی صالحہ بیگم عرف بہو بیگم ریاست کی دعویدار تھیں۔ صالحہ بیگم واصل محمد خاں کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ واصل محمد خان کے انتقال کی خبر سن کر ماجی ممولا بہت اداس ہوئیں اور صالحہ بیگم کو اپنے پاس لے آئیں ان کی پرورش کی اور ان کی شادی نواب فیض محمد خاں سے کر دی اور بہو بیگم کے خطاب سے مشہور ہوئیں۔ جب فیض محمد خاں فوت ہوئے تو صالحہ بیگم نے خود ریاست کو سنبھالنے کا عہد کیا اور یہاں تک تیار تھیں کہ اگر ضرورت ہو تو فوجی مقابلہ بھی کرنے سے گریز نہیں کریں گی۔ مگر جب ماجی ممولا نے انہیں نواب حیات محمد خاں کے حق میں دستبردار ہونے کا کہا تو صالحہ بیگم نے حکم کی تعمیل کی لیکن ایک طویل عرصہ تک امور ریاست میں دخیل رہیں اور بحیثیت مشیر اپنے فرائض سرانجام دیتی رہیں تھیں۔

بیگمات بھوپال میں مذکورہ بالا خواتین کے علاوہ نواب حیات محمد خاں کی بیوی عصمت بیگم معاملہ فہم خاتون تھیں۔ حکومت کے فیصلے و احکامات انہی کی مرضی سے طے پاتے تھے۔ وہ بہت انصاف پسند اور دیندار خاتون تھیں۔ نواب حیات محمد خاں کے عہد میں دیکھا جائے تو ایسٹ انڈیا کمپنی کا اثر ورسوخ ہندوستان میں بڑھتا جا رہا تھا اور کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر انگریزوں کا ایک تسلط قائم ہو گیا تھا۔ میجر ولیم ہاف (William Half) نے اپنی تاریخ کی کتاب میں لکھا جس کا مفہوم کچھ اس طرح سے ہے کہ ۱۷۷۷ء میں بنگال سے کرنل تھامس گڈارڈ (Thomas Gadarid) انگریزوں کی ایک فوج لے کر مرہٹوں سے لڑنے کے لئے بھوپال کے علاقہ سے گزرا تھا۔ نواب حیات محمد خاں کو دعوت دی جس میں دوستی اور ہر مشکل گھڑی میں ساتھ نبھانے کا عہد تھا۔ اس تناظر میں کہ دوران معاہدہ کیا طے پایا گیا طیبہ بی بی لکھتی ہیں

> سرکار کمپنی کے آپ کے درمیان دوستی رہے گی اور جب بھی نواب صاحب یا ان
> کی اولاد پر کوئی وقت پڑیگا تو ان کی مدد کی جائے گے۔(۸۴)

بھوپال کے پانچویں فرمانروا نواب غوث محمد خاں (۱۷۶۷ء۔۱۸۲۶ء) کی اہلیہ نواب زینت بیگم اپنے اعلی کردار و عمل کے اعتبار سے کامل نمونہ تھیں۔ زینت بیگم کے والد وزیر شاہ خاں ماجی ممولا کے عہد حکومت سے

بھوپال کی فوج میں ملازم تھے اور سہیور کی جنگ میں شہید ہو گئے۔ نواب حیات خاں نے زینت بیگم کو کمسنی اور یتیمی کے سبب عصمت بیگم کی زیر نگرانی پرورش سپرد کر دی اور جب وہ جوان ہوئیں تو ان کی شادی غوث محمد خاں جو اس وقت ولی عہد ریاست تھے ان سے نہایت سادہ طریقے سے کر دی تھی۔ وھاج الدین چشتی اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ

نواب غوث محمد خاں جب مسند ریاست ہوئے تو زینت بیگم اپنے شوہر کی چہیتی ہونے کی وجہ سے معاملات ریاست پر حاوی ہو گئیں۔ عصمت بیگم کی رحلت کے بعد محل کی ذمہ داری زینت بیگم کی تھی۔ جس کو وہ نہایت سلیقے سے نبھا رہی تھیں۔(۸۵)

۱۸۱۴ء میں ناگپور، گوالیار کی متحدہ فوجوں سے اور دوسری جانب مرہٹوں نے بھی بھرپور تیاری سے بھوپال پر حملہ کیا اور قلعے کی فصیلوں تک پہنچ گئے تھے۔ بھوپال کا قلعہ محصور ہو گیا تھا۔ زینت بیگم نے اس مشکل وقت میں عورتوں کی قیادت کی اور انہوں نے ہمت و شجاعت کا مظاہرہ کیا اور ان کی وجہ سے دشمن کو قلعہ میں داخل ہونے میں ناکامی ہوئی۔ سر جان مالکم نے "اے ممائر آف سینٹرل انڈیا" میں اس جنگی کشمکش کا نقشہ کچھ اس قسم کے الفاظ میں کھینچا ہے کہ جس سے صورت حال واضح ہو جاتی ہے بقول مولانا وھاج الدین چشتی

جنوری میں دو مختلف حملے ہوئے یعنی ایک حملہ صادق علی (پیشوا کی فوج کا سپہ سالار) نے۔۔۔۔ جزوی فتح نے محاصرین کی توجہ اس قدر اپنی طرف منعطف کی کہ تمام حملہ آور اسی طرف جمع ہو گئے۔۔۔۔ اس خطرہ کو دیکھ کر شہر کی مستورات خوفزدہ ہو کر مکانات کی چھتوں اور بلند مقامات پر چڑھ گئیں۔ اور وہاں سے دشمن پر کھپرے، کویلو، کنکر پتھر جو بھی ہاتھ میں آیا، کی بوچھاڑ اس برجی پر کر دی۔ جنگجو عورتوں کے اس غیر متوقع حملہ سے دشمن نے پریشان ہو کر اپنا جھنڈا نیچا کر دیا اور بمشکل اس برج کو اپنے قبضہ میں رکھ سکا۔(۸۶)

جب یہ کاروائی بھوپالی خواتین کی جانب سے ہو رہی تھی تو اس وقت وزیر محمد خاں بھوپال کی فوج کا سپہ سالار منگلوارے والے حملے کو نمٹا کر گنوری پہنچ گیا اور عورتوں کی جوانمردی پر جنہوں نے غیر محفوظ مقام کو ہمت کر کے بچا لیا تھا، ان عورتوں کی ہمت کو بہت سراہا اور انعام و اکرام سے نوازا تھا۔ دشمن بھی اسی حملے کے نتیجے میں ہونے والی عورتوں

کی جوابی کاروائی سے حیران تھے۔میجر ولیم ہاگ نے ان جانباز عورتوں کو خراج عقیدت کرتے ہوئے لکھا جس کا ذکر ڈاکٹر رضیہ حامد نے بھی کیا ہے کہ

> وزیر محمد خاں ان عورتوں کی بہادری سے جنہوں نے اس حصہ کو بچا لیا تھا بہت خوش ہوااور بہت کچھ تعریف کی اور اس خدمت کے صلے میں جو عورتوں نے انجام دی تھی۔انعامات تقسیم کیے۔۔۔۔اس کے مزاج میں وہم نہ تھا مگر عورتوں کی بہادری دیکھ کر اس نے نیک شگون نکالااور سمجھ لیا کہ یہ مقام کسی طرح دشمنوں کے قبضے میں نہیں جاسکتا۔(۸۷)

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں دیکھا جائے تو ریاست بھوپال میں ہر دور میں کوئی نہ کوئی خاتون نوابوں کے معاملات ریاست میں برابر شریک رہی اور محب وطن ہونے کا بھرپور ساتھ دیا۔ایسی ہی ایک اور نامور خاتون موتی بیگم کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہیں۔موتی بیگم نواب یار محمد خاں کی بیٹی تھیں۔ان کی شادی نواب وزیر محمد خاں کے چچا مجید محمد خاں سے ہوئی جو ریاست کے اہم رکن تھے۔بیوہ ہونے کے بعد قلعہ اسلام نگر میں رہائش رکھتی تھیں۔اسلام نگر کے محصور کیے جانے کے حوالے سے جب سازشیں بنی جانے لگیں تو موتی بیگم نے ہمت نہ ہاری بلکہ یہ حکم صادر کیا کہ مقابلہ کیا جائے گا۔توپیں سر ہونے لگیں اور اس قدر سخت مقابلہ ہوا کہ بالا خر دشمنوں کو اسی شکست سے دوچار ہونا پڑا۔سر جان مالکم نے اپنی کتاب اے ممائر آف سینٹرل انڈیا میں لکھا ہے کہ

> مرید خاں نے اپنے معاونین کو اسلام نگر کا قلعہ دیا لیکن جو کچھ وزیر نے خوف سے دیا تھا اسے ایک افغان بیوہ مسمی موتی بی بی نے بچا لیا تھا۔مرہٹوں نے جس وقت دروازہ بند کر کے فیر کرنے شروع کیے تو اس نے کہا میں نہیں جانتی کہ کس کے حکم سے مرید محمد خاں نے بھوپال کا قلعہ دے دیا۔میں ہر گز اپنے قیام کی جگہ کسی اجنبی شخص کو قدم رکھنے کی اجازت نہ دوں گی معلوم ہوتا ہے کہ اس عالی دماغ عورت کے خیال پر تمام بھوپال کی فوج جھک پڑی کیونکہ 'مرہٹہ فوج مجبور ہو کر واپس گئی۔(۸۸)

جبکہ دوسری جانب میجر ولیم ہاگ (William Huge) اس واقعہ کے سلسلے میں جب سیندھیا کا جھنڈا بھوپال پر لہرا رہا تھا اور اس نے مرہٹوں کو قلعہ اسلام نگر دینے کے وعدے وعید کر رکھے تھے۔ میجر ولیم ہاگ اس کی منظر کشی کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں بقول محمد امین زبیری کہ

> اس وعدہ کو ایک بیوہ افغان عورت نے جس کا نام موتی بی بی تھا پورا نہ ہونے دیا جب مرہٹے داخل ہو رہے تھے اوس نے دروازہ کر دیئے اور توپوں کے منہ کھول دینے کا حکم دیا اور کہنے لگی کہ مرید خاں نے کس کے حکم سے قلعہ کی حفاظت ترک کی اور جہاں وہ رہتی ہے وہاں کسی غیر کو داخل نہ ہونے دیں گی، قلعہ کی فوج نے اس شریف عورت کے ارادہ کی پوری تائید کی ہے اور مرہٹے واپس ہونے پہ مجبور ہوئے۔(۸۹)

موتی بیگم کی ہمت، صبر واستقلال کی داد نہ صرف اپنے بلکہ غیر بھی دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ موتی بیگم کے بعد ریاست بھوپال کی فرمانروا خاتون ہمارے سامنے آتی ہیں وہ نواب قدسیہ گوہر بیگم (۱۸۱۹ء۔۱۸۳۷ء) ہیں۔ یہ بیگم نواب غوث محمد خاں بہادر کی بیٹی تھیں۔۱۷۹۹ء میں پیدا ہوئیں اور ۱۵ سال کی عمر میں نواب نظر محمد خاں کے ساتھ شادی ہوئی۔ شادی کے ۱۹ ماہ بعد ان کے ہاں بیٹی سکندر بیگم پیدا ہوئی۔ نواب قدسیہ بیگم ۱۷ سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ نواب نظر محمد کی وصیت کے مطابق مختار ریاست قرار دی گئیں۔ نواب نظر محمد خاں کے انتقال کے وقت ریاست بھوپال کے کئی امیدوار تھے۔ ان کی سازشوں کی وجہ سے گوہر قدسیہ بیگم مکمل اطمینان و سکون نصیب نہیں ہوا۔ ریاست بھوپال کو حاصل کرنے کے لیے سازشیں چل رہی تھیں۔ گوہر بیگم قدسیہ نے نہایت ہمت اور استقلال سے ان کا مقابلہ کیا۔ اس وقت ان کو حکیم شہزاد مسیح جو نظر محمد خاں کے عہد میں وزیر ریاست تھے اور راجہ خوشوقت رائے، کامدار میاں کرم محمد خاں اور بخشی بہادر جیسی، وفادار بہادر اور ایماندار شخصیات کا ساتھ میسر تھا۔ ان کی وجہ سے گوہر بیگم قدسیہ کو بہت اطمینان تھا کہ دشمن ان کو اور ان کی بیٹی سکندر بیگم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ اس حوالے سے نظر محمد خاں کی خواہش تھی جس کا ذکر وھاج الدین چشتی نے کیا ہے کہ

> میری بیٹی سن شعور کو پہونچیں تو اون کی شادی ہمارے اقربا میں سے جو اون کا ہمسر ہو کر دی جائے اور اون کا شوہر نواب کہلائے۔(۹۰)

نواب سکندر بیگم کے عقد کو جہانگیر محمد خاں کے ساتھ طے کیا گیا۔اس عقد کو طے کرنے کے لیے اراکین ریاست اور ایسٹ انڈیا کمپنی سے بھی مشاورت لی گئی۔جہانگیر محمد خاں کے والد امیر محمد خاں اور چچا نظر محمد خاں تھے۔نسبت طے کرتے وقت جہانگیر محمد خاں کی عمر ۷ سے ۹ برس تک تھی۔نواب سکندر جہاں بیگم اور جہانگیر محمد خاں کی تعلیم و تربیت ایک ہی طرز پر کی گئی تھی۔قدسیہ بیگم نے ان کی تعلیم و تربیت کے لیے بہترین اساتذہ مقرر کیے۔ جہانگیر محمد خاں کی عمر اس وقت چودہ برس اور سکندر جہاں بیگم کی تیرہ سال تھی۔نواب قدسیہ بیگم جلد عقد کرنے کے حق میں نہیں تھیں مگر جہانگیر محمد خاں کو معاہدہ کی رو سے ریاست کی مسند اسی وقت ملتی جب عقد ہو جاتا تھا۔اس لیے ان کے خاندان کے افراد اور بہی خواہوں نے پولیٹیکل ایجنٹ سے مل کر نواب قدسیہ بیگم کو عقد کرنے پر مجبور کر دیا

بقول ڈاکٹر رضیہ حامد

> پولیٹیکل ایجنٹ مسٹر ولکنسن نے قدسیہ بیگم کو لکھا کہ آج نکاح کر دیجیے۔شادی کی رسمیں بعد میں ہوتی رہیں گی اور جب تک نقارہ شادی کی آواز اپنے کانوں سے نہ سن لوں سہیور نہیں جاؤں گا۔بھوپال ہی میں قیام رکھوں گا۔سکندر بیگم کی شادی کے کچھ عرصہ بعد نواب قدسیہ بیگم ۱۸۳۷ء نے ریاست بھوپال کے تخت سے دستبرداری اختیار کر لی۔(۹۱)

گوہر بیگم نیک دل اور اعلیٰ اوصاف کی حامل خاتون تھیں اور اس وجہ سے ان کو خاندانی خطاب "قدسیہ" بھی وراثت میں ملا یہاں تک کہ ان کا اصل نام گوہر بیگم کو پس پشت چلا گیا۔مزاجاً دلیر واقع ہوئیں اور فن سپہ گری، گھڑ سواری سے بخوبی آگاہ تھیں۔لوگوں کو ان کی اہلیت کے مطابق بلا تفریق مذہب و وطنیت کے مختلف عہدوں پر فائز کرتیں۔ہر شعبہ زندگی پر ان کی مہارت تھی۔رعایا کو ان کے پاس جا کر اپنے مسائل کے اظہار کی مکمل آزادی تھی۔لوگوں کے مسائل توجہ سے سنتیں اور ان کے حل کے لیے حتی المقدور کوشش کرتیں اور دیہی علاقوں کے دورے کر کے حالات سے باخبر رہتیں تھیں۔ان کے عہد میں عوام بہت خوش حال تھے۔معاشی و اقتصادی سطح پر ریاست خود کفیل تھے اس بارے میں مولانا وھاج الدین چشتی کا کہنا ہے کہ

> قدسیہ بیگم متعدد اور متضاد خوبیوں کی حامل تھیں۔جتنی بہادر تھیں اتنی ہی رحم دل اور فیاض بھی تھیں۔راتوں کا شہر گشت کرنا بھی انکے معمولات میں داخل

تھا۔ حاجت مندوں کے گھروں پر خود پہنچ کر حاجت روائی کرنا ان کا محبوب مشغلہ
تھا۔ مختصر یہ کہ وہ ایک مکمل خاتون تھیں۔(۹۲)

نواب قدسیہ بیگم نے شہر بھوپال کے وسط میں ایک وسیع جامع مسجد بنوائی۔ اس میں دو منزلہ عمارت اور بارہ دری بنوائی۔ ریاست سے دستبردار ہونے کے باوجود قدسیہ بیگم نے انگریز گورنمنٹ کو بھوپال میں ریلوے لائن ڈالنے کی طرف متوجہ کیا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے پندرہ لاکھ روپیہ دینے کا معاہدہ کیا۔ تین قسطیں انہوں نے اپنی زندگی میں ادا کر دی تھیں، باقی ان کے انتقال کے بعد ادا کی گئیں۔ ریاست بھوپال کے محکمہ واٹر ورکس کے لیے پانچ لاکھ روپیہ گورنمنٹ برطانیہ کو دیا اور وصیت کی کہ رعایا سے واٹر ورکس کا ٹیکس وصول نہ کیا جائے۔ ۱۸۷۲ء میں قدسیہ بیگم کو برطانیہ کی ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے کراؤن آف انڈیا(Crown of india) کا خطاب اور تمغہ عطا کیا گیا۔ ان کے ریاست سے دستبردار ہونے کے باوجود برطانوی حکومت کی طرف سے بہت زیادہ عزت و احترام سے نوازا جاتا تھا۔ حکومت کی طرف سے ان کی سلامی کے لیے پندرہ توپیں مقرر تھیں۔ نواب قدسیہ بیگم نے نواب سکندر جہاں بیگم کے ساتھ حج کا سفر کیا۔ ۳۳ جنوری ۱۸۶۴ء کو جدہ پہنچیں۔ مکہ معظمہ میں ایک رباط بنوائی اور مدینہ منورہ میں ایک مکان خرید کر رباط کے لیے وقف کیا اور ساتھ ہی نہر زبیدہ کی بحالی تک چھ ہزار روپیہ پیشگی دے دیا تھا۔ وھاج الدین چشتی ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

> قدسیہ بیگم بھوپال سے باہر بھی برصغیر کے اسلامی مراکز اور اداروں کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ ہزاروں روپے کی مالی امداد، سالانہ وظیفے، کتابیں اور دوسرا ضروری سامان بھیجتی رہتی تھیں۔ درگاہ خواجہ صاحب اجمیر شریف کے لیے سالانہ ایک رقم مخصوص تھی۔۔۔۔(۹۳)

نواب قدسیہ بیگم نے عہد سکندری میں انہوں نے جلیورہ، الہ آباد، لکھنو، کانپور، فیض آباد اور آگرہ کا سفر کیا تھا۔ نواب قدسیہ بیگم کے نزدیک مذہب کی کوئی تفریق نہیں تھی۔ بحیثیت انسان سب کو یکساں جانتی تھیں ان کے دربار میں تین وزیر تھے جن میں ایک ہندو راجہ خوشوقت رائے، دوسرے مسلمان کرم محمد خاں اور تیسرے عیسائی شہزاد مسیح تھے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر رضیہ حامد لکھتی ہیں کہ

انہوں نے (قدسیہ بیگم)اپنی جاگیر میں جہاں اڑ تیس ہزار کی جاگیریں مسلمانوں کو دی تھیں وہیں تیس ہزار کی جاگیریں ہندوؤں کو بھی دی تھیں، حتی کہ ہندو پجاریوں کی تنخواہیں اوراخراجات کے لیے سالانہ مقرر تھے۔(۹۴)

قدسیہ بیگم بہت عبادت گزار خاتون تھیں۔غریبوں، مسکینوں کی مدد کرنا فرض اول سمجھتی تھیں۔مگر خود اپنے لیے کبھی سخی یا فیاض کا لقب پسند نہیں کیا۔۷ ادسمبر ۱۸۸۱ء کو نواب قدسیہ بیگم کا انتقال ہو گیا۔علاوہ ازیں علماو فضلا بھی دیگر ریاستوں سے یہاں آکر بسنا شروع ہو گئے۔اور علم و فضل کو کمال پہنچایا، جس کا اظہار نواب شاہجہاں بیگم نے اپنی کتاب تاج الاقبال میں کیا ہے کہ نواب قدسیہ بیگم کی مختاری میں اہل قلم کو بہت ترقی ہوئی تھی۔یوں تو سردار دوست محمد خاں کے عہد سے ہی بھوپال میں علم و ادب کا چرچا ہو گیا تھا۔انہوں نے ہندوستان کے دیگر علاقوں سے مشہور علما کو بھوپال بلایا اور ان کے بعد بھی علما کی سرپرستی کا سلسلہ برابر جاری رہا تھا۔شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کو بھوپال آنے کی دعوت دی گئی اور بارہ ہزار سالانہ کی جاگیر کی پیش کش کی تھی۔لیکن شاہ صاحب نے بڑھاپے کی وجہ سے دلی نہ چھوڑنے کا عذر کیا البتہ کئی دوسرے علماء کو بھوپال بھیج دیا۔جہانگیر محمد خاں صاحب دیوان شاعر تھے۔ان کے عہد میں تہذیبی، علمی اور ادبی ترقی کی رفتار بہت تیز تھی۔انہوں نے علماء فضلا کو بڑی بڑی جاگیریں دیں۔مومن خاں مومن کو بھوپال آنے کی دعوت دی۔اہل علم کے قدردان، علم پرور اور علم دوست انسان تھے۔اردو، فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔جہانگیر محمد خاں نے اطراف ہند سے علماء فضلا کو بھوپال میں جمع کیا۔ نواب جہانگیر محمد خاں ۳۰ نومبر ۱۸۳۷ء کو مسند ریاست پر فائز ہوئے۔نواب صاحب کو ان کے مشیروں نے قدسیہ بیگم اور نواب سکندر جہاں بیگم کے خلاف کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ مشیروں کی اختراعات کے نتیجے میں نواب جہانگیر محمد خاں نے حکمران ہونے کے چھ ماہ بعد ۲۷ اپریل ۱۸۳۸ء بدھ کی رات جب نواب سکندر بیگم سو رہی تھیں تلوار سے وار کیا جس سے وہ قتل ہونے سے تو بچ گئیں مگر شدید زخمی ہوئیں۔اس حادثہ کے حوالے سے رضیہ حامد لکھتی ہیں کہ

فوراً اپنی والدہ قدسیہ بیگم کے پاس چلی گئیں اور ان کے ساتھ اسلام نگر میں منتقل ہو گئیں۔وہیں ۲۰ جولائی ۱۸۳۸ء کو شاہجہاں بیگم پیدا ہوئیں۔تاریخی نام "مسعود بخت بیگم "اور "خورشید اقبال" ہے۔جہانگیر محمد خاں کا عین شباب میں انتقال ہو گیا۔ان کی بیٹی شاہجہاں بیگم جانشین قرار دی گئیں۔ان کی عمر اس وقت سات سال تھی۔(۹۵)

جہانگیر محمد خاں سپہ گری کے تمام اوصاف کے حامل تھے۔ نواب جہانگیر محمد خاں کو تعمیرات کا بہت شوق تھا۔ بھوپال کے جنوب میں چھوٹے تالاب کے کنارے بادل محل تعمیر کیا۔ جہانگیر محمد خاں ہمہ صفت انسان تھے لیکن وہ اپنے مشیروں اور اپنے مقاصد جاہ و نصب کے لئے کوشاں حضرات کے ہاتھوں مجبور ہو گئے۔ جس سے بھوپال ریاست کی ترقی کی راہیں دشوار ہو گئیں۔ صحیح معنوں میں ان کو ذہنی آسودگی، ازدواجی زندگی کا بھرپور سکون و اطمینان اور خوشی حاصل نہیں ہوئی۔ کثرت شراب نوشی کے سبب ۹ دسمبر ۱۸۴۴ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ جہانگیر محمد خاں نے ۷ سال دو ماہ اٹھائیس دن حکومت کی۔ جہانگیر محمد خاں کے بعد ان کی بیٹی شاہجہاں بیگم کو ۲۱ جنوری ۱۸۴۵ء کو بحیثیت حکمران تسلیم کیا گیا۔ گورنر جنرل نے اپنے حکم نامہ میں یہ بات صاف طور پر درج کی کہ جس کے ساتھ نواب بیگم کی شادی ہو گی وہی شخص مسند نشیں ریاست ہو گا۔ ابتدا میں فوجدار محمد خاں کو مختار ریاست بنایا۔

نواب شاہجہاں بیگم کی کمسنی کی وجہ سے ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ان کی والدہ نواب سکندر جہاں بیگم کو سپرد کی گئی۔ فوجدار محمد خاں ریاست کے حکمران تھے۔ ان کے زمانہ مختاری میں ریاست کے نظم و نسق میں بد نظمی اور انتشار پیدا ہونے لگا تھا۔ ریاست کے اراکین اپنی سازشوں میں مگن رہے اور دوسری جانب نواب سکندر بیگم نے ان خطرات کو محسوس کرتے ہوئے اپنے اختیارات اور حقوق سے متعلق گورنمنٹ برطانیہ کی ایجنسی کو اس سلسلہ میں خط لکھا۔ بقول رضیہ حامد

> اپنی تقدیر پر حیرت ہے کہ نواب نظر محمد خاں کے انتقال کے زمانہ سے جن کو ۲۶ سال کا عرصہ گزرا حکومت ریاست جناب کرامت مآب نواب قدسیہ بیگم صاحبہ اور نواب صاحب بہادر کے قبضہ اقتدار میں رہی ۔۔۔۔ اس عالم اسباب میں باپ، شوہر، لڑکا اور بھائی وسیلہ قوی ہوتے ہیں اور جس صورت میں کہ میں ایک بھی ان میں سے نہیں رکھتی ہوں تو کیوں کر ممکن ہے کہ تن تنہا بغیر اختیار حکومت ایک لڑکی کو رکھ کر ہم چشموں میں زندگی بسر کروں۔ میری دلی تمنا ہے کہ میرے جوہر ذاتی کے امتحان کا وقت ہے جو حصول اختیار کے بعد حسب دلخواہ ظاہر ہو گا اور جو کچھ صاحبان عالی شان بہادر کو ریاست کی بد انتظامی کے باعث افسوس ہے وہ میرے اور میرے حسن تدبیر سے مرتفع اور مبدل بہ خوشی ہو جائے گا۔(۹۶)

نواب سکندر بیگم کی کوشش رائیگاں نہیں گئی۔ آر۔ سی ہملٹن(R.C Hamilton)ایجنٹ گورنر جنرل سینٹرل انڈیا نے امور ریاست میں نواب سکندر بیگم کے مطالبہ کو تسلیم کرتے ہوئے ایک خریطہ بھیجا اور اشتہار کے ذریعے عوام کو مطلع کیا تھا۔ نواب سکندر بیگم اپنی ذمہ داری اور فرائض کو نہایت استقلال اور بیدار مغزی سے پورے کرتی رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنی تجاویز ریذیڈینسی کو تحریر کرتیں لیکن اس تمام عرصہ میں سکندر بیگم اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے کوشش کرتی رہیں ہیں۔ برطانوی گورنمنٹ کو اپنے حقوق کی موافقت میں دلائل دے کر تحریری و تقریری طور پر وقتاً فوقتاً متوجہ کرتی رہتی تھیں۔ نواب سکندر بیگم کی بیدار مغزی، قابلیت کے جوہر بھوپال میں قیام کے دوران ان پر کھلے تو انہوں نے ریاستی امور پر بیگم صاحبہ کی آراء کو اہمیت دیتے اور عمل کرتے تھے۔ آخر کار ۲۸ جنوری ۱۸۴۶ء کو نواب سکندر بیگم کے مختار ریاست ہونے کا باضابطہ اعلان کر دیا گیا تھا۔

سکندر بیگم نے بہت جد وجہد اور سیاسی سوجھ بوجھ کے ساتھ جانشینی کے مسائل اور شاہجہاں بیگم کے عقد کے مسئلے کو حکومت برطانیہ سے طے کیا کہ کسی خاندانی شرط کے بغیر ریاست بھوپال جہاں مناسب سمجھے گی ان کی شادی کر دی جائے گی اور شاہجہاں بیگم آزادانہ ریاست بھوپال کی حکمران اور ان کا شوہر برائے نام نواب ہوگا۔ یہ اس قسم کے مسائل تھے جو ماضی میں بھی فسادات کا باعث بنے رہے اور مستقبل میں بھی ان سے خانہ جنگی کا اندیشہ تھا۔ نواب سکندر بیگم کے مختار ریاست ہونے کے بعد ہندوستان میں انگریز حکومت سے آزادی حاصل کرنے کی تگ و دو اور دوسری جانب عوامی جد وجہد نے بھی انقلاب کی شکل اختیار کر لی تھی۔ آزادی کی یہ تحریک صرف چند چھاونیوں تک محدود نہیں رہی بلکہ پورے ہندوستان میں پھیلتی جارہی تھی۔ فوج کے علاوہ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے مجاہدین آزادی بھی حصہ لینے کے لیے دہلی گئے۔ یکم مئی ۱۸۵۷ء کو شہر بھوپال میں کہیں سے ایک باغیانہ پوسٹر کی سو کاپیاں آئیں جو بھوپال کی فوج میں تقسیم کی گئیں تھیں۔ اس پوسٹر کی تقسیم نے بھوپال کی فوج کے ذہنوں، دلوں میں انگریزوں کے خلاف جذبات ابھارے۔ بھوپال کی فوج میں بے چینی پیدا ہوگئی، یہاں تک کہ معمولی پیشہ سے منسوب افراد بھی انگریزوں کا نام سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ اسد محمد خاں اپنی کتاب سپاہی بہا در میں اس دن کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں جس کا ذکر ڈاکٹر رضیہ حامد نے کچھ اس طرح سے کیا ہے کہ

> اس وقت سیہور چھاؤنی میں باغیوں کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ بخشی فوج اور دیگر اعلیٰ افسران کو اس کاروائی میں مداخلت کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ بڑے صبر و

ضبط کے ساتھ اپنے کمروں میں بیٹھے ہوئے اس باغیانہ کاروائی کو دیکھتے رہے۔یہ واقعہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں ایک تاریخ ساز واقعہ تھا کیوں کہ اس دن سہیور میں انگریزی راج کے خلاف ایک جرآت مندانہ اور مثبت اقدام کیا گیا تھا۔۔۔(۹۷)

بھوپال کی فوج کے سپاہیوں نے آزادی کے لیے بہت جدوجہد کی تھی۔ان کی یہ جدوجہد بھوپال کی سیاسی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔بھوپال کی کنٹنجینٹ فوج نظر محمد خاں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان معاہدہ کے تحت قائم کی گئی تھی۔اس کے سپاہیوں نے سکندر بیگم کے حکم کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔نواب سکندر بیگم نے انگریزوں کے ہندوستان سے نکالے جانے کے متعلق کہا تھا بقول محمد امین زبیری ''ابھی انگریزوں کے نکالنے کا مناسب وقت نہیں آیا۔''(۹۸)

نواب سکندر جہاں بیگم نے اپنی ریاست کی حفاظت کرتے ہوئے انگریزوں کی مدد کی تھی۔تحریک آزادی کے نقطہ نظر سے یہ عمل قابل مذمت اور قابل گرفت ہے لیکن ان کے اس عمل کے پیچھے کیا عوامل تھے ان کا جاننا بہت ضروری ہے۔انگریزوں نے ہندوستان کی اکثر ریاستوں کو ختم کر کے ان کو انگریزی حکومت میں شامل کر لیا تھا۔سکندر جہاں بیگم بھوپال کو باقاعدہ شکل دینے والی آئینی حکومت بنانے والی پہلی حکمران تھیں۔ریاست میں ایک طبقہ سکندر بیگم کو قتل کر دینا چاہتا تھا۔ایسے میں سکندر بیگم نے اپنے والد نظر محمد خاں کے انگریزوں سے کیے گئے معاہدہ ۱۸۱۸ء کو سہارا بنایا اور اپنی ریاست کے ساتھ ہی اپنی حفاظت کا بھی بندوبست کیا۔ان ہنگامی حالات کے بعد امن وامان قائم کرنے کی تدابیر کے ساتھ ہی انہوں نے اپنی پچھلی اصلاحات کے سلسلہ کو بھی جاری رکھا اور متعدد اصلاحات نافذ کی تھیں۔ڈاکٹر رضیہ حامد اس حوالے سے لکھتی ہیں کہ

یہ بات کہنا مشکل ہے کہ اگر سکندر بیگم انگریزوں کی حمایت نہ کرتیں تو کیا باغی طاقتیں انگریزوں کو ملک سے باہر نکال دینے میں کامیاب ہو جاتیں؟لیکن ایک بات یقینی تھی کہ انگریزوں کی کامیابی کے بعد ریاست بھوپال کا خاتمہ ہو جاتا۔(۹۹)

کیونکہ سکندر بیگم کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ وہ ریاست کی حقدار اور مسند حکومت کی وارث ہیں جس سے وہ محروم رہی ہیں۔ وہ دلائل کے ساتھ اپنے حق کو ثابت کرتی تھیں۔ وہ باور کرانا چاہتی تھیں کہ مسند ریاست کی حقیقی وارث وہی ہیں اور ان کا حق کوئی اور نہیں لے سکتا ہے۔

سکندر بیگم کی فہم و فراست اور دانشورانہ مشوروں کو دیکھتے ہوئے جو انہوں نے مختلف اوقات میں انگریز افسران کو دیئے گئے تھے، بالآخر حکومت برطانیہ نے سکندر بیگم کے رئیسہ بھوپال ہونے کو تسلیم کیا۔ لیکن ایک دشواری یہ پیش آئی کہ نواب شاہجہاں بیگم کے رئیسہ بھوپال ہونے کو اس وقت تسلیم کیا گیا جب وہ چھ سال کی تھیں۔ اس موقع پر شاہجہاں بیگم نے سعادت مندی، فراخ دلی اور بلند حوصلگی کا ثبوت دیا۔ اور بالآخر ۱۸۵۹ء کو حکومت سے دستبردار ہو گئیں۔ یکم مئی ۱۸۶۰ء کو نواب سکندر بیگم رئیس اور شاہجہاں بیگم ولی عہد تسلیم کی گئیں۔ اس وقت سکندر بیگم کی عمر ۴۳ سال تھی۔ وہ ۱۳ سال مختار ریاست رہیں۔ صدر نشینی کا دربار منعقد ہوا۔ کرنل ڈیورینڈ (Maj.Durand) نے مبارکباد کے ساتھ ان کی قابلیت اور بلند ہمتی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا۔ بقول ڈاکٹر رضیہ حامد ''مورخ تاریخ بھوپال کو چاہیے کہ فہم اور فکر رسا سے نواب سکندر بیگم کی بلند ہمتی اور مستقل مزاجی کا حال لکھے۔''(۱۰۰)

یکم نومبر ۱۸۶۱ء کو دربار الہ آباد میں انہیں اسٹار آف انڈیا جی۔ سی۔ ایس۔ آئی کا تمغہ اور نائٹ گرینڈ کمانڈر کا خطاب ملا۔ نواب سکندر جہاں بیگم ہندوستان کی پہلی رئیسہ خاتون تھیں جن کو یہ اعزاز ملا۔ نواب سکندر بیگم نے تدبر، معاملہ فہمی کے ساتھ ریاست میں قانون کی پابندی کرنے کی تدبیریں کیں۔ نواب وزیر محمد خاں نے جس ریاست کو بزور تلوار نیست و نابود ہونے سے بچایا تھا ان کی پوتی نے نہایت حکمت سے اس کو استحکام بخشا۔ سکندر بیگم کا عہد حکومت آئینی عہد کے نام سے مشہور ہے۔ محمد امین زبیری نے بیگمات بھوپال میں اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے

> ان کے استقلال، بیدار مغزی اور فراست نے ہر موقع پر ان کا ساتھ دیا اور ایک ہوشیار جہاز ران ان کی طرح سمندر کی پر شور، پر خطر موجوں سے انہوں نے اپنے جہاز کو سلامتی کے ساتھ ساحل پر پہنچایا۔(۱۰۱)

نواب سکندر نے ۱۸۵۹ء میں ہندوستان کی سب ریاستوں سے پہلے بھوپال ریاست میں فارسی کے بجائے اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا۔ انہوں نے تعلیم کے فروغ کے لیے ریاست بھوپال میں کئی مدرسے قائم کیے اور بیرون

بھوپال امداد دی۔ ۱۸۶۲ء میں سر سید احمد خاں کو سائنٹفک سوسائٹی قائم کرنے کی خوشی میں الماس کی ایک بیش قیمت انگوٹھی بھیجی۔ انہوں نے دفتر انشاء اور دفتر تاریخ قائم کیا۔ نواب سکندر بیگم نے ریاست کے تاریخی حالات کو محفوظ کیا۔ اس تاریخ کی تکمیل نواب شاہجہاں بیگم کے عہد میں ہوئی، شاہجہاں بیگم نے اس کو تاج الاقبال کے نام سے شائع کیا۔ نواب سکندر بیگم علمی ذوق رکھتی تھیں۔ بھوپال اور اطراف بھوپال تعلیمی اغراض کے لئے وظائف اور امداد دی۔ مرزا رجب علی بیگ سرور سے سارس کے جوڑے کا قصہ لکھنے کی فرمائش کی۔ انہوں نے فسانہ عجائب کی طرز پر بہ عجلت پیش کیا۔ سکندر بیگم نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور قدردانی کے طور پر پانچ سو روپیہ انعام دیا۔ یہ فسانہ شرار عشق کے نام سے طبع ہو کر شائع ہوا۔ سکندر بیگم محنتی اور جفاکش دلیر و مدبر حکمران کے ساتھ ہی سلیقہ منداور ماہر خاتون خانہ بھی تھیں۔ اس اولوالعزم حکمران نے ۵۲ سال کی عمر میں ۳۰ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو اس عالم فانی سے کوچ کیا۔ انتقال کے بعد ''خلد نشین'' کا لقب پایا۔ کلکتہ کے اخبار ''ہندو پیٹریٹ'' نے نواب سکندر بیگم کی وفات پر حکمران مرد اور عورت کا مقابلہ کرتے ہوئے ایک مختصر تبصرہ کیا جس میں سکندر بیگم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا بقول محمد امین زبیری

> اکثر مرد قابل حکمران اور بہت سے ناقابل مرد حکمران ہوتے ہیں لیکن صرف عورتیں جو حکمران ہوتی ہیں ہمیشہ قابل ہوتی ہیں۔ مرد اور عورت کی ذہنی اور اخلاقی مساوات کا یہ کیسا بین ثبوت ہے۔ گو اس میں شک نہیں کہ ذہنی تفاوت کی وجہ سے خفیف عدم مساوات بھی ناگزیر ہے۔ مگر یہ عورتوں کی تمدنی رتبہ افزائی اور تعلیم کی تائید میں کتنی بڑی دلیل ہے۔ (۱۰۲)

نواب سکندر بیگم کے انتقال کے بعد ۱۶ نومبر ۱۸۶۸ء کو ایوان موتی محل میں نواب شاہجہاں بیگم مسند آرا ہوئیں اور ان کی بیٹی سلطان جہاں بیگم ولی عہد قرار دی گئیں۔ نواب سکندر بیگم نے شاہجہاں بیگم کی تعلیم و تربیت پر بہت توجہ دی۔ ان کو بچپن سے ہی گھڑ سواری، نشانہ بازی کی مشق کرائی جاتی تھی۔ خانہ داری اور دیگر ہنر کی تعلیم خود سکندر بیگم نے دی تھی۔ نواب سکندر بیگم نے شاہجہاں بیگم کے ہر کام کو دلچسپی اور شوق سے دیکھا اور سرانجام دیا تھا۔ نواب شاہجہاں بیگم اپنے والد نواب جہانگیر محمد خاں کے انتقال کے بعد چھ سال کی عمر میں حکومت کے اختیارات دیئے جائیں گے۔ شادی کے بعد ان کا شوہر رئیس بھوپال ہوگا۔ گورنمنٹ برطانیہ نے نواب بیگم پر امور ملکی کی کچھ ذمہ داریاں عائد کیں جن کو وہ نہایت قابلیت اور بیدار مغزی سے انجام دیتی تھیں۔ نواب سکندر بیگم کو اپنی بیٹی کی شادی طے کرنے کی

بہت فکر تھی کیونکہ خود ان کی شادی کے وقت بہت پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں تھیں۔ تقریباوہ سب پیچیدگیاں اب بھی موجود تھیں۔ سکندر بیگم نے شاہجہاں بیگم کے شوہر کا انتخاب کرنے لیے ۱۸۵۱ء میں ایک مدرسہ قائم کیا جس میں شاہی خاندان کے چند لڑکوں کو منتخب کر کے ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ سکندر بیگم نے برطانیہ ایک خط بھیجابقول محمدامین زبیری

> خاندان میں شاہجہاں بیگم کی شادی کے لائق کوئی نظر نہیں آتااور جب غیر خاندان کے ساتھ کرنے کا سوچوں تو معلوم نہیں کیاانجام ہو۔اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ریاست نواب شاہجہاں بیگم کے نام رہےاور ان کا شوہر امور ریاست میں بے اختیار ہو۔ صرف مرتب ہو نام و عزت میں نواب رہے مگر جو اولاد ان سے ہو وہ مستقبل کانواب اور مالک ٹھہرے۔(۱۰۳)

شاہجہاں بیگم کو حق ریاست دلوانے کے لئے نواب سکندر بیگم نے بہت کوشش کی اور وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب رہیں۔ حکومت برطانیہ نے شاہجہاں بیگم کی شادی سے قبل یہ اعلان کر دیا تھا کہ نواب شاہجہاں بیگم حکمران بھوپال ہوں گی اور ان کے شوہر کو حکومت کے اختیارات حاصل نہ ہوں گے اور وہ برائے نام نواب ہوگا۔ ریاست میں اندرون خانہ سیاسی چالیں بھی زور و شور سے جاری و ساری تھیں۔ سکندر بیگم ان حالات سے گزر چکی تھیں اس لیے انہوں نے اپنی بیٹی کی حکومت اور مستقبل میں پیش آنے والے متوقع مسائل کا خیال کرتے ہوئے ریاست کے سپہ سالار بخشی محمد خاں کا انتخاب داماد کے طور پر کیا۔ اراکین ریاست نے سکندر بیگم کی رائے سے اتفاق کیا۔ اس کے بعد نواب شاہجہاں بیگم کا عقد ۲۶ جولائی ۱۸۵۵ء کو بخشی محمد خاں کے ساتھ ہوا۔ بخشی محمد خاں کو حکومت برطانیہ کی طرف سے نواب ''نظیر الدولہ''، ''امراؤ الدولہ'' کا خطاب ملا۔ نواب شاہجہاں بیگم کی دو اولادیں ہوئیں جن میں بڑی بیٹی سلطان جہاں بیگم اور دوسری سلیمان جہاں بیگم تھیں لیکن چند برس بعد سلیمان جہاں بیگم کا انتقال ہو گیا۔ نواب باقی محمد خاں کا جون ۱۸۶۷ء کو انتقال ہو گیا۔ نواب باقی محمد خاں کے انتقال کے وقت شاہجہاں بیگم ۲۹ برس کی تھیں۔ شوہر کی وفات کے ایک سال بعد والدہ کی شفقت سے بھی محروم ہو گئیں۔ ریاست کے نظام کو رواں دواں رکھنے کے لیے حکومت برطانیہ اور اراکین ریاست کی باہمی مشاورت سے ۱۸۷۱ء میں نواب صدیق حسن خاں سے نکاح کیا۔ گورنمنٹ کی طرف سے انہیں "والا جاہ، امیر الملک" کا خطاب دیا گیا۔ نواب صاحب کو عربی، فارسی، اردو وغیرہ پر زبردست مہارت تھی۔ نواب شاہجہاں بیگم کے ساتھ زندگی کے ۲۶ برس گزارنے کے بعد ۱۸۹۰ء کو جہان فانی سے

کوچ کر گئے۔ نواب سکندر بیگم کی وراثت کے حق میں نواب شاہجہاں بیگم دستبردار ہو گئی تھیں۔ ولیعہدی کے دوران انہوں نے مختلف خدمات سرانجام دیں تھیں بقول ڈاکٹر رضیہ حامد

> ۱۶ نومبر ۱۸۶۸ء کو شاہجہاں بیگم نے رئیسہ بھوپال ہونے کے ناطے پوری ریاست کا دورہ کیا۔ از سر نو ریاست کی پیمائش کروائی۔ گردونواح کی ریاستوں کے سکے مختلف اوزان کے تھے جبکہ نواب شاہجہاں بیگم نے نئے ہم وزن جدید سکہ رائج کروایا جس پر ان کے نام کا پہلا حرف 'ش' اور سن ہجری نقش ہوتا تھا۔(۱۰۴)

علاوہ ازیں نواب شاہجہاں بیگم نے تعلیم کے فروغ کے لیے محکمہ تعلیم قائم کیا، جس کا نام نظارۃ المعارف العمومیہ تھا۔ اپنے والد محترم نواب جہانگیر محمد خاں کی یاد میں مدرسہ جہانگیریہ قائم کیا۔ جہاں حصول علم کے لئے طلبہ دور دور سے آتے اور انہیں وظائف دیئے جاتے تھے۔ پرنس آف ویلز صنعتی تعلیم کے لیے مدرسہ قائم کیا گیا۔ وہاں نادار، غریب طلبہ کے لئے لباس اور کھانے کا بھی انتظام کیا۔ نواب شاہجہاں بیگم کو تعلیم سے شغف تھا۔ انہوں نے نواب سکندر کے قائم کردہ مدرسہ سلیمانیہ کو ترقی دی اور ۱۸۹۲ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے اس کا الحاق کیا گیا۔ اس مدرسہ میں عربی، اردو فارسی کے ساتھ انگریزی تعلیم کا انتظام بھی تھا اور اس کے لیے باقاعدہ نصاب جاری کیے گئے۔ مدرسوں میں حصول ملازمت کے لیے تعلیمی سرٹیفیکٹ اور سند کو ضروری قرار دیا گیا۔ نواب شاہجہاں بیگم سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کی سرپرست بھی تھیں۔ سرسید احمد خاں جب حیدر آباد دکن جاتے ہوئے بھوپال میں ۱۸۹۱ء میں مقیم ہوئے اور نواب شاہجہاں بیگم نے محمڈن کالج کی تعمیر کے لیے دس ہزار رقم دی اور دو ہزار باقی عزیزوں کی طرف سے بھجوائے۔ سرسید نے شکریہ کے طور پر فارسی میں نظم کہی۔

نواب شاہجہاں بیگم نے کئی کتب تصنیف بھی کیں تھیں۔ تہذیب النسواں و تربیت الانساں، تاج الاقبال تاریخ بھوپال جلد اول، دوم ، سوم، خزینۃ الالغات یہ لغت سات زبانوں اردو، عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت، ہندی اور انگریزی میں ہے۔ نواب شاہجہاں بیگم صاحب دیوان شاعرہ تھیں۔ انکا تخلص شیریں، تاجور تھا۔ ان کے دو دیوان مطبوعہ تاج الکلام اور دیوان شیریں ہیں۔ انہوں نے ایک مثنوی صدق البیان کے نام سے لکھی تھی۔ عمدۃ الاخبار کے نام سے ایک اخبار جاری کیا جو ریاست کے مطابع مطبع سکندری اور مطبع شاہجہانی میں طبع ہوتا تھا۔ یہ اخبار ہفت روزہ تھا اور اس کی پہلی اشاعت ۲۴ مارچ ۱۸۷۱ء میں ہوئی۔ لاوارث لڑکیوں کے لئے

اپنی نواسی بلقیس جہاں بیگم کے نام سے ''بلقیسہ نرسنگ ہوم'' قائم کیا تھا۔ جہاں بچیوں کی نگہداشت کے علاوہ تعلیم و تربیت کا بھی معقول انتظام ہے اور یہ آج بھی قائم ہے۔ نواب شاہجہاں بیگم نے برطانیہ میں پہلی مسجد بنوائی جو ووکنگ میں واقع ہے اور شاہجہانی مسجد کے نام سے مشہور ہے اس کے ساتھ لائبریری اور ایک مدرسہ بھی ہے۔ نواب شاہجہاں بیگم کے بائیں رخسار میں کینسر ہو گیا تھا جس کی وجہ سے وہ گیارہ ماہ سخت بیمار رہیں تھیں۔ اس حوالے سے محمد امین زبیری لکھتے ہیں کہ

> اپنی زندگی سے مایوس ہو کر رعایا کے نام سے اعلان شائع کیا کہ میری حکومت کے تینتیس برس میں مجھ سے کوئی ظلم ہوا ہو کسی پر تو اللہ کے لیے معاف کر دیں اور میری صحت کے لیے دعا کریں۔ آخر بہت تکلیف اٹھانے کے بعد ۱۹ جون ۱۹۰۱ء کو تریسٹھ برس کی عمر میں وفات پائی۔ اپنے باغ نشاط افزا میں دفن ہوئیں۔ (۱۰۵)

نواب شاہجہاں بیگم کے بعد ریاست بھوپال پر فرمارِوایان بھوپال میں گیارہویں فرمانروا اور سلسلہ فرمانروا بیگمات میں چوتھی بیگم نواب سلطان جہاں تھیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے فرمانروا ہوتے ہی بھوپال میں انقلاب برپا کر دیا تھا۔ ریاست بھوپال کے حکمرانوں خصوصاً نواب سلطان جہاں بیگم نے مختلف جہات میں کام کیے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ نظم و نسق کے مسائل کو حل کروانے کی کوشش کی بلکہ رعایا کے اندر بھی نظم و نسق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی خدمات صرف بھوپال تک محدود نہیں رہیں بلکہ ملک گیر تھیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے ۲۶ سال حکومت کی، ان کے عہد حکومت میں ریاست بھوپال کی اصطلاحات، علمی سرگرمیاں، تعلیمی ترقی اور خصوصی طور پر خواتین کے لیے تعلیمی انتظامات وغیرہ نمایاں کارنامے ہیں۔ عورتوں کی ترقی کے حوالے سے جاوید یزدانی لکھتے ہیں کہ

> نواب سلطان جہاں بیگم خاتون پہلے تھیں حکمران بعد میں۔ انہوں نے عوام کے مسائل اور بالخصوص محکوم اور مظلوم عورتوں کے حالات زندگی کا بہت قریب سے مطالعہ کیا تھا۔ خواتین کی ازدواجی اور خاندانی مسائل اور پریشانیوں کا انہیں ایک صدی پہلے ادراک ہو گیا تھا۔ نواب سلطان جہاں بیگم کے نزدیک انسانوں کے فلاح و بہبود کی بنیادی کلید تعلیم ہے۔۔۔۔ وہ تعلیم کے فروغ کے لیے ہمیشہ کوشاں رہیں۔ (۱۰۶)

کسی بھی ملک کے شہریوں کی علمی وادبی، فنی، سیاسی، تمدنی اور اخلاقی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے مردوں کے علاوہ عورتوں کے حالات سے واقفیت بھی بہت ضروری ہے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ مشرقی و مغربی تمدن کا تصادم بھی شروع ہوا۔ فارسی کی جگہ انگریزی کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔ پرانی قدریں ایک ایک کر کے مٹنے لگیں۔ بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں میں مسلمانوں میں تعلیمی بیداری کی لہر پیدا ہوئی ہے۔ آج بڑی تعداد میں مسلم گھرانوں کی لڑکیاں گھر کی چار دیواری سے باہر نکل کر تعلیم حاصل کرنے لگیں۔ عطیہ فیضی (۱۸۷۷ء۔۱۹۶۷ء) اس حوالے سے لکھتی ہیں کہ

> عورتوں کو تعلیم دینا نہایت ضروری امر ہے، کیوں کہ قوم کی فلاح وبہبود کا انحصار تمام تر تعلیم یافتہ ماؤں پر ہے۔۔۔۔ مسلم خواتین کی ترقی کے لیے آپ کے دل میں جو جذبہ کار فرما تھا تاریخ میں وہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔ (۱۰۷)

نواب سلطان جہاں بیگم ہمیشہ اپنی صنف کی تعلیمی و معاشرتی ترقی کے لیے بے قرار رہتی تھیں۔ آپ کی حیثیت ایک فرمانروا ہونے کے ساتھ ساتھ مصنف کی بھی ہے۔ اس لیے صنف نسواں کے لیے بے شمار ادبی خدمات بھی سرانجام دیں تھیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے متعدد ایسی کتابیں تصنیف کیں جو ہر دور میں خواتین کے لیے مددگار ثابت ہو رہی ہیں۔ جس طرح سر سید کو مسلمان مردوں میں تعلیم کے احیا اور نشر و اشاعت کا فخر حاصل ہے اسی طرح نواب سلطان جہاں بیگم کو عورتوں میں ہے۔ نواب سلطان جہاں بیگم محض ایک حکمران ہی نہیں تھیں بلکہ وہ قوم کی رہنمائی کرنے والی حساس خاتون بھی تھیں۔ بقول ڈاکٹر سیما صغیر

> سر سید اور رفقاء سر سید سے براہ راست یا بالواسطہ طور پر وابستہ افراد کے علاوہ نوابین، امراء اور روسا کی ایک طویل فہرست ہے جن میں ایک نام سلطان جہاں بیگم کا بھی ہے۔ علی گڑھ کے ان سب محسنوں کے مدبرانہ فکر و عمل کا مکمل احاطہ کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ نسائی تدبر اور فہم و فراست کی مثالیں بہت سی دی جا سکتی ہیں۔ رضیہ سلطانہ، چاند بی بی، نور محل، جہاں آرا، ممتاز محل، حضرت محل، سکندر بیگم، شاہجہاں بیگم کی کاوشیں خواتین کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئی ہیں لیکن نواب سلطان جہاں بیگم کی نسائی جہت مشرقی علوم کی خوبیوں کے ساتھ مغربی فنون کی ضروریات پر مشتمل تھی۔ (۱۰۸)

مندرجہ بالا اقتباس کی ذیل میں دیکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ نواب سلطان جہاں بیگم لڑکیوں کی تعلیم و تربیت اور حسن اخلاق، اچھے کردار کو ان کے لیے اہم تصور کرتی تھیں۔ انہوں نے تعلیم کے ساتھ عورتوں کی آزادی، فلاح و ترقی کے لئے تعمیری کام سرانجام دیئے ہیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم کی خدمات کا اعتراف مختلف علمی و ادبی شخصیات نے کیا جن کا ذکر ڈاکٹر رضیہ حامد نے اپنی کتاب میں کچھ اس طرح سے کیا ہے مثلاً قرۃ العین حیدر (۱۹۲۷ء۔۲۰۰۷ء) نے نواب سلطان جہاں بیگم کی خدمات کے حوالے سے لکھا ہے کہ

> نواب سلطان جہاں بیگم ہندوستان کی پہلی خاتون تھیں جو کسی یونیورسٹی کی وائس چانسلر مقرر کی گئیں، ہر ہائنس نقاب پہن کر باہر آتی تھیں۔۔۔۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یکے بعد دیگرے چار بیگمات بھوپال کی فرمانروا رہی ہیں انہوں نے حکومت کی خود احکام اور فرمان جاری کئے لیکن کسی مولوی نے یہ فتویٰ نہیں دیا کہ عورت کی حکومت جائز نہیں۔۔۔۔ یہ بیگمات پردہ نشین تھیں مگر سلطان جہاں بیگم بے نقاب باہر آئیں۔۔۔۔ متواتر چار بیگمات کی حکمرانی کی بدولت بھوپال کی عورتوں کو اپنی اہمیت کا احساس اور جذبہ خودداری بیدار ہوا۔۔۔۔ بھوپال میں اسلامی شریعت کی پابندی اس حد تک ہے کہ وہاں ہندوستان کے دوسرے خطوں کے برعکس طلاق یا عقد بیوگان کو برا نہیں سمجھا جاتا۔(۱۰۹)

نواب سلطان جہاں بیگم نے اصلاح معاشرہ کی طرف بھرپور توجہ دی اور بھوپال کی فضا کو علمیت، اخوت و محبت سے معمور کر دیا تھا۔ ریاست بھوپال کو وقار بخشنے میں اگرچہ عہد بہ عہد مسند ریاست پر آنے والے تمام حکمرانوں نے اہم کردار ادا کیا ہے لیکن فرمانروا و غیر فرمانروا خواتین کا کردار ہمیں زیادہ مضبوط بنیادوں کا حامل نظر آتا ہے۔ آنے والے ابواب میں فرداً فرداً تمام فرمانروا خواتین کے تعلیم نسواں کے فروغ میں ادبی خدمات کا تنقیدی جائزہ لیا جائے گا۔

حوالہ جات

۱۔ احمد تقی،سید۔ہندوستان کا پس منظر و پیش منظر (کراچی: انجمن ترقی اردو،۱۸۶۸ء)،ص ۳۲

۲۔ مبارک علی،ڈاکٹر،ہندوستان کی کہانی(اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن،۲۰۰۹ء)،ص ۱۶،۱۵

۳۔ پی۔سی۔جوشی،انقلاب 1857 (نئی دہلی: نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا،۱۹۷۲ء)،ص ۲۷

۴۔ احمد تقی،سید۔ہندوستان کا پس منظر و پیش منظر (کراچی: انجمن ترقی اردو،۱۸۶۸ء)،ص ۳۲

۵۔ کارل مارکس،فریڈرک اینگلز،ہندوستان کا تاریخی خاکہ مترجم احمد سلیم (تخلیقات لاہور،۲۰۰۲ء)،ص ۲۴۰

۶۔ پی۔سی۔جوشی،انقلاب 1857 (نئی دہلی: نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا،۱۹۷۲ء)،ص ۸۹

۷۔ مبارک علی،ڈاکٹر،ہندوستان کی کہانی(اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن،۲۰۰۹ء)،ص ۱۱

۸۔ نیر،ناصر عباس،لسانیات اور تنقید(اسلام آباد: پورب اکادمی،۲۰۰۹ء)،ص ۲۴

۹۔ فرانز فینن،افتادگان خاک مترجم محمد پرویز، سجاد باقر رضوی(لاہور: نگارشات لاہور،۱۹۶۹ء)،ص ۳۸

۱۰۔ ڈی۔آر۔گیڈگل،Industrial evolation of India(طبع چہارم،۱۹۴۴ء)،ص ۳۸

۱۰۔ مبارک علی،ڈاکٹر،ہندوستان کی کہانی(اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن،۲۰۰۹ء)،ص ۶۹۔۷۱

۱۱۔ مناظر احسن گیلانی،سید،پاک و ہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت،حصہ اول
(دکن: ندوۃ المصنفین،۱۹۴۲ء)،ص ۵

۱۲۔ ایضاً،ص ۵

۱۳۔ افتخار احمد صدیقی،ڈاکٹر،مولوی نذیر احمد احوال و آثار(لاہور: مجلس ترقی ادب،۱۹۱۷ء)،ص ۳۱۶

۱۴۔ گورڈن چائلڈ(Gordan childe)،تاریخ میں کیا ہوا مترجم۔۔۔(کراچی:۱۹۸۷ء)،ص ۷۱۔۷۰

۱۵۔ فہمیدہ ریاض،فیمنزم اور ہم،مرتبہ فاطمہ حسن(کراچی: وعدہ کتاب گھر،۲۰۰۵ء)،ص ۳۴

۱۶۔ سائمن دی بوار(Saimon de Bovar)،عورت مترجم یاسر جواد(لاہور: فکشن ہاؤس،۱۹۹۹ء)،ص ۱۲۵،۱۲۴

۱۷۔ شبلی احمد،ڈاکٹر،مسلمانوں کا نظام تعلیم(بک ہوم لاہور،۲۰۰۴ء)،ص ۱۸۰

۱۸۔ محمد حسن جان،شریعت محمدی اور مسلمان عورت(اسلام آباد: مدرسہ محمودیہ تحفیظ القرآن،۲۰۰۰ء)،ص ۱۱

۱۹۔ شبلی احمد،ڈاکٹر،مسلمانوں کا نظام تعلیم(بک ہوم لاہور:۲۰۰۴ء)،ص ۸۳

۲۰۔ ایضاً۔ص ۱۸۳

۲۱۔ مبارک علی،ڈاکٹر،ہندوستان کی کہانی(اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن،۲۰۰۹ء)،ص ۴۷

۲۲۔ راحت ابرار، ڈاکٹر،مسلم تعلیم نسواں کے سو سال(چلمن سے چاند تک)(دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۰ء)، ص ۱۲۱

۲۳۔ ایضاً۔ ص ۱۲۲

۲۴۔ ایضاً۔ ص ۱۲۳

۲۵۔ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر،مولوی نذیر احمد احوال و آثار (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۱)، ص ۳۱۵

۲۶۔ ایضا، ص ۳۱٦

۲۷۔ مقالات گارساں دتاسی (حصہ دوم)، ص ۴٦

۲۸۔ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، مولوی نذیر احمد احوال و آثار (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۱)، ص ۳۱۵

۲۹۔ ایضاً، ص ۳۱٦

۳۰۔ ایضاً، ص ۳۱۵

۳۱۔ نیر، ناصر عباس،لسانیات اور تنقید(اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۹ء)، ص ۲۴

۳۲۔ محمد حسین زبیری،مشاہیر کے تعلیمی نظریے (دہلی: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۵۸ء)، ص ۱۳۱

۳۳۔ رشندی دیوی، بحوالہ: زاہدہ حنا،عورت زندگی کا زنداں(کراچی: شہرزاد، ۲۰۰۴ء)، ص ۱۴۴

۳۴۔ محمد حسین زبیری،مشاہیر کے تعلیمی نظریے (دہلی: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۵۸ء)، ص ۱۲۴

۳۵۔ ایضاً۔ ص ۱۲۴

۳٦۔ ایضاً۔ ص ۷

۳۷۔ راحت ابرار، ڈاکٹر،مسلم تعلیم نسواں کے سو سال(چلمن سے چاند تک)(دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۰ء)، ص ۹

۳۸۔ اطہر صدیقی،نواب سلطان جہاں بیگم حیات و خدمات،اصغر عباس،سرسید تحریک کی نسائی جہت (نئی دہلی: فیمیل ایجوکیشن ایسوسی ایشن علی گڑھ، ۲۰۱۳ء)، ص ۳۰۴

۳۹۔ بیسنٹ اینی(Besant Anni)،Wake Up India (مدراس: ۱۹۱۳ء)، ص ۳۰

۴۰۔ راحت ابرار، ڈاکٹر، مسلم تعلیم نسواں کے سو سال (چلمن سے چاند تک)(دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، ۲۰۱۰ء)، ص ۷

۴۱۔ ایضاً، ص ۲۴

۴۲۔ ایضاً، ص ۲۷

۴۳۔ علامہ اقبال،کلیات اقبال(لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۰ء)، ص ۱۰۸

۴۴۔ حالی، مولانا الطاف حسین، حیات جاوید (لاہور؛ سیونتھ سکائی پبلیشرز، ۲۰۱۵ء)، ص ۱۵۹

۴۵۔ محمد حسین زبیری، مشاہیر کے تعلیمی نظریے (دہلی: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۵۸)، ص ۱۱۹

۴۶۔ محمد حسین زبیری، مشاہیر کے تعلیمی نظریے (دہلی: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۵۸ء)، ص ۱۲۰

۴۷۔ راحت ابرار، ڈاکٹر، مسلم تعلیم نسواں کے سو سال (چلمن سے چاند تک) (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۰ء)، ص ۱۳۳

۴۸۔ ایضاً، ص ۱۸۱

۴۹۔ اطہر صدیقی، نواب سلطان جہاں بیگم حیات و خدمات، اصغر عباس، سرسید تحریک کی نسائی جہت (نئی دہلی: فیمیل ایجوکشن ایسوسی ایشن علی گڑھ، ۲۰۱۳)، ص ۳۰۷

۵۰۔ سید تقی عابدی، ڈاکٹر، حالی فہمی (بک کارنر جہلم: س ن)، ص ۴۰۴

۵۱۔ ایضاً، ص ۴۰۴

۵۲۔ صفورا خیری، ماہنامہ عصمت، غزل یعقوب، اشاریہ ماہنامہ عصمت (کراچی: جون، جولائی، ۲۰۱۴)، ص ۱۳۔۱۴

۵۳۔ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، مولوی نذیر احمد احوال و آثار (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۱)، ص ۳۱۹

۵۴۔ ایضاً۔ ص ۳۱۶

۵۵۔ ایضاً۔ ص ۳۲۶

۵۶۔ ایضاً۔ ص ۳۲۸

۵۷۔ ایضاً۔ ص ۳۲۹

۵۸۔ صغیر ابراہیم، تہذیب الاخلاق، محمد خالد اختر، ڈپٹی نذیر احمد اور اصلاح معاشرہ، جلد: ۳۵، شمارہ ۱۳، (دسمبر ۲۰۱۶)، ص ۸۴

۵۹۔ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، مولوی نذیر احمد احوال و آثار (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۱)، ص ۳۳۰

۶۱۔ ایضاً، ص ۳۳۰۔۳۳۱

۶۲۔ ایضاً۔ ص ۳۳۱

۶۳۔ صغیر ابراہیم، تہذیب الاخلاق، محمد خالد اختر، ڈپٹی نذیر احمداور اصلاح معاشرہ، جلد: ۳۵، شمارہ ۱۳، (دسمبر ۲۰۱۶)، ص ۸۲

۶۴۔ ایضاً۔ ص ۸۲

۶۵۔ ایضاً۔ص ۸۲

۶۶۔ ایضاً۔ص ۸۱

۶۷۔ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، مولوی نذیر احمد احوال و آثار (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۱)، ص ۳۴۲

۶۸۔ محمد حسین زبیری، مشاہیر کے تعلیمی نظریے (دہلی: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۵۸)، ص ۱۲۲

۶۹۔ انیس ناگی، ڈپٹی نذیر احمد کی ناول نگاری (لاہور: فیروز سنز، ۱۹۸۸)، ص ۸۲

۷۰۔ راحت ابرار، ڈاکٹر، مسلم تعلیم نسواں کے سو سال (چلمن سے چاند تک) (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۰ء)، ص ۵

۷۱۔ طاہر مسعود، ڈاکٹر، اردو صحافت انیسویں صدی میں (کراچی: فضلی سنز، س ن)، ص ۱۰۷۳

۷۲۔ ایضاً۔ص ۱۰۷۴

۷۳۔ اطہر صدیقی، نواب سلطان جہاں بیگم حیات و خدمات، اصغر عباس، سرسید تحریک کی نسائی جہت (نئی دہلی: فیمیل ایجوکشن ایسوسی ایشن علی گڑھ، ۲۰۱۳)، ص ۱۴۲

۷۴۔ اطہر صدیقی، نواب سلطان جہاں بیگم حیات و خدمات، اصغر عباس، سرسید تحریک کی نسائی جہت (نئی دہلی: فیمیل ایجوکشن ایسوسی ایشن علی گڑھ، ۲۰۱۳)، ص ۱۴۲

۷۵۔ ایضاً۔ص ۱۴۲

۷۶۔ محمد امین زبیری، بیگمات بھوپال (بھوپال: مطبع ریاست سلطانی، ۱۹۸۱)، ص ۸۔۹

۷۷۔ ایضاً، ص ۱۴۔۱۶

۷۸۔ چشتی، مولانا وھاج الدین، بیگمات بھوپال (کراچی: قدسیہ پرنٹرز، ۱۹۸۱)، ص ۲۵

۷۹۔ محمد امین زبیری، بیگمات بھوپال (بھوپال: مطبع ریاست سلطانی، ۱۹۱۸)، ص ۳۴

۸۰۔ چشتی، مولانا وھاج الدین، بیگمات بھوپال (کراچی: قدسیہ پرنٹرز، ۱۹۸۱ء)، ص ۲۷

۸۱۔ ایضاً۔ص ۲۹

۸۲۔ ایضاً۔ص ۳۱

۸۳۔ محمد امین زبیری، بیگمات بھوپال (بھوپال: مطبع ریاست سلطانی، ۱۹۱۸)، ص ۲۴

۸۴۔ طیبہ بی، تاریخ فرمارو ایان بھوپال (بھوپال: بھوپال بک ہاؤس۔۱۹۷۷)، ص ۳۰

۸۵۔ چشتی، مولانا وھاج الدین، بیگمات بھوپال (کراچی: قدسیہ پرنٹرز، ۱۹۸۱)، ص ۳۳

۸۶۔ ایضاً۔ص ۳۴

۸۷۔ رضیہ حامد،ڈاکٹر،نواب سلطان جہاں بیگم(بھوپال: باب العلم پبلیکشنز،۲۰۱۱ء)،ص ۳۲

۸۸۔ محمد امین زبیری،بیگمات بھوپال(بھوپال: مطبع ریاست سلطانی،۱۹۱۸ء)،ص ۳۴

۸۹۔ ایضاً۔ص ۳۴

۹۰۔ چشتی،مولاناوھاج الدین،بیگمات بھوپال(کراچی: قدسیہ پرنٹرز،۱۹۸۱ء)،ص ۳۵

۹۱۔ رضیہ حامد،ڈاکٹر،نواب سلطان جہاں بیگم(بھوپال: باب العلم پبلیکشنز،۲۰۱۱ء)،ص ۳۹

۹۲۔ چشتی،مولاناوھاج الدین،بیگمات بھوپال(کراچی: قدسیہ پرنٹرز،۱۹۸۱ء)،ص ۴۸

۹۳۔ ایضاً۔ص ۴۸

۹۴۔ رضیہ حامد،ڈاکٹر،نواب سلطان جہاں بیگم(بھوپال: باب العلم پبلیکشنز،۲۰۱۱ء)،ص ۴۰

۹۵۔ ایضاً۔ص ۴۲

۹۶۔ ایضاً۔ص ۴۳

۹۷۔ ایضاً۔ص ۴۶

۹۸۔ محمد امین زبیری،بیگمات بھوپال(بھوپال: مطبع ریاست سلطانی،۱۹۱۸)،ص ۷۷

۹۹۔ رضیہ حامد،ڈاکٹر،نواب سلطان جہاں بیگم(بھوپال: باب العلم پبلیکشنز،۲۰۱۱ء)،ص ۴۸

۱۰۰۔ ایضا،ص ۴۹

۱۰۱۔ محمد امین زبیری، بیگمات بھوپال (بھوپال: مطبع ریاست سلطانی،۱۹۱۸)،ص ۶۰۔۶۱

۱۰۲۔ ایضاً۔ص ۶۳۔۶۴

۱۰۳۔ ایضاً۔ص ۵۴

۱۰۴۔ رضیہ حامد،ڈاکٹر،نواب سلطان جہاں بیگم (بھوپال: باب العلم پبلیکشنز،۲۰۱۱ء)،ص ۵۹

۱۰۵۔ محمد امین زبیری، بیگمات بھوپال(بھوپال: مطبع ریاست سلطانی،۱۹۱۸ء)،ص ۸۷

۱۰۶۔ جاوید یزدانی، تعلیم نسواں: نواب سلطان جہاں بیگم، اطہر صدیقی، نواب سلطان جہاں بیگم حیات و خدمات (نئی دہلی: فیمیل ایجوکشن ایسوسی ایشن علی گڑھ،۲۰۱۳ء)،ص ۱۲۶

۱۰۷۔ عطیہ فیضی، سرکار عالیہ، صغیر ابراہیم، تہذیب الاخلاق، جلد: ۳۵، شمارہ، ۱۳،(دسمبر ۲۰۱۶ء)،ص ۱۲۶

۱۰۸۔ سیما صغیر،، محسن نسواں: نواب سلطان جہاں بیگم، صغیر ابراہیم، تہذیب الاخلاق، جلد: ۳۵، شمارہ ۱۳(دسمبر ۲۰۱۶ء)،ص ۲۶

۱۰۹۔ رضیہ حامد،ڈاکٹر،نواب سلطان جہاں بیگم (بھوپال: باب العلم پبلیکشنز،۲۰۱۱ء)،ص ۲۹۷

باب دوم

باب دوم

نواب سکندر جہاں بیگم کی تصانیف میں فروغ تعلیم نسواں کی کاوشیں: ایک مطالعہ

انگریزوں نے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر (۱۸۳۷۔۱۸۵۷ء) کو قید کیا اور دہلی پر قابض ہو گئے کیونکہ اس وقت برصغیر پاک و ہند انگریزوں کی مضبوط گرفت میں تھا۔ انگریزوں نے اطاعت نہ کرنے کی پاداش میں مسلم طبقہ پر ہیبت ناک ظلم ڈھائے بلا وجہ ہزاروں مسلمانوں کو سر عام سڑکوں پر جلایا اور پھانسی دی تھی۔ اسی ہولناک دور میں بھوپال سے ایک عظیم اور معتبر شخصیت دہلی کی جانب آئی جس نے مظلوم عوام کے حق کے لیے آواز بلند کی کہ انگریزوں بھی ان کے پرزور دلائل سے قائل ہو گئے تھے۔ یہ شاندار اور قابل شخصیت نواب سکندر بیگم (۱۸۱۸۔۱۸۶۸ء) تھی۔ بقول نواب سلطان جہاں بیگم "تاریخ بھوپال میں نواب سکندر جہاں بیگم کا وہی مقام ہے جو تاریخ ہند میں شہنشاہ اکبر اعظم کو حاصل ہے۔"(۱)

نواب سکندر بیگم کی ولادت ۱۳ اگست ۱۸۱۸ء کو ہوئی۔ یہ پہلی خاتون تھیں جن کے نام کے ساتھ (جہاں) کا لقب لگایا گیا اور عرفیت آپ کی موتی بی بی تھی۔ شیر خواری میں ان کے والد انتقال فرما گئے تھے۔ نواب سکندر جہاں بیگم نے اپنی مدبر اور شفیق ماں (قدسیہ بیگم) کی آغوش میں تربیت پائی اور ساتھ ہی ساتھ اس زمانے کے مشہور و معروف علما اور باکمال اساتذہ سے تعلیم حاصل کی علاوہ ازیں فنون سپہ گری میں بھی مہارت حاصل کی تھی۔ نواب سکندر جہاں بیگم کی تعلیم و تربیت کے لیے تمام علوم و فنون کے الگ الگ اساتذہ مقرر تھے۔ علاوہ ازیں انہوں نے خانہ داری کے تعلیمی مراحل اپنی والدہ کے معتمد وزرا حکیم شہزاد مسیح، میاں کرم محمد خاں اور راجہ خوشوقت رائے کی نگرانی میں طے کیے تھے۔ حصول علم کے لیے اس دور میں مخصوص نصاب مدارس میں رائج رہا جسے حاصل کرنا ہر کسی کے بس میں نہیں تھا صرف قابل اور ذہین طلبہ ہی یہ تعلیم حاصل کر پاتے تھے۔ اس دور میں تعلیم نسواں کا رواج بھی نہیں تھا صرف چند گھرانوں میں تعلیم نسواں پر توجہ دی گئی جہاں لڑکیاں مذہبی تعلیم کے ساتھ فارسی زبان و ادب کی تعلیم بھی حاصل کرتی تھیں۔ فارسی اس وقت دفتری زبان تھی لہذا نواب سکندر جہاں بیگم نے شاہی خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے تمام

علوم وفنون میں مہارت حاصل کی۔ "سلطان شاہ"نواب سکندر جہاں بیگم کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''سکندر بیگم بڑی بہادر اور جری خاتون تھیں۔ شیر کا شکار ان کا محبوب شوق تھا۔ پولو کھیلنا بھی انہیں پسند تھا جبکہ شمشیر زنی میں بھی انہیں مہارت حاصل تھی۔''(۲)

مذہبی تعلیم کی ابتداء قرآن شریف سے کی گئی اور علمی وذہنی فہم وفراست واستعداد میں اضافہ ہوا لہذا اس وقت پھر قرآن پاک کا ترجمہ پڑھایا گیا تھا۔ نواب سکندر جہاں بیگم نے قرآن کے ترجمہ و تفسیر پر خصوصی توجہ صرف کی تھی جس کا اندازہ ان کی تقریر و تحریر میں آیات قرآنی کے برجستہ حوالوں سے ہوتا ہے۔ نواب سکندر بیگم کو خوش خطی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ نواب سکندر جہاں بیگم کی تعلیم و تربیت اور ریاستی امور کے حوالے سے فہم و فراست کے متعلق نواب قدسیہ گوہر بیگم ایک خط میں نواب گورنر جنرل بہادر کو تحریر کرتی ہیں کہ

> میں نے سکندر بیگم کی تعلیم میں بڑی کوشش کی ہے۔ اور وہ عقل وفراست رکھتی ہیں اس لیے انہیں کو بغیر کسی مداخلت کے ریاست سپرد کی جائے۔(۳)

مندرجہ بالا مقصد کے حصول کے لیے خصوصی توجہ تعلیم پر صرف کی گئی تھی۔ نواب گوہر قدسیہ بیگم اپنی اکلوتی بیٹی سکندر بیگم کو مسند ریاست پر فائز دیکھنا چاہتی تھیں۔ ان کو نواب سکندر جہاں بیگم سے بہت سی توقعات تھیں۔ نواب سکندر جہاں بیگم ابتداً پردہ میں رہتیں لیکن جب ان کی والدہ نے پردہ ترک کیا تو ان کو بھی ترک پردہ کا حکم دیا بقول نواب سلطان جہاں بیگم

> معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں یہ خیال راسخ ہو گیا تھا کہ پردہ کے ساتھ انتظام ریاست دشوار ہے اور خصوصاً جب کہ شرع نے جس قدر حکم دیا ہے اس سے زیادہ پردہ ترک کر دیا جائے اور یہی وجہ ہوئی کہ انہوں نے نواب سکندر بیگم کو بھی ترک پردہ پر مجبور کیا کیونکہ ان کے دل میں یہ یقین جاگزیں تھا کہ آئندہ زمانہ میں ان کی بیٹی اس ملک پر حکمرانی کرے گی۔(۴)

نواب سکندر جہاں بیگم اپنے والد کی وصیت کی رو سے جو اس زمانے کا تقاضا تھی یا راسخ عقیدہ کہ عورت حکومتی امور کو احسن طریقے سے انجام دینے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہے۔ اسی نظریے کی وجہ سے نواب سکندر جہاں بیگم اپنے موروثی حق حکومت سے محروم کر دی گئی تھیں۔ اور یہ حکم صادر کر دیا گیا کہ ان کا شوہر حکمران ریاست ہوگا۔ نواب سکندر جہاں بیگم کی شیر خوارگی ہی میں نواب منیر محمد خاں سے نسبت کر دی گئی تھی جو ایک عرصہ کے بعد

کچھ مخالفتوں کی بدولت ختم ہو گئی تھی۔ بعدازاں نواب جہانگیر محمد خاں سے نسبت قرار پائی اور بالا خر انہیں کے ساتھ نکاح ہوا۔ نواب سکندر جہاں بیگم کی غیر معمولی ذہانت اور خداداد قابلیت کے جوہر سب پر عیاں ہو چکے تھے۔ عقد کے زمانے تک نواب سکندر بیگم تمام تعلیم و تربیت حاصل کر چکی تھیں۔ نواب سکندر بیگم کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ وارثِ بھوپال ہونے کیوجہ سے سے وہ مملکت وریاست بھوپال کی صحیح معنوں میں حکمران کہلانے کی حقدار ہیں۔ ان کے شوہر کو ریاست کے تخت پر بٹھانا ناانصافی سمجھتی تھیں۔ اپنے حقوق کے حصول کے لیے ان کے دل میں جذبات کا ایک سمندر اُٹھا تھا۔ نواب قدسیہ بیگم کی شفقت و محبت نے نواب سکندر بیگم کے جذبات کو مزید تقویت عطا کی تھی۔ کسی ملک کی خوشحالی اور رعایا کی زندگی کے تمام معاملات اسی حق سے تعلق رکھتے تھے۔ نواب سکندر جہاں بیگم اور جہانگیر محمد خاں کے رشتہ ازدواج کے مسائل اور حقوق سے دستبرداری بہت پیچیدہ معاملات تھے کیونکہ مزاجوں کے اختلافات نے خاندانی پیچیدگیوں اور حالات نے بہت سنگینی پیدا کر دی تھی۔ نواب جہانگیر محمد خاں سے نکاح ہوتے ہی مستقبل کا خوفناک و ہولناک منظر وقت سے پہلے ہی اپنا عکس ظاہر کرنے لگا تھا۔ وہ تمام خدشات جو نکاح سے قبل محسوس ہو رہے تھے بعدازاں حقیقت کا روپ دھارنے لگے تھے۔ بقول طیبہ بی بی

> نواب جہانگیر محمد خاں کے دل میں خود مختارانہ حکومت کرنے کا خیال جگہ پکڑ گیا تھا۔ انہوں نے کوشش کی جس قدر جلد ممکن ہو اختیارات حاصل کر لیے جائیں لیکن ازروئے معاہدہ یہ اختیارات سکندر بیگم سے شادی پر موقوف تھے۔ (۴)

مندرجہ بالا اقتباس کی رو سے دیکھا جائے تو اس وقت نواب سکندر بیگم ان تمام حالات سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتی تھیں مگر صورتحال نے اس قدر شدت اختیار کر لی کہ نوبت قتل کی سازشوں، خانہ جنگیوں اور معرکہ آرائیوں تک جا پہنچی تھی۔ ایجنسی، رزیڈنسی اور "گورنمنٹ آف انڈیا" کو بھی ان معاملات میں دخل دینے کی ضرورت پڑی۔ نواب جہانگیر محمد خاں گورنمنٹ کے فیصلہ اور مدد سے مسند نشیں ہوئے۔ حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے نواب سکندر بیگم اور نواب جہانگیر میں باہمی صلح صفائی کرادی گئی اور نواب سکندر بیگم کا قیام شوہر کے محل میں ہوا۔ نواب صاحب کی جانب سے پردہ میں رہنے پر کیے گئے پر زور اصرار کو بھی منظور کر لیا گیا تھا۔ لیکن یہاں یہ واقعہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ نواب نظر محمد خاں کے انتقال کے بعد جب منیر محمد خاں کے ساتھ رشتہ طے ہوا تو نواب قدسیہ اس عقد کے خلاف تھیں۔ انہوں نے ارکان ریاست کی رائے سے مجبور ہو کر اس رشتہ کے لیے منظوری دے دی اور یہ بھی ایک

بڑی وجہ اس رنج وعداوت کی تھی۔ان حالات میں نواب سکندر بیگم اپنے شوہر کے محل میں رہیں مگر ایک دن نواب سکندر جہاں بیگم سورہیں تھیں تو جہانگیر محمد خان نے ہاتھ پر تلوار ماری، مگر وار پورا نہ پڑا۔نواب سکندر بیگم نے نہایت ضبط واستقلال سے کام لیا تھا۔نواب جہانگیر محمد خاں وار کرنے کے بعد ہی محل سے چلے گئے نواب سکندر بیگم ان حالات میں فوراً اپنی والدہ کے پاس چلی آئیں اور ماں اور بیٹی دونوں نے شہر کی سکونت ترک کر کے قلعہ اسلام نگر میں اقامت اختیار کی تھی۔اس قاتلانہ حملے کی جب تحقیقات کروائی گئیں تو معلوم ہوا بقول نواب سلطان جہاں بیگم

> نواب گورنر جنرل نے نواب قدسیہ بیگم کی تائید کی کہ جو زخم نواب سکندر بیگم کو لگایا ہے وہ بے پردگی کے سبب سے ہے اور ہمارے نزدیک بے شک یہ ایک ظلم ہے لیکن مسلمانوں کے نزدیک یہ حرکت ظلم میں داخل نہیں ہے۔اس پر نواب سکندر بیگم نے کہا کہ "پردہ کی حالت میں مجھے زخمی کیا ہے نہ کہ بے پردگی میں۔نواب قدسیہ بیگم نے کہا کہ "نکاح سے قبل سکندر بیگم بے پردہ تھیں۔اگر نواب صاحب میں غیرت تھی تو کیوں نکاح کی درخواست کی۔۔۔(٦)

مندرجہ بالا انہی ناگفتہ بہ حالات میں ٦ جمادی الاول ۱۲۹۴ھ میں نواب شاہجہاں بیگم کی ولادت ہوئی اور نواب سکندر بیگم ماں نواب قدسیہ بیگم کے پاس مقیم رہیں تھیں۔یہاں تک کہ ۲۰ ذیقعد ۱۲۶۰ھ کو ۲۶ برس کی عمر میں نواب جہانگیر محمد خاں کا انتقال ہوگیا۔انتقال سے قبل نواب صاحب نے ایک وصیت میں اپنے بیٹے دستگیر محمد خاں کو جو حرم سے تھے اپنا جانشین بنایا لیکن اس وصیت نامہ پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی اور نواب شاہجہاں بیگم ان کی جائز وارث قرار پائیں۔ان کی جانشینی کے وقت بھی وہی شرط رکھی گئی جو نواب سکندر بیگم کی جانشینی کے وقت تھی یعنی ان کے عقد کے بعد ان کے شوہر کو حکومت تفویض کی جائے گی۔چونکہ نواب شاہجہاں بیگم کم عمر تھیں اس کے لیے نواب فوجدار محمد خاں جو نواب سکندر بیگم کے ماموں اور نواب غوث محمد خاں کی بیٹے تھے مختار ریاست کیے گئے تھے۔نواب شاہجہاں بیگم کی تعلیم وتربیت اسی طرز پر کی گئی جس پر نواب سکندر بیگم کی گئی تھی۔نواب فوجدار ایک ذہین اور تیز فہم آدمی تھے۔انہوں نے حکومت ہاتھ لیتے ہی کچھ اس قسم کی کاروائیاں کیں جن سے قدیم ملازمین ریاست میں رنجشیں پیدا ہوئی اور ریاست کا بھی خطرہ ہوگیا۔نواب سکندر بیگم اس فیصلہ پر رضامند نہ ہوئیں وہ ریاست کی سلامتی کے لیے خود مختار حکمران ہونا چاہتی تھیں اور اس مقصد کے تکمیل کے لیے انہوں نے ایسے ایسے دلائل پیش کیے جن کے متعلق اس زمانہ میں ایک مشہور انگریزی اخبار نے لکھا کہ

> نواب سکندر بیگم عوام و خواص کے سامنے اپنے استحقاق کو عقل سلیم کے ساتھ دلیلوں اور حجتوں سے ثابت کرتی ہیں ایسے بہت کم آدمی ہوں گے جو ان کی طرح سے خوبی کے ساتھ اپنے دلائل کو ثابت کر سکتے ہیں۔(۷)

نواب سکندر بیگم نے فوجدار محمد خاں کے مقابلہ میں ایجنسی سے لیکر گورنر جنرل تک نعرہ احتجاج بلند کیا اور نہ صرف یہ کہ استحقاقِ خاندان و نسل بلکہ قابلیت کی بنا پر اپنے حقوق پر زور انداز میں ثابت کئے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انتظام ریاست میں مداخلت کرنے لگیں تھیں۔ نواب سکندر جہاں بیگم کی خواہش تھی کہ وہ بلاشرکت غیر مختار ریاست مقرر کی جائیں۔ کینگھم صاحب (J.D.Cunningham) نے نواب سکندر بیگم کی قابلیتوں کو دیکھتے ہوئے فیصلہ کیا اور فوجدار محمد خاں کو مسند ریاست سے ہٹادیا گیا اور یوں نواب سکندر بیگم مختار ریاست کی گئیں۔ ۱۲۶۳ھ کو نواب سکندر بیگم مختار ریاست اور نواب شاہجہاں بیگم کو ولی عہد ریاست مقرر کرنے کی باقاعدہ رسمیں ادا ہوئیں۔ اس موقع پر شعرا نے بڑے بڑے فصیح و بلیغ قصائد پیش کیے۔ نواب سکندر بیگم نے تقریباً ۲۴ سال حکومت کی تھی۔ بقول طیبہ بی بی

> جہانگیر خاں کے سات سالہ دور میں بھوپال کی قدیم اور پاکیزہ تہذیب جو ماجی ممولا، زینت بیگم اور قدسیہ بیگم جیسی اولوالعزم مسلم خواتین سے قائم ہوئی تھی بالکل بدل چکی تھی اور اس کی جگہ جدید تہذیب جو انگریز کے بڑھتے ہوئے اثرات سے ہندوستان میں پھیل رہی تھی، بھوپال میں بھی اثر انداز ہو کر اخلاقی و مذہبی کردار کو ملیامیٹ کر رہی تھی۔ بھوپال کے سادہ لوح لوگوں میں عیش پرستی، نفاست، نزاکت، غفلت و سستی کے جراثیم پھیلا کر ان کو فضول خرچی اور عیاشی میں مبتلا کر کے ان کے جوہر ختم کر دیئے۔(۸)

نواب سکندر بیگم کو حکمران بننے کے بعد اپنی بیدار مغزی، قابلیت اور فرمانروائی کے اوصاف کو نمایاں کرنے کا موقع ملا، انہوں نے بہ نفس نفیس شب و روز محنت شاقہ کی اور ملکی انتظام پر بھرپور توجہ فرمائی۔ سب سے پہلے اس قرض کی ادائیگی سے نجات پانے کی کوشش کی جو نواب جہانگیر محمد خاں اور فوجدار محمد خاں کے زمانہ ریاست میں ہو گیا تھا اس کی مقدار ۲۴ لاکھ کے قریب تھی جس پر سود کا کاروبار تھا۔ علاوہ ازیں ملک کے مختلف حصے جو سرسبز زرخیز تھے مہاجنوں کے پاس تھے۔ اس زمانہ میں ریاست کی آمدنی کل گیارہ لاکھ سالانہ تھی۔

نواب سکندر بیگم کی اصلاحات میں فوج کی اصلاح پہلے تھی۔ پہلے تیموری حکومت کی طرز پر یہاں بھی فوجی افسروں کی جاگیریں مقرر تھیں۔ ہر افسر اپنی جاگیر میں سے فوجی ملازم رکھتا اور تنخواہ ادا کرتا تھا۔ اس طریقہ میں خرابی یہ تھی کہ ہر وقت ان فوجی افسروں سے خطرہ لاحق رہتا تھا۔ نواب سکندر بیگم نے اس طریقہ کو توڑا فوجی افسران کی تنخواہیں جاگیر کے بجائے براہ راست خزانہ سے ادا کرنے کا طریقہ جاری کیا۔ فوج کی تربیت اور قواعد جنگ کی تعلیم اور توپ خانہ کی درستی و تنظیم کے متعلق خاص توجہ صرف کی تھی۔ ہفتے میں ایک دن فوج کے لیے دربار منعقد کرتیں تھیں جس کا نام "دربار شنبہ" تھا۔ اس میں تمام فوجی چاہے وہ افسر ہو یا سپاہی بیگم صاحبہ سے براہ راست ملاقات کر کے اپنے مسائل بتا سکتا تھا۔ بقول طیبہ بی بی

> انگریزی اصول پر فوج کے لئے قواعد جنگ کی تعلیم کا انتظام کیا اور اس کے لیے تربیت یافتہ دیسی فوجی افسر مقرر کیے۔ کمانڈنگ افسر فوج کنجنٹ بھوپال نے لکھا بھوپال سے جو سپاہی آتے ہیں وہ بہتر طور پر قواعد کرتے ہیں۔(۹)

یوں اگر دیکھا جائے تو فوجی اصلاحات کے نتیجے میں فوج تربیت یافتہ اور مطیع و فرماں بردار ہو گئی تھی۔ توپ خانہ کی مناسب تنظیم کی اور سواروں کی وردیوں کے رنگ سرخ، سبز، سیاہ مقرر کیے تھے۔ اسی مناسبت سے "رسالہ سرخ اور سیاہ وردی" مشہور ہوئے۔ فوج کے لئے علیحدہ فوجی ہسپتال بنوائے۔ پولیس کو باقاعدہ بنایا۔ ریاست بھوپال کے لئے الگ سے شناختی جھنڈا بنایا گیا۔ اس کی بناوٹ میں نواب سکندر جہاں بیگم نے از خود دلچسپی کا مظاہرہ کیا جیسا کہ ہمیں اس اقتباس میں نظر آتا ہے کہ

> بھوپال کے جھنڈے پر ریاست کی تصویر بنائی گئی۔ ان جھنڈوں پر جو جنگی رسالوں کے لیے تھے بے ادبی ہونے کے خیال سے آیت لکھنے کی ممانعت کی۔ کیوں کہ ہاتھی کے اوپر سوار لوگوں سے جھنڈا نیچے رہتا تھا البتہ ہاتھی کے اوپر والے جھنڈوں پر آیت (نصر من) پوری لکھی جاتی تھی۔ جھنڈوں پر دو تلواروں کی شبیہ اور لفظ نظر یعنی اپنے والد کے نام کا مخفف لکھنے کا حکم دیا۔(۱۰)

جب (۱۸۵۷ء) میں نعرہ غدر بلند ہوا۔ انگریزوں کا عمل دخل بڑھا تو برطانیہ کے اسلحہ خانہ سے نئے قسم کے کارتوس ہندوستان آئے۔ جن کا اوپر کا خول دانتوں سے کاٹ کر کارتوس بندوق کی نال میں ڈالا جاتا تھا۔ کارتوس تمام فوجی چھاونیوں میں تقسیم ہوئے۔ اس وقت تمام ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط ہو چکا تھا۔ بادشاہ کی بادشاہی صرف لال

قلعہ دہلی کے اندر تک محدود تھی۔ فوج میں ہندوستانی ہندو مسلمان ملازم تھے۔ کارتوس کے بیرونی خول کا کاغذ چکنا ہونے کے سبب ہندوؤں کو شبہ ہوا کہ شاید یہ کاغذ گائے کی چربی سے تیار ہوا ہے۔ مسلمانوں کو یہ شک ہوا کہ سور کی چربی سے تیار ہوا ہے۔ لہٰذا دونوں مذاہب کے سپاہیوں نے یہ کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر دیا اور انگریز حکومت سے باغی ہو گئے اور ہر جگہ انگریزوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ گوالیار اور اندور کے والیان نے انگریزوں کی مدد سے پہلو تہی کی اور ان مقامات پر کثیر تعداد میں انگریز مارے گئے۔ اس تناظر میں طیبہ بی بی لکھتی ہیں کہ

> بغاوت کرنے والوں نے اس ہنگامہ کو مذہب کے نام پر برپا کیا اس موقع پر نواب سکندر بیگم نے اولاً اس خیال سے کہ غدر مذہب کے خلاف اور بجائے خود مذہب کی خلاف ورزی ہے۔ ثانیاً جو معاہدہ بھوپال اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان ہوا تھا اس کی پابندی بھی ضروری تھی۔ ثالثاً آل اندیشی کا بھی یہی تقاضا تھا کہ اپنے علاقہ کو آئندہ کے فتنہ و فساد سے بچانے کے لئے انگریزوں کو پوری پوری مدد دی جائے۔(۱۱)

نواب سکندر بیگم نے نہایت دلیری اور جانفشانی کے ساتھ اپنے ملک کو اس کے اثرات سے محفوظ رکھا اور انگریزوں کی پوری مدد کی۔ اس وقت رزیڈنسی اندور سے چھاؤنی سیہور تک نواب سکندر بیگم کی امداد رزیڈنٹ اور پولیٹیکل ایجنٹ اور دوسرے انگریزوں کی جانوں کے محافظ تھی۔ اس ہنگامہ میں نواب سکندر بیگم کو ہر روز ایک نئی مشکل کا سامنا تھا۔ طیبہ بی بی نے یہاں ذوق کے مصرعہ کا حوالہ دیا ہے کہ

ے سنتے ہیں بھوپال میں شمشیر چل کے رہ گئی

کبھی بھوپال کی فوج کی طرف سے نئے نئے مطالبات کیے جاتے اور کبھی کنجنٹ کی فوج میں بے چینی ہو جاتی تھی۔ اور ہر لحہ طبعیتوں میں ہیجان برپا ہوتا تھا، غرض اشتعال انگیز حالات و واقعات یکے بعد دیگرے رونما ہوتے تھے مگر نواب سکندر بیگم کی فہم و فراست اور ذہانت نے ان مشکلوں کا سدباب آن کی آن میں کر دیا تھا۔ مختلف مہمات پر افواج کو بھیجتی تھیں۔ انگریزی فوجوں کے لئے رسد وغیرہ کی فراہمی، امن وامان کے انتظام کا انحصار صرف انہی کی بیدار مغزی پر تھا۔ اس موقع پر انہوں نے اپنی رعایا کا شکر بجالایا بقول نواب سلطان جہاں بیگم

> مین اس موقع پر اپنے ملک کے اون بہادرون کو، جنھوں نے ایام غدر ایسی بے بہا خدمات کیں فراموش نہیں کر سکتی، اور نہایت فخر کے ساتھ اوس عزت میں

> شریک کرتی ہوں جو سرکار نشین کو ہوئی،اور مجھے اس امر پر افتخار ہے کہ جس طرح
> مین گورنمنٹ برطانیہ کی وفادار،اور خیر خواہ رئیسہ کی جانشین ہون۔اوس طرح
> میرے ملک کے باشندے۔۔۔(۱۳)

غدر کے بعد جب سلطنت ہند ملکہ معظمہ وکٹوریہ کی شاندار حکومت سے متعلق ہو گئی تو نواب سکندر بیگم نے اپنے حقوق وراثت کے لیے پھر جدوجہد کی تھی۔مسند ریاست کی اصل حقدار تھیں کیونکہ وہ نواب نظر محمد خاں کی بیٹی تھیں۔مگر ان کے حوصلوں کو ناکامی پست نہ کر سکی۔شوہر کے انتقال کے بعد بطور مختار ریاست کے طور پر تو فائز رہیں مگر حقوق وراثت کے حصول میں بھی کوشش کرتی رہی تھیں۔ان دونوں کی ہمت اور عزم و حوصلہ کو اس وقت بہت تقویت نصیب ہوئی۔جب ہندوستان کی سلطنت کا براہ راست تعلق ملکہ وکٹوریہ سے طے ہوا۔نواب سکندر بیگم کے پاس بہترین موقع تھا کہ عورت ہونے کے باوجود اپنی بہترین انتظامی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ریاست بھوپال کو ترقی دی۔ملکہ وکٹوریہ جو کہ بذات خود عورت تھیں ان کے سامنے جب نواب سکندر بیگم نے حق مسند ریاست کے متعلق جاندار دلائل پیش کیے تو وہ ان کے استحقاق اور قابلیت کی معترف ہوئیں۔نواب قدسیہ سکندر بیگم نے ریاست کے حصول کے لیے ہر ممکن کوشش کی اگرچہ مسلسل ناکامی کا سامنا ہوا اور یکم مئی ۱۸۶۰ء بمطابق ۱۲۷۶ھ کو فرمانروائے بھوپال قرار دی گئیں۔اور اس طرح ۴۳ سال کی عمر میں ۱۳ سال مختار ریاست رہنے کے بعد اپنے باپ کی جانشین ہو گئیں۔

زیر نظر تمام مسائل اور فسادات کو مد نظر رکھتے ہوئے نواب سکندر بیگم نے اپنی بیٹی نواب شاہجہاں بیگم کا نکاح کرنے سے قبل طے کر لیا تھا کہ ان کے شوہر کو اختیارات حکومت نہیں تفویض کیے جائیں گے۔بلکہ وہ خود آزادانہ حکومت کریں گے۔اور بلاشبہ خاندان ریاست جہاں مناسب ہو گا شادی کی جائے گی۔یہ دونوں مرحلے جو ماضی میں تمام فسادات کا سبب بنے تھے۔اور جن سے مستقبل میں بھی اندیشہ تھا انہوں نے نہایت قابل تعریف سیاسی حکمت عملی کے ساتھ طے کی گویا ان شرائط سے عورت کے وجود کو جسد روح تسلیم کرنے کا جو مضبوط خیال تھا اس کو بڑی محنت سے ختم کیا۔

نواب سکندر جہاں بیگم نے اپنی اکلوتی بیٹی کی مسند ریاست کی تقریبات نہایت پر جوش طریقے سے انجام دیں تھیں۔جمادی الاول ۱۲۶۶ھ میں نواب شاہجہاں بیگم کے نشرہ کی تقریب ہوئی جس کا سلسلہ کئی برس جاری رہا تھا۔کئی

لاکھ روپیہ اس تقریب میں صرف ہوئے تھے۔ان ستر دنوں میں بھوپال میں ہر روز روز عید اور ہر شب شب برات کا عالم تھا۔نواب سکندر بیگم نے اگرچہ صرف درسی کتابوں کی تعلیم پائی تھی لیکن خداداصلاحیتوں کی بھی مالک تھیں۔وہ نہایت حاضر جواب تھیں اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ ذرا سی دیر میں ان کی تدبیر سے حل ہو جاتا تھابقول طیبہ بی بی

> سکندر بیگم فطرتاً امن دوست، صلح پسند تھیں۔انہوں نے بھوپال اور اہل بھوپال کی اصلاح کو اپنی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد قرار دیا تھا۔اس لئے انہوں نے کسی مشکل کی پرواہ نہ کی اور خدا کی مدد اور اپنی ہمت پر بھروسہ کر کے ان تمام روکاوٹوں اور مشکلات پر فتح پائی جو ان کی راہ میں حائل تھیں۔(۱۴)

مندرجہ بالا اقتباس کی ذیل میں دیکھا جائے تو وہ فیاض طبع تھیں۔ایک طرف انہوں نے ملک کے ایک ایک مزارعے کو اپنی آنکھ سے دیکھا اس کے لگان اور پیداوار کی جانچ کی،دوسری طرف انہوں نے مستحقین کو بڑی بڑی بیش قیمت جاگیریں بھی عطا کیں تھیں۔اس حوالے سے نواب سلطان جہاں بیگم تزک سلطانی،تاج الاقبال میں لکھتی ہیں کہ

> مجھے خوب یاد ہے کہ میرے بچپن مین جب کبھی وہ نصیحت فرماتین تو اون مین سب سے پہلی نصیحت جو نہایت موثر طریقہ پر ہوتی یہ کی جاتی "کاشت کار ہماری اصل پونجی ہین" یہ سب انہین غریب لوگوں کی مشقت اور محنت و عرق ریزی کی بدولت ہے کہ ہم حکومت کرتے ہیں۔۔۔جب تم مسند ریاست پر بیٹھنا تب اوس ناتواں، مگر سب سے زیادہ قیمتی اور سفید گروہ کی فلاح کو اپنا بہترین اور مقدم فرض سمجھنا۔(۱۵)

نواب سکندر بیگم نے زراعت پیشہ رعایا کو سود خوروں کے ہاتھوں سے نجات دی تھی۔شہر کی آراستگی پر توجہ کی اور عالی شان عمارات بنائی تھیں۔ملک کی جغرافیائی تقسیم کر کے عہدیداروں کو کام متعین کیے اور نو سال کے عرصہ میں دس مرتبہ ملک کا دورہ کر کے تمام حالات کا بچشم خود جائزہ لیا تھا۔تمام ضروری قوانین نافذ فرمائے اور عدالتیں قائم کی تھیں۔ملک کی پیائش کر کے بند وبست کیا اور مالگزاری کے قواعد مقرر کیے تھے۔اور بیرون ریاست بھی امداد دینے کا سلسلہ قائم کیا تھا۔

رفاہ عامہ کے کاموں سے ان کو بہت دلچسپی تھی، سب سے پہلے انہوں نے ہی ریاست میں مدارس اور شفاخانے جاری کیے تھے۔ نواب سکندر بیگم نے اپنے عہد حکومت میں شفاخانوں کو ترقی دی ۲۹ جون ۱۸۶۳ء کو ایک قانون جاری کیا جس میں طبیبوں کے فرائض اور دواسازی کے احکام تھے۔ اور دواخانوں کے لیے ٹھیکے دار مقرر کیے گئے۔ ہر محلہ میں آبادی کے لحاظ سے ہندو، مسلمانوں کی دکانیں قائم کی گئی تھیں۔ دوافروشوں کا امتحان لے کر لائسنس دیا گیا۔ ناقص قسم کی دواؤں کے اتلاف وغیرہ کے لیے ہدایات دی گئیں۔ قانون کی خلاف ورزی پر قید اور جرمانہ کی سزائیں مقرر کی گئی تھیں۔ طیبہ بی اس حوالے سے لکھتی ہیں کہ

> دواخانوں میں گیلی دواؤں کے بنانے کے لئے ہندوؤں کے واسطے برہمن مقرر کیے گئے۔ مسافروں کے آرام کے لیے دوافروشوں کی دکان پر دیگچی، سہل صافی مہیا کر کے رکھنے کا حکم دیا گیا تاکہ بے خانماں مسافر دکان میں دواجوش کر کے یا پیس کر پی سکے ۱۸۵۹ء میں پولیٹیکل ایجنٹ کے مشورے سے ایک ہندوستانی ڈاکٹر مقرر کر کے انگریزی ہاسپٹل قائم کیا۔(۱۶)

وہ ہندوستان کی پہلی خاتون تھیں جنھوں نے مجمع عام میں تقریریں کیں، فرمانروا ہونے کے آٹھ ماہ بعد جنوری ۱۸۶۱ء میں انہوں نے سب سے پہلے جلپور کے دربار میں تقریر کی اور یہ ہندوستان میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کے لیے ایک ہندوستانی خاتون کی تقریر سننے کا پہلا موقع تھا۔ یہ تقریر وائسرائے ہند کی اس تقریر کے جواب میں تھی جو انہوں نے نواب سکندر بیگم کو سند بیر سیہ عطا کرتے وقت ان کے احسانات زمانہ غدر کی شکر گزاری میں کی تھی۔ اور بصلہ خیر خواہی ایک پورا پرگنہ بیر سیہ عطا ہوا۔ لارڈ لیننگ (Lord Lenining) نے ان کو خطاب کر کے کہا بقول طیبہ بی بی

> یور ہائنس اس دربار میں آپ کا شریک ہونا ایک مبارک خال ہے میں آپ کی خدمات کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ اس ریاست کی فرمانروا ہیں۔ جس نے دولت برطانیہ کے خلاف کبھی تلوار نہیں اٹھائی آپ نے عورت ہو کر ایسی بہادری دکھلائی جو فی الحقیقت ایک مدبر یا ایک سپاہی کے شایان شان تھی اس لیے اس صلہ میں آپ کو سند تملیک بیر سیہ عطا کی جاتی ہے۔(۱۷)

ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کی سیر کی اور مشاہیر و فضلا سے ملاقاتیں ہوئیں تھیں۔یکم نومبر ۱۸۶۱ء کے بعد دربار الہ آباد سے نواب سکندر جہاں بیگم کو اسٹار آف انڈیا۔جی۔سی۔ایس۔آئی اور نائٹ گرینڈ کمانڈر کا خطاب ملا تھا۔نواب سکندر جہاں بیگم ہندوستان میں پہلی عورت تھیں جن کو یہ معزز خطاب حاصل ہوا۔طیبہ بی کتاب فرمار وایان بھوپال میں لکھتی ہیں کہ

> لارڈ برٹس نے اپنی کتاب میں لکھا کہ اس دربار میں بیگم صاحبہ کی طرف سب کی آنکھیں تھیں: کیوں کہ ایک خاتون کا نائٹ ہونا انگریزوں اور ہندوستانیوں میں ایک انوکھی بات تھی۔سب لوگ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ وہ اس دربار میں خود کو کس طرح پیش کریں گی۔لیکن جس شان اور سلیقے سے انہوں نے اپنے آپ کو پیش کیا کوئی دوسرا نہیں کر سکتا تھا۔(۱۸)

۱۶فروری ۱۸۶۳ء لارڈ لارنس(Lord Lawrance) نے آگرہ میں ایک عظیم الشان خاص دربار منعقد کیا تھا۔نواب سکندر جہاں بیگم کی شرکت کو وائسرائے نے بہت سراہا کہ آپ کے ساتھ تعارف ہونے اور ملاقات کرنے سے بے حد خوشی ہوئی جس وقت وہ ملکہ وکٹوریہ سے مل کر رخصت ہو رہے تھے تو انہوں نے اپنی آخری گفتگو میں فرمایا بقول طیبہ بی بی

> جو بیگم ہمارے بعد عورتوں میں سے حکمران ہیں وہ بھوپال کی بیگم اور ممبر اسٹار آف انڈیا ہیں۔نواب سکندر بیگم نے اس کا شکریہ ادا کیا۔دوسرے دن عام دربار میں شرکت کی۔(۱۹)

۱۹ نومبر ۱۸۶۶ء آگرہ میں لارڈ لارنس(Lord Lawrance) نے دوسرا دربار کیا۔نواب سکندر بیگم بحیثیت نائٹ گرنیڈ کمانڈر اس میں شریک ہوئیں تھیں۔وائسرائے نے اپنی تقریر میں نواب سکندر بیگم اور راجہ بندھیا کے حسن انتظام کی تعریف کی تھی۔نواب سکندر جہاں بیگم نے دربار سے فراغت پر ایک ہفتہ دہلی میں رہیں اور دھولپور، گوالیار وغیرہ میں مختصر قیام کرتی ہوئی بھوپال واپس آگئیں۔علاوہ ازیں جلپور، الہ آباد، اکبر آباد، آگرہ کے درباروں میں جو تقریبات کیں ان میں شریک ہوئیں تھیں۔اس سیر و سیاحت کے حالات روزانہ انگریزی اخباروں میں شائع ہوتے رہتے تھے اور دہلی گزٹ میں تو بالالتزام اشاعت ہوتی تھی۔ان اخبارات کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر جگہ باضابطہ داخلہ ہوتا تھا۔مقامی حکام مع مقامی افواج کے استقبال کرتے تھے۔ہندوستانی شرفاء اور یورپین مرد و خواتین

سب کے سب ان کی ملاقات کے خواہشمند رہتے تھے اور دلچسپ ملاقاتیں ہوتی تھیں ان کی باتیں نہایت ہی ادب اور غور کے ساتھ سنتے تھے۔ جہاں ان کا کیمپ ہوتا تھا وہاں دور دور سے ملاقات کا شرف پانے کے خواہشمندوں کا جم غفیر اکٹھا ہو جاتا تھا۔ انہی دوران سفر کے حالات میں داخلہ دہلی کے متعلق دہلی گزٹ نے اپنی اشاعت ۲۵ جنوری ۱۸۶۳ء میں مندرجہ ذیل صورت حال شائع کی تھی۔ بقول محمد امین زبیری

> دہلی ۲۲ جنوری۔ دہلی براگیڈ مع ہز مجسٹی کی انیسویں فوج کے آج صبح کو فل ڈریس میں ملبوس ہو کر ہر ہائنس سکندر بیگم آف بھوپال جی۔ سی۔ ایس۔ آئی کی تعظیم کے لیے موجود تھا۔۔۔۔ انیس اتواپ کے سر ہونے سے معلوم ہوا کہ ہر ہائنس تشریف لے آئیں۔۔۔۔ جب تمام افواج نے خلوص آمیز جذبہ کے ساتھ برٹش انداز سے چیرز دیئے اور عوام سلامی کر چکی تو بیگم صاحبہ نے ہو وج میں کھڑے ہو کر براگیڈ کی تعریف میں یہ چند الفاظ فرمائے: آج صبح جو کچھ میں نے دیکھا ہے اور اس سے میرے دل میں جو معترفانہ خیالات پیدا ہوئے ان کے بیان کرنے کے لیے مجھے الفاظ نہیں ملتے۔ میری جس قدر خاطر کی گئی ہے اس سے بہت ہی مسرور ہوئی۔۔۔۔ لیکن گزشتہ زمانے کی تاریخ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی بڑی بڑی لڑنے والی جماعتوں کا بھی انگریزی افواج سے مقابلہ نہیں ہو سکتا۔(۲۰)

اس عہد میں فرائض مذہبی میں سب سے زیادہ مشکل کام جو ایک خاتون کے لیے ہو سکتا تھا وہ حج کا بجالانا ہے۔ چنانچہ سلطنت تیموریہ کی تاریخ میں گلبدن بیگم کے سوا جو کہ اکبر اعظم کی بہو بھی تھیں کسی کو اس فرض کے بجالانے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ نواب سکندر بیگم جب ملکی انتظامات کی طرف سے مطمئن ہو گئیں تو حج بیت اللہ کا ارادہ کیا اپنے زمانہ سفر کے دوران انتظام ریاست کے لئے ایک کونسل آف ایجنسی قائم کی تھی۔ نواب شاہجہاں بیگم کو کونسل کی صدارت کا عہدہ دیا اور امراؤالدولہ صاحب اور راجہ کشن رام کو کونسل کی صدارت کا نواب سکندر بیگم کٹھن راستہ اور سفر کی مشکلات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ۱۲۸۰ھ میں پندرہ سو آدمی ہمراہ لے کر مکہ معظمہ حج کے لیے گئیں تھیں۔ حج ادا کیا خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کیا۔ جس طرح تمام والیان ملک میں ان کے حضور پیش ہونے کا شرف امتیاز و اولیت انہیں کو حاصل ہوا۔ وہ عقائد اسلام میں راسخ اور مذہبی امور میں نہایت مستعد و سرگرم تھیں۔ انہیں مذہبی امور، اصول و ضوابط سے مکمل واقفیت اور فروعی مسائل پر عبور تھا۔ علماء و فضلا کی قدر دان اور شعائر اسلام کا احترام

کرتی تھیں۔اتنا احترام کہ جب دہلی تشریف لے گئیں تو جامع مسجد جو پانچ سال سے بند تھی ان کی کوشش سے کھولی گئی اور پھر اللہ تعالی کی تقدیس و عبادت شروع ہوئی ،ان کے ہمراہ اس زمانہ کے جو پولیٹیکل ایجنٹ۔ای۔آر ہچنسن (E.R.Hutchinson) تھے اس واقعہ کو اپنے دوست کے خط میں اس طرح لکھتے ہیں کہ بقول محمد امین زبیری

> ۱۸۲۳ء کے دورہ میں جب کہ میں سہیور سے الہ آباد، بنارس، فیض آباد، لکھنو، کان پور، دہلی، جے پور ہو کر واپس بھوپال ہوا تھا،اس زمانہ میں دہلی کی جامع مسجد اس قصور پر مسلمانوں کے لیے بند کر دی گئی تھی کہ غدر ۱۸۵۷ء میں انہوں نے چھ حصہ لیا تھا، مگر ہر ہائنس نواب سکندر بیگم کی استدعا پر گورنمنٹ آف انڈیا نے نماز پڑھنے کے لیے عام طور پر مسلمانوں کو اجازت دے دی تھی،اور ہر ہائنس کو اس مبارک جگہ پر عبادت کرنے کا موقع ملا تھا۔(۲۱)

نواب سکندر بیگم ان سیاحوں سے بہت خاطر داری سے ملتی تھیں جو یورپ سے ہندوستان آتے تھے۔چنانچہ ۱۸۶۴ء میں فرانس کا ایک فوجی افسر کپتان روز لیٹ (Ross leit) سیاحت کے لیے ہندوستان آیا اور اس نے تقریباً تمام ہندوستان اور دیسی ریاستوں کی سیر کی وہاں کے حالات کو نہایت وضاحت کے ساتھ لکھا ہے یہ افسر بھوپال میں کئی مہینے مقیم رہا اور یہاں کے تمام درباری اور تمدنی زندگی نیز سوسائٹی حالت پر عجیب و غریب تبصرہ کیا ہے۔اس نے متعدد مقامات کی نہایت دلچسپ تصویریں بھی دی ہیں جن میں بھوپال کی بھی کئی تصویریں ہیں ان تصاویر میں سب سے زیادہ دلچسپ تصویر اس دربار کی ہے جس میں نواب سکندر بیگم اس فرانسیسی سیاح کو تمغہ عطا کر رہی ہیں۔یہ کتاب فرانسیسی سے انگریزی میں ترجمہ ہوئی اور اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کے متعدد اڈیشن شائع کیے گئے۔سیاح مذکور کے اس حصہ بھوپال میں سے ذیل کو بیان جو نواب سکندر بیگم کی متنوع قابلیتوں کا مظہر ہے مثلاً محمد امین زبیری اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ

> ہمارے بھوپال میں وارد ہونے کے دوسرے دن ہم کو ہر ہائنس سکندر بیگم سے پرائیوٹ ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور دربار سے سواری بھیجی گئی تھی کہ ہم کو موتی بنگلہ سے محل پر جو شہر کے سرے پر قلعہ کے قریب واقع سے لے کر آئے دروازہ پر وزیر اعظم نے ہمارا استقبال کیا ہم نے زینے پر چڑھ کر دربار کے کمرے

> میں پہنچے جہاں بیگم ہماری منتظر تھیں، ہماری طرف بڑھیں، مصافحہ کیااور اپنے
> قریب صوفہ پر بیٹھ جانے کو کہا۔(۲۲)

اس حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ سکندر بیگم ہندوستان میں اس صدی میں پیدا ہونے والی وہ عظیم ہستی تھیں جس سے ہندوستان کی خوش بختی میں اضافہ ہوا۔ایک اور جگہ کچھ اس طرح سے رقمطراز ہیں کہ بقول محمد امین زبیری

> بیگم صاحبہ سے ہماری پہلی ملاقات چند گھنٹے تک جاری رہی جس کے درمیان
> انہوں نے اپنی اور اپنے بزرگوں کی تاریخ نہایت جوشیلے طرز سے بیان کی اور پھر
> فوراً ہی ہندوستانی ریاستوں کے رسوم دربار اور سیاسی مصالح کے متعلق مجھ سے
> سوالات کیے ہر سوال کے بعد دوسرا سوال اس قدر تیز ہوتا کہ میں پہلے سوال
> کا جواب بھی پورے طور پر نہ دے پاتا۔اس کے بعد اپنی صاحبزادی شاہجہاں بیگم
> سے تعارف نہ کرا سکنے پر افسوس ظاہر کیا۔۔۔۔اس کے عوض اپنی نواسی سلطان
> جہاں بیگم کو بلوایا جو ایک ہشت سالہ پیاری لڑکی تھیں۔۔۔۔(۲۳)

بیگم سکندر جہاں کے پاس علم کا ایک وسیع ذخیرہ تھا۔مختلف اقوام کی شناخت، مختلف پیداوار کی تجارتی خاصیتیں اور قیمتیں، مذہبی مباحثے کرتیں تھیں۔عیسائیت پر نہایت سنجیدگی سے گفتگو کرتی، انہیں مذہب (عیسائیت) سے زبردست دلچسپی رہی ہے۔ان کے عہد میں رقص و موسیقی کے حوالے سے دیکھا جائے تو محل میں وہ جگہ جو عورتوں کے لیے مخصوص تھی وہاں مرد ناچتے تھے، لیکن یہ ناچ اس لیے تعجب خیز بات نہیں تھی کہ جس سلطنت کی حکمرانی عورتوں کے ہاتھ میں ہو اور مزید دو نسلوں تک رہنے والی ہو۔

نواب سکندر بیگم کو قدرت نے حیرت انگیز قابلیت، صلاحیتوں اور بھرپور دل و دماغ سے نوازا تھا۔وہ اپنی وسعت علمی، فہم و فراست کی بدولت ہر درجے کے قابل شخص کو متحیر کر دینے کی خوبی رکھتی تھیں۔ہر شخص کے دل و دماغ پر انکی قابلیت کے نقوش ثبت ہو جاتے تھے۔میجر سموئیل ارٹر سیکفرسن سی۔بی (M.J.Sumoil Arter Sacfirson) ۱۸۵۳ء میں بھوپال ایجنسی میں پولیٹیکل ایجنٹ مقرر ہو کر آئے تھے۔نواب سکندر بیگم اور ان میں سرکاری و غیر سرکاری طور پر متعدد ملاقاتیں ہوئی تھیں، ان ملاقاتوں میں میجر صاحب موصوف پر نواب سکندر کی قابلیتوں کا جو اثر قائم ہوا اس کو انہوں نے وقتاً فوقتاً ان کے ذاتی و نجی خطوط میں ظاہر کیا ہے جو انگلستان کے دوستوں اور

اپنے عزیزوں کو یہاں سے بھیجے تھے۔ چنانچہ مندرجہ بالا دعوے کی تائید میں ان کے ایک خط کی چند سطور کا ذکر محمد امین مارہروی نے اپنی کتاب میں کچھ اس طرح سے قلمبند کیا ہے کہ

> بھوپال ایک نہایت خوبصورت اور دل پسند چھوٹا سا ملک ہے اور جیسا کہ میرا خیال ہے میں اس کے جملہ حالات کو نہایت پسند کرتا ہوں، حال ہی میں مجھے یہاں کے دربار سے آشنا ہونے کا موقع ملا۔۔۔۔ یہاں تین بیگمات ہیں جن میں سے کوئی پردہ نہیں کرتی، یہ جملہ امور میں یورپ کی عورتوں کی طرح آزاد ہیں۔ اول نانی (قدسیہ بیگم)، دوسری والدہ سلطانہ (نواب سکندر بیگم)، تیسری خرد سال بیگم (نواب شاہجہاں بیگم) ہیں۔ جو مسند نشیں ہیں مسند ریاست سے مراد تخت کے مترادف ہے۔ نانی اور والدہ سلطان گھوڑ سواری کرتی ہیں۔ نیز بازی، نشانہ بازی میں کمال مہارت رکھتی ہیں۔ افواج کی قواعد کو وہ خود دیکھتی ہیں، اور قریب قریب ہر سپاہی کے ساز و سامان اور اس کی حالت سے خود واقف ہیں۔ سیاسی قابلیت اپنی مثال آپ ہے۔ (۲۴)

نواب سکندر بیگم کی زندگی وقتاً فوقتاً ایسے واقعات و حادثات پر مشتمل تھی۔ جو ایک عام انسان کی زندگی میں نسبتاً کم یا شاذو نادر ہی نظر آتے ہیں۔ عالم شیر خوارگی میں باپ کا انتقال، خانہ جنگیوں میں پرورش پانا، اپنے آپ کو سخت خطرات میں مبتلا پانا، اپنے حقوق سے محرومی کا احساس، شوہر سے ناکشیدگی، اور اپنی بیٹی کے آئندہ حقوق کی طرف سے پریشانی، بیوگی کے بعد ریاست کے متعلق قبضے کے خطرات وغیرہ۔ ان تمام واقعات میں جو ۳۳ برس میں رونما ہوئے ہر موقع پر فہم و فراست سے کام لیا تھا۔ ملک کی خستہ حالی کو درست کیا، قومی خزانے میں اضافہ کیا، خود مسند نشین ہوئیں، اپنے حقوق کو حاصل کیا اور اس طرز پر زندگی کے ۱۳ برس کامیاب زندگی گزاری تھی۔ غرض سکندر بیگم کے گھر کے اندر ایک سلیقہ شعار بیگم تھیں تو مسند حکومت پر ایک مدبر بادشاہ ثابت ہوئیں۔ وہ ماہر اقتصادیات تھیں۔ فوجی مہموں کے موقع پر جہاں ان کے دل میں خالد بن ولید (۵۸۵۔۶۴۲ء)، اور سلطان صلاح الدین (۱۱۳۷۔۱۱۹۳ء) جیسے شیر دل مسلمانوں کے اوصاف بہادری بھی موجود تھے۔ بقول سلطان جہاں بیگم

> ان حالات کو دیکھ کر یہ بے شک ماننا پڑتا ہے کہ سرکار خلد نشین نے ریاست کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو مثل ایک ہوشیار، اور تجربہ کار ملاحکی طرح طوفان تباہی سے

نکالا۔اور اپنے شیر دل جد نامور وزیر محمد خاں صاحب کی طرح آئندہ بربادیوں سے
دوبارہ بچایا البتہ فرق یہ رہا کہ وزیر محمد خاں صاحب مرد تھے،اور سرکار خلد نشین
عورت،انہوں نے بزور شمشیر ریاست کی حفاظت کی۔۔۔۔(۲۵)

نواب سکندر جہاں بیگم کی تعلیمی کوششیں:

نواب سکندر بیگم کی تعلیمی کوششوں کا اگر تنقیدی جائزہ لیا جائے تو در حقیقت سکولوں کا اجراء اور ان کا انتظام نواب سکندر بیگم کے عہد حکومت ۱۸۴۸ء سے شروع ہوتا ہے۔اس زمانہ میں لڑکیوں کی تعلیم پر کسی قسم کی کوئی توجہ صرف نہیں کی جاتی تھی۔لڑکیوں کے لیے کوئی مدرسہ نہیں بنایا گیا جبکہ بعض ریاستوں میں لڑکوں کے لیے مذہبی و تعلیمی مدرسے جاری کیے گئے تھے۔ایسے وقت میں نواب سکندر بیگم نے بھوپال میں لڑکیوں اور لڑکوں دونوں کے لیے مدارس کا اجراء فرما کر ایک بہترین مثال قائم کر دی کہ ایک فرمانروا کو اپنی رعایا کے ہر مرد و عورت کا کس طرح یکساں خیال رکھنا چاہیے۔نواب سکندر جہاں بیگم کے تعلیمی نظریات کے حوالے سے شہریار خاں لکھتے ہیں کہ

> Of all Bhopal's women rulers, Sikandar Begum was the most Aggressive, dynamic and charismatic. During her exile,Sikandar had matured into a remarkably complete person….Sikandar was equally forward looking in introducing schools for girls….she also Replaced Farsi with Urdu as Bhopals official court language. (26)

انہوں نے نہ صرف بھوپال میں اردو وہندی کے مدرسے قائم کیے بلکہ رعایا کو پڑھنے لکھنے کی ہر ممکن ترغیب دلائی تھی۔مدرسہ سلمانیہ میں فارسی اردو کے ساتھ انگریزی زبان سکھانے کا بھی انتظام وانصرام تھا۔تمام طالب علموں جن میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہوتے تھے انہیں کامیاب ہونے پر ایسی کتابیں تحفتاً دی جاتی تھیں جن سے مختلف اداروں میں کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہو۔وہ کتابیں اسکول ہی میں رکھ دی جاتی اور طالب علم انہیں پڑھ کر ختم کر لیتے تو انہیں اس کتاب کی قیمت کے مطابق روپے مل جاتے تھے۔نواب سکندر جہاں بیگم نے قصبوں،گاؤں میں تعلیم کے لیے اردو،ہندی کے مدرسے قائم کیے علاوہ ازیں شہروں میں عربی،فارسی،انگریزی اور دستکاری و صنعتی تعلیم کے مدرسے جاری کیے گئے تھے۔

اس دور میں "مانیٹری" کا عہدہ بطور اعزاز دے دیا جاتا تھا۔ لیکن نواب سکندر جہاں بیگم نے اس کی بھی ماہوار تنخواہ مقرر کر رکھی تھی۔ لڑکیوں کو دو روپے اور لڑکوں کو تین روپے ماہوار ملتے تھے۔ جس وقت طلباء اسکول کی تعلیم سے فارغ ہو جاتے اور جن کے اچھے نمبر آتے تھے وہ سرکاری دفتروں اور محکموں میں بطور امیدوار رکھ لیے جاتے اور موقع کی مناسبت سے انہیں معقول ملازمتیں دی جاتی تھیں۔ نواب سکندر جہاں بیگم نے یتیم لاوارث اور غریب بچیوں کے لیے کوئین وکٹوریا کے نام پر وکٹوریا اسکول قائم کیا جہاں پڑھائی کے علاوہ دستکاری پر بھی بالخصوص توجہ صرف کی جاتی علاوہ ازیں سوزن کاری بلکہ کھانے پینے کی اشیاء کا تیار کرنا وغیرہ بھی سکھایا جاتا تھا۔ اس سکول کی لڑکیوں کے ہاتھ کی چیزیں نواب سکندر بیگم وائسرائے اور اکثر یورپین خواتین کو تحفتاً بھیجا کرتی تھیں۔ اکثر عمائدین ریاست کو بھی عنایت فرماتی تھیں اور سالگرہ کو موقع پر حضور کوئین وکٹوریا اور شہزادی ویلز کو بھی آپ نے یہی تحفے ارسال کیے۔ بقول و۔ اصاحبہ

> سفر حج سے واپسی پر ترکی لباس کا نمونہ اپنے ہمراہ لائیں اور وہی لباس اس اسکول کی وردی قرار دیا گیا تھا۔ مدرسے کی نگرانی بہت سخت کی جاتی تھی۔ لڑکے لڑکیاں اکثر ڈیوڑھی پر حاضر ہوتے تھے۔ اور وہاں ان کی قابلیت اور ہنر مندی کا امتحان لیا جاتا۔ نواب شاہجہاں بیگم اور نواب سلطان جہاں بیگم ہفتے میں ایک ایک دن خود جاکر اسکول کا معائنہ کرتی تھیں۔ (۲۷)

سکول کے طالب علموں کی شادیاں بھی نواب سکندر بیگم خود اپنی ذمہ داری سمجھ کر مقرر کرواتی اور اس اہم فریضے کی ادائیگی کے سلسلے میں تمام اخراجات ریاست بھوپال کی جانب سے ادا کیے جاتے تھے۔ طلباء کی حاضری پر غیر معمولی توجہ دی جاتی، سرکاری کاغذات کی طرح ملاحظے میں طلباء کی حاضری رجسٹرڈ پیش کیے جاتے تھے۔ طالب علموں میں تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا کرنے کی کوششوں کے علاوہ مدرسوں کو بھی مالی معاونت عطا فرما کر ان کا حوصلہ بڑھایا جاتا تھا تاکہ وہ رعایا کی تعلیم میں دل لگا کر محنت کریں۔

نواب سکندر بیگم کی تصنیفات اور ذوق علمی اور ادبی خدمات:

نواب سکندر بیگم کی باقاعدہ تعلیم شادی سے پہلے مکمل ہو چکی تھی لیکن ان کے علمی شوق نے ہمیشہ ان کو طالب علم ہی رکھا۔ مذہبی علوم خاص کر فقہ تصوف اور معرفت کی کتابوں سے ان کو خصوصی لگاؤ تھا جبکہ دوسرے مذاہب کی کتابیں بھی شوق سے دیکھتیں، سریمد بھاگوت ہندوؤں کی مشہور کتاب اور توریت وانجیل کے ترجموں کا بہت غور سے مطالعہ فرمایا تھا۔ اور ان کا حال بھی انہوں نے اپنے روزنامچے میں لکھا ہے۔ مذہبی کتابوں کے علاوہ اخلاقی، تمدنی وتاریخی اور جغرافیے کی کتابیں بھی دلچسپی سے پڑھتی تھیں۔ نواب سکندر جہاں بیگم میں علم حاصل کرنے کی لگن اس قدر تھی کہ ریاستی امور سے فراغت کے اوقات میں مطالعہ کرتیں اور عمر کے آخری حصے میں پہنچی تو اس دور میں انگریزی زبان کا چرچا عام تھا لہذا انہوں نے انگریزی زبان سیکھنا شروع کر دی تھی۔ بقول و۔ اصاحبہ

> مکہ معظمہ میں قیام کے دوران انہوں نے یہ بھی کوشش کی تھی کہ قرآن مجید کے احکام میں سے لے کر ایک ایسا مجموعہ تیار کرائیں۔ جس میں انتظام ملک کے سارے اہم امور آجائیں۔ اس کوشش میں انہوں نے خود بھی بہت کچھ محنت کی اور کتاب کی تکمیل کے لیے مولوی عبدالقیوم صاحب کو مامور کیا۔ جس وقت وہ مکمل ہو گئی تو مولوی شاہ حسین صاحب بخاری جو ایک جید عالم تھے۔ اس کے تبصرے اور تنقید پر مقرر کیے گئے۔ (۲۸)

شومئ قسمت سے اس کتاب کا کوئی مسودہ نہ مل سکا اور اس لیے اس کتاب کی بابت یا متعلق کچھ نہیں لکھا جاسکتا ہے۔ نواب سکندر جہاں بیگم نے مکہ معظمہ میں قیام کے زمانے میں ترکوں کا سیاسی وسماجی اور بالخصوص مذہبی شعور دیکھ کر انہوں نے یہ بھی تجویز پیش کی تھی کہ قرآن مجید کا ترکی زبان میں ترجمہ کیا جائے۔ وہ لوگ مذہبی احکامات سے مکمل طور پر بے بہرہ تھے لہذا ان احکامات پر عمل کرنا ممکن تھا۔ نواب سکندر بیگم نے شیخ احمد صاحب احمد داغستانی سے جو ایک زبردست عالم اور ترکی زبان میں ماہر تھے ان کو اس صورتحال سے آگاہ کیا اور انہیں قرآن پاک کا ترکی زبان میں ترجمہ لکھنے کے لئے آمادہ کر لیا تھا۔ داغستانی صاحب نے اپنے وعدہ کے مطابق وہ ترجمہ کر کے سب سکندر بیگم کے پاس بھیج دیا تھا۔ جس کے صلہ میں داغستانی صاحب کو چار ہزار روپیہ نقد اور قیمتی تحفے دیئے گئے لیکن قدرت نے اس کے شائع ہونے کی مہلت نہ دی۔ افسوس کہ آج اس ترجمے کا ایک مسودہ بھی موجود نہیں ہے۔ البتہ ۱۲۹۴ھ میں مصر کے مطبع خدیویہ میں مولوی جمال الدین خاں مدارالمہام نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے فارسی ترجمے فتح الرحمن کا ترجمہ کرا کے شائع کیا گیا ہے۔

اسی سلسلے میں نواب سکندر بیگم کا یہ کارنامہ بھی ہے کہ عام مسلمانوں کے لیے انہوں نے مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کی تفسیر فتح العزیز کو مکمل کرانے کی طرف توجہ صرف کی تھی۔انہوں نے اس کی تکمیل کے لیے مولوی حیدر علی لکھنوی مولف منتہی الکلام کو جو شاہ صاحب کے شاگردوں میں سے سب سے زیادہ قابل اور ذہین وفطین شاگرد تھے انہیں تفسیر کی تکمیل کی خاطر پانچ سو روپے ماہوار پر مقرر کیا تھا۔چند علماان کی مدد کے لیے معین کیے تھے۔چنانچہ کئی سال کی محنت میں و المصنات تک چار ضخیم جلدیں تیار ہوئیں تھیں۔مگر اس کے بعد مولانا دکن چلے گئے اور تفسیر ناتمام رہ گئی تھی۔یہ چاروں جلدیں ندوۃ العلما کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔

نواب سکندر بیگم میں تصنیف وتالیف کی قابلیت بھی موجود تھی۔جو تاریخ سکندری کے دیکھنے سے اچھی طرح ظاہر ہوتی ہے۔انہوں نے اسے میجر ڈیورینڈ پولیٹکل ایجنٹ(M.Durend) کی تحریک سے تزک بابری کے طرز پر مرتب کروایا اور بانی ریاست کے زمانے سے حالات وواقعات کی مکمل چھان بین کی۔لیکن اس کام میں مشکل یہ گزری کہ گذشتہ زمانے کے کاغذات موجود نہ تھے ماسوائے ان چند کے جو نواب قدسیہ بیگم کے محل سے دستیاب ہو سکے۔پھر ایسے بزرگ اور عمر رسیدہ آدمیوں کو تلاش کر کے جہاں تک ممکن ہوا ان سے واقعات معلوم کئے گئے تھے۔اور کچھ تاریخوں (جیسے "تاریخ جاورہ" تاریخ مالکم صاحب" اور "سراج الاقبال" وغیرہ) سے مدد لی اور اس طرح ابتدائی حالات مرتب کیے تھے۔اپنے زمانے کے حالات دفتر تاریخ سے معلوم کیے حالانکہ وہ نامکمل وبے ترتیب تھے لیکن بہر حال اس مواد سے کتاب کی ترتیب شروع کرادی تھی۔مولوی صدیق حسن خان صاحب مرحوم کو کتاب مرتب کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔جیسے جیسے مسودات تیار ہوتے گئے نواب سکندر جہاں بیگم کی خدمت میں پیش کیے جاتے رہے اور وقتاً فوقتاً ہدایات کے مطابق مواد میں ترمیم و اضافے کیے جاتے رہے تھے۔چنانچہ ان کی ہدایت ونگرانی کا اندازہ ذیل کے احکام سے ہو جاتا ہے بقول وہ اصاحبہ

> یہ عرضی نزدیک مولوی حسن کے بھیجی جائے کہ جو عبارت تاریخ بابری کے قاعدے پر تم بتاتے ہو۔وہ دقیق ہے اور اس عبارت کے درست کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جو عبارت خرائط وخطوط وغیرہ کی ہے وہ بدستور رہے گی۔صرف اختصار اسکا ہوگا۔(۲۹)

اس کے بعد ایک اور خط میں لکھتی ہیں:

فصل پہلی تاریخ بھوپال کی جو ہمہ جہت تیار کر کے آپ نے دی ہے۔اس کی مثال خام مقدمہ وار نہیں ہے۔کچھ حال اس کا تصنیف دیانت رائے سے لکھا گیا ہے اور کچھ تاریخ مطبوعہ گلشن آباد عرف جاورہ سے۔۔۔۔فارسی سلیس اور مختصر میں مطابق محاورہ ایران کے نہیں لکھی گئی ہے۔۔۔۔(۳۰)

یوں پھر نواب سکندر بیگم کے زیر نگرانی اس کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

(1) سردار دوست محمد خاں کے زمانے سے نواب نظر محمد خاں کے انتقال تک۔

(۲) نواب نظر محمد خاں کے انتقال سے نواب بیگم کی مختاری ریاست تک

(۳) حالات زمانہ مختاری نواب سکندر جہاں بیگم

(٤) حالات صدر نشینی نواب سکندر جہاں بیگم

زیر نظر کتاب ۱۸۸۱ء تک بہت کافی حد تک مرتب ہو چکی تھی۔لیکن صرف پہلا حصہ تاریخ سکندری کے نام سے طبع ہو سکا اور باقی حصے رہ گئے تھے۔بعد میں نواب شاہجہاں بیگم نے اپنے زمانے کے حالات اس میں اضافہ کر کے تاج الاقبال کے نام سے طبع کرا دیا۔مگر اس کتاب میں نواب سکندر بیگم کے حالات بہت ہی کم ہیں۔

سفر نامہ حج:

اسی طرح جب نواب سکندر بیگم نے حج کا ارادہ کیا تو میجر ڈیوریںڈ اور ان کی بیگم صاحبہ نے ان سے اپنا سفر نامہ لکھنے کی بھی درخواست کی۔چنانچہ حج سے واپسی پر یہ سفر نامہ "سفر حجاز" کے نام سے مرتب ہوا۔اپنے سفر نامہ میں لکھتی ہیں کہ بقول نواب سلطان جہاں بیگم

> ہجوم بہ کثرت ہوا اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ حساب نواب بیگم صاحبہ قدسیہ کا جانا واسطے طواف بیت اللہ کے بالکل موقوف ہو گیا۔مین لاچار ہوئی اور دل مین سمجھی کہ جس عبادت کے لئے آئے ہیں وہی نصیب نہیں ہوتی شریف صاحب اور پاشا صاحب سے درخواست کی اور کچھ ترکو نکو طواف کے وقت اپنے ہمراہ رکھا جنکی وجہ سے طواف ہو جاتا تھا۔(۳۱)

اس سفر نامہ کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس اہم اور مقدس سفر میں ہر چیز کو کیسی بغور نظر دیکھا۔آب و ہوا، موسمی حالات، صحت، تمدن، معاشرت، سلیقہ، طرز تعمیر، آرائش و زیبائش، مکانات، طرز آبادی،

تجارت، قومی حالت وغیرہ سب پر مختصر بحث کی ہے۔یہ سفر نامہ ان کی زندگی میں تو نہیں چھپ سکا۔لیکن بعد میں نواب شاہجہاں بیگم نے انگریزی میں ترجمہ کرا کے شائع کر دیا۔اور کوئین وکٹوریا کے نام کے ساتھ اس کا ہدیہ کیا گیا۔اس سفر نامہ کے حوالے سے سلیم حامد رضوی لکھتے ہیں کہ

> آپ صاحبوں کو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اردو ادب کی ترقی کی رفتار سست ہو گئی ہے نہ صرف اردو جرائد کی تعداد ہندی جرائد کے مقابلے میں زیادہ ہے بلکہ دوسری مطبوعات بھی اردو میں زیادہ تعداد میں شائع ہوتی ہیں۔مثال کے طور پر بیگم صاحبہ بھوپال نے اپنے سفر حجاز کے حالات اردو میں لکھے ہیں۔(۳۲)

آئین سکندری:

ان کتابوں کے علاوہ ایک اور مجموعہ آئین سکندری ہے۔اس میں مذہبی اخلاقی اور سیاسی نصیحت فرماں روا کے فرائض،اعمال کی نگرانی، مخلوق الٰہی کا تحفظ وغیرہ جیسے مباحث ہیں۔یہ موضوعات انہوں نے مستند اور ماہر بزرگان دین کی کتابوں کا تجزیہ کر کے پیش کیے تھے۔چنانچہ وہ خود بھی ان ہدایتوں پر کاربند رہیں اور چاہتی تھیں ان کے جانشین بھی انہی اصولوں کے پابند رہیں۔۱۸۴۷ء میں جب نواب سکندر جہاں بیگم اور میاں فوجدار محمد خاں ریجنٹ کی حیثیت سے بغیر کسی اشتراک حکومتی نظم و نسق چلاتے تھے۔بقول طیبہ بی

> اس وقت نواب سکندر بیگم نے کچھ اصول و آئین وضع کئے اور ان کا نام "آئین سکندری" رکھا اور اپنی حکومت کے زمانہ میں ان ہی اصولوں کے ساتھ حکومت کی۔آئین سکندری کو کتاب کی شکل میں نواب سلطان جہاں نے طبع کروادیا جس میں نصیحتوں کے طور صاحبان حکومت کو حکومت کرنے کے طریقے بتلائے۔(۳۳)

مندرجہ بالا اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ ایک مورخ کی حیثیت سے تاریخ نگاری کے فرض کو کس خوش اسلوبی سے انجام دیا چنانچہ اس کتاب کا ایک حصہ فارسی میں "تاریخ سکندری" کے نام سے شائع ہوا۔اس کتاب کی اشاعت کے حوالے سے نواب سلطان جہاں بیگم نے کچھ اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے کہ

> چونکہ اس زمانہ میں فارسی زبان سے بالکل اجنبیت اور بیگانگی ہوتی جارہی ہے اس لئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ ساتھ ہی ساتھ اس کا ترجمہ بھی شائع کیا

جائے چنانچہ دفتر تاریخ کے ایک اہلکار منشی محمد عبدالوحید نے اس کا ترجمہ کیااور اصل متن کی تصحیح اور ترجمہ پر نظر ثانی مولوی محمد عبدالرزاق صاحب منتظم تاریخ نے کی ہے۔(۳۴)

نواب سکندر بیگم جس طرح فارسی زبان میں لگاؤاور دلچسپی رکھتی تھیں۔اسی طرح اردو کی بھی جو ابھی بالکل ابتدائی حالت میں تھی قدر دان تھیں۔ایک مرتبہ سیر وسیاحت کے سلسلے میں لکھنو تشریف لے گئیں تو مرزا رجب علی بیگ سرور کو بلایا جو اس زمانے کے مشہور انشاپرداز تھے۔نواب سکندر بیگم نے ان سے ایک قصہ لکھنے کو اصرار کے ساتھ فرمائش کی تھی۔قصے کا مضمون یہ تھا کہ بھوپال کے کسی امیر نے ایک نر سارس کا شکار کیا تھااور اس کی مادہ اس کے لیے کڑھ کڑھ کر مر گئی تھی۔وقت بہت کم تھا اور فرمائش یہ تھی کہ جلد لکھا جائے۔مرزا صاحب نے فسانہ عجائب کے انداز پر روانگی سے پہلے ہی قصہ لکھ کر پیش کر دیا۔جس کے صلے میں خلعت اور پانچ سو روپے انعام پیش کیا گیا۔یہ قصہ شرار عشق نام سے لکھنو میں چھپ چکا ہے۔بقول سلطان جہاں بیگم

اگرچہ وہ خود عالم نہ تہیں مگر علم کی قدر دان تہیں اور باوجود عدیم الفرصتی اور فرائض حکومت کے وقت کا کچھ حصہ مطالعہ کتب کے لئے وقف تہااور ان کے مطالعہ مین مذہبی واخلاقی کتابیں زیادہ رہتی تہیں۔۔۔لٹریچر کے ساتھ خاص ذوق پیدا ہو گیاان کی علمی ذوق اور مسٹر جوزف ڈوی کنگھم کی ترغیب نے ان کو تاریخ بھوپال کی ترتیب وتدوین پر آمادہ کیا۔(۳۵)

نواب سکندر بیگم کی علمی اور تعلیمی کوششیں بھوپال ہی تک محدود نہیں تھیں بلکہ بھوپال سے باہر بھی انہیں تعلیم کی اشاعت میں دلچسپی تھی اس مقصد کے لیے جدوجہد کرتی تھیں اور ان کی امداد فرماتی تھیں۔سکندر بیگم نے ہندوستان کے اندر اردو کو ترقی پذیر زبان سمجھتے ہوئے فارسی کے بجائے اردو کو رواج دیا۔اس عہد میں گورنمنٹ کا بھی تقاضا یہی تھا کہ فارسی کے بجائے انگلش یا مقامی زبان کو فروغ اور ترقی دی جائے۔نواب سکندر بیگم کو علم سے ذاتی شغف تھا۔اہل ہنر کی دل سے قدر دانی کرتی تھیں۔ان کو خود بھی تصنیف وتالیف کا ذوق تھا۔ریاست میں تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری تھا۔انہوں نے کتابوں کی طباعت کے لئے بھوپال میں ۱۸۵۱ء میں مطبع سکندری قائم کیا۔ہندوستان میں سب سے پہلے انہوں نے ۱۸۵۹ء میں بھوپال میں اردو کو سرکاری زبان قرار دیا۔حیات سکندری میں نواب سلطان جہاں بیگم لکھتی ہیں کہ

> فارسی کی استعداد اچھی تھی لیکن وہ فارسی میں بہت کم لکھتی تھیں۔البتہ اردو زبان
> پر ان کو بڑی قدرت حاصل تھی۔ تمام خطوط اور سرکاری مراسلت اردو میں ہی
> کیا کرتی تھیں۔۔۔(۳۶)

فوجدار محمد خاں جو نواب سکندر بیگم کے ماموں تھے ان کو غالب نے اپنا دیوان اپنے قلم سے تصحیح کر کے بھیجا تھا جو بعد میں نسخہ حمیدیہ کے نام سے منظر عام پر آیا۔ نواب سکندر بیگم نے ۱۸۵۷ء میں غالب کو بھوپال آنے کی دعوت دی اور کل مصارف کی ذمہ داری لی۔ مگر غالب نے دہلی نہ چھوڑنے کا عذر کیا۔

نواب سکندر بیگم جہاں بھی سفر پر جاتی تھیں۔وہاں کے چند علماء و فضلاء کو بھوپال لانے کا کام انجام دیتی تھیں۔وہ سفر حج سے واپسی میں یمن سے شیخ زین العابدین کو بھوپال لائیں۔ شیخ المحدثین شاہ عبدالقیوم محدث دہلوی کو دعوت دے کر بھوپال بلایا۔ سرسید احمد خاں کی اشاعت تعلیم کی کوششوں کو نواب سکندر بیگم نے نہایت قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھا۔اور جون ۱۸۶۶ء میں ان کو اظہار خوشنودی کے طور پر الماس کی ایک انگوٹھی بھیجی جس کی قیمت ایک ہزار روپیہ تھی۔

تعمیر امداد مدرسہ سہیور:

سہیور کا مدرسہ بہت چھوٹا تھا۔ عمارت بھی اچھی نہ تھی۔ ۱۸۵۰ء میں نواب سکندر بیگم نے اس کی نہایت خوش نما عمارت بنوائی۔ جس کی اطلاع ایجنسی ریذیڈنسی سے نواب گورنر جنرل بہادر کی خدمت میں بھیجی گئی۔ صاحب بہادر نے نواب بیگم کو ایک خط بھیجا جس میں تحریر کیا تھا بقول و۔اصاحبہ کہ

> اس عرصہ میں صاحب ریذیڈنٹ بہادر اندور اور صاحب پولیٹیکل ایجنٹ بہادر
> بھوپال کی تحریروں سے معلوم ہوا کہ آپ نے عالی ہمتی اور بلند حوصلگی سے مدرسہ
> سہیور تعمیر کیا ہے۔اس بات کے معلوم ہونے سے بہت انبساط ہوا۔اور آپ کی
> حسن نیت پر تحسین وآفرین کی۔(۳۷)

نواب منیر محمد خاں صاحب بہادر جو نواب جہانگیر محمد خاں صاحب بہادر کے بڑے بھائی تھے۔اپنی جاگیر سے سالانہ اس مدرسے کو دیا کرتے تھے چونکہ ان کے انتقال کے بعد جاگیر خالصہ میں شامل ہوگئی تھی اور اس کی سالانہ آمدنی بھی اسی سبب بند ہوگئی۔ نواب سکندر جہاں بیگم کو ہرگز یہ قبول نہ تھا کہ آمدنی کے مسائل کے سبب تعلیم کا سلسلہ

بند ہو جائے۔اس لیے بغیر کسی تحریک کے خود نواب صاحب پولیٹیکل ایجنٹ کو لکھ کر خزانہ ریاست سے عطیہ جاری کر دیا تھا۔

مدرسہ ساگر کا معائنہ وانتظام:

ریاست بھوپال کے قریب ضلع ساگر تھا۔نواب سکندر جہاں بیگم نے ساگر کا دورہ کیا اور جس طرح انگریزی کارخانہ جات اور میگزین کو دیکھا،اسی طرح مدارس کا بھی معائنہ کیا۔یہاں انگریزی کا جدید مدرسہ قائم ہوا تھا۔اس کے کامیاب طلبہ حوصلہ افزائی کی خاطر ۵۰۰روپے انعام دیا تھا۔

نواب سکندر جہاں بیگم نے زندگی کے ۵۲ سالہ زندگی، گوناگوں خطرات اور زمانہ کی نیرنگیوں کا کامیابیوں کے تلاطم و سکون میں بسر کر کے ۳۰ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو اس جہاں فانی سے رخصت ہو گئیں۔ان کے انتقال کو ایک عظیم صدمہ محسوس کیا گیا، گورنمنٹ آف انڈیا نے غیر معمولی گزٹ کے ذریعے سے اپنے رنج و ملال کا اظہار اور ان کی قابلیت کا اعتراف کیا۔ہندوستان واانگلستان کے تمام اخبارات نے غم والم کے ساتھ یہ خبر شائع کی۔ان کی فہم وفراست اور سوانح کے حوالے سے بڑے بڑے کالم لکھے گئے "آئین سکندری" میں سلطان جہاں بیگم لکھتی ہیں کہ

> خلد نشین نواب سکندر بیگم صاحبہ فرمانروائے بھوپال ان خواتین میں تھیں، جن کی زندگی تاریخ عالم نسواں کی زیب وزینت ہے۔ان کے دور حیات میں جو گوناگوں انقلاب پیش آئے اور ان مین انہوں نے جس عزم،استقلال فراست اور بیداری کا ثبوت دیا۔۔۔۔۔اٹھارویں صدی عیسویں کے پر آشوب زمانہ اور ایک ایسے غیر متمدن ملک مین جہاں آثار مدنیت کو مٹے ہوئے صدیاں گزر چکی تھیں ان کے ہاتھوں عظیم الشان کام سرانجام پائیں۔(۳۸)

ان کے ہم عصروں میں سے کسی فرد نے بھی ان جیسی معاملہ فہمی، فہم وفراست اور صبر واستقامت کے بل بوتے پر وہ عروج حاصل نہ کیا جو نواب سکندر جہاں بیگم کو نصیب ہوا۔دیگر خوبیوں کے علاوہ ایک نمایاں صفت جو ہمیں ان کے ہاں بحیثیت خاتون حکمران کے دکھائی دیتی ہیں وہ قوت وطاقت ہے۔اور اسی کی بنا پر ان کی ریاست کا نظم ونسق قومی بنیادوں پر قائم تھا۔جس کا ہر پہلو ان کی الوالعزمی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔سکندر بیگم ایک حلیم اور مستقل مزاج خاتون اور پاسِ عزت میں اپنی مثال آپ تھیں۔تاریخ میں مرد حکمرانوں میں کچھ قابل اور بہت سے نااہل ثابت ہوئے

ہیں۔ مگر عورتیں جو حکمران ہوئی ہیں، ہمیشہ ہی قابل فخر حکمران کہلائی گئی ہیں۔ جس کا بین ثبوت ہمیں نواب سکندر جہاں بیگم کی صورت میں ملتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سلطان شاہ،بیگمات بھوپال، مشرق۔ پشاور/اسلام آباد۔ منگل، ۳۰ اگست ۲۰۱۶

۲۔ و۔اصاحبہ،تذکرہ بیگمات بھوپال(لاہور: دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۳۳ء)، ص ۱۱

۳۔ سلطان جہاں بیگم، نواب،حیات قدسی(بھوپال: مطبع ریاست بھوپال، ۱۹۱۷ء)، ص ۱۲۴

۴۔ طیبہ بی،تاریخ فرماروایان بھوپال(بھوپال: موتی مسجد محل، ۱۹۷۷ء)، ص ۶۱

۵۔ سلطان جہاں بیگم، نواب،حیات قدسی(بھوپال: مطبع ریاست بھوپال، ۱۹۱۷ء)، ص ۱۳۷

۶۔ مارہروی، محمد امین،بیگمات بھوپال(بھوپال: مطبع ریاست بھوپال، ۱۹۱۸ء)، ص ۴۲

۷۔ طیبہ بی،تاریخ فرمانروایان بھوپال(بھوپال: موتی مسجد محل، ۱۹۷۷ء)، ص ۳۲

۸۔ ایضاً، ص ۹۶

۹۔ ایضاً، ص ۹۷

۱۰۔ ایضاً، ص ۸۲

۱۱۔ ایضاً، ص ۷۸

۱۲۔ سلطان جہاں بیگم، نواب،تزک سلطانی(حصہ اول)(بھوپال: مطبع سلطانی بھوپال، ۱۳۲۸ھ)، ص ۱۷

۱۳۔ طیبہ بی،تاریخ فرماروایان بھوپال(بھوپال: موتی مسجد محل، ۱۹۷۷ء)، ص ۷۸

۱۴۔ نواب سلطان جہاں بیگم،تزک سلطانی(حصہ اول)،(بھوپال: مطبع سلطانی بھوپال، ۱۳۲۸ھ)، ص ۲۱

۱۵۔ طیبہ بی،تاریخ فرماروایان بھوپال(بھوپال: موتی مسجد محل، ۱۹۷۷ء)، ص ۹۸

۱۶۔ ایضاً، ص ۸۹۔۹۰

۱۷۔ ایضاً، ص ۹۰

۱۸۔ ایضاً، ص ۹۱

۱۹۔ مارہروی، محمد امین،بیگمات بھوپال(بھوپال: مطبع سلطانی ریاست بھوپال، ۱۹۱۷ء)، ص ۵۰۔۵۱

۲۰۔ ایضاً، ص ۵۱(حصہ اول)

۲۱۔ ایضاً، ص ۵۲

۲۲۔ ایضاً، ص ۵۳

۲۳۔ ایضاً، ص ۶۰

۲۴۔ سلطان جہاں بیگم، نواب، تزک سلطانی (حصہ اول)، (بھوپال: مطبع سلطانی بھوپال، ۱۳۲۸ھ) ص ۲۰

۲۵۔ و۔ اصاحبہ، تذکرہ بیگمات بھوپال (لاہور: دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۳۳ء)، ص ۱۵

۲۶۔ شہریار خاں Sheryar khan، The Begums of Bhopal (Viva books private Ltd.N.Delhi.)، ص ۹۲

۲۷۔ و۔ اصاحبہ، تذکرہ بیگمات بھوپال (لاہور: دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۳۳ء)، ص ۹

۲۸۔ ایضاً، ص ۲۲

۲۹۔ ایضاً، ص ۲۳

۳۰۔ سلطان جہاں بیگم، نواب، حیات قدسی (بھوپال: مطبع ریاست بھوپال، ۱۹۱۷ء)، ص ۲۰۷

۳۱۔ سلیم حامد رضوی، ڈاکٹر، اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ (دہلی: فائن آفیسٹ پریس، ۲۰۱۴ء)، ص ۱۷۵

۳۲۔ طیبہ بی، تاریخ فرمارو ایان بھوپال (بھوپال: موتی مسجد محل، ۱۹۷۷ء)، ص ۹۹

۳۳۔ نواب سلطان جہاں بیگم، آئین سکندری (مطبع بھوپال، سن ن)، ص ر

۳۴۔ ایضاً، ص ب

۳۵۔ سلیم حامد رضوی، ڈاکٹر، اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ (دہلی: فائن آفیسٹ پریس، ۲۰۱۴ء)، ص ۱۷۴

۳۶۔ و۔ اصاحبہ، تذکرہ بیگمات بھوپال (لاہور: دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۳۳ء)، ص ۲۸

۳۷۔ سلطان جہاں بیگم، نواب، آئین سکندری (مطبع بھوپال، سن ن)، ص ا

باب سوم

باب سوم

نواب شاہجہاں بیگم کی تحریروں میں خواتین کی تعلیم کے فروغ کی کاوشوں کا تحقیقی جائزہ

نواب شاہجہاں بیگم:

نواب شاہجہاں بیگم کی ولادت ۳۰ جولائی ۱۸۳۸ء کو قلعہ اسلام نگر میں ہوئی تھی۔ انہوں نے نواب سکندر جہاں بیگم جیسی اعلیٰ صفات کی حامل والدہ اور نواب قدسیہ بیگم سی ذہین وفطین نانی کی شفقت میں پرورش پائی۔ اگرچہ اس زمانے میں تعلیم وتربیت کے جدید طور طریقے رائج نہیں ہوئے تھے۔ لیکن ایک تعلیم یافتہ اور روشن خیال ماں جسے قدرت نے غیر معمولی قابلیت وصلاحیت اور بیدار مغزی سے نوازا ہو اپنی اولاد کی جیسی عمدہ تربیت کر سکتی ہے، ویسے ہی نواب سکندر بیگم نے اپنی اکلوتی بیٹی کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم وتربیت کا اہم فـــریضــــہ سرانجام دیا۔ خانہ داری کی تعلیم نواب سکندر جہاں بیگم نے خود دی اور دینی ودنیاوی تعلیم کے لیے اس زمانے کے مشہور اور ممتاز علماء کو مقرر کیا۔ جن میں اس وقت کے مستند عالم حضرات مولوی حبیب احمد، حاجی عبدالکرین انصاری اور منتہی الکلام کے مصنف مولوی حیدر علی خاں کو مقرر کیا۔ نواب شاہجہاں بیگم کو بطور ولی عہد ریاست، بھوپال کے ریاستی معاملات سے واقفیت ہونا لازمی تھی اس لیے ان کی تربیت میں اس چیز کا خاص دھیان رکھا گیا تھا۔ علاوہ ازیں باقاعدگی سے شہسواری اور نشانہ بازی کی بھی مشق کرائی جاتی تھی۔ نواب شاہجہاں بیگم نے ذہانت، شوق اور دلچسپی سے یہ تمام تعلیمی وتربیتی مراحل بہت جلد طے کر لیے تھے۔ نواب سلطان جہاں بیگم اپنی والدہ نواب شاہجہاں کی صلاحیتوں کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ

> نواب شاہجہاں بیگم وسیع الاخلاق، منکسر المزاج، قول کی مضبوط، ارادہ کی مستقل اور غیور تھیں، ان کو دستکاری کا بہت شوق تھا بارہا اون کے صفات عالیہ کا اس درجہ تجربہ ہو چکا تھا کہ کوئی متنفس اونسے انکار نہین کر سکتا۔(۱)

نواب شاہجہاں بیگم ابھی ۸ برس کی تھیں کہ ان کے والد نواب جہانگیر محمد خان معدہ کی مرض میں مبتلا ہو گئے تھے۔ بعض ریاستی معاملات کی وجہ سے اول اول تو بیماری کو پوشیدہ رکھا گیا مگر بعد ازاں جب معاملہ حد سے بڑھا تو بیماری کی خبر پھیل گئی۔ اس صورت حال میں بیوی اور بیٹی سے بھی ضبط نہ ہو سکا اور عیادت کے لیے بھوپال تشریف لے

آئیں۔نواب جہانگیر بیوی اور بیٹی کی آمد پر خوش ہوئے۔اپنی بیماری کا تمام حال سنایا اور نواب سکندر بیگم سے شکوہ کیا کہ اگر وہ ان کی بیماری میں ان کے پاس ہوتیں تو یہ حالت نہ ہوتی کیونکہ نہ تو ان کا علاج اچھی طرح ہوا نہ ہی دیکھ بھال کی گئی۔نواب سلطان جہاں بیگم لکھتی ہیں کہ

> سرکار خلد نشین نے کہا مین علاج اور تیمارداری کے لئے تیار ہون بشرطیکہ آپ میرے پاس رہیں وہ راضی ہو گئے مگر ان کے ماموں نے رہنے نہ دیا۔اسوقت ایک عجیب حالت تھی بیوی اور بیٹی کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔۔۔۔۔ناچار سرکار خلد نشین اور نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ اسلام نگر کو واپسی کی غرض سے روانہ ہو گیئن دلی بے چینی جو ایسے موقعوں پر خود بخود پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ بہوپال اور اسلام نگر کے درمیان قیام کیا۔ایک ہفتہ بعد نواب صاحب کا انتقال ہوا۔اور یہ اطلاع ملی کہ نائب الریاست یعنی اون کے مامون اسد علی خان اور چند لوگوں نے اتفاق کر کے نواب صاحب کے فرزند دستگیر محمد خان کو جو ایک طوائف کے بطن سے تھے مسند نشین ریاست کر دیا اور توپ خانہ سے سلامی بھی ادا کر دی گئی۔(۲)

مندرجہ بالا صورت حال سے نواب سکندر جہاں بیگم بہت اداس ہوئیں اور فوراً ایجنسی میں ایک خط موجودہ صورت کے متعلق تحریر کیا تھا۔اس خط میں نواب شاہجہاں بیگم صاحب کا استحقاق ظاہر کر کے اس عہد نامہ کا حوالہ دیا گیا تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی اور نواب نظر محمد خان کے مابین جانشینی کے حوالے سے طے ہوا تھا۔پولیٹیکل ایجنٹ سہیور بھوپال آئے اور اس صدر نشینی کو غلط قرار دے کر نواب گورنر جنرل بہادر کو اس کیفیت کی اطلاع کی اور اس سب کے بعد بھی نواب گورنر جنرل بہادر کے حکم سے اسد علی خان کو بدستور نائب الریاست کی حیثیت سے کام کرنے کا حکم دیا۔اس کے بعد نواب سکندر بیگم کے نام لارڈ ہارڈنگ (Loard Hardeng) نواب جنرل بہادر کا خط تاریخ ۲۸ دسمبر ۱۸۴۴ء کو موصول ہوا۔جس میں تعزیت کے بعد یہ اطلاع تھی کہ بھوپال کے رسم و رواج کے مطابق نواب شاہجہاں بیگم کی مسند نشینی منظور ہو گئی اور یہ بھی کہا گیا کہ جس وقت شاہجہاں بیگم تخت نشین ہوں گی ان کا شوہر رئیس ہو گا۔اور ان کی بلوغت تک امور ریاست پولیٹکل ایجنٹ بہادر انجام دے گا۔نواب غوث محمد کے بیٹے فوجدار خان جن کی قابلیت، لیاقت پر سب کو بھروسہ تھا ریاست کو وہ سنبھالیں گے۔بقول سلطان جہاں بیگم

> ڈیڑھ مہینے کے بعد صاحب پولیٹیکل ایجنٹ نے نواب گورنر جنرل بہادر کے حکم سے نواب شاہجہاں بیگم کو مسند نشین ریاست اور میاں فوجدار محمد خان کو ریجنٹ مقرر کیا۔۔۔۔نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ بھوپال چلی آئیں اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ مختاری ریاست کا مرحلہ طے ہونے پر سرکار خلد نشین کو نواب شاہجہاں بیگم کی شادی کی فکر در پیش ہوئی۔۔۔۔(۳)

مندرجہ بالا صورت حال کے سبب نواب سکندر جہاں بیگم نے اس فکر کے پیش نظر خاندانِ ریاست پر غور کیا اور بعض کو اپنے ذہن میں منتخب کر لیا اور ان کی تربیت کا خصوصی اہتمام بھی فرمایا تھا۔ تا کہ ان میں سے جو لڑکا قابل نکلے اس کے ساتھ عقد کر دیا جائے لیکن جب ان میں ذاتی وصفاتی سطح پر خامیاں پائیں تو وائسرائے ہند کی اجازت سے بھوپال اور بھوپال سے باہر دوسرے خاندانوں میں تلاش شروع کر دی تھی۔ جو ہر لحاظ سے لائق تھے ان کے بارے میں صاحب پولیٹکل ایجنٹ کو اطلاع دی۔ ساتھ ہی نواب شاہجہاں بیگم کے متعلق خود مختار حکمران ہونے کے لئے نواب سکندر بیگم نے حکومت برطانیہ سے خط و کتابت کی اور یہ طے کیا کہ ان کا شوہر امور ریاست میں بے اختیار ہو گا۔ بقول نواب سلطان جہاں بیگم

> خاندان میں نواب شاہجہاں بیگم کی شادی کے لائق کوئی نظر نہیں آتا اور جب غیر خاندان میں شادی ہو گی تو نہ معلوم انجام کیا ہو۔ اس لئے مناسب ہوتا ہے کہ ریاست نواب شاہجہاں بیگم کے نام رہے اون کا شوہر امور ریاست مین بے اختیار ہو صرف نام و مرتبہ و عزت مین نواب رہے مگر اون مین سے جو اولاد ہو وہ مستقل نواب اور مالک قرار پائے۔۔۔۔(۴)

مجوزہ رائے کے مطابق نواب گورنر نے تسلیم کیا کہ ریاست کا انتظام وانصرام نواب شاہجہاں بیگم کی ۲۱ برس کی عمر تک نواب سکندر جہاں بیگم کے پاس ہی رہے گا کیونکہ امور ریاست میں ان کے انتظام وانصرام سے برطانوی حکومت بہت مطمئن تھی۔ لیکن اس کے بعد جب نواب شاہجہاں بیگم مقررہ عمر میں پہنچنے کے بعد اگر مسند ریاست یا حکومت کی خواہش کریں گی تو اس وقت ان کی مرضی کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی جائے گی یوں حکومت کی طرف سے باقاعدہ منظوری دے دی گئی۔ اس حکومت کی طرف سے باقاعدہ منظوری کے بعد نواب سکندر بیگم کو بہت خوشی

ہوئی اور انہوں نے باقی محمد خان بہادر کے نام خط بھیجا جس کا نفس مضمون کچھ اس طرح سے تھابقول نواب سلطان جہاں بیگم

> آج بفضل قادر و ذوالجلال عزت سلطانہ پیشگاہ نواب ستطاب معلی القاب گورنر جنرل صاحب بہادر سے نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ اطال اللہ عمرہا کے ساتھ آپ کی شادی کا خریطہ منظوری صادر ہو گیا اللہ تعالیٰ آپ کو مبارک کرے اور ہم نے اپنی طرف سے آپ کو خطاب امراودولہ دیا ہے چونکہ اس خوشخبری کی اطلاع آپ کو ضروری تھی لہذا اطلاعاً لکھا گیا۔(۵)

یوں بالآخر ۱۱ذی قعدہ ۱۲۷۱ھ کو نواب شاہجہاں بیگم کا نکاح بھوپال کی فوج کے کمانڈر انچیف بخشی بہادر باقی محمد خاں سے ہوا۔ نکاح مولوی عبدالقیوم دہلوی نے پڑھایا تھا۔ گورنمنٹ کی منظوری کے بعد بخشی باقی محمد خان کو نواب "نظیرالدولہ "اور "امراؤوالدولہ "کا خطاب دیا گیا اور اعزاز میں ۲۱ ضرب توپ سر ہوئیں۔ شادی کے تین سال بعد ۹ جولائی ۱۸۵۸ء بروز جمعہ کو نواب سلطان جہاں بیگم کی ولادت ہوئی۔

نواب شاہجہاں بیگم اپنی ذاتی صفات کی وجہ سے ہر دلعزیز شخصیت تھیں اور اس بنیاد پر وہ باضابطہ طور پر ریاست بھوپال کی حکمران منتخب ہوئیں۔ تاریخ پر اگر نظر دوڑائی جائے تو یہ حقیقت بہت کھل کر واضح ہو جاتی ہے کہ شاہی خاندانوں میں محبت کی وقعت و حیثیت ایک بے معنی لفظ سے کچھ زیادہ نہیں رہی اور حکمرانی کے شوق میں یہ جذبہ نفرت و عداوت میں بدل جاتا ہے۔ ان حالات میں نواب شاہجہاں بیگم کی طرف سے والدہ نواب سکندر جہاں بیگم کے حق میں حکمرانی سے دستبرداری، سعادت مندی اور ایثار کی نادر مثال ہے۔ ۱۸۶۰ء میں سکندر بیگم کو فرمانروائے ریاست اور شاہجہاں بیگم کو ولی عہد ریاست تسلیم کر لیا گیا۔ و۔ اصاحبہ

> انگریزوں نے نواب سکندر بیگم کے حقوق تسلیم کر لیے۔ لیکن یہ فیصلہ کہ وہ رئیس بنائی جائیں یا نواب شاہجہاں بیگم بدستور اپنی جگہ رہیں۔ نواب شاہجہاں بیگم کی مرضی پر منحصر رکھا، انہوں نے اس چندروزہ دنیوی ریاست و حکومت کو کوئی چیز نہ سمجھا۔ اور خوشی سے ان قدموں پر قربان کر دیا جن کے نیچے جنت کا یقین تھا۔(۶)

اسی تناظر میں دیکھا جائے تو حکومتوں اور سلطنتوں کی تاریخ میں اس قسم کی مثالیں شاذ و نادر ہی ملیں گی کہ کسی حکمران ریاست نے فرماں روائی کے حق کو اپنے کسی عزیز کی دلجوئی، ادب یا محبت کی وجہ سے ترک کر کے حکومت سے دست برداری کی ہو۔ مگر جب تک اس زریں واقعہ کا تذکرہ تاریخی صفحات پر رہے گا نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ کی سعادت مندی ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ نواب شاہجہاں کے شوہر نواب باقی محمد خان علوم و فنون کے ماہر اور اعلیٰ انسانی صفات کے حامل تھے۔ ریاست میں ملازمت کے دور میں دیگر اراکین ریاست کے ساتھ ان کے تعلقات نہایت دوستانہ بنیادوں پر استوار رہے تھے۔ حتیٰ کے نوابی کے زمانہ بھی انہوں نے اپنے عمدہ برتاؤ سے کبھی کسی رکن ریاست کو شکایت کا موقع نہیں دیا اور حسن سلوک سے سب کو خوش رکھا۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے اس حوالے سے لکھا ہے کہ

> ریاست کی خیر خواہی اور وفاداری نواب صاحب کی موروثی صفت تھی، انکی تمام عمر ریاست کی خیر خواہی مین بسر ہوئی اور وہ اپنے اسلاف کی پیروی سے کبھی منحرف نہیں ہوئے اور جادہ وفاداری سے کبھی باہر قدم نہیں رکھا۔۔۔ نواب قدسیہ صاحبہ کو بھی نواب صاحب پر اسقدر اعتماد تھا کہ جب فوج نے زرلین اور دوماہ کا جھگڑا برپا کیا تو انہوں نے بھی نواب سکندر بیگم کو مشورہ دیا کہ برخوددار امراؤالدولہ کے سپرد کل انتظام کیا جائے اور ان کی پوری خاطر سے دلجوئی رکھی جائے۔(۷)

نواب سکندر جہاں بیگم کے سفر حج سے واپسی کے بعد نواب باقی نظیر الدولہ صاحب نے فوراً ہی بیت اللہ جانے کا ارادہ کیا اور اس کی اطلاع رزیڈنسی کو بھی دے دی۔ منظوری کے بعد نواب باقی نظیر الدولہ بہادر ۱۲۸۳ھ میں فرض حج ادا کرنے کی غرض سے بیت اللہ گئے تھے۔ ان کی طبیعت سفر حج سے پہلے بھی خراب تھی مگر وہاں اور زیادہ ہو گئی اور سفر کی تھکان سے مرض اور زیادہ بڑھ گیا۔ انہوں نے چند دن مصر میں ٹھہر کر علاج کرایا مگر افاقہ نہ ہوا۔ مصر سے بھوپال آئے یہاں یونانی اور ڈاکٹری علاج کیا گیا لیکن صحت یاب نہ ہوئے اور نواب باقی محمد خاں کا ۲۰ صفر ۱۲۸۴ھ میں انتقال ہو گیا۔ اس طرح شادی کے ۱۲ سال بعد نواب شاہجہاں بیگم کو ۲۹ برس کی عمر میں بیوگی کا غم برداشت کرنا پڑا۔ کچھ عرصے بعد نواب سکندر جہاں بیگم تقریباً ۹ سال تک فرمانروائے بھوپال رہنے کے بعد ۱۳ رجب ۱۲۸۵ھ میں وفات پا گئیں۔ اس موقع پر منشی عبد العزیز رقم نے مصرع تاریخ لکھا بقول ڈاکٹر رضیہ حامد "حاکم سد آن دو بار وولیعہدہ

شد دوبار" (۸) یکے بعد دیگرے ان غموں نے نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ کی نگاہ میں دنیا کی بے ثباتی کا تصور واضح کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے نہایت شکستہ دلی کے ساتھ فرمایا بقول ڈاکٹر رضیہ حامد

اے چرخ چہ کر دی بہ سلیمان و سکندر
کز تو ہوس عیش بود شاہجہاں را (۹)

نواب سکندر جہاں بیگم کی وفات کے غم میں تین دن تک کاروبار ریاست بند رہے تھے۔ ۱۶ نومبر ۱۸۶۸ء کو سر جان میڈ ایجنٹ (Sir John Mede) گورنر جنرل بہادر اور کرنل جان ولیم ولبی آسبورن (John Walbiasborn) صاحب مختلف امور کی انجام دہی کی خاطر بھوپال تشریف لائے اور موتی محل میں دربار منعقد ہوا۔ اس دربار میں یہ طے پایا گیا کہ گورنمنٹ کی منظوری سے صدر نشینی نواب شاہجہاں بیگم اور ولیعہدی ان کی اولاد نواب سلطان جہاں بیگم کو دی جائے گی۔ چنانچہ ۱۶ نومبر ۱۸۶۸ء کو بھوپال کے موتی محل میں نواب شاہجہاں بیگم ریاست کی حکمران مقرر کی گئیں۔ اشتہارات کے زریعے رعایا و امراء جاگیرداروں، سرداروں اور ارکین ریاست کو نواب شاہجہاں بیگم کو اپنا حکمران تصور کر کے جان و دل سے اطاعت و فرمانبرداری کی تلقین کی گئی۔ اس تقریب میں مسند آرائی کے بعد نواب شاہجہاں بیگم نے تقریر کی جس میں انہوں نے کہا کہ

> اول میں شکر ادا کرتی ہوں اپنے خدا کا جس نے مجھ کو نواب سکندر بیگم والیہ بھوپال سے پیدا کیا۔ اور شکر کرتی ہوں مین اپنی بادشاہ وقت ملکہ معظمہ وکٹوریہ بادشاہ ہندوستان وانگلستان اور اون کے اراکین دولت کا جنہوں نے میری والدہ نواب سکندر جہاں بیگم صاحبہ پر بڑے احسان کیے۔ تمام عمر مین اپنے بادشاہ وقت کی اور ارکان دولت کے احسانوں کی ممنون ہو چکی اب آرزو کرتی ہون مین خداوند کریم سے کہ میری تمام عمر مثل میری مان کے خیر خواہی سرکار انگریزی اور انتظام ریاست بہوپال اور رفاہ مخلوق مین گزرے۔ (۱۰)

اس دور میں سلطنت ہند پر حکومت برطانیہ کا تسلط برقرار تھا۔ روساء ہند پر "ملکہ معظمہ قیصرہ ہند" کی توجہ خصوصی تھی۔ انہوں نے نواب سکندر بیگم کی وفات پر ۱۳ جولائی ۱۸۶۹ء کو نواب شاہجہاں بیگم سے تعزیتی خط بھیجا جس میں گہرے رنج و ملال کا اظہار کیا تھا۔ اس خط میں انہوں نے نواب شاہجہاں بیگم کو مسند نشینی کی مبارکباد دی۔ نواب شاہجہاں بیگم کی مسند نشینی اور بھوپال کے حالات کے حوالے سے عبدالغنی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ

> انگریز پوری طرح بر صغیر پر مسلط اور قابض ہو چکے تھے۔ مشرق کے لوگ دیار غیر سے مغربی اور یورپی تہذیب کو اپنانا باعث فخر سمجھنے لگے تھے۔اور اس کے بدلے میں اپنا بیش بہا علمی اور قدرتی خزانے دیار غیر کو برآمد کرنے لگے تھے۔ایسے میں بھوپال کے محافظ کی حیثیت سے جو عظیم شخصیت سامنے آئی وہ نواب شاہجہاں بیگم کی تھی۔(۱۱)

نواب شاہجہاں بیگم کے لیے انتظام ریاست اور اس کے امور کی انجام دہی دقت طلب کام نہیں تھا۔ وہ ابتداء ہی سے محنت کی عادی تھیں۔ان کو حالات ریاست سے پوری واقفیت تھی کیوں کہ وہ اپنی نانی اور والدہ سے حکمرانی کی تعلیم مکمل طور پر حاصل کر چکی تھیں۔اس لیے ریاست کو ہاتھ میں لیتے ہی بذات خود معائنہ کی طرف توجہ دی جس میں سب سے پہلے ملکی خزانے کا جائزہ لیا گیا۔ریاست پر قریب ۷ لاکھ قرض ہو گیا تھا،اسکی ادائیگی کا انتظام کیا تھا۔ نواب شاہجہاں بیگم کے دور حکومت میں ملک میں تین مرتبہ قحط پڑا۔ پہلی مرتبہ ۱۸۷۸ء میں لیکن یہ زیادہ سخت نہیں تھااور معمولی سی امداد سے رعایا کی مصیبتوں میں کمی ہو گئی۔دوسری مرتبہ ۱۸۹۴ء میں خشک سالی آئی جو نہایت سخت تھی اس دوران رعایا کو بہت پریشان ہوئی۔نواب شاہجہاں بیگم نے اس حوالے سے محتاج خانے قائم کیے اس کے علاوہ غیر ممالک سے کافی مقدار میں غلہ منگوا کر رعایا میں تقسیم کیا تھا۔قحط کے دنوں میں انسداد جرائم کی شرح بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ تیسری مرتبہ ۱۸۹۹ءایسا عالمگیر قحط نمودار ہوا کہ اطراف میں ایک مصیبت برپا تھی۔ بھوپال میں اگرچہ زیادہ خوفناک حالت نہیں تھی لیکن اطراف ہند میں بہت شدید صورت حال تھی۔دیگر شہروں کی آبادی نے بھوپال کا رخ کیااور پناہ گزین بن کر رہنے لگے۔اور نواب صاحبہ نے لوگوں کی سہولت کی خاطر ایک کمیٹی قائم کی اور ہر طرح کی مدد پہنچائی۔نواب شاہجہاں بیگم نے بہت فیاضی اور بلند حوصلگی کے ساتھ ریاست بنگال،مدارس اور گوالیار کے قحط زدگان کی مدد کی۔بقول رضیہ حامد

> ریاست بھوپال کے اطراف و جوانب سے بے شمار قحط زدہ افراد نے پناہ لی۔ نواب شاہجہاں بیگم نے ان لوگوں کی آسائش کا انتظام ریاستی مسائل کی خاطر مختلف علاقوں اور ممالک کے دورے کیے۔سب سے بڑا سفر حجاز تھا۔علاوہ ازیں ریاست کا مشرق،مغرب شمال، جنوب اور جنوب کا دوبار دورہ کیا۔(۱۲)

علاوہ ازیں نواب شاہجہاں بیگم نے قانون سازی کی طرف توجہ دی اور ایک مستقل محکمہ ترتیب قانون کا بنام "تنظیمات شاہجہانی" قائم کیا۔اس حوالہ سے نواب سلطان جہاں بیگم لکھتی ہیں کہ

> حیات شاہجہانی" میں لکھتی ہیں کہ "اس ادارہ میں دیوانی، فوجداری مال، اور مختص الامور قوانین و قواعد ترتیب دیئے گئے ان کو طبع کرا کے ملک مین نافذ کیا اور پھر سلسلہ ترتیب قوانین و قواعد برابر جاری رہا اور اسمین وقتاً فوقتاً اصلاح بھی ہوتی رہی، دیوانی، فوجداری، مال کے نہایت عمدہ ضابطے تیار ہوئے، تعزیرات شاہجہانی، تنبیہات شاہجہانی، توضیحات شاہجہانی نافذ کیے گئے۔(۱۳)

نواب شاہجہاں بیگم بیوگی کے عالم میں ریاست کے نظم ونسق کی اصلاح و ترقی میں ہمہ تن مصروف رہیں اور ریاست کے دورے کیے تھے۔کلکتہ جا کر ڈیوک آف ایڈمبرا سے ملاقات کی۔اسی سفر میں پولیٹیکل ایجنٹ اور کرنل ٹامسن پولیٹکل (Col.Tomsan) اور رچرڈ میڈ(Richard Made)ایجنٹ نواب گورنر جنرل بہادر سنٹرل انڈیا نے مشورہ دیا کہ نواب شاہجہاں بیگم کو نکاح کر لینا چاہیے تاکہ جو شخص نکاح میں آئے امور ریاست میں مددگار ثابت ہو سکے۔دیکھا جائے تو شریعت کی رو سے نکاح ثانی ایک اچھا عمل ہے اور نواب شاہجہاں بیگم کو اس وقت ایک ایسے ساتھی کی جو ان کے امور ریاست کی انجام دہی میں فعال ہو اشد ضرورت تھی۔لہذا انہوں نے سرکار عالیہ کے مشورے کے بعد بھوپال واپس آ کر اپنے مشیر ریاست اور دیگر ارکان ریاست سے صلاح مشورہ سے مولوی سید صدیق خان صاحب کو نواب شاہجہاں بیگم نے منتخب کیا۔نواب شاہجہاں بیگم نے نواب قدسیہ بیگم کی رضا کے بغیر یہ فیصلہ کر لیا تھا۔اس فیصلے کے پس پشت چند ایسے واقعات پیش آئے جو نانی اور نواسی کے درمیان رنجشوں کا سبب بنے تھے۔نواب سلطان جہاں بیگم اس تناظر میں لکھتی ہیں کہ

> نواب جہانگیر محمد خاں بہادر اور نواب قدسیہ بیگم سے ایک عرصہ تک خانہ جنگی رہی تھی اور نواب صاحب موصوف نواب شاہجہاں بیگم کے والد تھے اس لئے ان پرانے واقعات نے نانی کے ساتھ تعصبات بھی پیدا کر دیئے تھے،۔۔۔۔جب نواب شاہجہاں بیگم نے نواب صدیق حسن خان کے ساتھ عقد ثانی کیا تو یہ عقد ان کے مشورہ و اطلاع کے بغیر ہوا تھا۔نواب صدیق کا اس ریاست سے کوئی تعلق

نہیں تھااور نہ کوئی کار اہم ظہور پزیر ہوا تھا جس سے خاندان ریاست ان کا مشکور ہوتا۔(۱۴)

اور یوں پھر نواب شاہجہاں بیگم نے اپنے شوہر نواب باقی محمد خاں کے انتقال کے تین سال بعد مولوی محمد صدیق حسن قنوجی سے ۸ مئی ۱۸۷۱ء سے عقد ثانی کیااور اسکی اطلاع حسب قاعدہ ایجنسی وغیرہ کو دی گئی تھی۔شاہجہاں بیگم نے اپنے سابق شوہر کی طرح محمد صدیق حسن قنوجی کو خطاب واعزازات دلوانے کے لئے حکومت برطانیہ سے خط و کتابت کی تھی۔یوں بھوپال ریاست سے نواب اور خاں کے خطاب سے نوازا گیا۔اس کے علاوہ حکومت برطانیہ کی منظوری کے بعد دہلی دربار میں شرکت کے موقع پر جن اعزازات سے نوازا گیااس حوالے سے رضیہ حامد لکھتی ہیں کہ

> وائسرائے کی جانب سے نواب صدیق حسن خاں کو خطاب والا جاہ امیر الملک اور خلعت عطا کی گئی۔حدود برطانیہ میں سترہ توپوں کی سلامی مقرر ہوئی۔شاہجہاں بیگم نے ریاست کی جانب ۷۵ ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر مرحمت فرمائی۔شوہر رئیسہ ہونے کی وجہ سے درباروں میں شرکت کے موقع پر نواب صدیق حسن خاں کی نشست کا خصوصی اور امتیازی اہتمام کیا جاتا تھا۔(۱۵)

نواب شاہجہاں بیگم کو نواب صدیق حسن خاں سے دلی وابستگی تھی۔انہوں نے نواب صاحب کو اپنی معیت سے کبھی جدا نہیں ہونے دیا۔نواب صدیق خاں کے اعزاز اور اقتدار میں اضافہ کے لئے ہمیشہ کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب ہوئیں۔نواب شاہجہاں بیگم متعدد مرتبہ نواب صدیق حسن خاں کو اپنے ساتھ ہندوستان لے کر گئیں۔نواب صدیق حسن خاں کی کئی ریاستوں کے حکمرانوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور کئی علماء وقت سے تبادلہ خیال کا موقع ملا۔بقول و۔ا۔صاحبہ

> نواب صدیق حسن خاں کو ایسے بہت سے امتیازات واعزازات حاصل ہوئے جو اس سے قبل بھوپال کے کسی فرمانروا کو حاصل نہیں ہوئے تھے۔ریاست بھوپال کی طرف سے مجروحین ترک کی امداد کے صلہ میں سلطان ترکی عبدالحمید خاں غازی نے ۱۲۹۶ھ میں نواب شاہجہاں بیگم کو تمغہ شفقت اور نواب صدیق حسن خاں کو تمغہ مجیدی درجہ دوم عطا کیا۔(۱۶)

نکاح کے بعد سے نواب صاحب بہادر کی مداخلت امور ریاست میں شروع ہو گئی اور نواب شاہجہاں بیگم ان کی مداخلت کو اپنی مدد تصور کر کے مطمئن ہو گئیں اور اس طرح نواب سکندر بیگم کی وہ پالیسی کہ شوہر امور ریاست سے بے دخل رہے، تبدیل ہو گئی تھی۔ نواب صدیق حسن خان کا عمل دخل امور حکومت میں کثرت سے نظر آتا ہے لیکن وہ حکومتی امور کا صحیح علم نہیں رکھتے تھے اس کے باوجود وہ تمام معاملات پر حاوی ہو گئے تھے۔ انھوں نے اپنے گرد و پیش ایسے لوگوں کو جمع کر لیا تھا جو نظریاتی سطح پر ان کے ہم خیال و معاون تھے اور اس مداخلت کی وجہ سے تقریباً تمام بڑے بڑے سرکاری عہدے ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آ گئے تھے جن کو نہ ضرورت زمانہ کا احساس تھا اور نہ ہی رعایا سے ہمدردی تھی۔ اس لیے ریاستی انتظام میں بدنظمی پھیلتی گئی تھی۔ بقول نواب سلطان جہاں بیگم

> سرکار خلد مکان نواب صدیق حسن خان صاحب کی طبیعت سے ناواقف تھیں، اور اس ناواقفیت کے ساتھ ان کا حسن ظن کچھ اس درجہ پر تھا کہ نواب صدیق حسن خان صاحب کے خلاف کوئی بات سنا چاہتی تھیں، اور نہ کوئی کام نامنظور تھا، اس لیے وہ ایک عرصہ تک مغالطہ میں رہیں۔۔۔ نواب صدیق حسن ایک ذہین، ذی علم انسان تھے لیکن اس ذہانت کا استعمال کچھ اس طریقہ سے ہوا جس کے نتائج نہایت افسوسناک مرتب ہوئے۔(۱۷)

نواب شاہجہاں بیگم کی بدولت نواب صدیق سے نرمی برتتے ہوئے سر لیفل گریفن (Sir Lefil Griffen) نے صرف انتباہ کیا اور شاہجہاں بیگم کو حکم دیا گیا کہ صدیق حسن خاں کی مداخلت حکومت کے کاموں میں روک دی جائے اور حکومت کے کاموں کے لیے ایک قابل اور مدبر مدار المہام مقرر فرمائیں۔ اگر دیکھا جائے تو اس حکم نامے کے پیچھے سب سے بڑی وجہ ان کی تصنیفات میں سے بعض کتابوں میں کچھ ایسے مضامین تھے جن کو گورنمنٹ کے خلاف سمجھا گیا تھا۔ نواب صدیق پر انگریزوں نے جہاد کی ترغیب دینے، باغیانہ خیالات تحریر کرنے اور ان کی اشاعت کا الزام لگایا۔ اس کے باوجود نواب صدیق حسن خاں کے رویہ میں جب کوئی فرق نہ آیا تو برطانوی حکومت نے سخت قدم اٹھایا۔ اس خطرناک مرحلہ میں نواب شاہجہاں بیگم کی وفاداری، عزم و حوصلہ نے نواب صاحب کی پشت پناہی کی۔ نواب صاحب کو گرفتار کرنے کے لیے انگریزی فوج نے نواب شاہجہاں بیگم کے رہائشی محل "التاج محل" کا محاصرہ کر لیا اور شاہجہاں بیگم سے کہلوایا کہ نواب صاحب کو انگریزی فوج کی حراست میں دے دیا جائے۔

بھوپال کے قاضی وجدی الحسینی اپنی کتاب بھوپال تحریکات آزادی کے آئینے میں اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> نواب شاہجہاں بیگم نے کمانڈر افواج کو باریاب کر کے صورت حال معلوم کر کے پردہ کے اندر سے اپنی جوتی پھینک کر فرمایا اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا جواب یہ ہے اور کہا کہ میں نے اپنی رعایا کو اشارہ کر دیا تو تم میں سے کسی کی ایک بوٹی بھی نہ ملے گی۔ بعد میں جو ہو گا میں دیکھ لوں گی۔ یہ میری ناموس کا معاملہ ہے۔(۱۸)

یوں نواب شاہجہاں بیگم کے اس سخت رویہ سے انگریزی فوج نے محاصرہ ختم کر دیا تھا لیکن انگریز افسر نے اس معاملہ کو ٹھنڈا نہیں ہونے دیا۔ چند ہفتہ گزرنے کے بعد سر لیفل گریفن نے ایک خصوصی دربار منعقد کر کے نواب صدیق حسن خاں کے خطابات واعزازات کی واپسی اوران کی ریاست سے معزولی کے احکام کا اعلان بر سر خاص وعام کر دیا تھا۔ نواب شاہجہاں بیگم اور ریاست بھوپال کے سابق فرمانرواؤں کا لحاظ کرتے ہوئے حکومت برطانیہ نے نواب صدیق حسن خاں کو صرف بے دست وپا بنانے پر اکتفا کیا تھا۔ اس دور میں بھوپال میں انتشار، بدنظمی عام ہو گئی تھی۔ نواب صدیق حسن خاں کے خطابات واعزازات کی واپسی پر نواب شاہجہاں بیگم کو بہت غم و غصہ تھا لیکن ریاست بھوپال کے حالات کی درستگی میں بھی سر گرم رہیں تھیں۔ بقول سلطان جہاں بیگم

> مولوی صدیق حسن خان صاحب کے انتزاع خطاب کی کاروائی کے ساتھ ہی اون لوگوں کو سزا دینے کے لیے سفارش کی گئی جنکے مظالم نے غریب رعایا پر آفت ڈہائی تھی حسب ایمائے سرکار خلد مکان اون کے جرائم کی باضابطہ تحقیقاتین کی گئیں اور بعض کو اخراج اور بعض کو قید کی سزائیں ہوئین۔(۱۹)

نواب شاہجہاں بیگم کو اس بات کا پختہ یقین دلایا گیا تھا کہ مولوی صدیق حسن خان صاحب بے جرم ہیں۔ یہ سب کاروائی ان کے مخالفین کی سازشوں کا نتیجہ ہے، لہذا اس یقین پختہ کی بناء پر انہوں نے بہت دلیری کے ساتھ سر لیفل گریفن کا مقابلہ کیا۔ نواب صدیق حسن خاں کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے انہوں نے انگریز افسران سے شملہ جا کر ملاقات کی اور اس سلسلہ میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا۔ نواب شاہجہاں بیگم نے اس سلسلہ میں وائسرائے لارڈ فرن صاحب بہادر (Lord Faerran) سے ملاقات کے لیے روابط بڑھائے تاکہ معاملات پر نظر ثانی کی گزارش کر سکیں۔ نواب شاہجہاں بیگم دہلی بغرض ملاقات گئیں مگر وائسرائے کے پاس ملاقات کے لیے فرصت نہیں

تھی لہذا اس سلسلے میں کلکتہ جانے کا ارادہ کیا۔ گورنر جنرل بہادر سنٹرل انڈیا کو جب یہ معلوم ہوا کہ مولوی صدیق حسن خان بھی نواب شاہجہاں بیگم کے ساتھ ہوں گے تو انہوں نے سختی سے منع کیا کہ نواب شاہجہاں بیگم ان کو ہمراہ نہ لے کر آئیں۔ اس ملاقات کے احوال کے متعلق نواب سلطان جہاں بیگم لکھتی ہیں کہ

> مسٹر ڈیوریںڈ صاحب بہادر فارن سکریٹری نے سرکار خلد مکان سے ملاقات کی اور اونکو نہایت ادب، اور نرمی و اخلاق سے سمجھایا کہ جدید انتظامات مین کوئی تغیر نہیں ہو سکتا، بالآخر سرکار خلد مکان کو اس مقصد مین جسکے لیے سفر کیا گیا تھا ناکامی ہوئی چونکہ مسٹر ڈیوریںڈ صاحب بہادر افغانی قوم کے رسم و رواج سے واقف تھے۔۔۔۔اس موقع پر افسوس ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکے، اونہوں نے سرکار خلد مکان سے اپنے خلوص و ہمدردی کا اعادہ کر کے کہا کہ "یہ جو کچھ نتیجہ ہے وہ اسکا ہے کہ آپنے اپنے بزرگوں کے رسم و رواج کے خلاف نکاح ثانی کیا اور وہ بھی ایک ایسے شخص سے جو کوئی ممتاز شخص نہیں ہے۔(۲۰)

نواب شاہجہاں بیگم نے کلکتہ میں پندرہ دن قیام کیا اور پھر واپس آ گئیں۔ اگرچہ انتزاع خطاب و سلامی کے مولوی صدیق حسن خان صاحب کی معاملات ریاست میں کسی طرح کی ظاہری مداخلت نہیں رہی تھی۔ لیکن ان کو سب سے زیادہ آرزو اپنے اقتدار و اعزاز کو حاصل کرنے کی تھی۔ اس خواہش کے لیے وہ شب و روز نواب شاہجہاں بیگم کو کوشش کے لیے آمادہ کرتے رہے تھے۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے مولوی صدیق حسن خان کا احوال اپنی کتاب تاج الاقبال میں ایسے کیا ہے کہ

> اگرچہ میرا دل نہین چاہتا کہ مین مولوی صدیق حسن خان صاحب کے متعلق اپنی کتاب مین مفصل کیفیت درج کرکے ناظرین کو کتاب کو اون کی طبیعت کا اصل رنگ دکھلاؤں کیونکہ اون کو میری والدہ مکرمہ نے اعزاز بخشا تھا، اور شرعی عقد نے جو رشتہ سرکار خلد مکان مین اور اون مین پیدا کر دیا تھا اوسکے لحاظ سے مجھکو درگزر کرنا چاہیے تھا، اور دراصل میرا قلم ان حالات کو لکھتے وقت رکتا ہے، اور طبیعت مین کچھ روکاوٹ سی پیدا ہوتی ہے۔۔۔۔ لیکن خیال اسکے کہ مین ایک ایسی تاریخ لکھ رہی ہون جس مین میرے ملک و خاندان کے واقعات اس طرح ملے ہوئے ہیں کہ تحلیل کیمیاوی سے بھی جدا نہیں ہو سکتے، اس لیے ہر رطب و یابس

> چار و ناچار لکھنا پڑا ہے۔ مگر میں نے کوشش کی کہ اختصار سے کام لوں ورنہ میری حکایت درد انگیز قابل اختصار نہیں ہے۔(۲۱)

جب کہ مندرجہ بالا اقتباس کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو بیگم عبد الغنی نے صدیق حسن خان، نواب شاہجہاں بیگم اور نواب سلطان جہاں بیگم کے حوالے سے اپنی کتاب بیگمات بھوپال میں جو لکھا ہے وہ کچھ اس طرح سے ہے کہ

> نواب شاہجہاں بیگم کا دوسرا نکاح نواب صدیق حسن خان صاحب سے ہوا۔ ان کے تعارف کے لئے اتنا لکھنا کافی ہے کہ وہ علمائے دیوبند کے امام تسلیم کئے جاتے ہیں۔ لیکن اس نکاح سے شاہی خاندان میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ خود شاہجہاں کی بیٹی جو ولی عہد ریاست تھیں' خلاف ہو گئیں۔ اور آخر وقت تک ماں بیٹی میں ملاپ نہ ہو سکا۔(۲۲)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان سب حالات کے باوجود نواب شاہجہاں بیگم کو اپنے شوہر سے محبت تھی لہذا انھوں نے حکومت برطانیہ کے بارہا انکار کے باوجود کوشش جاری رکھی تھی۔ اس دوران ۱۸۸۶ء میں نواب صدیق حسن خاں کی صحت خراب رہنے لگی اور بالا خر ۲۰ فروری ۱۸۹۰ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ نواب شاہجہاں بیگم کو دوبارہ بیوگی کا رنج برداشت کرنا پڑا تھا۔ ڈاکٹر رضیہ حامد اس تناظر میں لکھتی ہیں کہ

> لیکن نواب شاہجہاں بیگم نے اپنی کوششوں کو جاری رکھا۔ آخر کار انگریزوں نے شاہجہاں بیگم کی دلجوئی اور پاس خاطر سے اس خواہش کو منظور کر لیا اور باضابطہ طور پر نواب صدیق حسن خان کو اس خطاب سے یاد کئے جانے کا حکم دیا۔(۲۳)

نواب شاہجہاں بیگم نے صحت عامہ اور اپنی رعایا کی بہبود کے لئے لیڈی لینسیڈون کے نام سے عورتوں کے لئے ایک اسپتال قائم کیا اس میں دایہ گیری کی تعلیم کا بھی انتظام کیا۔ بھوپال کے قریب ضلع سیور میں جذام کے مریضوں کے علاج کے لئے ایک جذام خانہ قائم کیا۔ نواب شاہجہاں بیگم نے حفظان صحت کی طرف خاص توجہ دی تھی۔ شہر و دیہات وقصبات میں اسپتال بنائے اور معالجین مقرر کیے تھے۔ چیچک کے ٹیکے لگوانے کا باقاعدہ انتظام کیا گیا تھا۔ رعایا کو اس صحت پروگرام کی طرف متوجہ کرنے کے لئے اپنی نواسی بلقیس جہاں بیگم کو ٹیکہ لگوایا، یہاں تک کہ ٹیکہ لگوانے والوں کے لیے انعام بھی مقرر کیا گیا تھا۔ نواب شاہجہاں بیگم دینی کاموں میں بڑھ چڑھ کر امداد دیتی تھیں

نواب شاہجہاں پہلی خاتون حکمران جنہوں نے برطانیہ میں مسجد تعمیر کروائی ہے۔ مسجد شاہجہانی آج بھی موجود ہے انہوں نے اس مسجد کے ساتھ ایک دینی خیراتی مرکز کے لیے بھی امداد دی۔

> نواب شاہجہاں بیگم اولعزام خاتون، مستقل مزاج خاتون تھیں۔ ایک بار جس بات کا عزم کر لیتی تھیں۔ جب تک مکمل نہ کر لیں چین نہیں ملتا تھا۔ نواب صدیق حسن خاں نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "ابجد العلوم" میں نواب شاہجہاں بیگم کی شان میں ایک قصیدہ لکھ کر شامل کیا ہے۔ یہ قصیدہ امرالقیس کے مشہور معلقہ کی زمین میں لکھا گیا ہے۔(۲۴)

نواب شاہجہاں بیگم نے حصول ثواب اور ریاست کو مشکلات سے بچانے کے لئے "ایک ختم خانہ" قائم کیا تھا۔ جس میں متعدد اشخاص کو ملازم رکھا تاکہ وہ مقررہ اوقات میں قرآن مجید کی تلاوت کرتے رہیں اور بخاری شریف کا ورد رکھیں۔ نواب شاہجہاں بیگم علم کی قدر شناس تھیں۔ انہوں نے علمی کاموں میں بڑی فراخ دلی سے حصہ لیا۔ انہوں نے اپنے زمانہ حکومت میں سب سے پہلے اپنی بیٹی سلطان جہاں بیگم کے قرآن پاک پورا پڑھ لینے پر نشرح کی تقریب منعقد کی تھی۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ عوام میں قرآن پاک پڑھنے اور سمجھنے میں دلچسپی پیدا ہو اور وہ قرآن فہمی کی طرف راغب ہو جائیں۔ بقول ڈاکٹر رضیہ حامد

> نواب شاہجہاں بیگم نے اپنے دور حکومت میں سب سے پہلی تقریب کا اہتمام اپنی بیٹی سلطان جہاں بیگم کے نشرہ کیا۔ انہوں نے اس تقریب کو ایک ماہ چوبیس دن تک جاری رکھا۔ اس کی ابتداء ۱۷ محرم ۱۲۸۸ھ مطابق ۱۸۷۱ء سے ہوئی اور ۱۱ ربیع الاول تک اس کا سلسلہ چلتا رہا۔ بھوپال میں جشن کا سماں تھا ہر طرف چہل پہل تھی۔(۲۵)

نواب شاہجہاں بیگم کے عہد حکومت کی تعلیمی خدمات:

سردار دوست محمد خاں کے عہد سے ہی بھوپال میں علم وادب کا چرچا شروع ہو گیا تھا۔ انہوں نے ہندوستان کے دیگر علاقوں سے مشہور علماء کو بھوپال بلایا اور ان کے بعد بھی علماء کی سرپرستی کا سلسلہ برابر جاری رہا تھا۔ شاہجہاں بیگم کے دور میں اشاعت تعلیم کا باقاعدہ طور پر آغاز ہو چکا تھا۔ نواب شاہجہاں بیگم نے حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد اس تعلیمی پروگرام میں اور اضافہ فرمایا۔ بھوپال کے گرد و نواح میں جو مدارس قائم تھے نہ صرف ان کی اصلاح کی گئی

بلکہ باقاعدہ نصاب کا تعین ہوا۔اردو ہندی کے استاد الگ الگ رکھے اور ان پر ایک ذمہ دار افسر کو مقرر کیا گیا۔ ملازمت کے لیے یہ لازمی قرار دیا کہ امیدوار کے پاس تعلیمی سند ہونی چاہیے۔یوں ایک باقاعدہ ہدایت نامہ جاری کر دیا کہ جس شخص کے پاس اسکول یا کالج کا سرٹیفکیٹ نہ ہو گا اس کو ریاست میں جگہ پانے کا کوئی استحقاق نہیں ہے۔ تعلیمی اداروں میں کامیاب طلباء کو انعامات دیئے جاتے تھے اس کے علاوہ وظیفے بھی نہایت فیاضی کے ساتھ دیئے جاتے تھے۔ غریب و نادار طلباء کے لیے لباس و خوراک کا بھی انتظام کیا جاتا تھا۔ صنعتی مدرسوں کا بھی سال کے ختم پر امتحان ہوتا تھا۔اور تعلیمی معیار کا جائزہ لینے کی غرض سے طلباء کے ہاتھ سے بنی ہوئی چیزوں کو خود ملاحظہ فرماتی تھیں۔اور ایک عرصے تک تمام مدارس پر نواب شاہجہاں بیگم کی عام نگرانی تھی۔ بعدازاں پھر کچھ عرصہ وزیر ریاست کے زیر نگران رہی اور آخر میں باقاعدہ ایک نگران کمیٹی مقرر ہوئی جس کے زیر ہدایت تمام انتظام انجام پاتے تھے۔

نواب شاہجہاں بیگم کو علم کے فروغ اور عوام کی بہبودی سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔انہوں نے کئی مدرسے قائم کیے۔ان کی والدہ نواب سکندر بیگم نے مدرسہ سلیمانیہ کو شاہجہاں بیگم کی چھوٹی بیٹی سلیمان جہاں بیگم کی یادگار میں قائم کیا تھا۔ نواب شاہجہاں بیگم نے اس کو ترقی دی اور ہائی اسکول بنا کر کلکتہ یونیورسٹی سے اس کا الحاق کر دیا۔ بقول ڈاکٹر رضیہ حامد

> اپنے والد نواب جہانگیر محمد خاں کی یاد میں مدرسہ جہانگیریہ قائم کیا۔جس میں صرف قرآن مجید کی تعلیم ہوتی تھی۔اس مدرسہ میں پڑھنے والے سینکڑوں طلبا کو وظیفے دیئے جاتے تھے۔اپنی نواسی یعنی سلطان جہاں بیگم کی بیٹی صاحبزادی بلقیس بیگم کی یاد میں لاوارث و یتیم بچوں کی پرورش و تعلیم کے لئے مدرسہ بلقیسیہ قائم کیا۔(۲۶)

نواب شاہجہاں بیگم تعلیم کے فروغ کے لیے محکمہ تعلیم قائم کیا۔انہوں نے لڑکوں کی صنعتی تعلیم کے لیے پرنس آف ویلز اسکول قائم کیا۔ خواتین کے لئے ایک صنعتی "مدرسہ نسواں" قائم کیا۔ نواب شاہجہاں بیگم نے تعلیم کی عمومی اشاعت کے لئے "نظارۃ المعارف العمومیہ" کے نام سے ایک محکمہ قائم کیا۔ نواب شاہجہاں بیگم ادب سے دلچسپی رکھتی تھیں اور انہوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔

> ان کے شوہر نواب صدیق حسن خاں، صاحب علم اور صاحب قلم تھے۔ نواب شاہجہاں بیگم بڑی فراخ دلی کے ساتھ علم کے فروغ کے کام کرتی تھیں۔انہوں

> نے کتابوں کی طباعت کے لئے مطبع شاہجہانی اور مطبع صدیقی قائم کیے جس سے لاکھوں قرآن مجید طبع کرا کے مفت تقسیم کروائے ۔اس کے علاوہ نیل الاوطار، فتح البیان، تفسیر ابن کثیر ،فتح الباری، روضۃ الندیہ ، نزل الابرار، جلالین وغیرہ جیسی نایاب کتابیں زر کثیر خرچ کر کے طبع کروائیں۔(۲۷)

نواب شاہجہاں بیگم ان تمام کتب کو عالم اسلام میں تحفتاً بھجوایا کرتی تھیں۔نواب شاہجہاں بیگم نے نہایت فراخ دلی سے نواب صدیق حسن خاں کی کتب طبع کروائیں اور بہت اہتمام سے لوگوں کو تحفتاً بھجواتی تھیں۔نواب صاحب کو ان کی بھرپور تائید اور نصرت حاصل تھی۔ریاست کے آٹھ مطابع نواب صدیق حسن خاں کی کتب کی طباعت میں دن رات مصروف رہتے تھے۔اس کے علاوہ نواب شاہجہاں بیگم نے مصر، قسطنطنیہ، آگرہ،الہ آباد، دہلی، کانپور، بیت المقدس، شام، بیروت، دمشق،اصفہان،ایران،کابل، خراسان، کشمیر، پشاور، لکھنو، لاہور، حیدرآباد دکن وغیرہ میں نواب صدیق حسن خاں کی کتب طبع کروانے میں ان کی مدد کی۔نواب سکندر بیگم نے حرمین شریفین میں غربا کو کچھ امداد و وظائف دینے کا سلسلہ شروع کیا تھا اس میں نواب شاہجہاں بیگم نے ایک مستقل محکمہ قائم کر کے وظائف اور امداد میں بہت توسیع کر دی۔اور ہر سال ایک قافلہ سرکاری خرچ پر حرمین شریفین بھیجنے کا انتظام کیا۔

نواب شاہجہاں بیگم نہایت رحم دل اور منکسر المزاج تھی۔ان کے اندر فیاضی کا وصف نمایاں تھا جو انسانی صفات میں سب سے بہتر صفت شمار کی جاتی ہے۔وہ کسی کی حاجت براری کرنا اس کی خواہش اور ضرورت کو پورا کرنا اپنے لئے لازم سمجھتی تھیں۔مولانا اسلم جی راجپوری اپنی کتاب خو اتین میں ان کے عہد کے بھوپال اور شاہجہاں بیگم کے اس وصف کے متعلق لکھتے ہیں کہ

> ان کا زمانہ بھوپال کے لئے ایسا ہی تھا جیسا باغ میں بہار کا زمانہ ہوتا ہے ان کی داد و دہش اور فیاضی کی وجہ سے دیار اور امصار سے لوگ کھنچے ہوئے بھوپال میں چلے آئے تھے۔شام و عرب تک اہل علم کو وہاں کی کشش کھینچ لائی تھی۔اور سب کا دامن آرزو ان کی فیاضی سے مالامال ہوتا تھا۔(۲۸)

نواب شاہجہاں بیگم نے نواب سکندر بیگم کے قائم کردہ مدرسہ سلیمانیہ کو ترقی دی اور ۱۸۹۲ء میں اس کا الحاق کلکتہ یونیورسٹی سے کیا اور اس مدرسہ میں اردو، عربی اور فارسی کے ساتھ انگریزی تعلیم کا بھی انتظام کیا تھا۔نواب شاہجہاں بیگم سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کی سرپرست تھیں۔۱۸۹۱ء میں جب سرسید احمد خاں حیدر آباد دکن جاتے

ہوئے بھوپال میں مقیم ہوئے تو نواب شاہجہاں بیگم نے محمڈن کالج کی مسجد کی تعمیر کے لیے دس ہزار روپیہ کی رقم عنایت کی۔اس دور میں بھوپال کی علمی وادبی فضا کے حوالے سے متعلق ڈاکٹر سلیم حامد رضوی لکھتے ہیں کہ

> اس وقت بھوپال اپنے علمی اور ادبی کارناموں کے لحاظ سے "بغداد الہند" کی حیثیت رکھتا تھا۔(۲۹)

نواب شاہجہاں بیگم کی علم پروری، سخاوت، وسیع القلبی اور علماء و فضلا کی قدردانی نے بھوپال کو اہل علم کے لیے مرکز نگاہ بنادیا تھا۔ پورے ہندوستان میں دہلی کے بعد بھوپال تشنگان علم کے لئے اور علماء فضلا کے لئے مرکز کشش بنا ہوا تھا۔ بھوپال میں دینی وادبی ذوق عام تھا۔ عوام و خواص میں تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ تصنیف و تالیف کا رواج عام ہوا۔ ریاست کی طرف سے کتابیں مفت تقسیم کی جاتی تھیں۔ جس کی وجہ سے گھروں میں اپنی لائبریری قائم کرنے کا رواج و چلن عام ہوا۔ نواب شاہجہاں بیگم کے عہد میں بکثرت علماء بھوپال آئے،ان میں سے کچھ نے بھوپال میں ہی سکونت اختیار کی اور بعض تحصیل علم کے بعد واپس اپنے وطن چلے گئے۔بقول ڈاکٹر رضیہ حامد

> نواب شاہجہاں بیگم کے دربار میں علماء و فضلا بڑی تعداد میں موجود تھے۔ جن میں اکثر صاحب تصانیف تھے وہ ان لوگوں سے فرمائش کر کے کتابیں لکھواتیں،ان کو طبع کرواتیں اور انعام واکرام دیا کرتی تھیں۔(۳۰)

نواب شاہجہاں بیگم نے اشاعت و ترقی و تعلیم کی غرض سے پریس کو ترقی دی اور ایک مطبع شاہجہانی تعلیمی کتابوں کے لیے مخصوص کردیا۔اسی مطبع میں عمدۃ الاخبار بھی شائع ہوتا تھا جس میں سرکاری گزٹ اور انگریزی اخبارات سے خبروں کے علاوہ بھوپال کے حالات پر علمی وادبی مضامین وغیرہ درج ہوتے تھے۔اسی مطبع میں قرآن شریف نہایت اہتمام وصحت کے ساتھ طبع کرایا تھا۔ جس کی نسبت عام رائے یہی ہے کہ اس میں کہیں کسی نقطے اور اعراب تک کی غلطی نہیں ہے۔اس سے بہتر اور صحت کے ساتھ کوئی دوسرا قرآن شریف طبع نہیں ہوا۔ عربی ادب اور فقہ کے متعلق بھی متعدد کتابیں حسن وصفائی کے ساتھ چھاپی گئیں۔

عہد شاہجہانی میں علماء و فضلا کی خاصی تعداد جمع ہوگئی شیخ محسن الیمانی نواب سکندر بیگم کے عہد میں بھوپال آئے تھے اور پانچ سال قیام کیا تھا۔ پانچ برس بعد نواب شاہجہاں بیگم کے عہد میں بھوپال آئے اور چار سال رہ کر واپس چلے گئے، تیسری مرتبہ پانچ سال بعد آئے اور بھوپال میں سکونت اختیار کی۔ان کے درس حدیث میں شرکت کرنے

اطراف عالم سے علما بھوپال آتے تھے اور فن حدیث کا علم اور پھر مکمل ہونے پر سند حاصل کرتے تھے۔ شیخ زین العابدین جن کو سکندر بیگم اپنے ساتھ لائیں درس حدیث دیا کرتے تھے۔ ان کے درس میں شیخ محمد بن حسین الیمانی نے شرکت کی آپ تکمیل علم کے بعد بھوپال میں اپنے والد کی مسند پر جلوہ افروز ہوئے اور طویل مدت تک درس کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس دور میں اردو فارسی شاعری نے بھی بھوپال میں کافی ترقی کی۔ نواب شاہجہاں بیگم اور نواب صدیق حسن خاں کی علم پروری، علماء فضلاء کی قدر دانی اور توقیر کے سلسلہ میں لالہ سری رام خم خانہ جاوید میں لکھتے ہیں کہ

> ان کی قدر دانی اور ہنر پروری و ادب نوازی کی بدولت مشرقی علوم و فنون کے
> بڑے بڑے ماہر بھوپال میں جمع ہو گئے تھے۔ (۳۱)

عہد شاہجہانی کے چند علماء اور شعراء کے نام درج ذیل ہیں مثلاً مولانا عباس رفعت شیروانی، مولوی اسحاق بن ابراہیم قنوجی، مولانا ذوالفقار احمد مالوی بھوپالی، مولانا قاضی محمد احسن مراد آبادی، قاضی انور علی لکھنوی، مولوی عنایت اللہ سندھی، قاضی ایوب بن قمر الدین پھلتی، مفتی یحیٰی بن ایوب پھلتی، حکیم معزالدین، مولوی قدرت اللہ قدرت، قاضی ایوب بن یعقوب کوٹلی، صابر حسین صبا سہسوانی، سید امجد علی اشہری، مولوی حکیم سید اعظم حسین سلیم سندیلوی، حافظ سید ممتاز علی، سراج میر خاں سحر، عالمگیر نمود، نورالحسن کلیم، علی حسن خاں طاہر، مولوی سلامت اللہ جیراجپوری وغیرہ کے نام بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ نواب شاہجہاں بیگم نے مولوی یعقوب علی خاں رئیس بانس بریلی کو ان کی تعلیمی اور انتظامی صلاحیت کی شہرت کے باعث بھوپال بلا کر محکمہ عدالت کا کام سپرد کیا جو تقوی میں اپنے استاد شاہ اسحاق جیسا کمال رکھتے تھے۔ یہاں علماء کی مکمل فہرست یا نام گنوانا مقصد نہیں تھا۔ ان کے دور میں اتنے علماء تھے کہ ان کی فہرست کئی صفحات پر محیط ہو سکتی ہے۔ وہ سب صاحب قلم اور صاحب تصنیف تھے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ اس زمانہ میں ارباب علم و دانش کی اتنی بڑی تعداد بھوپال کے علاوہ ہندوستان کے کسی دوسرے شہر میں موجود نہیں تھی۔ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی اپنی کتاب اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ میں نواب شاہجہاں بیگم کے عہد میں ہوئی ترقی اور علم کے فروغ کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

> اس دور کی علمی اور ادبی ترقی کے مختلف اسباب تھے۔ اول تو نواب شاہجہاں بیگم اور
> ان کے شوہر نواب صدیق حسن خاں کی ذاتی علمی اور ادبی دلچسپیاں، دوسرے
> شعوری طور پر بھوپال کو دہلی اور لکھنو کی طرح مرکز علم و ادب بنانے کی کوشش۔

تیسرے طباعت کی سہولتیں جو سرکاری مطابع کی صورت میں موجود تھیں جن میں ہر اچھی کتاب سرکاری مصارف سے چھپتی اور مفت تقسیم ہوتی تھی۔ چوتھی سرکاری اور غیر سرکاری اخبارات اور علمی وادبی رسائل کا اجراء جن کی تعداد آٹھ تک پہنچ گئی تھی۔ پانچویں بھوپال کا ریلوے لائن پر ہونا جس نے انکی مرکزیت کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ چھٹے غدر کے سیاسی و تمدنی نتائج جنہوں نے بھوپال کو دارالامان بنا کر فنکاران علم وادب کو پناہ دینے کا کام اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ ساتویں فرمانروائے وقت کی تقلید میں امراداعیان کی علمی وادبی سرپرستیاں ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھوپال علماء وفضلاء کا مرکز بن گیا۔(۳۲)

نواب شاہجہاں بیگم اور نواب صدیق حسن خاں کی باہمی کوشش سے زبردست علمی وادبی کام ہوا۔ ان کی علمی لگن، دین کے فروغ کی دھن اور فیاضی نے بھوپال کو چہار سو میں روشناس کرایا تھا۔ نواب شاہجہاں بیگم کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے نواب صدیق حسن خاں کی کتب دنیا کے گوشہ گوشہ میں تشنگان علم کے ہاتھوں میں پہنچیں۔ بلاشبہ نواب شاہجہاں بیگم کی نصرت وتائید نے محمد صدیق حسن کو جہاں نواب صدیق حسن خاں بنادیا، وہاں علماء کی صف میں بلندی تک پہنچانے میں بھی بھرپور تعاون کیا تھا۔

عہد شاہجہانی کے علماء بھوپال:

بانی ریاست سردار دوست محمد خاں علماء وفضلا کے قدرداں اور علم دوست شخص تھے۔ ریاست بھوپال کی بنیاد رکھے جانے سے ہی علماء کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ سردار دوست محمد خاں نے بھوپال کو دارالخلافہ بنانے کے ارادہ سے ایک قلعہ فتح گڑھ کے نام سے تعمیر کرنے کا بیڑا اٹھایا، اس کی بنیاد کا پہلا پتھر رائسین کے قاضی محمد معظم کے ہاتھوں سے رکھوایا، جن کو وہ اپنے ساتھ بھوپال لائے تھے۔ لہذا بھوپال ریاست کی بنیاد علم وفضل کے پسینہ سے سیراب ہوئی اور پھلی پھولی تھی۔ سردار دوست محمد خاں نے اطراف سے علماء و فضلا کو بلا کر بھوپال میں آباد کیا اور جاگیریں دیں۔ درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ رستم علی سرہندی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب تاریخ ہندی میں دوست محمد خاں اور ان کے بیٹے یار محمد خاں کی سوانح شامل اشاعت کی ہیں وہ لکھتے ہیں۔

بھوپال صحیح معنوں میں دارالامان کہلائے جانے کا مستحق تھا۔ سردار مرحوم کی دین داری اور علم نوازی کی بدولت اطراف ہند سے علماء وفضلاء بھوپال آتے رہتے تھے

اور نواب کے دستر خوان پر فقراء علما کی بڑی جماعت بیٹھتی تھی جن کی بدولت علم و ادب کا چرچا عام ہوا۔(۳۳)

ذوالفقار علی نقوی اپنی کتاب تذکرہ قضاۃ بھوپال میں لکھتے ہیں کہ

مولوی یوسف علی صاحب فرماتے تھے کہ چھوٹے خاں نے شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں بایں مضمون عریضہ لکھا کہ آپ بھوپال تشریف لائیں۔ بارہ ہزار کی جاگیر حاضر ہے چند معتبر ادیبوں کو یہ خط اور پانصد روپیہ دے کر دہلی بھیجا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ بڑھاپے میں دہلی چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔(۳۴)

جہانگیر محمد خاں کے دور حکومت میں امن وامان تھا۔ ریاست بھوپال میں علم و فضل، تہذیبی ترقی میں تیزی آگئی تھی۔ جہانگیر محمد خاں علم دوست اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ان کے دور میں دہلی، ٹونک، لکھنو اور دیگر شہروں سے علما بھوپال آئے۔اس وقت بھوپال شعراء کا بڑا مرکز بن گیا۔ جہانگیر محمد خاں نے مومن خاں مومن کو بھوپال آنے کی دعوت دی۔انہوں نے قبول نہیں کی۔اٹھارویں صدی کے آخر میں اور انیسویں صدی کی ابتداء تک بھوپال علمی وادبی حلقوں میں شمالی ہند کے ترقی یافتہ مراکز کے برابر آگیا تھا۔نواب سکندر بیگم (والدہ) کو علمی وادبی کاموں سے دلچسپی تھی، خود بھی صاحب تصنیف تھیں۔انہوں نے تزک سکندری لکھی جو ان کی زندگی میں نامکمل رہی اور نواب شاہجہاں بیگم نے اپنے عہد کے چند سال کے حالات شامل کر کے تاج الاقبال تاریخ ریاست بھوپال کے نام سے اردو اور فارسی میں شائع ہوئی۔قرآن کریم کے تراجم اردو، فارسی، پشتو اور ترکی میں کروائے۔بقول ڈاکٹر سلیم حامد رضوی

نواب شاہجہاں بیگم کا دور حکومت اردو کے علم وادب کی ترقی کے لحاظ سے "سنہرا زمانہ" کہا جاسکتا ہے۔ بھوپال کی کشش مقناطیسی نے اطراف ہند سے اساتذہ علم و فن کو اپنے دامن عاطفت میں کھینچ لیا۔ بھوپال نے لکھنو کی جگہ لے لی۔(۳۵)

نواب شاہجہاں بیگم نے اپنی والدہ کے انتقال کے بعد جب عنان حکومت سنبھالی، بھوپال بلاشبہ اہل علم کے لیے کشش کا مرکز بن گیا تھا۔ نواب شاہجہاں بیگم خود صاحب کتاب تھیں۔ان کی علم پروری، علماء کی قدردانی نے ان کے عہد کو زریں عہد بنا دیا۔ جہاں علما جوق در جوق علم کی پیاس بجھانے آتے تھے۔اکثر نے یہاں طویل قیام کیا اور واپس اپنے وطن چلے گئے اور بعض نے بھوپال کو اپنا مستقل ٹھکانہ ٹھہرایا۔نواب صدیق حسن خاں خود عالم تھے اور

شاہجہاں بیگم کے تمام علمی کاموں میں ان کے مشیر خاص تھے۔ذیل میں ان علماء ادبااور شعراء میں سے چند کے تفصیلی حالات اور کمالات کا جائزہ پیش ہے۔

مدارلمہام منشی جمال الدین خان:

جمال الدین خاں ۱۲۱۲ھ میں بمقام کوتانہ پیدا ہوئے جو دہلی سے تیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ان کے والد کا نام وحید الدین خاں تھا۔ان کا سلسلہ نسب محمد بن ابو بکر صدیق سے جاملتا ہے۔جمال الدین خاں نے کوتانہ میں پرورش پائی اور اس کے بعد وہ دہلی تشریف لے گئے۔اور مولانا مملوک علی نانوتوی مولانایعقوب بن افضل دہلوی مولانا اسحاق بن افضل، حضرت مولانا رفیع الدین صاحب، حضرت غلام علی صاحب سے تعلیم حاصل کی اور شیخ محمد آفاق نقشبندی سے بیعت ہوئے۔صاحب ماثر صدیقی نواب علی حسن تحریر فرماتے ہیں بقول ڈاکٹر سلیم حامد رضوی

> مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے مجالس وعظ میں شریک ہونا انہوں نے اپنے اوپر لازم کر لیا چونکہ عنفوان شباب کا عالم تھا۔اس زمانہ میں رفتہ رفتہ ان کے مکان پر یاران رنگین طبع کا مجمع رہنے لگا۔۔۔۔شطرنج کی ایک بالشت بھر بساط نے بازیچہ روزگار کا نقشہ دل سے بھلادیا شب وروز اسی دلچسپ مشغلے میں سارا وقت گزرنے لگا۔اتفاق زمانہ دیکھو کہ اسی دوران سال اس شریف خاتون کا جس کی سرپرستی پر مدار کار تھا انتقال ہو گیا اور خود بھی بیمار پڑ گئے۔یاران صحبت نے جب ان کو مفلوک الحال اور علیل پایا اور کوئی اپنی دلچسپی کا سامان وہاں نہ دیکھا تو انہوں نے کنارہ کشی اختیار کی، یہ تنہا بے یار و مددگار رہ گئے۔خوش قسمتی سے مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب نے جب ان کو مجلس عظ میں دفعتہ غیر حاضر پایا توان کے حالات کے متلاشی ہوئے، لوگوں سے خبر علالت سن کر عیادت کے لئے ان کے گھر تشریف لائے اور ہر طرح سے ان تسلی و تشفی کر کے ان کی دستگیری میں کوشش کی۔شاہ صاحب کے ایثار اور فیضان صحبت نے ان پر ایسا اثر ڈالا کہ وہ اسی وقت تائب ہو گئے۔اور تمام لہو ولعب کو چھوڑ کر اتباع شریعت اور تحصیل علم کا سلسلہ از سر نو شروع کیا۔(۳۶)

جمال الدین صاحب سیاسی صلاحیت و قابلیت اور فنون سپہ گری کے بھی ماہر تھے۔ تیراکی میں خاص کمال رکھتے تھے علاوہ ازیں دینی اور علمی ترویج سے ان کو بڑا شغف تھا۔ وزارتی مصروفیات، دربار سے وابستگی اور سرکاری اہلکاروں سے تعلق کے باوجود ان کی کوئی صحبت علماء اور طلبا کے مجمع سے خالی نہیں ہوتی تھی۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے خاندان سے ان کو خاص عقیدت تھی اور ان کی صحبت میں بہت سے مدارج علم و عمل طے کئے تھے۔ شاہ صاحب کی بہترین تصنیف حجتہ اللہ البالغتہ جو دنیائے اسلام میں فن اسرار شریعت کے لحاظ سے اہم گردانی جاتی ہے اور ازالتہ الخفاءؔ انہیں کی وسعت فیاضی و علم دوستی سے پہلے پہل ۱۲۸۶ھ میں طبع ہوئیں۔ شیخ علی بن احمد مہائمی کی تفسیر رحمانی چار جلدوں میں طبع کروائی۔ ڈاکٹر رضیہ حامد لکھتی ہیں کہ

> اہم دینی اور علمی کتب کو طبع کروا کر تقسیم کرنا مدار المہام صاحب کی زندگی کا دلچسپ مشغلہ اور لازمی جزو تھا۔ وعظ و نصیحت اور قرآن حکیم کے ترجمہ سے ان کو شگفتگی تھی اور ان کاموں سے ان کو بہت فرحت علمی حاصل ہوتی تھی۔ یہ شگفتگی درجہ عشق تک پہنچ گئی تھی۔ ترجمہ قرآن کریم کے درس و تدریس کے ذوق میں ہمیشہ سرشار رہا کرتے تھے۔(۳۷)

تدریس قرآن، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، ضعفاء کی دیکھ بھال ان کا محبوب ترین فعل تھا۔ قرآن پاک کی نشر و اشاعت میں انتہائی سرگرم رہتے تھے۔ جمال الدین خاں نے ایک کتاب فرہنگ قرآن لکھی تھی جس کا نام کوکب دری تھا۔ وہ بذات خود طلبہ کو ترجمہ قرآن مجید و کتب حدیث کا درس دیا کرتے تھے۔ طلبہ کی تعلیم کے لیے انہوں نے مناسب تنخواہوں پر متعدد اساتذہ کو مقرر کیا۔ ایک مستقل مدرسہ بطور وقف موتی محل میں جہاں مدار المہام صاحب خود رہتے تھے قائم ہو گیا تھا۔ تمام مصارف تعلیم اور یتیم و لاوارث طلبہ کی خوراک اور لباس کا خرچ اپنی جیب سے ادا کرتے تھے۔ جمال الدین خاں کے مطبخ میں، غرباء و یتیموں کے لیے روزانہ کھانا تقسیم ہوتا تھا۔ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی اپنی کتاب اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ میں یوں رقم طراز ہیں کہ

> غریب طلباء کے لئے ۴ من کی روٹیاں اور بارہ بکروں کا سالن ان کی طرف سے روزانہ تیار ہوتا تھا۔(۳۸)

جمال الدین خاں انتہائی مدبر و حلیم طبع، متواضع، سخی، صادق وامیں انسان تھے۔ وہ اعلی صورت کے ساتھ ساتھ اعلی سیرت کے بھی حامل شخص تھے۔ پانچوں وقت کی نمازیں مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔ اپنے جوتے خود اپنے ہاتھ سے اٹھاتے تھے، ان کے دربار میں کسی کے لیے کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ وہ حتی المقدور طور پر کوشش کرتے تھے کہ کام اپنے ہاتھ سے کریں۔" نزہۃ الخواطر" میں مولانا عبدالحئی صاحب تحریر فرماتے ہیں۔ "نواب سکندر بیگم بھوپال سے ان کی شادی ہوئی"(۳۹)

مندرجہ بالا اقتباس کو مدنظر رکھا جائے تو ہمیں اور کہیں بھی یہ بیان نہیں ملتا کہ آیا نواب سکندر بیگم ان کی زوجیت میں رہیں یا نہیں۔ جمال الدین خاں تقریباً چالیس سال تک مدار المہامی کے عہدہ پر فائز رہے تھے۔ جس میں سترہ سال کا عرصہ نواب سکندر بیگم کے عہد حکومت میں گزرا۔ آخر عمر تک شاہجہاں بیگم کے دور حکومت میں مدار المہامی کے عہدہ پر فائز رہے۔ مدار المہام صاحب نے مولوی عبدالقیوم صاحب اور مولانا شاہ بخاری کو قرآن کی روشنی میں ایک ایسی کتاب تیار کرنے کا حکم دیا تھا جو انتظام مملکت میں مددگار ثابت ہوسکے۔ انہوں نے مولانا عبدالغنی صاحب سے مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی کی ایک کتاب کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کروایا جس کا نام ارکان حج رکھا۔ مولانا احمد یار خاں سے شاہ عبدالعزیز دہلوی کا رسالہ موجود لکھوا کر طبع کروایا۔ متعدد تراجم قرآن پاک کے اردو، فارسی، ترکی اور پشتو زبان میں کروا کر عرب و عجم میں شائع کروائے۔ غرض مدار المہام صاحب نے کتب علمی کی ترویج میں بہت سعی کی۔

> مدار المہام صاحب کو مذہبی شغف کے علاوہ شعر و شاعری کا ذوق بھی تھا۔ دہلی کے قیام کے دوران مومنؔ، ذوقؔ، غالبؔ کی صحبتوں سے مستفید ہوئے۔ مومنؔ کے مشورہ سے گمنام تخلص رکھا، اکثر فارسی میں قطعات تاریخ کہے ہیں، فارسی اور اردو کا کلام تذکروں میں دستیاب ہے۔(۴۰)

جمال الدین خاں ۲۷ محرم الحرام ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۱ء کو رات ۱۱ بجے وفات پاگئے۔ کئی اہل علم نے ان کی تاریخ کہی جن میں نواب شاہجہاں بیگم بھی شامل ہیں۔ انہوں نے جو تاریخ کہی وہ یہ ہے۔ "جود مہر آسمان علم ودیں وعدل و شرع" ۱۲۹۹ھ۔(۴۱)۔ جمال الدین خاں کا جنازہ موتی محل سے اٹھایا گیا تھا۔ جنازہ میں بے شمار لوگ شامل ہوئے، گیارہ مرتبہ نماز جنازہ پڑھائی گئی۔ اہل مدارس وغیرہ نے طریقہ محدثین کے مطابق غائبانہ نماز جنازہ ادا کی۔

نواب صدیق حسن خان:

نواب صدیق حسن خاں ۱۴ اکتوبر ۱۸۳۲ء مطابق ۱۹ جمادی الاول ۱۲۴۸ھ قنوج کے قریب بانس بریلی میں اپنے ننھیال میں پیدا ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد ان کی والدہ ان کو بریلی سے قنوج لے آئیں۔ پانچ برس کی عمر میں آپ کے سر سے والد کا سایہ اٹھ گیا۔ ابتدائی تعلیم مقامی مکتب میں حاصل کی پھر فرخ آباد چلے گئے، وہاں قیام کے دوران قیام مولوی محمد حسین صاحب شاہجہانپوری اور حکیم اصغر حسین صاحب سے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے بعد کانپور کا سفر اختیار کیا وہاں کے علماء مثلاً ملا محمد مراد صاحب، مولوی محب اللہ پانی پتی وغیرہ سے کچھ درسیہ کتب پڑھیں۔ ۱۸۵۲ء میں دہلی آ گئے اور مفتی صدر الدین خاں سے باقاعدہ اکتساب علم شروع کیا۔ یہاں تک کہ اکیس سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ نواب صدیق حسن خاں نے جن دیگر علماء سے علم حاصل کیا ان کے نام درج ذیل ہیں۔ شیخ زین العابدین قاضی ریاست بھوپال (ابن محسن ابن محمد انصاری الیمانی) مولانا حسین بن محسن الیمانی، مولوی عبدالحق بنارسی، شیخ محمد یعقوب دہلوی مقیم مکہ معظمہ وغیرہ۔ ۱۸۵۵ء میں تلاش معاش کے سلسلہ میں صدیق حسن خاں بھوپال آئے، اس وقت نواب سکندر بیگم والئی ریاست تھیں۔ ان کو ۳۰ روپے ماہوار پر منشی گیری کی خدمت تفویض کی گئی، آپ مسجد ابراہیم خاں میں اکثر وعظ و نصیحت فرماتے تھے۔ ۱۸۵۹ء میں بھوپال پہنچے اور ان کی ملازمت کا بھوپال میں از سر نو آغاز ہوا۔ انہوں نے اس وقت ایک کتاب تحفتہ الفقیر تالیف کی تھی۔

مدار المہام صاحب صدیق حسن خاں کی علمی قابلیت سے بہت متاثر ہوئے اور اپنی بیٹی سے ان کا عقد کر دیا۔ ان کا دوسرا عقد نواب شاہجہاں بیگم والیہ ریاست بھوپال سے ۸ مئی ۱۸۷۱ء کو ہوا۔ سرکاری مراتب و اعزاز سے نوازے گئے۔ ان مراتب میں موصوف کو خطاب والا جاہ امیر الملک عطا ہوا نیز ۱۷ ضرب توپ کی سلامی بھوپال کے علاقہ میں مقرر ہوئی۔

> نواب صدیق حسن خاں کا رسوخ روز بروز ریاست کے انتظام میں بڑھتا گیا۔ شاہجہاں بیگم کے ساتھ ہندوستان کے مختلف شہروں کا دورہ بھی کیا۔ جنگ روم و روس کے درمیان ریاست بھوپال کی جانب سے حمیت اسلامی اور بیوگان و ترک مروحین کی امداد کے صلہ میں سلطان عبدالحمید خاں غازی سلطان ترکی نے ۱۲۹۶ھ میں شاہجہاں بیگم کو تمغہ شفقت اور نواب صدیق حسن خاں کو تمغہ مجیدی درجہ دوم سے سرفراز فرمایا۔ (۴۲)

انہی خصوصیات کے پیش نظر سلطان ترکی نے شاہجہاں بیگم کو روانہ کردہ ایک تحریری فرمان میں نواب صدیق حسن خاں کے اوصاف کا اعتراف کیا۔ نواب صدیق حسن خاں کی ذات مختلف کمالات کا ایک مجموعہ تھی۔ وہ عالم، مصلح دین، کتاب وسنت کے پیرو، ریاست سے منسلک، جاگیر دار اور ان سب سے بڑھ کر شوہر رئیسہ بھوپال تھے۔

نواب صدیق حسن خاں ایک صاحب نظر عالم دین تھے اور ان کی ذہنی نشوونما میں مفتی صدر الدین کی کوششوں کو بڑا دخل ہے۔ مفتی صاحب نے جہاد کا فتویٰ دیا تھا، مفتی صاحب کے زیر اثر سید احمد شہید کی تحریک جہاد کے شیدائی مسلمانوں نے زبردست قربانیاں دی تھیں۔ نواب صدیق حسن خاں کے والد حسن صاحب خود بھی سید احمد شہید کی تحریک سے متاثر تھے اور براہ راست وابستہ رہے تھے۔ بحیثیت مصنف بھی جہاد کی طرف راغب تھے۔ صدیق حسن خاں کا اس تحریک سے لگاؤ ہونا ایک فطری عمل تھا۔ بھوپال مدار المہام جمال الدین خاں نے ان کی سرپرستی کی جو خود بھی اس تحریک سے متاثر تھے۔ کثرت مشاغل سرکاری کاموں نیز مطالعہ کتب اور بے شمار کاموں کے باوجود ان کی تصنیفات وتالیفات کا کام برابر جاری رہتا تھا۔ اس کے لئے آپ نے علماء ائمہ سلف کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ نواب صدیق حسن خاں کی تحریر کا عام انداز یہ ہے بقول ڈاکٹر رضیہ حامد

> وہ جس ضمن اور موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں مضمون کی ابتداء اللہ تعالی کی حمد سے کرتے ہیں اور حمد کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو نفس مضمون سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد رسول اللہ پر درود وسلام ہوتا ہے اور اس میں بھی نفس مضمون کی رعایت ہوتی ہے۔ اس کے بعد سب سے پہلے قرآن پر استدلال کرتے ہیں اور آخر میں معتبر روایات لکھ کر اپنے موقف کے ثبوت کو پایہ تکمیل پہنچادیتے ہیں۔(۴۳)

نواب صدیق حسن خاں نے عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں کتابیں لکھی ہیں۔ تقریباً ہر موضوع پر چند ایسی تصنیفات ضرور ملتی ہیں جو اس موضوع کی بہترین کتابوں کی فہرست میں شمار کی جاسکتی ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں اعلی درجہ کے انشاء پرداز اور شاعر بھی تھے، ان کی تصنیفات کی تعداد ۲۲۲ کی قریب ہے۔

> تفسیر اور متعلقات تفسیر پر ان کی کتابیں، حدیث اور متعلقات حدیث پر ۳۳، عقائد اور مسائل پر ۳۰، فقہ اور متعلقات فقہ پر ۲۳، اتباع سنت پر ۱۱، اصول سیاست و حکمرانی پر ۶، تاریخ و سیر پر ۲۲علوم وادبیات پر ۲۲، اخلاقیات پر ۳۸، تصوف پر

> ۱۷، مناقب و فضائل پر ۱۳ کتابیں ہیں۔انہوں نے عربی زبان میں تقریباً
> ۵۵، فارسی میں ۵۰ اور اردو میں ایک سو سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔چند کتابیں
> تو مصادر و ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔(۴۴)

نواب صاحب نے خود بلند پایہ کتابیں تصنیف کیں۔اشاعت کتب کے لیے نواب صدیق حسن خاں کا اپنا مطبع ،"مطبع صدیقی" کے نام اسے تھا۔اسکے علاوہ بھوپال میں چار سرکاری مطابع اور تھے جن میں سے بیشتر میں نواب صاحب کی کتب شائع ہوتی تھیں۔ مطبع صدیقی میں شب و روز کام ہوتا تھا،وہاں کا عملہ نواب صاحب کی تصانیف و تالیفات کی نقل و تصحیح طبع میں سرگرم رہا کرتا تھا۔ان کی کثرت تالیفات کے لحاظ سے یہ مطبع کافی نہ تھا اس لیے مطبع مفید عام واقع اکبر آباد میں بھی مستقل ان کی کتب طبع ہوتی تھیں۔نواب صدیق حسن خاں کی تصنیفات و مولفات ان کے زمانہ حیات میں چھپ کر تمام اطراف ہند اور بیرون ہند میں پھیل گئی تھیں اور قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ان کی تصنیفات تقریباً ۱۶ مطابع میں ہندوستان میں شائع ہوئی ہیں اور بیرون ملک تقریباً ۳۰ مطابع میں طبع ہوئیں اور مفت تقسیم کی گئیں۔نواب صدیق حسن خاں کی اپنی تصنیفات و تالیفات میں فتح البیان فی مقاصد القرآن کو سب پر فوقیت دیا کرتے تھے۔یہ کتب سات جلدوں میں کئی بار چھپ چکی ہے۔

> نواب صاحب نے اس تفسیر میں سلفی انداز میں قرآن فہمی کی بڑی کامیاب کوشش
> کی ہے اور بیشتر قدیم مستند تفسیروں کا ماحصل محفوظ کر دیا ہے۔یہ تفسیر علمی اور
> تفسیری اعتبار سے بڑی جامع ہے اور مستند تصور کی جاتی ہے۔عالم عرب کے علماء
> دین بھی اس تفسیر کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔(۴۵)

۱۲۸۵ھ میں سفر حج کے دوران نواب صاحب نے متعدد کتابیں خریدیں بہت سی نقل کیں،علماء سے ملاقاتیں کیں۔ان کو اپنی کتابیں پیش کیں۔محدثین کے سامنے کتب حدیث کی قرات کی اور ان کے سلسلہ حدیث میں شامل ہوئے۔ان تمام باتوں سے علماء بہت متاثر ہوئے۔نواب صدیق حسن خاں نے عربی اور اسلامی علوم کی ترویج و اشاعت میں بڑی گرم جوشی کا اظہار کیا اور ان کے عہد میں بھوپال دینی علوم کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔نواب صدیق حسن خاں نے نواب شاہجہاں بیگم کے تعاون سے لاکھوں روپیہ خرچ کر کے تفسیر و حدیث کی نایاب کتب شائع کیں اور کتب خانوں اور علماء کو مفت تقسیم کیں۔ان کتب میں تفسیر ابن کثیر ،فتح البیان ،شرح صحیح بخاری ،امام شوکانی کی تصنیف نیل الاوطار خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

> انھوں نے علمائے دین اور مدارس اسلامیہ کی سرپرستی کر کے دینی علوم کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا۔ صحاح ستہ کے اولین تراجم اور طباعت و شاعت پر زر کثیر صرف کر کے علوم حدیث کو عام کیا۔(۴۶)

نواب صدیق حسن خاں کی مساعی جمیلہ کے باعث بر صغیر میں علوم دینیہ کا احیاء ہوااور مذہبی حلقوں میں جمود ٹوٹ کر ان میں علمی تحقیق کا شوق پیدا ہوا۔ نواب صدیق حسن خاں نے اطراف ہند سے جن علماء و فضلاء کو بلا کر بھوپال میں جمع کیا ان میں ہر قسم کے اہل علم و فن موجود تھے۔ چونکہ نواب صدیق حسن خاں اہل علم کے قدر داں تھے اس لیے بھی علماء و اہل فن جوق در جوق بھوپال آتے تھے۔ لالہ سری رام خمخانہ جاوید میں لکھتے ہیں۔

> ان کی قدر دانی اور ہنر پروری و ادب نوازی کی بدولت مشرقی علوم و فنون کے بڑے بڑے ماہر بھوپال میں جمع ہو گئے۔(۴۷)

نواب صدیق حسن خاں دہلی میں مشاہیر شعراء سے فیض صحبت اٹھائے ہوئے تھے، جس نے ان کی شاعری میں تازہ روح پھونک دی تھی۔ نواب صدیق حسن خاں عربی فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے۔ آپ کے دو دیوان ہیں۔ نواب صدیق حسن خان کی بدولت اہل لکھنو کی در آمد حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی جس نے ادب کے رجحانات اور زبان کے معیار میں بھی تبدیلی پیدا کر دی تھی۔

> شعر و شاعر میں دہلویت کے بجائے لکھنویت کا رنگ عام ہونا شروع ہو گیا تھا۔ تاثیر، خلوص، جوش اور سادگی کے بجائے رعایت لفظی، مبالغہ آرائی، خیال آفرینی، قافیہ پیمائی اور رسمی شاعری کا رجحان بڑھ گیا تھا۔ داخلیت کی جگہ خارجیت نے لے بے کیف اور بے مزہ شاعری کا آغاز کیا۔ شاعر کی نظر ادب کے ظاہری خدوخال تک محدود ہو گئی۔ الفاظ اور قوافی سے کھیلنا ان کا محبوب مشغلہ بن گیا۔(۴۸)

مختصر یہ کہ اس دور کی شاعری انہی رجحانات کی حامل نظر آتی ہے جو اس وقت عام طور پر پورے ہندوستان کی اردو شاعری پر طاری تھے۔ اس دور میں امیر مینائی کے شاگردوں کی بڑی کثرت تھی۔ البتہ داغ دہلوی کے شاگرد برائے نام تھے اور جو تھے وہ بھی امیری رنگ میں ڈوب کر شعر کہتے تھے۔ عورت کی حکومت کے اثرات اپنا کام برابر کرتے رہے۔ لکھنوی رنگ کے عام ہونے کے باوجود لکھنوی ابتذال اور عریانی سے یہاں کی شاعری پاک رہی

ہے۔غزل کے علاوہ قصیدے کو بھی اس دور میں بڑا فروغ حاصل ہوا۔وہ لوگ جو دربار سے وابستہ تھے بات بات پر قصیدہ لکھتے تھے۔

> اس میں شبہ نہیں کہ بعض شاعروں نے قصیدہ نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔لیکن ان میں سے ایک بھی ایسا قصیدہ گو نہیں جو سودا اور ذوق کے کارناموں میں کوئی اضافہ کر سکتا۔البتہ اس دور میں مثنویاں ناپید ہیں۔(۴۹)

جہاں تک نثر کا تعلق ہے یہ دور نظم سے بھی زیادہ ممتاز نظر آتا ہے۔شعراء کے تذکرے بھی اسی دور میں شائع ہوئے۔البتہ داستانی ادب کی طرف کم توجہ دی گئی۔یہ دور اخبارات کے اجراء کے لحاظ سے کم نمایاں نہیں ہے۔پہلا اخبار ۱۸۷۱ء میں حکیم اصغر حسین فرخ آبادی کی ادارت میں نکلا۔اس کے بعد مولانا اشہری اور حکیم برہم کی بدولت کئی اخبارات یکے بعد دیگرے لکھتے رہے ہیں۔اردو میں ماہانہ رسائل کا اجراء بھی اسی دور میں ہوا جن کی تعداد نو تھی۔امیر مینائی بھوپال آئے تھے ان کی یادگار کے طور پر ان کے شاگردوں نے ایک گلدستہ گلبن سخن،مثل پیام یار جاری کیا جو کئی سال تک نکلتا رہا۔۱۸۵۷ء میں نواب صدیق حسن خاں کے احکامات معزولی جاری ہوئے۔انگریز سرکار نے ان خطابات واختیارات واپس لے لئے۔نظم ونسق ریاست میں مداخلت کی ممانعت کر دی۔احکام معزولی کے اجراء کے تقریباً ۵ سال بعد چند ماہ مرض استفادہ میں مبتلا رہ کر بھوپال میں ۲۰ فروری ۱۸۹۰ء کو نواب صدیق حسن خاں نے وفات پائی۔کئی مشاہیر شعراء نے مرثیے لکھے اور تاریخ کہی۔حافظ خاں محمد شہیرؔ نے تاریخ کہی۔بقول ڈاکٹر رضیہ حامد"قدفاز فوزاً عظیماً"۱۳۰۷ھ۔(۵۰)

شیخ حسین بن محسن الیمانی:

آپ کی ولادت حدیدہ میں ۱۲۴۵ھ میں ہوئی۔علامہ حسن ابدالی سے حدیث پڑھی۔علامہ سلیمان ابدالی سے صحاح ستہ کا درس لیا،حرمین شریفین میں شیخ محمد بن ناصر الحازی سے کئی سال موسم حج میں استفادہ کرتے رہے تھے۔حدیدہ کے قریب لحیہ میں چار سال قاضی رہے تھے۔انہوں نے حدیدہ کے ترک امیر احمد پاشا کی خواہش اور حکم کے مطابق غیر معین ٹیکس کے سلسلہ میں غلط فتوی دینے سے صاف انکار کر دیا۔ترک وطن کر کے ہندوستان آ گئے۔بھوپال میں سکندر بیگم کے عہد میں ۱۸۵۷ء کی آزادی کی ناکام کوشش کے تقریباً پانچ برس بعد بھوپال آئے،دو سال مقیم رہ کر پھر یمن چلے گئے۔پھر پانچ برس کے بعد شاہجہاں بیگم کے عہد میں بھوپال میں چار سال رہ کر واپس چلے

گئے۔ تیسری بار پانچ سال بعد آکر بھوپال ہی میں مقیم ہو گئے۔ علماء کی کثیر تعداد نے ان سے استفادہ علم کیا جس میں نواب صدیق حسن خاں کا نام سر فہرست ہے۔تالیف سے دلچسپی نہ تھی ورنہ حدیث میں سب سے زیادہ لکھ سکتے تھے۔البتہ ان کے رسائل کا مجموعہ ہے۔

> "سنن ابی داؤد" ایک شرح بھی لکھی تھی۔آخر عمر میں لکھنو آتے جاتے تھے اور تحقیق و تجسس علم و دین میں مصروف رہے۔۱۳۲۷ھ میں بھوپال میں انتقال ہوا۔ شیخ حسین کا وجود اور ان کا درس حدیث ایک نعمت خداوندی تھا جس نے ہندوستان کو اس دور میں بلاد مغرب و یمن کا ہمسر بنادیا تھا اور ان جلیل القدر شیوخ حدیث کی یاد تازہ کردی تھی۔(۵۱)

ان کی سند حدیث بہت بڑی دلیل سمجھی جاتی تھی۔کئی برس تک درس وتدریس کے مشاغل سے وابستہ رہے تھے۔ہندوستان میں ان کی آمد پر یہاں کے علماء وفضلاء نے آپ سے فن وحدیث کی تکمیل کی اور سند حاصل کی تھی۔

مولاناعباس رفعت شیر وانی:

مولاناعباس احمد شیر وانی کے بیٹے تھے۔۱۲۴۱ھ میں بنارس میں پیدا ہوئے۔فارسی کی تعلیم میر خیرات علی خاں مشتاق خیر آبادی سے حاصل کی جو علی حزیںؔ کے شاگرد تھے۔بہادر شاہ ظفر کے عہد میں دہلی پہنچے اور مرزائی،خانی وابوالفضل دوراں کے خطابات سے سرفراز ہوئے۔مرزاغالب کی شاگردی اختیار کی تھی۔ان کے والد علامہ احمد یمنی مصنف نفحتہ الیمن ،عجب العجائب بھوپال میں نواب جہانگیر محمد خاں کے عہد میں مقیم رہے تھے۔مولانا عباس کو سکندر بیگم نے ملازم رکھا تھا۔پھر قدسیہ بیگم نے اپنے یہاں بلالیا،بھوپال کی جامع مسجد کی تعمیر میں ان کو مہتمم مقرر کیا گیا۔مسجد کے شمالی باب پر کتبہ میں ان کا نام کندہ ہے۔کچھ عرصہ منشی جمال الدین مدار المہام بھوپال کے روبکار رہے۔۱۲۸۸ھ میں شاہجہاں بیگم نے ان کو تاریخ نگاری کی ذمہ داری دے دی،سولہ برس اس عہدے پر مامور رہے۔سید ممتاز علی حافظ نے آثار الشعراء میں لکھا ہے۔

> رفعت زبان عربی وفارسی کے ماہر اور اکثر علوم وفنون میں صاحب دستگاہ ہیں۔علم، ادب وکلام،علم تاریخ میں وحید العصر ہیں۔(۵۲)

تذکرہ صبح گلشن میں نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں بقول ڈاکٹر رضیہ حامد

در عربی، فارسی واردو، استعداد کافی دارد، نظم ونثر فارسی رابکمال لطافت وفصاحت
می نگارد" (ترجمہ: زبان عربی و فارسی و اردو میں آپ کو اچھی استعداد حاصل
ہے، فارسی میں نظم ونثر بڑی لطافت وفصاحت کے ساتھ لکھتے ہیں)۔(۵۳)

یار محمد خاں شوکت نے تذکرہ فرح بخش میں اس طرح تحریر کیا ہے کہ

مولانا فنون ادبیہ وعلم تاریخ وغیرہ میں بڑے ذی استعداد ہیں۔ صاحب طبع وقادرو
ذہین نقاد ہیں۔(۵۴)

مولانا عبدالحئ لکھنوی نے اپنی تصنیف نزھۃالخواطر میں بھوپال میں ان کی ملاقات سے مشرف ہونے کا ذکر کیا ہے۔اور ان کو تاریخ اور انشاپردازی کا ماہر بتایا ہے۔ مولانا عباس رفعت شیروانی کی عربی و اردو کی تصنیف کتب کی تعداد تقریباً ساٹھ ہے۔۱۳۱۵ھ میں انھوں نے وفات پائی اور بھوپال میں کربلا کے میدان میں دفن ہوئے۔ مولانا عباس رفعت شیروانی کی تصانیف میں فیروز نامہ،خلافت عثمانیہ کی تاریخ میں چار چمن،تاریخ دکن ،تاریخ بھوپال ،قلائد الجواہر فی احوال الجواہر بہت اہم ہیں۔

حکیم عبدالعلی لکھنوی:

عبدالعلی بن ابراہیم بن یعقوب لکھنوی کی ولادت لکھنو میں ہوئی۔ وہیں پرورش پائی، حفظ قرآن کرنے کے بعد تحصیل قلم میں مشغول ہوگئے۔ علامہ عبدالحئ بن عبدالحلیم انصاری لکھنوی اور شیخ محمد نعیم بن عبدالحکیم انصاری آپ کے مشہور اساتذہ تھے۔ اپنے دادااور والد سے فن طب میں مہارت حاصل کی تھی۔ فنون علمیہ و عملیہ میں اپنے معاصرین پر فوقیت لے گئے۔ رام پور کے نواب کلب علی خاں نے آپ کو افسرالاطباء مقرر کر کے رام پور بلایا جو آپ کے والد کا عہدہ تھا۔ آپ رامپور میں کافی عرصہ مقیم رہے۔ پھر نواب واجد علی شاہ لکھنوی نے کلکتہ طلب فرمایا۔ نواب واجد علی شاہ کی وفات کے بعد آپ کو بھوپال طلب کیا گیا۔ آخر عمر میں آپ لکھنو چلے گئے۔ مولانا عبدالحی مصنف نزہتہ الخواطر نے تحریر کیا۔ کہ انھوں نے بھوپال میں بعض طبی کتابیں پڑھی ہیں۔ اعلی شخصیت کے مالک حسین وجمیل، منکسر المزاج اور خوش طبع انسان تھے۔ غرباء وامراء کی یکساں طور پر خبر گیری اور علاج معالجہ کرتے تھے۔ آپ نے جارج پنجم کے زمانے میں میڈیکل کالج لکھنو کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ ۱۳۲۳ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔

مولاناذوالفقاراحمدمالوی بھوپالی:

ذوالفقار احمد بن ہمت علی بن شاہ ولی حسینی نقوی ۱۲۶۲ھ میں بھوپال میں پیدا ہوئے۔ان کا سلسلہ نسب حضرت امام علی نقی سے ملتا ہے۔مولوی ذوالفقار احمد نے اپنے ماموں مفتی فضل اللہ کے زیر شفقت تربیت پائی۔ شیخ حسین بن محسن اور بھوپال کے دیگر علمائے وقت سے تحصیل علم کیا، جن میں مولوی عبد اللہ، مولوی جان محمد، مفتی احمد گل، حکیم معزالدین، مولوی عبدالحق بن محمد اعظم کابلی، عبدالقیوم بڑھانوی کے نام خاص ہیں۔

> دو بار بیت اللہ گئے۔وہاں بھی مختلف علماء سے علم و کمال میں رسوخ حاصل کیا،
> نیز ان سے اجازت حاصل کی۔مولاناذوالفقاراحمد کو نواب صدیق حسن خاں
> نے اپنا مقرب بنالیا تھااور ان سے بہت محبت کرتے تھے۔(۵۵)

ذوالفقار احمد عربی فارسی وار دو تینوں زبانوں کے زبردست عالم تھے۔نواب صدیق حسن خاں کی تصنیف و تالیف کے کاموں میں سب سے زیادہ معاونت مولاناذوالفقاراحمد نے کی تھی۔ہندوستان سے زیادہ ان کی شہرت عرب ممالک میں تھی۔ان کی تصنیف کا موضوع تفسیر، فقہ، حدیث اور ادب تھا۔مولاناذوالفقاراحمد کی تصانیف کی فہرست طویل ہے۔ان میں سے چند کے نام یہ ہیں مثلاً"الروض الممطور فی تراجم علماء شرح الصدور،و طی الفراسخ فی منازل البرازخ،اور محسن المحسنین فی حکایات الصالحین، تاریخ قضاوۃ و مفتیان بھوپال،ذوالفقاراحمد عربی میں شعر بھی کہتے تھے۔۱۳۴۰ھ میں مولوی ذوالفقاراحمد کاانتقال بھوپال میں ہوا۔

مولانامفتی عبدالقیوم بڑھانوی:

مولانا مفتی عبدالقیوم صاحب اپنے عہد کے ممتاز حنفی عالم اور محدث تھے۔آپ کے والد کا نام عبدالحئ اور دادا کا نام ہبتہ اللہ تھا۔مفتی عبدالقیوم ۱۲۳۱ھ میں پیدا ہوئے۔حافظ قرآن تھے۔بچپن ہی سید احمد شہید کے دست مبارک پر بیعت کی تھی۔نواب سکندر بیگم کے عہد میں بھوپال کے مفتی بنائے گئے۔مولاناعبدالحئ صاحب نےنزہتہ الخواطر میں اچھے الفاظ میں تذکرہ کیاہے۔ان کی وفات بڑھانہ میں ۱۲۹۹ھ میں ہوئی۔

قاضی ایوب بن قمر الدین پھلتی:

شیخ ایوب مشہور عالم اور محدث تھے۔سدھور ان کا آبائی وطن تھا جو ضلع بارہ بنکی میں واقع ہے۔جائے پیدائش پھلت کہی جاتی ہے جو ضلع مظفر نگر کا ایک گاؤں ہے۔سن ولادت ۱۲۴۱ھ سے ۱۲۴۴ھ کے درمیان ہے۔ابتدائی تعلیم مظفر نگر میں مولانا نصر اللہ خورجوی سے حاصل کی پھر دہلی میں سید محمود دہلوی، علی اکبر، علی اصغر القاسمین سونی پتی، مولوی سید بدر الدین بن رشید الدین دہلوی، مولانا نصیر الدین لکھنوی، شیخ عمر بن اسماعیل دہلوی وغیرہ سے علم حدیث حاصل کیا۔مولانا اسحاق بن افضل العمری کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی مجلس وعظ میں شرکت کرتے تھے، حج کی سعادت سے بھی دو بار نصیب ہوئی اور وہاں بھی حصول علم میں مصروف رہے تھے۔مکہ مکرمہ میں شریف ناصر بن حسین الحجازی البخاری اور شیخ یعقوب بن افضل العمری جیسے مشہور محدثین سے علم حدیث حاصل کیا تھا۔تقریباً ۱۲۷۷ھ میں بھوپال تشریف لائے اور یہیں مقیم رہے تھے۔غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے ان کو بہت عزت و رفعت حاصل ہوئی۔۱۲۹۷ھ میں ریاست بھوپال کے مفتی کے عہدہ پر فائز ہوئے۔۱۳۰۲ھ میں قاضی القضاۃ ریاست کے منصب عالی پر فائز کیے گئے۔ڈاکٹر رضیہ حامد

> قاضی صاحب نہایت نیک اور بزرگ آدمی تھا۔حسن معاشرت، خوش مزاجی اور تواضع میں اپنی مثال خود تھے۔خوابوں کی تعبیر بتانے میں مہارت رکھتے تھے۔آپ کو درس وتدریس سے خاصی دلچسپی تھی اور آپ کا علمی فیض عام تھا۔۱۳۱۵ھ میں وفات پائی اور بھوپال میں مدفون ہوئے۔(۵۶)

قاضی انور علی لکھنوی:

قاضی انور علی حسنی حنفی لکھنوی کا شمار فضلاء کبار میں کیا جاتا ہے۔تحصیل علم کے سلسلہ میں انھوں مولانا تراب علی لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔دیگر علماء سے بھی استفادہ کیا۔فن طب حکیم مسیح الدولہ حسن علی خاں لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔دیگر علماء سے بھی استفادہ کیا۔فن طب حکیم مسیح الدولہ حسن علی خاں لکھنوی سے حاصل کیا۔آپ لکھنو میں درس وتدریس کی صدارت کے منصب پر فائز رہے۔علماء کی ایک کثیر تعداد نے آپ سے استفادہ علم کیا۔شہر جونپور میں مدرسہ امامیہ حنفیہ میں درس وتدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔پھر بھوپال تشریف لاکر قاضی القضاۃ مقرر ہوئے، حج وزیارت کے بعد اپنے وطن واپس جاکر گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ان کی تصانیف میں

سب سے زیادہ مشہور کتب انوار الحواشی، التبیان حاشیہ علی اوقات البحران، ضوالسراج، حاشیہ علی السراجیۃ فی المواریث' میں درسی کتب پر اکثر تعلیقات موجود ہیں۔ آپ نے ۱۳۰۳ھ میں لکھنو میں وفات پائی۔

قاضی ایوب بن یعقوب الکوئلی:

شیخ ایوب بن یعقوب کوئلی کی پیدائش کوئلہ میں ہوئی۔ انھوں نے وہیں پرورش پائی۔ کچھ عرصہ اپنے والد اور چچا سے تحصیل علم کرنے کے بعد بھوپال تشریف لائے اور شیخ قاضی عبدالحق کابلی سے منطق، فلسفہ اور حکمت کا علم حاصل کیا۔ علم ریاضی کے کچھ مسائل علامہ سید احمد دہلوی سے پڑھے اصول اور علم کلام کی کچھ کتب علامہ محمد بشیر سہسوانی، عبدالولی بن عبدالعلی لکھنوی سے فن طب حاصل کیا۔ ایوب بن یعقوب کوئلی مطبع نول کشور میں تصحیح کتب اور حاشیہ آرائی کی خدمت انجام دیتے رہے۔ پھر دہلی چلے گئے اور وہاں کچھ عرصہ دراز تک تصنیف و تدریس میں مشغول رہے۔ آپ نے دہلی میں وفات پائی۔

> قاضی ایوب نہایت زود فہم اور روشن دماغ، فطرت سلیمہ اور روشن عقل کے مالک تھے۔ حسن الاخلاق اور انکساری آپ کا شعار تھا۔ اصول فقہ کی ایک کتاب "توضیح اور تلویح" پر آپ کا حاشیہ موجود ہے۔ موصوف کی اور بھی تصانیف پائی جاتی ہیں۔۔۔(۵۷)

قاضی زین العابدین الیمانی:

زین العابدین محسن انصاری یمانی، یمن کے ایک شہر حدیدہ میں پیدا ہوئے۔ اپنے بھائی شیخ حسین و شیخ محمد سے تعلیم حاصل کی پھر مراوعۃ چلے گئے۔ وہاں سید حسین بن عبدالباری کی صحبت سے ایک طویل مدت تک فیضاب ہوئے اور بہت سے علوم پڑھے فقہ و نحو پر بھرپور دسترس حاصل کی۔ شب و روز مطالعہ میں مصروف رہتے تھے۔ آپ کا شمار کامل علماء میں ہوتا ہے۔ جمال الدین خاں مدار المہام ریاست بھوپال سفر حج میں ایک وفد کے ساتھ حدیدہ گئے۔ وہاں قاضی زیب العابدین سے ملاقات ہوئی، اس وقت آپ کی عمر ۱۹ سال تھی۔ زین العابدین جمال الدین خاں کے ساتھ بھوپال تشریف لائے۔ یہیں بھوپال کے قاضی کے عہدہ جلیلہ پر متمکن ہوئے۔ نواب صدیق حسن خاں اور کثیر تعداد میں لوگوں نے آپ سے صحاح ستہ پڑھی۔ ۱۲۹۷ھ میں بھوپال میں انتقال ہوا اور یہیں تدفین عمل میں آئی۔

قاضی زین العابدین کو نحو ولغت اور انشا میں مہارت حاصل تھی۔ فقہ وحدیث میں دست کامل رکھتے ہیں۔ شرح المناسک، مجموع الفتاوی اور کئی رسائل ان فنون میں آپ نے تصنیف کیے۔(۵۸)

شیخ عبدالعلیم لوھاروی:

شیخ عبدالعلیم بن جاں محمد حنفی نقشبندی لوھاروی، سہارنپور کے ایک گاؤں لوہارو میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد کے ساتھ دہلی گئے وہاں شیخ غلام علی دہلوی اور مولوی محمد صادق سے اکتساب علم کیا۔ ۲۵ سال کی عمر تک وہاں رہے، پھر لوہارو لوٹ گئے۔ شیخ احسان علی اجورھنی سے ملاقات ہوئی ان سے بھی علم حاصل کیا، ان کا شمار متقی لوگوں میں ہوتا تھا۔ عبدالعلیم لوہارو نے حجاز کا سفر کیا۔ جب ہندوستان واپس آرہے تھے تو درمیان سفر، بحری امراض میں گرفتار ہو گئے۔ بھوپال پہنچ کر ۱۲۶۶ھ میں وفات پائی، جہانگیر آباد کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

شیخ محمد بن حسین انصاری یمانی:

محمد بن حسین انصاری ۱۲۷۳ھ میں حدیدہ میں پیدا ہوئے۔ نحو، فقہ شافعی اپنے والد سے پڑھا اور اپنے بڑے چچا شیخ محمد بن محسن الیمانی سے بھی درس لیا۔ تقریباً ۱۲۹۱ھ میں بھوپال تشریف لائے اور اپنے چچا شیخ زین العابدین کے زیر تدریس رہے۔ ان سے فقہ و حدیث کی تعلیم حاصل کی، انھوں نے نحو، منطق، فقہ، اصول فقہ، حکمت، عروض و قافیہ کی کتب، صحیح بخاری، بلوغ الرام وغیرہ کا درس اس وقت کے نامور علماء سے اور اجازت وسند حاصل کی۔ حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے، وہاں پر شیخ عبداللہ بن ادریس سنوجی حسنی فارسی سے اجازت وسند حاصل کی۔ بھوپال واپس تشریف لائے تو اپنے والد کی مسند درس پر جلوہ افروز ہوئے اور طویل مدت تک درس و تدریس میں مشغول رہے۔ ایک بار پھر حجاز تشریف لے گئے اور واپس آکر لکھنو میں دار العلوم میں تدریس کا سلسلہ جاری کیا۔ شیخ محمد کی کئی تصانیف ہیں۔ چند کے نام یہ ہیں مثلاً "الطر ز الموشی بفوائدالانشاء "، "والمورود الصافی فی العروض و القوافی" ، "النور الساطع المقنبس من محاسن البدر الطالع" شامل ہیں۔ "نزہۃ الخواطر" میں ان کے کئی قصائد درج ہیں جن میں ایک بھوپال کے لیے ہے جو ۱۳۰۴ء میں لکھا گیا تھا۔ ۱۳۴۴ھ میں بھوپال میں انتقال فرمایا اور یہیں مدفون ہوئے۔

شیخ اسماعیل راندیری:

مولانا اسماعیل راندیر میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ مقامی علماء سے ابتدائی کتب پڑھیں پھر بھوپال کا سفر اختیار کیا۔ مولوی بدیع الزماں لکھنوی اور دوسرے علماء سے کتب درسیہ پڑھیں۔ صحاح اور سنن حسین بن محسن یمانی سے پڑھیں اور ان کی خدمت میں عرصہ دراز تک رہے۔ حجاز کا سفر اختیار کیا اور حج سے مشرف ہوئے۔ تجوید کا علم شیخ محمد دمیاطی سے حاصل کیا۔ راندیر واپس آکر جامع مسجد میں خطیب مقرر ہوئے۔ ۱۳۳۰ھ میں راندیر میں وفات پائی۔

> شیخ اسماعیل صاحب عالم با عمل علماء میں شمار کئے جاتے تھے۔ شیخ اسماعیل نیک صالح، متورع متدین اور پختہ کار تھے۔ زہد و عبادت میں منہمک رہتے تھے۔ ان کو عفت اور صداقت اور توکل میں عالی مقام حاصل تھا۔ (۵۹)

حکیم معزالدین:

حکیم معزالدین بن قاضی مولوی نظام الدین خاں کی ولادت نواح پشاور میں ہوئی۔ معقولات و منقولات کی تکمیل کے بعد خالص پور آئے۔ اس کے بعد حکیم یعقوب حنفی لکھنوی سے علم طب حاصل کیا اور ان کی خدمت میں ایک عرصہ دراز تک رہے۔ وہ اپنے عہد کے علماء میں ایک مشہور عالم تھے۔ علم طب میں مہارت حاصل کرنے کے بعد بھوپال کا سفر اختیار کیا اور شاہی خاندان سے تقرب حاصل کیا۔ چنانچہ سرکار شاہجہاں بیگم نے اپنا طبیب خاص مقرر فرما کر رئیس الاطباء کے عہدہ پر فائز فرمایا۔ آپ صرف سرکار کا ہی علاج کرتے تھے یا پھر بحکم سرکار افراد خاندان شاہی کا علاج کرتے تھے۔ حکیم صاحب کا محبوب مشغلہ درس وتدریس تصنیف وتالیف اور مطالعہ کتب تھا۔ "مطول" نامی کتاب پر آپ کی شاندار تعلیقات موجود ہیں، معالجات کے سلسلہ میں شیخ الرئیس کی کتاب القانون پر بھی آپ نے حاشیہ لکھا ہے۔ ۱۳۲۹ھ میں بھوپال میں وفات ہوئی۔

مفتی یحیی ایوب پھلتی:

یحیی بن ایوب پھلتی ۱۲۷۸ھ میں بھوپال میں پیدا ہوئے، تقریباً دس سال کی عمر میں قرآن حکیم حفظ کر لیا۔ اپنے والد محترم محمد ایوب صاحب اور محدث عبدالقیوم بڑھانوی سے تحصیل علم کیا۔ علم طب بھوپال کے مشہور و معروف اطباء سے حاصل کیا۔ حضرت شیخ ابو احمد مجددی سے بیعت ہوئے اور انہی سے حدیث کی اجازت حاصل کی۔ اپنے والد کی زندگی میں دار الافتاء کے انچارج مقرر ہوئے۔ ۱۳۱۵ھ میں آپ کے والد کے انتقال کے بعد ان کا

تقرر مفتی بھوپال کے جلیل القدر عہدہ پر ہوا۔ نواب محی الدین مراد آبادی کے بھوپال سے چلے جانے کے بعد مولوی محمد ایوب قاضی کے منصب پر فائز ہوئے اور ایک عرصہ تک محکمہ قضاۃ میں اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۳۵۰ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ بقول سیلم حامد

> مفتی یحیی صاحب کو نادر کتب جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے قواعد میں جدید اصطلاحات کیں، انہیں خواب کی تعبیر میں ید طولی حاصل تھا۔ مفتی یحیی نیک اور صالح اور زہد و تقوی میں یکتائے روزگار تھے، بیشتر محدثین سے اجازت حاصل کی تھی، ان کا دلچسپ مشغلہ حدیث اور تفسیر کی تعلیم وتدریس تھا۔ (۶۰)

صابر حسین صباؔ سہسوانی:

صابر حسین صباؔ کی سن ولادت ۱۲۵۲ھ ہے اور وہ محمد احتشام الدین صدیقی کے بیٹے تھے۔ صباؔ ۱۲۹۸ھ میں نواب صدیق حسن خاں کی طلبی پر رامپور کی ملازمت سے استعفی دے کر بھوپال تشریف لائے۔ عربی وفارسی کے ماہر تھے۔ علم عروض اور فن صنائع و بدائع میں دخل رکھتے تھے۔ ۱۳۱۳ھ میں انتقال ہوا۔ صابر حسین صباؔ نواب صدیق حسن خاں کے ہم جلیس تھے۔

> بھوپال میں نظامت مشرق و نیابت وزارت دیوانی و فوجداری میں اعلی عہدہ پر فائز رہے۔ فارسی میں 'شوکت خسروی' لکھی، اس پر نواب کلب علی خاں نے ان کو نظامی ہند کا خطاب دیا تھا، ان کا شمار کہنہ مشق شاعروں میں ہوتا ہے۔ تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ (۶۱)

بھوپال اور بیرون بھوپال ان کے بے شمار شاگرد تھے۔ صابر حسین صبا کے کلام میں پختگی، الفاظ کی رنگینی اور بندش کی چستی ہے۔ صنائع و بدائع کا استعمال کم ہے۔ سادہ اشعار کثرت سے ملتے ہیں جن میں تغزل بدرجہ اتم موجود ہے۔ قصیدہ زیادہ اور غزل کم کہتے تھے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو

بہت کچھ اے صباؔ انداز اڑایا میرؔ و سوداؔ کا　　　نہ وہ حسن بیاں آیا نہ وہ شان سخن آئی

☆

تم نہ آئے تو بھی اک جلسہ رہا　　　کٹ گئی شب نالہ و فریاد میں۔ (۶۲)

لکھنو کے بگڑے ہوئے مذاق شعری کی اصلاح کر کے اس میں نیا حسن پیدا کرنے والے شعراء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ بھوپال میں پاکیزہ مذاق شعری کو پھیلانے میں آپ کا بھی حصہ ہے۔ ۱۳۱۳ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

سید احمد علی اشہری وامجد:

سید احمد علی اشہری ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد میر احمد علی ایسٹ انڈیا کمپنی میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ مولانا اشہری نے علوم مشرقی کی تعلیم حاصل کر کے نواب سکندر بیگم کے عہد میں بھوپال میں آکر ملازمت اختیار کر لی اور ترقی کر کے نائب مرافعہ و میر منشی کے عہدہ پر فائز رہے۔ آپ نے بھوپال میں دو فرمانرواؤں کا عہد دیکھا۔ بائیس سال بھوپال میں سکونت پذیر ہونے کے بعد ۱۸۸۶ء میں حیدر آباد منتقل ہو گئے۔

مولانا اشہری اپنے زمانہ کے مشہور صحافی، مقالہ نگار و مصنف تھے۔ بھوپال کے زمانہ قیام میں انہوں نے بیشتر کتب تصنیف کیں اور شائع کروائیں۔ جن میں سے چند بہت مشہور ہیں۔ کئی تصانیف کے علاوہ خمخانہ جاوید کی تقریظ میں مولانا نے بھوپال میں اپنے بائیس سالہ قیام اور نواب سکندر بیگم و نواب شاہجہاں بیگم سے قرب حضوری کا ذکر کیا ہے۔

> نثر میں سادہ و سلیس عبارت لکھتے ہیں۔ کچھ تصانیف میں حد درجہ پر تکلف اور مسجع عبارت بھی ملتی ہے۔ شاعری عام طور پر اصلاحی و اخلاقی اور علم و حکمت سے پر ہے۔ مولانا اشہری کے کلام میں قدیم و جدید رنگ کا حسین امتزاج ہے۔ عہد شاہجہانی میں بھوپال میں طرحی مشاعروں کا رواج عام ہو گیا تھا۔ نواب صدیق حسن خاں باقاعدہ پابندی کے ساتھ طرحی مشاعرے منعقد کرتے تھے۔ ان مشاعروں میں نواب صدیق حسن خاں کی غزل اور ان کے دونوں صاحبزادوں کی غزلیں مولانا اشہری پڑھ کر سامعین کو سناتے تھے۔ (۶۳)

مولانا اشہری جدید نظم کے ساتھ قصیدہ گوئی میں بھی کامل تھے۔ امجد علی اشہری نے ۱۲۹۸ھ میں ایک اخبار "دبیر الملک" اور ۱۳۰۰ھ میں ایک رسالہ "صحیفہ والا جاہی" نام سے جاری کیا تھا۔ تصانیف کی فہرست کافی طویل ہے بعض کتب ان کی حیات ہی میں شائع ہوئیں اور ادب میں اپنا مقام حاصل کیا۔ "حیات نور جہاں"، "حدیقہ شاہجہانی"، "خواتین اسلام"، "ایشیائی شاعری"، "حیات انیس"، "تاریخ اردو"، "ہادی

اسلام" ،"گوہر آبدار "،درشہوار،"جواہر خوانہ اشہری "،"گلدستہ سلطانی"،"اردو کا گلدستہ"،"شاہجہاں نامہ "وغیرہ ان کی تصانیف ہیں۔

مولوی حکیم سید اعظم حسین سندیلوی:

حکیم سید اعظم حسین کے جد امجد سید خادم حسین نواب جہانگیر محمد خاں کے عہد میں بھوپال آئے تھے۔آپ مہتمم کے عہدہ پر فائز تھے،بعد میں تحصیلدار ہو گئے۔حکیم صاحب نواب صدیق حسن خاں کے ہم جلیس تھے،نواب صاحب کی کتب پر آپ کے قطعہ تاریخ اور قصیدے اکثر موجود ہیں۔فارسی میں مونس اور اردو میں سلیم تخلص کرتے تھے۔حکیم مولوی اعظم حسین نے ریاست کے منشی امتیاز علی خاں سے مخالفت کے سبب استعفی دے دیا۔اس وقت نواب صدیق حسن خاں کا انتقال ہو چکا تھا۔امتیاز علی خاں کے خلاف انہوں نے اپنی شاعرانہ مہم شروع کی۔اس سلسلہ میں ایک مسدس بہت مشہور ہے جو مسدس حالیؔ کے انداز میں ہے۔

سیادت کی نسبت کو ہے عار تم سے
مشیخت کا رتبہ ہے بیزار تم سے
خطابات خانی ہوئے خوار تم سے
بہرحال بہتر ہیں انفار تم سے
اصالت کی تم میں نہیں کچھ نشانی
یہ جھوٹی ہے،شیخی ،غلط ہے یہ خانی(۶۴)

اس مسدس میں حکام ریاست پر نکتہ چینی کی ہے مگر کہیں سے گرفت میں نہیں آئے،اس مسدس میں حکیم صاحب نے انگریزی الفاظ کا استعمال اس میں بڑا بر محل کیا ہے۔مغربی تہذیب کا مذاق اڑایا ہے۔اور لطیف تمسخر پیدا کیا ہے۔بذلہ سنجی اور شوخی نیز ظرافت پائی جاتی ہے۔

قبا پانجامے لگے سب اترنے
لگے کوٹ پتلون درزی کترنے
برانڈی سے چلنے لگا دور ساغر
ٹہلنے لگے بوٹ جوتا پہن کر (۶۵)

مولوی حکیم سید اعظم حسین سندیلوی کا انتقال ۱۹۲۰ء میں قصبہ سلوانی میں ہوا۔

نواب یار محمد خاں شوکت:

نواب فوجدار محمد خاں کے صاحبزادے نواب یار محمد خاں شوکت ۱۲۴۹ھ میں پیدا ہوئے۔ سید عبداللہ سے درسی کتب پڑھیں۔ رامپور کے مفتی شرف الدین صاحب اور سروجن کے مفتی احمد علی صاحب سے علم حاصل کیا۔ شاعری میں مولانا عباس رفعتؔ اور غالبؔ کی شاگردی اختیار کی۔ غالبؔ سے نواب فوجدار محمد خاں کی خاص دوستی تھی۔ اس سبب سے فوجدار محمد خاں یار محمد خاں کو لے کر غالبؔ کے پاس گئے اور ان کا شاگرد بنوایا۔ آخر عمر میں اپنے ضعف کے سبب غالبؔ نے شوکت کو اجازت دے دی کہ ان کے خصوصی شاگرد مولانا عباس رفعتؔ کو اپنا کلام دکھلائیں۔

نواب یار محمد خاں کی ڈیوڑھی سے کئی اہل علم و فن وابستہ تھے اور ان کی توجہ سے کئی مصنفین کی کتابیں شائع ہو سکیں۔ اسی وجہ سے آپ اکثر مقروض رہا کرتے تھے۔ مصیبت زدہ شرفاء اور مفلس اور اہل جوہر کی امداد و سرپرستی ان کی فطرت ثانیہ تھی، جو لوگ ان کی ذات سے وابستہ تھے ان میں نواب سید ذوالفقار علی خاں وزیر بادشاہ دہلی کے نواسے سید محمد تقی خاں عرف میر نواب بھی تھے جو ہنگامہ غدر کے بعد بھوپال منتقل ہو گئے تھے۔

> نواب صدیق حسن خاں کے بعد علمی و ادبی قدر دانی اور سرپرستی کے لحاظ سے نواب یار محمد خاں شوکتؔ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے علمی و ادبی تصانیف کے ذخیروں سے بھوپال کو مالا مال کیا۔(۶۶)

ان کی اہلیہ حسن آراء تمکینؔ عرف مکہ والی بی بی اردو، فارسی اور ترکی زبان میں مہارت رکھتی تھیں اور صاحب تصنیف تھیں۔ کلام نمکین ان کی تصنیف ہے۔ یار محمد خاں کو بھوپال کے نثر نگاروں میں امتیازی مقام حاصل تھا۔

> ان کی علمی و فنی کتب کی زبان بہت زیادہ صاف سادہ اور سلیس ہے۔ انہوں نے قصص لکھنے کی طرف بھی توجہ دی، ان قصص کی زبان پر تکلف اور رنگین۔(۶۷)

ان کا ۸۰ سال کی عمر میں ۱۹۱۳ء میں انتقال ہوا۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ سب آپ کی زندگی میں شائع ہو گئی تھیں۔ ان کی تصانیف میں "ہفت خوان شوکت ،بازنامہ ،مراسلات شوکتؔ،تذکرہ فرخ بخش،دیوان شوکتؔ،مثنوی شعلہ عشق،گلدستہ نرگس ،فسانہ رحمت" وغیرہ شامل ہیں۔

عنایت محمد خاں راسخؔ رامپوری:

عنایت محمد خاں راسخؔ رامپور کے رہنے والے تھے۔ بھوپال میں فاخر محمد خاں جاگیر دار کی صاحبزادی سے ان کی شادی ۱۸۸۲ء میں ہوئی تھی اس لیے بھوپال میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ عربی و فارسی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ شعر و شعری سے دلچسپی تھی، لکھنوی رنگ میں شعر کہتے تھے۔ان کے کلام میں فنی باریکیاں پائی جاتی ہیں۔ مذہبیت کا زور اوائل عمر ہی سے غالب تھا۔ آخری عمر میں اپنا تمام کلام صنائع کی درستی پر زور دیا گیا ہے اسلام کی لازمی تعلیمات کو آپ نے نظم کیا ہے۔

منشی عبدالعزیز خاں اعجاز:

آپ سہسوان کے رہنے والے تھے۔۱۸۵۷ء میں بھوپال آئے۔اس سے پہلے دربار رام پور سے منسلک تھے۔ بھوپال میں نواب صدیق حسن خاں کے دربار میں ان کو اعلیٰ حیثیت حاصل رہی۔ پھر انہوں نے نواب یار محمد خاں شوکتؔ اور نواب یسین محمد خاں کی ڈیوڑھی سے تعلق پیدا کر کے نواب صدیق حسن خاں کی مخالفت مول لے لی، جس کی وجہ سے دو سال گوالیار میں رہے۔ نواب صدیق حسن خاں کے انتقال کے بعد بھوپال واپس آگئے۔۱۸۹۹ء میں انتقال ہوا۔ واجد علی شاہ جب کلکتہ میں اسیری کی زندگی گزار رہے تھے اس وقت اعجازؔ کی لکھی چند وصلیاں دیکھ کر ان کو ''اعجاز رقم'' کا خطاب دیا۔ امیر مینائی آپ کی استادی کے پہلے معترف تھے۔ منشی صاحب برجستہ تاریخ گوئی کے بے مثل ماہر تھے۔ مرنے سے پہلے اپنی رحلت کی تاریخ لکھی جو مشکل سے پڑھی گئی۔ ''اعجاز رقم خاں مرد'' اپنا کلام حفاظت سے رکھنے کے عادی نہ تھے، جس کی وجہ سے سارا کلام ضائع ہو گیا۔ آپ قصیدہ گوئی میں بھی ماہر تھے۔ اس میں شوکت الفاظ اور چستی بندش نے قصائد میں زور پیدا کر دیا ہے۔

مظفر حسین صباؔ:

آپ مولوی محمد یوسف گویا موویٰ کے صاحبزادے تھے۔ بہت ذہین اور طباع انسان تھے۔ آپ کے یہاں ہر وقت علمی اور ادبی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ محمد احسن بلگرامی کے شاگرد اور نواب صدیق حسن خاں کے ہم جلیس تھے۔ آپ کی اہم یادگار تصنیف تذکرہ روز روشن ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو

تنہائی بھی ہے رات بھی ہے آؤ مل بھی جاؤ
یہ کس کے اور کہاں کے کرشمے کدھر کے ناز

کیا غمزے کر رہے ہیں شب وصل وہ صبآ
کر لیں گے جیسے آج ہی تو عمر بھر کے ناز

☆

شراب ناب بھی ہے یا مہ لقا بھی ہے
کہو تو شیخ کہ جنت میں یہ مزا بھی ہے
بیان حوروں کا کرتا ہے شیخ مسجد میں
حریص! کچھ ادب خانہ خدا بھی ہے
کہا سنا کے انہیں حال بیقراری دل
یہ سرگزشت بھی ہے عرض مدعا بھی ہے(۶۸)

آخر عمر میں بھوپال سے حیدر آباد منتقل ہوگئے تھے۔۱۹۲۹ء میں انتقال ہوا۔

منشی غلام ضامن کرم:

مومنؔ دہلوی کے شاگرد تھے۔آپ کا کلام دہلی کی شستہ پاکیزہ زبان میں ہے۔داخلیت کے ساتھ معتدل خارجیت بھی ہے۔مضمون آفرینی معنویت اور فارسی ترکیبوں کا برمحل استعمال موؔمن کی شاگردی کی دین اور ان کا استادانہ انداز ہے۔حیدر آباد کی ملازمت ختم کر کے بھوپال آئے اور ناظم مقرر ہوئے۔غلام ضامن کا۱۸۴۸ء میں بھوپال میں انتقال ہوا۔

> بہت پر گو شاعر تھے بات بات پر شعر کہتے تھے۔ایک ہی نشست میں کئی غزلیں کہہ لیتے تھے۔آپ کے مکان پر ہفتہ وار مشاعرے ہوا کرتے تھے۔بھوپال کے مذاق شعری کو ترقی دینے میں آپ کا بڑا ہاتھ تھا۔(۶۹)

نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

سہ لیں گے جور طاقت و تاب و تواں تلک
لیکن یہ پوچھتے ہیں کہ آخر کہاں تلک (۷۰)

منشی معشوق علی خاں جوہر شاہجہاں پوری:

منشی معشوق علی خاں جوہر شاہجہاں پوری ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے۔ اوائل عمر میں بھوپال آئے تھے۔ شاعری سے غیر معمولی انہماک کی وجہ سے اپنے پیشہ طباعت اور وکالت میں ناکام رہے۔ چوبیس گھنٹہ شعر و شاعری کا مشغلہ رہتا تھا۔ ایک ایک نشست میں دو دو سو اشعار کہہ لیتے تھے۔

> حکیم صاحب غالب کے شاگرد تھے۔ لیکن اپنے طرز و رنگ کلام میں ذوق سے زیادہ قریب ہیں۔ بھوپال کے عوام میں مذاق سخن فہمی پیدا کرنے کی اور نکھارنے کی ناقابل فراموش سعی کی۔ عزیز لکھنوی کی رائے ہے کہ "معشوق علی جوہر کے برابر پر گو شاعر نہیں دیکھا۔" (۱۷)

۱۸۸۱ء سے ۱۹۰۸ء تک بھوپال میں مقیم رہے۔ پھر شاہجہاں پور چلے گئے۔ اور وہیں ۱۹۲۸ء میں انتقال ہوا۔

سید نیاز احمد نامی خیر آبادی:

۱۲۷۱ھ میں نیاز احمد کی ولادت ہوئی۔ سلطان جہاں بیگم ولی عہد ریاست بھوپال کے ملازم تھے بعد میں تحصیلدار ہو گئے۔ لکھنو اور رام پور میں کئی شاعروں کی صحبت سے فیض اٹھائے ہوئے تھے۔ جیسے قلق، امیر، برق اور بحر انیسؔ اور دبیرؔ کی صحبت اٹھائے تھے خود بھی ان ہی کے رنگ میں غزل پڑھتے اور مشاعروں پر چھا جایا کرتے تھے۔ ان کا کلام ورثاء کی بدذوقی کی بدولت برباد ہو گیا۔ کلام ناپید ہے۔ سراج میر خاں سحرؔ اور وفاؔ جیسے شاگرد چھوڑے ہیں۔

حافظ سید ممتاز علی حافظؔ:

بھوپال کے ذی عزت و قدیم سادات خاندان کے فرد تھے۔ اپنے درس و تدریس کی خوبی کی وجہ سے "شیخ عصر" کے نام سے منسوب تھے۔ حافظ سید ممتاز علی بڑے ذی علم، انشاء پرداز اور ادب نواز تھے۔ ان خصوصیات کی وجہ سے نواب شاہجہاں بیگم کے عہد میں روبکار نویس کے عہدے پر مقرر ہوئے۔

> ممتاز علی کی نثر سادہ ہے۔ حشو و زوائد سے پاک ہے، کسی قسم کی لفاظی نہیں پائی جاتی۔ آپ کا تذکرہ "آثار الشعراء" بھوپال کے تذکروں میں سب سے زیادہ

مکمل اور مستند ہے۔ ممتاز علی کہنہ مشق اور پر گو شاعر تھے، کلام نہایت صاف اور سادہ ہے، تصوف و معرفت کے جذبات کے ساتھ سوز و گداز بدرجہ اتم موجود ہے۔(۷۲)

ممتاز علی کی کئی کتابیں دیوان فیض تازہ مثنوی، جشن تاج محل اور مثنوی مراۃ الخیال، تاریخ کعبہ معروف بہ تحفتہالزائرین وغیرہ شامل ہیں۔

تھامس جیمز باپٹسٹ المعروف بہ اچھے صاحب نفیسؔ:

اچھے صاحب ۷ا دسمبر ۱۸۶۷ء میں بھوپال میں پیدا ہوئے۔ نفیسؔ آئزک باپٹسٹ عرف اسحاق صاحب کے بیٹے تھے۔ فن طب میں نفیسؔ کا خاندان کامل تھا۔ فن طب اور دیگر علوم کی تعلیم انہوں نے اپنے اہل خاندان سے حاصل کی۔ فرانسیسی زبان سمجھ لیتے تھے۔ لیکن بولنے پر قادر نہ تھے۔ عربی، انگریزی و پرتگالی جانتے تھے۔ ترکی و فارسی بہت روانی سے بولتے تھے۔

ان کے عہد یعنی عہد شاہجہاں اور سلطانی میں جو ترک سیاح بھوپال آئے تھے اچھے صاحب سے ضرور ملاقات رہی۔ اچھے صاحب بہت حسین و جمیل شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے خاندان کے ساتھ بھوپال کے فرمانرواؤں کے خصوصی تعلقات کی بناء پر اچھے صاحب کی آمد و رفت نواب شاہجہاں بیگم کے محل میں تھی۔ اچھے صاحب نے اپنے والدین کی چوری سے قرآن و حدیث کا علم مفتی ریاست بھوپال عبد الہادی خاں سے حاصل کیا۔ تقریباً ۲۶ سال کی عمر میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ نام سلیمان خاں عرف اچھے صاحب رکھا۔ بھوپال کی سرخ وردی فوج کے ایڈجوائنٹ کمانڈر اور میونسپل ایگزیکٹو آفیسر رہے۔ ایک بڑی جاگیر کے مالک تھے۔ ۷۹ سال کی عمر میں ۱۳اپریل ۱۹۴۶ء کو بھوپال میں انتقال ہوا۔ نفیسؔ کو فن شاعری سے ذوق تھا۔ امیر مینائی کے شاگرد تھے، ۱۶ سال کی عمر میں شعر کہنے لگے۔ زبان صاف اور پاکیزہ تھی۔ بلند خیالی اور سلاست ان کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

نغمہ بلبل کو ہم کو نالہ پسند
اپنا اپنا مذاق ہی تو ہے

☆

مجھے آتا نہیں فریاد کرنا
ذرا اے درد دل امداد کرنا

☆

چمن میں آشیاں اپنا جہاں تھا
وہیں بجلی گری ہے تلملا کر (۷۳)

سراج منیر خاں سحرؔ:

سراج منیر خاں سحرؔ کے جدامجد ریاست بھوپال کے بانی سردار دوست محمد خاں کے ہمراہ افغانستان سے آنے والوں میں سے تھے۔ وہ اپنی کار گزاری کے صلہ میں اعلی فوجی عہدے پر فائز ہوئے۔ نواب سکندر بیگم کے عہد میں سراج منیر خاں کے والد ہزار میر خاں کی دلیری و جرات کی بناء پر باقی محمد خاں سپہ سالار فوج ریاست بھوپال کی صاحبزادی سے عقد ہوا۔ باقی محمد خاں کی شاہجہاں بیگم سے شادی کے بعد ہزار میر خاں کو بھی منصب دیا گیا۔ سراج میر خاں ۱۸۸۷ء میں بھوپال میں پیدا ہوئے۔ والدین نے ان کے دو نام افضل میر خاں اور سراج میر خاں رکھے تھے۔ آپ نے شہ سواری اور نشانہ بازی کی تعلیم بچپن میں حاصل کر لی تھی۔ نشانہ اتنا صحیح تھا کہ ضعیفی کے دور میں بھی خطا نہ ہوتا تھا۔ مولوی وسیم بریلوی سے جو خاندان مجددیہ سے تھے فارسی عربی کی تمام درسی کتابیں پڑھیں۔ منشی عبدالغنی شاہی خوشنویس سے خط نسخ، نستعلیق، شیفتہ، گلزار میں شرف تلمذ حاصل کر کے مہارت پیدا کی۔ مصوری کا فطری شوق ہونے کے سبب سے اس کو سیکھا اور مصوری کی مشق جاری رکھی۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد ان کے لیے عہدہ نظامت تجویز ہوا لیکن انھوں نے علمی ذوق کی تکمیل اور آزادی کے باعث ملازمت سے انکار کر دیا۔ سیر و تفریح کا شوق تھا۔ کئی شہروں وریاستوں کی سیاحت کی، آخر عمر میں خانہ نشین ہو گئے تھے۔ بھوپال میں ۲۸ جون ۱۹۱۸ء میں انتقال ہو گیا۔

بھوپال کے ادبی ماحول اور مشاعروں کی تفریح شرکت نے شعر گوئی کی طرف راغب کیا۔ نیاز احمد خاں خیر آبادی کی شاگردی اختیار کی جو اس وقت بھوپال میں تحصیل دار تھے۔ پہلے سراج تخلص کرتے تھے۔ نامیؔ نے ان کا تخلص سحرؔ تجویز کیا۔

> اس زمانہ میں شہر میں جتنے مشاعرے ہوتے تھے سحرؔ ان میں شرکت کرتے تھے۔ طبیعت میں زبردست جولانی تھی۔ غزل اس تیزی سے لکھتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی کو پرچہ لکھ رہے ہیں۔ مشاقی کا یہ حال تھا کہ قصیدہ، مثنوی، قطعہ،

رباعی غرض سب اصناف سخن ہونے پر سراج منیر خاں سحرؔ کے اشعار عوام کے

نوک زباں ہوتے تھے۔(۷۴)

سحرؔ کے کلام میں جذب واثر نمایاں ہے۔ حسن بیان اور طرز ادا، معاملہ بندی، روزمرہ محاورے کی امتیازانہ خصوصیات سحرؔ کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ سحرؔ کے کلام میں ترنم اور غنائیت بدرجہ اتم ہے۔ سحرؔ صاحب کے کلام کو اس تمدن کی ایک جھلک سمجھنا چاہیے جس تمدن کے دہلی اور لکھنو مرکز تھے۔اور جس کو زمانہ نہایت تیزی سے مٹارہا ہے۔نہ معلوم کتنے نایاب اشعار مختلف شعراء کے ہم نے اپنی ناقدری سے کھو دیئے۔یہی حال سحرؔ کے کلام کا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو

الہی کس قدر میٹھا لہو تھا حلق بسمل کا
کہ وقت ذبح منھ پھر پھر گیا شمشیر قاتل کا

☆

اک جام کے عوض ہم جنت کو بیچ ڈالیں
زاہد غریب اتنا دل لائے گا کہاں سے(۷۵)

عالمگیر محمد خاں نمودؔ:

نواب شاہجہاں بیگم کے بھائی کے بیٹے تھے۔تاج محل میں شاہجہاں بیگم کے ساتھ رہتے تھے۔اس زمانہ میں مشہور علماء سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ محل کا ماحول علم وادب سے معمور تھا جس کے نتیجہ میں عالمگیر محمد خاں کو علم وادب سے لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔تاج محل کے مشاعروں کا انتظام بھی عالمگیر محمد خان کے ذمہ تھا۔ علم وادب سے لگاؤ کی وجہ سے اہل علم و فن کے قدردان تھے، بھوپال کے بے شمار اہل علم و فن آپ کی ذات سے مستفید ہوتے رہتے تھے۔عالمگیر محمد خاں بھوپال کے قدیم طرز کے انشاءپردازوں میں امتیازی حیثیت کے حامل ہیں۔ان کی سب سے قابل قدر کتاب اور قیمتی یادگار شبستان عالمگیری ہے۔جس میں بھوپال کی تاریخ کے ساتھ تاج محل میں منعقد مشاعروں میں شریک ہونے والے شعراء کا ردیف وار کلام اور مشاعرے کی روائیدادا تنقید تبصرے کے ساتھ دی گئی ہے۔ بھوپال کی مشہور عمارتوں کا ذکر بھی اس کتاب میں موجود ہے۔عالمگیر محمد خاں کی شادی نواب مصطفی خاں شیفتہؔ کی صاحبزادی منور جہاں بیگم مسرتؔ سے ہوئی تھی جو بڑی بیگم کے نام سے مشہور ہوئیں۔عالمگیر محمد خاں کے کلام میں حددرجہ فنکاری کے ساتھ برجستگی ہے۔نمونہ کلام ملاحظہ ہو

ہے تصور سخت مجھ کو اک بت بے پیر کا
سنگ پر لکھا ہے کیا نامہ مری تقدیر کا
جن کو دیکھا اک نظر تو نے وہ تیرا ہو گیا
کام آنکھوں سے ارے ظالم لیا تسخیر کا (۷۶)

عزیز اللہ خاں عزیزؔ بھوپالی:

ان میں شاعرانہ ذوق بدرجہ اتم موجود تھا۔ محکمہ سائر میں ملازم تھے۔ دفتر کے اوقات کے علاوہ اپنا تمام وقت شاعرانہ مشاغل میں صرف کرتے تھے۔ موجؔ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ آپ کا شمار اس دور کے نامی گرامی اساتذہ میں ہوتا ہے۔ عزیز اللہ خاں کو جملہ اصناف سخن پر قدرت حاصل تھی۔ نعت کہنے میں خاص شہرت پائی۔ ان کا کلام مختلف مجموعوں کی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ نعت عزیزی، مولود شریف، کلام عزیزؔ اور تضمین عزیزؔ بہت مشہور ہیں۔

اتنا بھی ضبط یاد کے لائق ہے اے عزیز شکوہ اجل سے بھی نہ کیا انتظار کا (۷۷)

امیر مینائی آپ کی بڑی قدر کرتے تھے۔ عزیز اللہ خاں کے کلام میں صفائی اور سادگی ہے۔ ابتدا میں عشق مجازی کا رنگ غالب تھا۔ لیکن بعد میں ترک کر کے نعت گوئی کی طرف متوجہ ہوئے۔

نام حضور جب کہ نکلتا زباں سے ہے
آتی صدائے "صلی علی" لامکاں سے ہے
ہر دم لبوں پہ اپنے ہو نام محمدی
اتنا ہی کام ہم کو تو کام و دہاں سے ہے (۷۸)

نظیر محمد خاں وفاؔ:

نظیر محمد خاں کا شمار دور شاہجہانی کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ آپ نیاز احمد نامیؔ کے دوسرے مشہور شاگرد رشید تھے۔ وفاؔ کو مشہور و معروف شعراء کے حالات زندگی اور منتخب کلام زبانی یاد تھے۔ اس حیرت انگیز قابلیت کی وجہ سے وفاؔ کو انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت حاصل تھی۔ نظیر محمد خاں وفاؔ کا کلام جذبات حسن و عشق سے معمور ہے۔ سلاست، روانی، اختصار، سادگی اور جوش بیان انکی نمایاں خصوصیات ہیں۔ جدید رنگ شاعری سے متاثر تھے۔ حالانکہ خود رنگ قدیم کے شاعر تھے۔ واقعیت و اصلیت کے دلدادہ تھے اور یہی صفت ان کو اپنے ہم

عصروں میں ممتاز کرتی ہے۔ کہیں کہیں مذہب کا غلبہ بھی نمایاں ہے۔ بڑھاپے میں بھی جوانوں کی سی شاعری کرتے تھے۔

مرا بیان کسی کو رلائے گا پہروں
کہ سوز و ساز محبت کا مرثیہ ہوں میں
مجھے تو تم نظر آتے ہو دونوں عالم میں
تمہارے حسن کے جلوؤں میں گھر گیا ہوں میں (۷۹)

حافظ غلام احمد فروغی:

غوری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اساتذہ وقت ان کی قابلیت کے معترف تھے۔ ابراہیم پورہ میں آپ کی کتابوں کی دکان تھی۔ جس پر عہد شاہجہانی کے اساتذہ جمع ہوتے تھے۔ حافظ صاحب فارسی واردو کی تعلیم بلا معاوضہ دیا کرتے تھے۔ جہانگیر یہ اسکول بھوپال میں حافظ صاحب فارسی کے ہیڈ مولوی تھے۔ طلباء کو بیت بازی میں سہولت ہو، اس خیال سے ایک کتاب فیض شاہجہانی لکھی جو خالق باری کی طرز پر ہے۔ اشعار میں روانی ہے اور حشوزائد سے پاک ہے۔ اردو، انگریزی، ہندی، فارسی، عربی و ترکی کے ۴۵ لغت استعمال کیے ہیں۔ حروف ابجد کے حساب سے ۱۲۔۱۳ااشعار ردیف وار نظم کیے ہیں اور ہر شعر کا خاتمہ "رائے مہملہ" پر کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر رضیہ حامد

> یہ کتاب شعر وادب کا اچھا مجموعہ ہے، جو بھوپال کے مدرسہ سلمانیہ کے نصاب میں داخل کر دی گئی تھی۔ شاہجہاں بیگم کی طرف سے اس کتاب پر حافظ صاحب کا دس روپیہ ماہوار منصب مقرر ہوا۔ (۸۰)

یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اسی قسم کی چند کتابیں حافظ صاحب نے اور تصنیف کیں۔ ان کتب کو دیکھ کر امام بخش صہبائی نے حافظ صاحب کو اپنے نواسے کی تعلیم کے لیے دہلی آنے کی دعوت دی۔ حافظ صاحب کو نجی ملازمت کرنا پسند نہیں تھا۔ اس لیے انکار کر دیا۔ آپ کی کتب کے نام ہیں حیات عزیزی ،نصاب بے نظیر ،نذر سلطانی ،مثنوی شاہجہانی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ نمونہ کلام

ایزد و اللہ و باری کردگار

خالق رحمن و خدا پروردگار

احمد و حامد محمد مصطفی

پارسا زاہد تقی پرہیزگار(۸۱)

سید علی اعظم ربطؔ:

سید علی اعظم ۱۲۸۵ھ میں پیدا ہوئے۔راجہ سید عبدالعلی خاں نائب دوم ریاست بھوپال کے منجھلے بیٹے تھے۔فارسی اور اردو کی اعلیٰ قابلیت کے حامل تھے۔علمائے وقت سے گہرا لگاؤ تھا،زیادہ وقت علماء کی صحبت میں گزارتے تھے۔جمیل سہسوانی کے شاگرد تھے۔پہلے ذکیؔ تخلص کرتے تھے بعد میں استاد کے مشورہ پر ربط تخلص کرنے لگے۔ربطؔ کو غزل اور قصیدہ دونوں پر عبور حاصل تھا۔آپ کے مکان پر بڑے پر زور مشعرے ہوا کرتے تھے۔ منشور سخن نام کا ایک مجموعہ آپ کا تالیف کردہ ہے،جس میں ان مشاعروں میں پڑھی جانے والی غزلیں شاعر کے تعارف کے ساتھ دی ہیں۔نمونہ کلام

پوچھو نہ حقیقت مرے دل اور جگر کی

درد ایک سا رہتا ہے ادھر اور ادھر روز

اے ربطؔ نصیب انکے ہیں ، تقدیر ہے ان کی

جاتے ہیں جو اس بزم میں بے خوف و خطر روز(۸۲)

منور جہاں بیگم مسرتؔ:

منور جہاں بیگم مسرتؔ نواب مصطفی خاں شیفتہؔ کی بڑی بیٹی تھیں عرف عام میں "بڑی بیگم "کے نام سے مشہور تھیں۔ان کی شادی عالمگیر محمد خاں نمودؔ سے ہوئی تھی۔شاعرانہ ماحول،شاعری کا ذوق ان کو ورثہ میں ملا تھا،بھوپال کی فضا نے ان کو مہمیز کیا۔نواب شاہجہاں بیگم کی مصاحبت میں رہتی تھیں۔محل میں ہونے والے مشاعروں میں برابر شرکت کرتی رہیں۔امیر مینائی سے اصطلاح لی،کلام میں پختگی ہے،زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ان کا دیوان طبع ہو گیا ہے۔نمونہ کلام

چلتے ہیں کس ادا سے وہ انداز دیکھنا

معجز نمائی نگہ ناز دیکھنا

اچھا نہ ہو سکا نگہ ناز کا مریض

اب پھر نہ کرنا دعویٰ اعجاز دیکھنا
تو سخت گیر ہے کہ مسرت ہے سخت جاں
اب ہم کو ہے یہ غمزہ غماز دیکھنا

☆

باغ میں سب کچھ بہار اے دلربا تھی میں نہ تھا
ابر تھا، مطرب تھا، ساقی تھا، ہوا تھی، میں نہ تھا

☆

دل مرا بیٹھ گیا ، اشک جو آنکھوں سے بہے
چند قطروں میں ہوا غرق سفینہ اپنا
دے چکے یار کو جان و جگر و دل ہیہات
ہم لٹا بیٹھے محبت میں خزینہ اپنا (۸۳)

حسن آراء بیگم تمکینؔ:

سعودی عرب کی رہنے والی تھیں۔نواب سکندر بیگم جب حج کرنے گئیں۔تو ان کے ساتھ بھوپال آگئیں،نواب سکندر بیگم کی رائے اور مرضی سے نواب یار محمد خاں شوکتؔ سے شادی ہوئی۔علوم و فنون سے غیر معمولی دلچسپی تھی، جس کی وجہ سے چند سال میں اردو زبان سیکھ لی،ان کو اہل زبان پر قدرت حاصل ہو گئی تھی، بھوپال کی شعری فضا نے ان کو متاثر کیا اور جلد ہی شعر کہنے لگیں۔عبدالعزیز اعجاز" کی شاگرد رہیں ہیں۔ محل پر شاہجہاں بیگم کے منعقدہ کئے مشاعروں میں شریک ہوتی تھیں۔ان کی مجلس کی رکن تھیں۔کلام تمکینؔ" کے نام سے ان کی تین کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ایک کتاب میں ایک کلام کے علاوہ دیگر خواتین کا کلام بھی درج کیا ہے۔زبان نہایت شستہ ہے،کلام پر لکھنو کا اثر نمایاں ہے۔سو سال کی عمر ۱۹۳۶ء میں ان کا انتقال ہوا۔نمونہ کلام

آنکھیں جو چار ہو گئیں کل ان سے راہ میں
صبر وقرار لے گئے اک ہی نگاہ میں
ذرات کائنات ہیں آئینہ جمال

کیا کیجیے فتور ہے اپنی نگاہ میں
اے مست خوش خرام ذرا دیکھ بھال کے
آنکھیں بچھی ہوئی ہیں تری شاہراہ میں

☆

بس نہیں چلتا کسی صورت مری تدبیر کا
وصل جاناں کیا نہیں خالق مری تقدیر کا
آج کل بھوپال میں ہے ایسی گرمی کی بہار
نام ٹھنڈا جس کے آگے ہو کیا کشمیر کا

☆

غریبوں پر ہے کیوں یہ مہربانی
کوئی پوچھے ہماری بے کسی سے
سنا ہے مرگ عاشق سے وہ خوش ہیں
خفا ہونا پڑا اب زندگی سے (۸۴)

مشرف جہاں بیگم ثروتؔ:

نواب مصطفی خاں شیفتہؔ کی چھوٹی بیٹی تھیں۔ نواب شاہجہاں بیگم ان سے بہت شفقت اور محبت سے پیش آتی تھیں۔ ثروت کی شادی بھوپال میں نواب صدر محمد خاں سے ہوئی تھی۔ ذوق شعری ان کو ورثہ میں اپنے والد سے ملا تھا۔ محل کی مجالس میں شرکت کرتی تھیں۔ امیر مینائی کی شاگرد تھیں۔ استادوں کی زمین میں طبع آزمائی کی ہے۔ کہیں کہیں بالکل نئے اور اچھوتے مضامین کو شعر میں ادا کئے ہیں۔ کلام میں ترنم، سادگی اور لطافت ہے۔ دیوان مطبوعہ ہے۔ نمونہ کلام

حال کیا پوچھتے ہو فرقت کا
ایک ہنگامہ تھا قیامت کا

ان سے لکھا مرا پڑھا نہ گیا
تھا یہ لکھا ہماری قسمت کا
خواب میں اب نظر وہ آنے لگے
خوب جاگا نصیب ثروتؔ کا

☆

ستم یار کا اظہار کروں یا نہ کروں
نالے دل کھول کے دوچار کروں یا نہ کروں
اپنی محفل میں تو آنے نہیں دیتے مجھ کو
کہہ دو نالے پس دیوار کروں یا نہ کروں
عشق اک پردہ نشیں کا ہے مرے دل میں نہاں
ثروتؔ اس کا کہو اظہار کروں یا نہ کروں

☆

ساقیا بھر دے ، لگا لیں منھ سے پیمانے کو ہم
دیں گے جی بھر کر دعائیں تیرے میخانے کو ہم
ہم پہ جو صدمے گزرتے ہیں نہ پوچھو جان من
جان جاناں جانتے ہیں دل کے آجانے کو ہم(۸۵)

کلثوم بی ممتازؔ:

نواب قدسیہ بیگم صاحبہ کی مصاحب تھیں۔اس کے بعد نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ کی ہم جلیس ہو گئیں۔ کلثوم بی کے والد کا نام مولوی فتح علی خاں حیدر آبادی تھا۔شاہجہاں بیگم کے ذوق شعری اور بھوپال کی فضائے شعری کی وجہ سے ان کو شاعری سے دلچسپی ہوئی۔ان کی غزلوں کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے ہر غزل کو ایک عنوان دیا ہے۔جیسے شیریں کلام،راحت طبع ،قرص قمر وغیرہ دیوان مطبوعہ ہے۔عبدالعزیز اعجازؔ اور یار محمد خاں شوکتؔ کی شاگرد تھیں۔نمونہ کلام

ستم سا ستم ہے جفا سی جفا ہے
مرا شکر بھی واں گلہ ہو گیا

لہو سے شہیدوں کے کوچہ ترا
تماشا کہہ کربلا ہو گیا

☆

حشر تک بھی نہ کھلی آنکھ نہ کروٹ بدلی
چین سے قبر میں اے موت سلایا کیا کیا
طعنے دشمن کے سنے سرزنش دوست سنی
آفت ہجر کا صدمہ نہ اٹھایا کیا کیا

☆

غیر از جفا بتوں سے امید وفا غلط
اظہار غم فضول ، ستم کا گلا غلط
ناآشنا مزاج ہیں، ناحق شناس ہیں
ہے ان بتوں سے شکوہ جورو جفا غلط
میں ہوں مریض عشق زمانے سے کیا غرض
فکر دوا عبث ہے خیال شفا غلط (۸۶)

سکندر بیگم ضیا:

جاورہ کے کوتوال امیر علی کی بیٹی تھیں،ان کے بھائی مولوی نظام الدین ریاست بھوپال میں وزیر مال تھے۔ضیاء کے کلام میں پختگی اور گہرائی ہے،فدا علی فارغ کی شاگرد تھیں۔اپنے عہد کی مشہور شاعرہ تھیں، محل کے مشاعروں میں شریک ہوتی تھیں۔کئی تذکروں میں ان کا کلام شامل ہے جیسے تذکرہ ماہ درخشاں ،خمخانہ جاوید وغیرہ دیوان مطبوعہ ہے نمونہ کلام

تماشائی تمہارے حسن کے ہر سو نکلتے ہیں
حرم میں اہل ایماں ، دیر میں ہندو نکلتے ہیں
نہ پیکاں ہے نہ ہے سوفار پر تیر ان کی نظروں کے
گزر جاتے ہیں دل سے توڑ کر پہلو نکلتے ہیں
ضیا کیا مدعی سمجھے سخن اپنا ہے ذومعنی

نئے انداز ہیں اس میں نئے پہلو نکلتے ہیں

☆

کچھ عجب اضطراب ہے دل میں
صبر ہے اور نہ تاب ہے دل میں
اس لیے عرش اس کو سمجھے ہیں
کہ وہ عالی جناب ہے دل میں

☆

گم کر دہ راہوں اور منزل سے دور ہوں
طوفان زدہ سفینہ ہوں ساحل سے دور ہوں
تسکین کون دونوں کودے اضطراب میں
دل مجھ سے ہائے دور ہے میں دل سے دور ہوں (۸۷)

سلطان جہاں بیگم حیا:

سکندر بیگم ضیاء کی چھوٹی بہن تھیں۔فارسی اور اردو زبان پر قدرت کاملہ رکھتی تھیں۔بھوپال کے سلطانیہ گرلس اسکول میں فارسی کی معلمہ مقرر ہو گئی تھیں۔شاعری میں اچھی دستگاہ تھی،ان کا کلام لکھنو کے گلدستہ "پیام یار "میں چھپتا رہتا تھا۔نمونہ کلام

دل لگی کی تھی کچھ ارمان نکلنے کے لیے
بھاڑ میں جھونک دیا عشق نے جلنے کے لئے
دل بیمار کو تم چھیڑتے ہو یاد رکھو!
مدتیں چاہیں پھر اس کو سنبھلنے کے لیے
شکوہ دوست حیاؔ نزع میں کیوں ہے لب پر
زہر کھا لیتے ہیں یوں زہر اگلنے کے لیے

☆

ہجر میں ہر لحظہ غمگیں ہوں ترا غم ہے گواہ
اشک جاری ہیں ہمیشہ چشم پرنم ہے گواہ

رخصت اے تاب و تواں ہے آمد رنج و الم
محفل عشرت ہے برہم بزم ماتم ہے گواہ
شام سے ہی یاد گل روئے عرق آلودہ ہوں
صبح تک رویا ہوں میں اے ماہ شبنم ہے گواہ
مار ڈالا کس لیے قاتل حیاؔ کو بے سبب
بے گناہی کا تو اس کی ایک عالم ہے گواہ (۸۸)

آمنہ بیگمؔ:

مشہور "تذکرہ آثار الشعرا" کے مرتب حافظ سید ممتاز علی کی اہلیہ تھیں۔ حافظ قرآن ہونے کے علاوہ حدیث و فقہ کا بھی علم حاصل کیا تھا، شاعری میں حمد و نعت کہتی تھیں۔ ان کا کلام ضائع ہو گیا۔ صرف ایک قطعہ ملتا ہے۔ جو حافظ سید ممتاز علی کی کتاب تاریخ کعبہ کی طباعت کے بعد لکھا تھا، جس سے تاریخ طباعت نکلتی ہے۔

فضل خدا سے جب چھپ چکی ساری کتاب
فکر سال طبع اس کی تب ہوئی اے ناظرین
غیب سے آئی ندا اے آمنہ بیگم لکھو!
رہنمائے باسعادت نا سکین و زائرین
(۱۳۱۹ھ)۔(۸۹)

ڈاکٹر سلیم حامد رضوی نے اپنے تحقیقی کاوش "اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ" میں چند خواتین کے نام درج کیے ہیں۔ جو شاعری کرتی تھیں۔ کچھ داغؔ اور کئی امیر مینائی کی شاگرد تھیں۔ کلثوم بی صنمؔ، ام الحامد پروین، عشرت جہاں عشرتؔ بھوپالی، محمود بیگم صاحبہ، آفتاب بیگم ماہد ہلوی اور اختر جہاں حیدر آبادی۔ ان کا سب کا کلام گاہ گاہ اس زمانہ کے رسائل میں شائع ہوتا رہتا تھا۔

سیٹھ چھوگ مل تجمؔ بھوپالی:

سیٹھ چھوگ مل تجمؔ خاندان موڑ سے تعلق رکھتے تھے۔ فارسی اور اردو کے بڑے ماہر تھے۔ عبد العزیز اعجاز رقم کے خاص شاگرد تھے۔ ۱۸۹۸ء میں امیرؔ مینائی بھوپال آئے تو اعجازؔ رقم کے ساتھ ملاقات کے لئے گئے۔ امیر مینائی

سے ان کا خصوصی تعلق پیدا ہو گیا۔انہوں نے اپنی شاگردی میں لیا۔امیر مینائی جب تک بھوپال رہے برابر برابر اپنے ساتھ رکھتے تھے،اپنے پاس سے ہٹنے نہیں دیتے تھے۔ تجمّ اردو اور فارسی دونوں میں شاعری کرتے تھے۔ان کے کلام میں روز مرہ اور محاورے کی خوبیاں موجود ہیں۔رعایت لفظی کا بے تکلفانہ استعمال ہے جس کی وجہ سے کلام اور بھی صاف وشستہ ہو گیا ہے۔نمونہ کلام

اگر وہ یاد کرتے ہیں تو صورت بھی دکھا جائیں
الہی جاں گسل آیا کریں ہچکیاں کب تک

☆

ہوتا آنسو تو گراتے مجھے سب آنکھوں سے
بات ہوتی تو میں منہ چڑھ کے پشیماں ہوتا (۹۰)

منشی ایسری پرشاد جوہر شاہجہاں پوری:

ایسری پرشاد کم عمری ہی میں بھوپال آئے تھے۔پہلے تحصیلدار ہوئے پھر دفتر تاریخ میں مدیر ہو گئے تھے۔جمیل سہسوانی کے شاگردوں میں جوہر کا کلام سب سے پاکیزہ اور بلند ہے۔کلام میں زبان کا لطف،خیال کی لطافت اور تغزل کی حلاوت نمایاں خصوصیات ہیں۔نمونہ کلام

دل بیتاب نہ ٹھہرائے سے اپنا ٹھہرا
تھک گئے اپنے پرائے سبھی ٹھہرا ٹھہرا

☆

کوچہ زلف بتاں میں ایک دل کی کیا بساط
قافلے اس راہ میں دیکھے ہیں لٹ جاتے ہوئے (۹۱)

میاں عاقل محمد خاں عاقل:

بھوپال کے بڑے جاگیر داروں میں سے تھے۔عاقل تاج محل کے مشاعروں میں بطور منتظمین شامل رہے اور دیگر ادبی تحریکات میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔خود صاحب دیوان شاعر تھے اور جملہ اصناف سخن پر قدرت رکھتے تھے۔عاقل محمد خاں عزیز بھوپالی کے شاگرد تھے۔ان کا کلام میں لفظی صنائع کے ساتھ ساتھ جذبات،سوز و گداز اور تصوف کی چاشنی ہے۔عاقل کا کلام لکھنوی اور دہلوی رنگ کا امتزاج ہے،کلام میں پختگی ہے۔ان کا شمار اساتذہ میں ہوتا

تھا۔ عاقل محمد خاں نہ صرف سخن سنج بلکہ سخن فہم اور سخن پرست بھی تھے۔ متعدد شاعروں کے کلام کی اشاعت آپ کی مرہون منت رہی ہے۔ نمونہ کلام

غم کے دریا میں ، بادباں ہو کر
کشتی تن چلی رواں ہو کر

☆

موسیٰ کوئی ہووے تو سنے کان لگا کر
خاموش نہیں ہے شجر طور کی آواز (۹۲)

سید محمد اسمعیل دسنوی:

۱۲۸۴ھ کے مطابق ۱۸۸۰ء کو دھولپور کی ملازمت ترک کر کے ملازمت بھوپال آئے، نواب سکندر بیگم ان کی علمی لیاقت سے بہت متاثر ہوئیں۔ جمال الدین خاں مدار المہام سے آپ کا تعارف تھا۔ دفتر روبکاری میں ملازم ہوئے، عہد شاجہانی میں تحصیلدار ہوئے۔ بعد میں علاقہ تال کے تحصیلدار ہوئے۔ محمد اسماعیل نے دو بڑی قیمتی کتابیں تصنیف کی ہیں۔

> ایک" تاریخ طلسم بکاؤلی"جو تین بار مختلف ناموں سے مختلف پریسوں میں طبع ہوئی، چوتھی مرتبہ طلسم بکاؤلی کے نام سے طبع ہوئی۔ آپ کی دوسری کتاب "التاریخ تال بھوپال"ہے۔ جس میں راجہ بھوج کے حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ تاریخی حیثیت سے اچھی کتاب ہے۔ (۹۳)

سید نورالحسن خاں کلیمؔ:

سید نورالحسن خاں بروز چہار شنبہ ۲۱رجب ۱۲۷۸ھ کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ اان کی پرورش خداترسی، علم دوستی اور صلاح و تقوی کے ماحول میں ہوئی، جس میں قرآن و حدیث کی صدائیں گونجتی تھیں۔ قاضی ایوب بن قمر الدین، قاضی انور علی لکھنوء، مولوی الٰہی بخش فیض آبادی، بشیر الدین عثمانی قنوجی، محمد بشیر سہسوانی، قاضی محمد بن عبدالعزیز جعفری، شیخ حسین بن محسن انصاری اپنے والد نواب صدیق حسن خاں سے تحصیل علم کیا۔ شیخ فضل الرحمن بن اہل اللہ بکرمی مراد آبادی کے پاس مراد آباد گئے اور ان کی صحبت میں رہ کر استفادہ کیا۔

اردو فارسی میں شعر کہتے تھے۔شعر گوئی کا ذوق ورثہ میں ملا تھا۔آخر عمر میں
تصوف سے زیادہ شغف ہو گیا تھا۔کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ عموماً کتب کا تعلق
صوفیانہ مسلک سے ہے۔(۹۴)

اردو ،فارسی شعراء کے تذکرے بھی لکھے مثلاً"تذکرہ طور کلیم ،تذکرہ شعراء الفرس،تذکرہ شعراء ہند،تذکرہ نگارستان سخن" ، یہ سب فارسی میں ہیں۔ایک ضخیم کتاب "مجموعہ رسائل" ہے اس میں مختلف صوفیانہ موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔آخر عمر میں بالکل خانہ نشین ہو کر فقیرانہ زندگی بسر کرنے لگے۔نواب صدیق حسن خاں کی قیمتی کتابوں کے خزانے سے استفادہ کرتے رہے تھے۔نواب شاہجہاں بیگم کے انتقال کے بعد لکھنو چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کی۔۱۳۳۰ھ میں لکھنو میں انتقال ہوا۔نمونہ کلام

دل تو رندوں کے صاف ہوتے ہیں
خطرہ آتا نہیں عبادت کا

☆

ہائے کس کو رلا دیا تو نے
تنگہ یاس کیا کیا تو نے
روش التماس کیا کہنا
کام بگڑا بنا دیا تو نے (۹۵)

میر علی حسن خاں طاہرؔ:

نواب صدیق حسن خاں کے دوسرے فرزند نور الحسن خاں کے بیٹے تھے۔۱۴ربیع الثانی ۱۲۸۳ھ کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ابتداء سے ہی علم و ادب سے دلچسپی تھی۔علی حسن خاں کا امتیاز نثر نگاری تھی کئی کتابوں کے مصنف تھے۔فارسی اور اردو کے شاعر تھے اور شعر و سخن کے قدردان تھے۔وہ احسن بلگرامی کے شاگرد تھے۔سرسید کی تحریک سے متاثر تھے۔علی حسن خاں شبلی کے بڑے معترف تھے۔شبلیؔ بھوپال میں ان ہی کے محل میں قیام کرتے تھے۔یہ محبت و عقیدت آخر عمر تک قائم رہی۔علی حسن خاں کو شاہجہاں بیگم نے ڈائریکٹر تعلیمات مقرر کیا۔تعلیم کی ترویج اور ترقی کے لیے علی حسن خاں نے شبلی سے مشورہ کیا اور اس سلسلہ میں شبلی نے کئی دفعہ بھوپال کا سفر

کیا۔۱۳۱۷ھ میں بھوپال کے علاوہ باہر کے ممتاز علماء کو اس کا ممبر بنایا جن میں علامہ شبلی اور محمد ابراہیم آروی بھی شامل تھے۔ان حضرات کے مشورہ سے مدارس بھوپال کی اصلاح کا کام شروع کیا۔۱۹۰۳ء میں علی حسن خاں لکھنو میں سکونت پذیر ہوئے۔ شبلی سے تعلقات اور زیادہ استوار ہو گئے۔

علی حسن خاں نے مولانا شبلی کی خاطر نواب صدیق حسن خاں کا پورا کتب خانہ ندوہ کو دے دیا اور ندوہ کی رکنیت قبول کر لی تھی۔(۹۶)

ندوہ کی رکنیت اختیار کی اور آخر میں ندوہ کی نظامت کا کام شبلی کی دوستی اور محبت میں قبول کیا، جس کو سالہا سال انجام دیتے رہے۔جب شبلی نعمانی کی ٹانگ اتفاقیہ گولی لگ جانے سے کاٹی گئی تو علی حسن نے ایک منظوم پیغام بھیجا۔

شبلی ترے قوم پر بڑے احسان ہیں
باتیں تری درد قوم کی ا رمان ہیں
اک پاؤں اگر گیا تو رنج نہ کر
اس ایک قدم پہ لاکھ سر قربان ہیں (۹۷)

ان کی کتابوں کے نام درج ذیل ہیں مثلا" ماثر صدیقی موسوم بہ سیرت ولا جاہی، سیرت الاسلام، تعلیم و تربیت والبیان، تذکرہ بزم سخن وغیرہ۔نمونہ کلام

شوق نے اب اور مضطرب کر دیا
چٹکیاں لے کر دل ناشاد میں

☆

غمزہ ؤ ناز و عشوہ ؤ انداز
انہیں دو چار نے تو مارا ہے
تجھ سے ظالم کے جور اٹھائے ہیں
یہ ہے دل یہ جگر ہمارا ہے ! (۹۸)

مولوی سلامت اللہ جیراجپوری:

انقلاب آزادی ۱۸۵۷ء سے سات سال پہلے جیراجپور میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد شیخ رجب علی آپ کی صغر سنی میں وفات پاگئے تھے۔مولوی سلامت اللہ کو بچپن سے طلب علم کا شوق تھا،اس لیے گھر سے روانہ ہوکر جونپور میں مولوی حیدر حسین مدرسہ میں تعلیم حاصل کی۔ان کا شمار ممتاز طالب علموں میں ہوتا تھا۔مفتی محمد یوسف اور مولانا محمد قاسم دیوبندی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔تحصیل علم کے بعد وطن واپس جاکر کتاب وسنت کی ترویج اور شرک وبدعت کی بیخ کنی میں مصروف ہوگئے۔شبلی نعمانی سے بعض امور پر بحث کی۔حالانکہ وہ بحث کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔بنارس میں ایک مدرسہ میں مدرس ہوگئے،وہاں پنڈتوں سے یوگ کا فن سیکھا،جس سے بعد میں بھوپال کے پنڈتوں نے استفادہ کیا۔بنارس میں آٹھ سال ملازمت کرنے کے بعد حج کے لیے گئے اور واپسی میں بھوپال میں مدرسہ وقفیہ کے صدر مدرس ہوئے اور ترقی کرتے ہوئے محکمہ تعلیمات کے مہتمم کے عہدہ پر فائز ہوئے۔جامع مسجد میں وعظ کہتے تھے،کسی بھی مسلک کے افراد کو کبھی آپ سے کوئی شکایت نہیں ہوئی۔بہت پاکباز،راست گواور متقی و پرہیز گار تھے۔تصنیف وتالیف کا ذوق نہ تھا۔ایک رسالہ تصوف

میں تحریر کیا تھا جو غلطی سے ان کے بیٹے اسلم جیراجپوری کے نام سے شائع ہو
گیا۔علاوہ ازیں بیعت کے متعلق بھی ایک مختصر تحریر ملتی ہے۔(۹۹)

ملازمت سے سبکدوش ہوکر گھر پر طلباء کو پڑھاتے تھے۔یہ عمل آخر تک جاری رہا۔مولوی سلامت اللہ کا ۱۵ جون ۱۹۰۴ء کو بھوپال میں انتقال ہوا۔تین بار جنازہ کی جماعت ہوئی۔محبت شاہ کے تکیہ میں دفن ہوئے۔

ارجمند محمد سلیم خاں:

نواب یسین محمد خان کے بیٹے میاں ارجمند محمد سلیم خاں شاعر وادیب تھے بھوپال کے وہ پہلے نوجوان نثر نگار تھے۔جنھوں نے ناول،ڈراما کی جانب توجہ دی۔انھوں نے کئی ناولوں کے ترجمے اردو میں کیے اور ڈرامے بھی لکھے اور معلومات عامہ تاریخ،مذہب اور اخلاقی موضوعات پر کتابیں تحریر کیں۔

حکیم اصغر حسین اخگر:

اس عہد کے نثر نگاروں میں حکیم اصغر حسین اخگر کا نام اس وجہ سے اہم ہے کہ وہ اس عہد کے مستند انشاء پرداز اور پہلے صحافی بھی تھے۔انہوں نے ۲۴ مارچ ۱۸۷۱ء میں نواب شاہجہاں بیگم کے حکم پر پہلا اردو اخبار "عمدۃ

الاخبار" جاری کیا۔ جس میں ان کی تحریریں شائع ہوتی تھیں۔ان کے علاوہ ان کی مطبوعہ وغیر مطبوعہ تصانیف میں "نالہ دل"، اور ایک رسالہ "تہذیب زبان" مطبع نظامی کانپور شامل ہیں۔

ہم نے جن قابل قدر علماء واد باء اور شعراء کا ذکر کیا ہے وہ نواب شاہجہاں بیگم کے عہد میں بھوپال میں موجود تھے۔اس عہد کے ماحول اور علمائے متذکرہ کی علمی خدمات کے نتیجے میں زمانہ مابعد بھی علماء کی بہت بڑی تعداد بھوپال میں پیدا ہوئی۔اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نواب سلطان جہاں بیگم کے عہد تک ان علمائے سابقہ نے بھوپال میں علمی فضا قائم کی۔ نواب شاہجہاں بیگم کے شوہر نواب صدیق حسن خاں ایک علم دوست، علماء پرور اور علم نواز شخصیت کے مالک تھے اور تصنیف و تالیف سے ان کو بے حد شغف تھا۔

> بہت سے علماء اور صاحب کمال ادیب و شعراء ان کی وجہ سے بھوپال تشریف لائے تھے۔اس زمانہ میں بھوپال میں علمی کشش مقناطیسی حد تک قائم ہو گئی تھی۔ کچھ علماء اور مشاہیر ایسے تھے کہ جن کا قیام بھوپال میں طویل نہیں رہا لیکن ان کے قیام نے بھوپال کی علمی و ادبی ترقی کو متاثر کیا۔(۱۰۰)

ان مشاہیر اور علماء میں اردو کے صاحب طرز شاعر امیر مینائی کی بھوپال آمد ہے۔ وہ پہلی بار ۱۸۹۷ء میں بھوپال آئے اور کچھ عرصہ قیام کیا تھا۔ نواب شاہجہاں بیگم کی خواہش تھی کہ وہ مستقل بھوپال میں مقیم ہو جائیں۔ان کو تین سو ماہوار وظیفہ کی پیشکش کی۔ان کے بیٹوں کو اعلیٰ عہدوں پر ملازمتیں دینے کا وعدہ کیا مگر پھر بھی وہ واپس جانے پر بضد رہے۔دوسری بار وہ ۱۹۰۰ء میں دوبارہ حیدر آباد جاتے ہوئے اہل بھوپال کے اصرار سے مجبور ہو رہ یہاں چند دن مقیم رہے۔ نواب شاہجہان بیگم نے ان کا اس بار بھی بھرپور استقبال کیا۔ان کے بھوپال قیام نے ادبی ذوق کو نکھار دیا۔ بھوپال کے بہت سے شعراء ان کے شاگرد ہو گئے۔ یہ دور بھوپال کے علم و فن کے اعتبار سے "دور زریں" کہے جانے کا مستحق ہے۔ان علماء کا ایک جگہ جمع ہو کر علم وادب کی خدمت کرنا بھوپال کی خوش قسمتی تھی۔

> یہ عہد اس وجہ سے بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ اس دور میں بھوپال میں نہ صرف اردو صحافت کا آغاز ہوا بلکہ "دبیر الملک"، "صداقت"، "موج نربدا"، ہفت روزہ"، صغیر عام"، پندرہ روزہ" ، "ہلال" وغیرہ اخبارات جاری ہوئے۔ "والا جاہی"، "مہر منیر"، "گل رعنا"، گلبن سخن" وغیرہ معیاری رسائل

اور گلدستوں کا اجراء اور بھوپال کا پہلا تذکرہ فرخ بخش کی اشاعت عمل میں آئی۔(۱۰۱)

نواب شاہجہاں بیگم بھوپال سے شائع ہونے والی ہر کتاب پر انعام دیتی تھیں چنانچہ بے شمار شعراء کے تذکرے اور دواوین شائع ہوئے۔ شعر و شاعری کے لحاظ سے دور شاہجہانی کو دیکھ کر دہلی اور لکھنو کے ایام شباب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ان کے محل میں بڑے دھوم دھام سے مشاعرے ہوا کرتے تھے۔اور شعراء کو انعام و اکرام کے ساتھ خلعت سے بھی نوازا جاتا تھا۔انیسویں صدی کا بھوپال مشرقی تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔نواب شاہجہاں بیگم کے والد نواب جہانگیر محمد خاں نے اپنے عہد حکومت میں مومن خاں مومنؔ دہلوی کو اور ان کی والدہ نواب سکندر بیگم نے ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے وقت غالبؔ کو دہلی سے بھوپال آنے کی دعوت دی اور کل مصارف کی ذمہ داری لی۔علاوہ ازیں فرمائش کر کے اردو میں فسانہ عجائب کے انداز میں ایک قصہ لکھوایا جو انھوں نے شرار عشق کے نام سے لکھ کر انعام و خلعت حاصل کی۔نواب جہانگیر محمد خاں اور نواب سکندر بیگم کے عہد میں اردو شاعری پر دہلوی رجحانات غالبؔ نظر آتے ہیں۔

> دور شاہجہانی میں اہل لکھنو کی آمد بڑھ جانے کی وجہ سے شاعری میں دہلویت کے بجائے لکھنویت کا رنگ عام ہونے کے باوجود ابتذال، عریانی اور بے حجابی سے بھوپال کی شاعری پاک رہی۔نواب شاہجہاں بیگم کا دور حکومت علمی و ادبی حوالے سے بھوپال کا زریں دور تسلیم کیا جاتا ہے۔(۱۰۲)

نواب شاہجہاں بیگم شیریں فطرتؔ بیدار مغز، جفاکش الوالعزم، فیاضی اور مدبر نہایت سادگی تھی۔مذہبی امور و فرائض کی ادائیگی کی نہایت سختی کے ساتھ پابند تھیں۔ان کا قد پستہ اور بدن دہرا تھا آواز میں رعب و دبدبہ تھا۔علم دوست اور صاحب قلم ماں باپ کی بیٹی نواب شاہجہاں بیگم نے قدرت سے ذہن رسا پایا تھا اور ذوق سخن و مذاق علمی ورثہ میں کثرت مطالعہ اور مشاہدات و تجربات نے جلا دی اور ان کی تخلیقی صلاحیتیں بحیثیت شاعرہ اور مصنفہ کے منظر عام پر آئیں۔جن سے اردو شاعری و نثر کے سرمایہ میں قابل قدر اضافہ ہوا۔

نواب شاہجہان بیگم کی تصنیفات اور ذوق علمی:

نواب شاہجہان بیگم بھوپال کی فرمانروا بیگمات میں سے پہلی بیگم ہیں۔جن کے نام کے ساتھ مصنفہ کا پر احترام لفظ نظر آرہا ہے۔یوں تو نواب سکندر بیگم میں بھی یہ قابلیت موجود تھی جو تاریخ سکندری اور آئین سکندری

کی تالیف وتدوین سے نمایاں ہوتی ہے لیکن انہوں نے خود کوئی کتاب تصنیف نہیں کی۔ نواب شاہجہاں بیگم شیریںؔ کے والد نواب جہانگیر محمد خاں خود ایک بلند پایہ شاعر اور والدہ نواب سکندر بیگم اعلیٰ درجہ کی نثر نگار تھیں۔ ان کے دوسرے شوہر نواب صدیق حسن خاں عربی، فارسی اور اردو کے جید عالم اور مفسر قرآن تھے۔ چنانچہ دونوں کے مذاق علمی ادبی ومذہبی کی بدولت بھوپال علماء وفضلا کا مرکز بن گیا۔

> نواب شاہجہاں بیگم کے عہد میں ریاست بھوپال کو کچھ ایسی شخصیتوں کا قرب حاصل ہوا جس نے بھوپال کو نہ صرف بلکہ ہندوستان سے باہر بھی وزن و وقار بخشا۔ ان شخصیتوں میں نواب صدیق حسن خاں کا نام سر فہرست ہے۔ وہ ایک عہد ایک زمانہ تھے۔ سرسید کی طرح ان کو بھی اگر ایک ادارہ کہا جائے تو نامناسب نہ ہو گا۔(۱۰۳)

نواب شاہجہاں بیگم مصنفہ اور شاعرہ بھی تھیں۔ نواب امیر الملک سے نکاح کرنے کے بعد تصنیف وتالیف کی طرف متوجہ ہوئیں۔ اور بہت مفید کتابیں تصنیف فرمائیں۔ عمر کے ساتھ شاعری کا شوق بھی ترقی کرتا گیا۔ پہلے شیریںؔ تخلص تھا۔ پھر بدل کر تاجورؔ کر دیا۔ نواب سلطان جہاں بیگم اصاحبہ

> ان کے دو دیوان "تاج الکلام" اور "دیوان شیریں" چھپ چکے مگر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ان کا اپنا کلام بہت تھوڑا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ شاعرہ تھیں باقی فضول گو لوگوں نے لکھ کر ان سے منسوب کر دیا۔ اس قیاس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی اور کتابوں میں ان کی تہذیب، متانت اور سنجیدگی کا جو انداز ہوتا ہے۔ دیوان کے زیادہ تر اشعار اس کے بالکل برعکس ہیں۔(۱۰۴)

شاعری کے سلسلہ میں ان کی ایک مثنوی صدق البیان کے نام لکھی اسکی زبان سادہ اور عام ہے۔ یہ مثنوی پاکیزگی، حقیقت نگاری، منظر نگاری اور فنکاری کے لحاظ سے بہت بلند ہے۔ اس کے مطالعہ سے ہندوستان کے جغرافیائی اور طبع حالت، رہن سہن، تہوار اور رسوم پر روشنی پڑتی ہے۔ بقول ڈاکٹر سلیم حامد رضوی

> اس میں (مثنوی صدق البیان) زبان کی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ حقیقت نگاری اور منظر نگاری کے بیش قیمت نمونے پائے جاتے ہیں۔ باعتبار بندش، تمثیل واستعارہ بھی۔ یہ مثنوی کلام الملوک ملوک الکلام کے مصداق ہے۔(۱۰۵)

اس مثنوی میں پہلے تو پرانے زمانے کی تحقیق کے مطابق آسمان کی حالت برجوں کی شکل، تبدیلی موسم کی وجوہات جو بروج کے اثر سے پیدا ہوتی ہیں، زمین کی ماہیت اور پیداوار کے متعلق معلومات ہیں۔ پھر ہندوستان کی زمین کی کیفیت اور اجناس کی پیداوار معدنیات، چرند و پرند، مچھلیاں اور موسمی کیفیات اور اس کا جو اثر انسانوں پر ہوتا ہے وغیرہ دکھانے کے بعد ان موسموں کے اشغال، کھیل، تماشے، میلے، تہوار، بسنت، ہولی، دیوالی کا مفصل بیان ہے۔ اس کے بعد شہنشاہ تیمور اور راجہ پتھورا کی جنگ، تیمور کی فتح یابی، اس کا جشن فتح اور انتظام مملکت دکھایا ہے۔ پھر بابر و شاہجہاں کا بھی ذکر ہے۔ دہلی کی عمارات آبادی، باغات، جشن، ساون اور ہولی کے حالات تحریر کیے ہیں۔ اس مثنوی سے ہندوستان کی جغرافیائی و طبعی حالت اور قدیم معاشرت بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ فنی سطح پر بھی یہ مثنوی بہت اہمیت کی حامل ہے۔

تاج الاقبال:

تاریخ میں تاج الاقبال مشہور کتاب ہے۔ جس میں سردار دوست محمد خاں بانی ریاست کے حالات سے لے کر اپنی حکومت کے ابتدائی چار سال تک کے حالات درج کیے ہیں۔ واقعات کے لحاظ سے یہ کتاب دو حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ حصہ اول جس میں ریاستی اصلاحات اور مختلف جنگی احوال کا بیان ہے۔ حصہ دوم نواب سکندر بیگم کے عہد سے شروع ہوتا ہے اور اختتام نواب شاہجہاں بیگم نے اپنے عہد کے ابتدائی عشروں پر کیا ہے۔ یہ کتاب گیارہ فرمانروایاں بھوپال کی جن کا زمانہ فرمانروائی ۱۱۲۰ھ سے شروع ہوتا ہے۔ ایک مکمل تاریخ ہے۔ ۱۶۹ سال تک کے تمام مفصل حالات نہایت تفصیل سے درج ہیں۔ آخر میں چند ضمیمہ جات ہیں۔ جن میں گوشوارہ مردم شماری، اپنے زمانے کے دفاتر کی تمام تفصیلات، قصبوں کا حال، وغیرہ کا تذکرہ نہایت وضاحت کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ اس تاریخ کا ترجمہ انگریزی، فارسی، مرہٹی میں بھی کیا گیا ہے۔

تہذیب النسواں و تربیت الانسان:

عورتوں کے لئے خاص طور پر تہذیب النسواں و تربیت الانساں لکھی۔ یہ کتاب امور خانہ داری کی تعلیم کے لیے نہایت مفید و کار آمد ہے۔ اس میں عورتوں کے امراض، ادویہ، گھٹی، عقیقہ، تقریبات، غذا و لباس، بیماری و علاج، منت و نذر، توہمات، ادعیہ، تربیت، والدین کا برتاؤ، گھر کی آرائش، زیورات، تعلیم، فنون، سپہ گری، سینا پرونا، رنگنا، ازدواج، حقوق الزوجین، طلاق و خلع، عدت، تیمارداری، تعزیت، موت، جزع و فزع، سوگ،

خیرات، مقبرہ، زیارت قبور وغیرہ کو نہایت عمدگی کے ساتھ قرآن وحدیث کے حوالے سے سلیس عبارت میں نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔اس کے صفحات کی تعداد ۴۷۵ ہے۔یہ کتاب اس قدر اہم ہے کہ تمام پڑھی لکھی عورتیں کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے اور معاملات زندگی سے متعلق آگاہی حاصل کریں۔ نواب شاہجہاں بیگم کی تمام تصنیفات میں اس کتاب کو ایسی قبولیت عامہ حاصل ہوئی کہ کئی دفعہ بکثرت چھپوا کر تقسیم کی گئی۔یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی اہمیت ہر دور میں مسلمہ ہے۔

خزینۃ اللغات:

اس کے علاوہ انہوں نے خزینہ اللغات کے نام سے ایک جامع لغت تیار کی، جس میں چھ زبانوں اردو، فارسی، عربی، سنسکرت، ترکی، اور انگریزی میں ہم معنی الفاظ دیئے گئے ہیں۔اس لغت کی انفرادیت یہ بھی ہے قاری کو تحریری اور تلفظ کی سہولت پہنچانے کی خاطر اردو کے علاوہ دیگر زبانوں کے الفاظ فارسی رسم الخط کے علاوہ اس زبان کے رسم الخط میں بھی لکھے گئے ہیں۔

دیوان شیریں:

سرزمین بھوپال میں نواب شاہجہاں بیگم ایک ایسی شاعرہ کے طور پر ابھرتی ہوئی نظر آتی ہیں جن کے ہاں مکمل شاعرانہ خصوصیات موجود ہیں۔

کبھی ہندو ہے کبھی وہ ہے مسلماں شیریںؔ
روز اس بت کو نئی شان سے ہم دیکھتے ہیں (۱۱۶)

شاہجہاں بیگم شاعرہ بھی تھیں۔ان کا تخلص تاجور اور شیریں تھا۔نواب شاہجہاں بیگم شیریںؔ نے اپنی سبھی مصروفیات کے باوجود شعر وشاعری کی طرف توجہ کی۔ان کی شیریں کلامی کا اعتراف ناقدین علم و فن نے کیا ہے۔تاریخ ادب اردو، کے مولف رام بابو سکسینہ کے الفاظ میں

نواب شاہجہاں بیگم بہت اچھی شاعرہ تھیں اردو میں شیریںؔ اور بعد میں تاؔجور تخلص کرتی تھیں۔(۱۰۷)

نواب شاہجہاں بیگم شیریں کی فصاحت اور سادگی بیان، روانی ان کے دیوان دیوان شیریں میں 'الف' سے 'ی' تک متعدد اشعار میں موجود ہے۔اس زمانے کے مطابق ان کے دیوان حروف تہجی کے اعتبار سے مکمل دیوان

ہیں۔یہ دیوان ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔دیوان شیریں کو مطبع نظامی نے شائع کیا ہے۔اس کی قطعہ تاریخ بہت سے لوگوں نے لکھی انہی میں منشی فدا علی صاحب متخلص فارغ بھی شامل تھے انہوں نے جو قطعہ تاریخ لکھی۔

لطف و خوبی و حسن خط سے فارغ

کیا ہی رنگین چھپا کلام شرین

حلوا بی دود ہی یہ تاریخ لذیذ

کیا ہی شیرین چھپا کلام شرین(۱۲۸۸ھ)۔(۱۰۸)

محمد عبدالباسط سہسوانی نےدیوان شیریں کے متعلق اپنی رائے پیش کرتے ہیں کہ

عجب دیوان ہی روشن حسن نہ کیون مشتاق ہون پروانہ حسن لطافت کوٹ کرا سمین

بھری ہی ہر اک بیت اسکی گویا اک پری ہی وہ ہین الفاظ رنگین بسکہ شیرین معانی

جس کے خود سر گرم تحسین زبان ہووے جو صرف وصف اعنی ہنے وہ ماہی دریای

معنی صفت جتنی کرون اسکی وہ کم ہی مجھے اقبال کے سر کی قسم ہی۔(۱۰۹)

اردو شاعری میں محبوب کا تصور ایک حسین و جمیل نازک اندام،خوش فکر اور خوش گفتار عورت کا ہے۔اردو غزل اپنے اس روایتی محبوب کی شان میں ہزار ہزار طریقوں سے نغمہ زن رہی ہے۔اردو شاعری میں خواتین شاعرات خال خال نظر آتی ہیں۔اس کے برعکس ہندی شاعری کا محبوب کرشن کنہیا ہے اور کرشن بھگتی کے رنگ میں رنگی ہوئی میرابائی، سجو بائی اور کتنی شاعرات ہیں جنھوں نے اپنے ہم عصر مرد شاعروں سے بڑھ کر نام پیدا کیا۔اس سے مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ اردو میں شاعرات نہیں ہیں۔بلکہ یہ کہ ہمارے ہاں یہ روایت کمزور ہے شاعرات اردو کے سلسلہ میں یہ امر قابل ذکر ہے ہندوستان کی وہ ریاستیں جو آزاد یا خود مختار ریاستیں تھیں وہاں حالات کی سازکاری کی بنیاد پر ادب نے فروغ پایا اور خواتین شاعرات بھی اس میدان میں نظر آتی ہیں۔جن میں بیگمات اودھ اور بیگمات بھوپال کے نام سر فہرست ہیں۔مولانا امجد اشہری اس ضمن میں کہ شاعری میں خواتین کس حد تک اپنے فن کے جوہر منوا رہی تھیں لکھتے ہیں کہ

حضور ممدوحہ کی بدولت نہ صرف بھوپال میں شعر و شاعری کا چرچا عام ہوا بلکہ محل خاص میں اکثر مشاعرہ کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ان میں بعض اعلی درجہ کی شاعرہ خواتین بھوپال کی عورتوں میں شعر و شاعری کے ذوق کی اشاعت بھی ممدوحہ کی بدولت عام ہوئی۔(۱۱۰)

۱۸۹۰ء کا نواب صدیق حسن خاں کا انتقال ہو گیا۔ان سب حالات سے وہ بہت زیادہ حساس ہو گئی تھیں اور یہی حسیت ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔نواب شاہجہاں بیگم شیریںؔ کا عہد بھوپال کی تاریخ میں اردو علم وادب کی ترقی کے لحاظ سے "سنہرا زمانہ" کہا جاتا ہے۔اس لم جیراجپوری لکھتے ہیں

اس وقت بھوپال اپنے علمی وادبی کارناموں کے لحاظ سے بغداد الہند کی حیثیت رکھتا تھا۔(۱۱۱)

نواب شاہجہاں بیگم شیریںؔ کے کلام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ حسن مجازی کے آئینہ میں حسن حقیقی کی جلوہ آرائی ہے۔

صورت تمہاری آئینہ دل پہ ہے عیاں
پردے میں تم نے منھ کو چھپایا تو کیا ہوا (۱۱۲)

☆☆

ساقی میخانہ ہوگی گر نگاہِ مست یار
مئے کا پینا اہل تقوی کو روا ہو جائیگا (۱۱۳)

☆☆

روشنی مہر کی زرہ سے بھی کم ہو جاتی
خیر گزری کہ ترے رخ کے مقابل نہ ہوا (۱۱۴)

☆☆

دن کو خورشید اسے کہتے ہیں شب کو مہتاب
مہر درخشاں گہے ، گاہے مہہ تاباں ہے وہ رخ
مجھ سے تعریف نہیں ہوتی ہے اس کی شیریںؔ
چشم بدور عجب قدرت یزداں ہے وہ رخ (۱۱۵)

☆☆

اردو شاعری میں غزل کا یہ دور استاد داغ کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے۔فصاحت اور سلاست بیان داغ کی شاعری کی بنیادی صفت ہے۔یہ خصوصیات نواب شاہجہاں بیگم شیریںؔ کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔نواب شاہجہاں بیگم کی شاعری روایت کا علمبردار ہے۔غزل کے روایتی انداز کے حوالے سے کچھ اشعار ملاحظہ ہیں۔

پیچ جو اس زلف کا یاد آگیا
سانپ میرے سینہ پہ لہرا گیا

☆☆

بزم میں بٹھایا نہ مجھ کو کبھی
روز ترے گھر میں ، میں آیا ، گیا (۱۱۶)

☆☆

بکھرے ہیں بال چہرے پہ ، زلفیں ہیں دوش پر
آئے ہو آج کیسے پریشان اس طرف(۱۱۷)

☆☆

آنکھیں کھلی ہیں دید کی حسرت میں اب تلک
مڑ کر تو دیکھو کشتہ شمشیر کی طرف (۱۱۸)

☆☆

نہیں تری باتوں کا مجھ کو گلہ ہے
تجھے سر چڑھایا یہ اس کی سزا ہے (۱۱۹)

☆☆

کیوں مسیحائی نہیں کرتے ہو لاشہ پر میرے
یہ سمجھتے ہو کہ سوتے کا جگانہ منع ہے (۱۲۰)

☆☆

نواب شاہجہاں بیگم کے کلام میں فلسفیانہ مسائل نہیں ہیں اور نہ انہوں نے مولانا الطاف حسین حالیؔ کے اتباع میں شاعری کو اصلاح کا ذریعہ بنایا۔وہ بااختیار خاتون، رعایا کی ہمدرد اور مصلح قوم تھیں۔مگر جب شاعری کرتیں تو دماغ کی نہیں دل کی شاعری کرتی ہیں۔ان کا تصور ادب برائے زندگی کے بجائے ادب برائے ادب کا نظر آتا ہے۔ان کی

شاعری قلبی احساسات، جذبات اور کیفیات کا دوسرا نام ہے۔ اور ان کی غزلوں میں الفاظ رواں دواں نظر آتے ہیں اور سننے والوں کے دل میں اتر جاتے ہیں۔ نواب شاہجہاں بیگم شیریںؔ نے موسمیات کو بھی موضوع غزل بنایا ہے۔ نمونہ کلام

بادل گرج گنگن چھائے گھڑی گھڑی پل چھن برہا ستائے
ہمرے پیا پردیس سدھارے ات بدرا جھک آئے کارے
وادر مور پپیہا بولے بنا پیا کچھ موہے نہ بھائے (۱۲۱)

☆☆

سکھی کالی بدیا گھر آئی پون چلت پروائی
اموا کی ڈال پپیہا بولے کوئل سبد سنائے
گرج گرج برست ہے مورے آنگن بجلی چمکی من بھائے (۱۲۲)

☆☆

پنگھٹ

پلا ساقیا بادۂ داستاں
کہ ہے سیر دریا کا کچھ اب بیاں
عجب حسن کا واں تھا پنگھٹ بنا
کہ ہر سو نیا نقشہ تھا گھاٹ کا
پری وش ، حسین ، دلربا ، خوبرو
فراہم وہاں ہوئی تھیں چار سو
وہ بن بن کے آتی تھیں اور پھر وہاں
تھیں گھونگھٹ میں کرتی نظر بازیاں
مٹکتی چمکتی وہاں آتی تھیں
اسی ڈھنگ سے پھر چلی جاتی تھیں
چہل سے تھیں آپس میں پھر کھیلتی
ہر اک طرح کی کرتی تھیں دل لگی

کوئی دھوتی تھی پالب آب پر
کوئی چھینٹوں سے کرتی تھی اس کو تر
کوئی شوخ تر اس سے واں بیٹھ کر
اڑاتی تھیں چھینٹے ادھر اور ادھر
کوئی گاگریں دھوکے پھر اس میں آب
جھکولے سے بھرتی تھی با آب و تاب
کوئی اپنی پائل بجاتی ہوئی
چلی جاتی تھی جھونکے کھاتی ہوئی (۱۲۳)

نواب شاہجہاں بیگم شیریںؔ نے دیگر شعری و نثری اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے مگر غزل گوئی ان کا خاص میدان ہے۔ان کے ہاں غزل کو بہت اہمیت حاصل ہے جو اپنے روایتی انداز کے ساتھ موجود ہے۔نواب شاہجہاں بیگم کے شعری ذوق کی بدولت اس دور میں خواتین شاعرات کی تعداد میں اضافہ ہوا اور دربار میں شعری محفلیں کثرت سے منعقد ہونے لگیں تھیں۔بھوپال کو ادبی مرکز بنانے میں فرمارو ایان بھوپال کی ذاتی دلچسپی کا بہت بڑا عمل دخل تھا۔

حوالہ جات

۱۔ سلطان جہاں بیگم، نواب، گوہر اقبال (بھوپال: س ن)، ص ت

۲۔ سلطان جہاں بیگم، نواب، حیات شاہجہانی (آگرہ: مطبع مفید عام، ۱۹۱۴ء)، ص ۳

۳۔ ایضاً، ص ۵

۴۔ ایضاً، ص ۶

۵۔ سلطان جہاں بیگم، نواب، تذکرہ باقی (بھوپال: مطبع سلطان الاقبال ہتمام مولوی حمید اللہ، ۱۹۱۵ء)، ص ۴۱

۶۔ و۔ اصاحبہ، بیگمات بھوپال (لاہور: دار الاشاعت پنجاب، ۱۹۳۲ء)، ص ۳۳

۷۔ سلطان جہاں بیگم، نواب، تذکرہ باقیٔ (بھوپال: مطبع سلطان الاقبال ہتمام مولوی حمید اللہ، ۱۹۱۵ء)، ص ۷۹

۸۔ رضیہ حامد، ڈاکٹر، نواب شاہجہاں بیگم (نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار، ۲۰۱۵ء)، ص ۵۲

۹۔ ایضاً، ص ۲۲۷

۱۰۔ سلطان جہاں بیگم، نواب، حیات شاہجہانی (آگرہ: مطبع مفید عام، ۱۹۱۴ء)، ص ۱۴، ۱۵

۱۱۔ عبد الغنی، بیگم، بیگمات بھوپال (کراچی: ایلیگنٹ پرنٹرز، ۱۴۰۵ھ)، ص ۳۴

۱۲۔ رضیہ حامد، ڈاکٹر، نواب شاہجہاں بیگم (نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار، ۲۰۱۵ء)، ص ۵۶۔۵۷

۱۳۔ سلطان جہاں بیگم، نواب، حیات شاہجہانی (آگرہ: مطبع مفید عام، ۱۹۱۴ء)، ص ۳۵

۱۴۔ سلطان جہاں بیگم، نواب، حیات قدسی (بھوپال: باہتمام مولوی محمد حمید اللہ مہتمم ریاست بھوپال مطبع سلطانی ریاست بھوپال، ۱۹۱۷ء)، ص ۱۵۳

۱۵۔ رضیہ حامد، ڈاکٹر، نواب شاہجہاں بیگم (نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار، ۲۰۱۵ء)، ص ۱۰۵

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۰۶

۱۷۔ سلطان جہاں بیگم، نواب، تاج الاقبال (مطبع سلطان محمد حمید اللہ۔ ۱۹۰۲ء)، ص ۱۷۱

۱۸۔ "قاضی وجدی الحسینی، بھوپال تحریکات آزادی کے آئینے میں (آگرہ: بھوپال بک ہاؤس، ۱۹۹۴ء)، ص ۱۱۰

۱۹۔ سلطان جہاں بیگم، نواب، تاج الاقبال (مطبع سلطان محمد حمید اللہ، ۱۹۰۴ء)، ص ۲۴۵
۲۰۔ ایضاً، ص ۲۵۶
۲۱۔ سلطان جہاں بیگم، نواب، تاج الاقبال (بھوپال: مطبع سلطان محمد حمید اللہ، ۱۹۰۲ء)، ص ۲۹۰
۲۲۔ عبد الغنی، بیگم، بیگمات بھوپال (کراچی: ایلیگنٹ پرنٹرز، ۱۴۰۵ھ)، ص ۳۷
۲۳۔ رضیہ حامد، ڈاکٹر، نواب شاہجہاں بیگم (نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار، ۲۰۱۵ء)، ص ۱۱۰
۲۴۔ ایضاً، ص ۱۰۹
۲۵۔ ایضاً، ص ۶۲
۲۶۔ رضیہ حامد، ڈاکٹر، نواب شاہجہاں بیگم (نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار، ۲۰۱۵ء)، ص ۱۰۶
۲۷۔ ایضاً، ص ۱۰۸
۲۸۔ رضیہ حامد، ڈاکٹر، نواب شاہجہاں بیگم (نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار، ۲۰۱۵ء)، ص ۱۰۹
۲۹۔ سیلم حامد رضوی، ڈاکٹر، اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ (نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار، ۱۹۶۵ء)، ص ۷۸
۳۰۔ رضیہ حامد، ڈاکٹر، نواب شاہجہاں بیگم (نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار، ۲۰۱۵ء)، ص ۱۱۱
۳۱۔ ایضاً، ص ۱۱۳
۳۲۔ سیلم حامد رضوی، ڈاکٹر، *اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ* (نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار، ۱۹۶۵ء)، ص ۵۴۔۵۵
۳۳۔ ایضاً، ص ۴
۳۴۔ ایضاً، ص ۴۴
۳۵۔ سیلم حامد رضوی، ڈاکٹر، اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ (نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار، ۱۹۶۵ء)، ص ۷۷
۳۶۔ ایضاً، ص ۱۲۷
۳۷۔ رضیہ حامد، ڈاکٹر، نواب شاہجہاں بیگم (نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار، ۲۰۱۵ء)، ص ۱۰۱

۳۸۔ سیلم حامد رضوی،ڈاکٹر،اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ(نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار، ۱۹۶۵ء)، ص ۱۲۱

۳۹۔ ندوی، مولانا عبدالحہ وابوالحسن علی،نزہتہ الخواطر (حیدر آباد: مطبع مجلس دائرۃ االمعارف العثمانیہ، ۱۹۸۱ء)، ص ۷، ص ۱۲۲

۴۰۔ رضیہ حامد، ڈاکٹر,نواب شاہجہاں بیگم(نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار، ۲۰۱۵ء)، ص ۱۳۰

۴۱۔ ایضاً، ص ۱۳۰

۴۲۔ ایضاً، ص ۱۳۱، ۱۳۲

۴۳۔ ایضاً، ص ۱۳۳

۴۴۔ دائرہ المعارف اسلامیہ (لاہور: ادارہ دانش گاہ)، ص ۱۰۳

۴۵۔ رضیہ حامد، ڈاکٹر،نواب شاہجہاں بیگم(نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار، ۲۰۱۵)، ص ۱۳۵

۴۶۔ ایضاً، ص ۱۳۵

۴۷۔ سیلم حامد رضوی،ڈاکٹر،اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ(نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار، ۱۹۶۵ء)، ص ۱۸۹

۴۸۔ سیلم حامد رضوی،ڈاکٹر،اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ(نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار، ۱۹۶۵ء)، ص ۷۸

۴۹۔ ایضاً، ص ۷۸

۵۰۔ رضیہ حامد، ڈاکٹر،نواب شاہجہاں بیگم(نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار، ۲۰۱۵ء)، ص ۱۳۶

۵۱۔ ایضاً، ص ۱۳۷

۵۲۔ ایضاً،، ص ۱۳۸

۵۳۔ رضیہ حامد، ڈاکٹر،نواب شاہجہاں بیگم(نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار، ۲۰۱۵ء)، ص ۲۰۱۵

۵۴۔ ایضاً، ص ۱۵

۵۵۔ رضیہ حامد، ڈاکٹر،نواب شاہجہاں بیگم(نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار، ۲۰۱۵ء)، ص ۱۴۰

۵۶۔ ایضاً۔ ص ۱۴۲

۵۷۔ ایضاً۔ ص ۱۴۳

۵۸۔ ایضاً۔ ص ۱۴۳

۵۹۔ ایضاً۔ ص ۱۴۵

۶۰۔ ایضاً۔ ص ۱۴۶

۶۱۔ رضیہ حامد،ڈاکٹر،نواب شاہجہاں بیگم(نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار،۲۰۱۵ء)، ص ۱۴۷

۶۲۔ ایضاً۔ ص ۱۴۸

۶۳۔ ایضاً۔ ص ۱۴۹

۶۴۔ ایضاً۔ ص ۱۵۱

۶۵۔ ایضاً۔ ص ۱۵۱

۶۶۔ ایضاً۔ ص ۱۵۶

۶۷۔ ایضاً۔ ص ۱۵۳

۶۸۔ سیلم حامد رضوی،ڈاکٹر،اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ(نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار، ۱۹۶۵)، ص ۲۴۲

۶۹۔ رضیہ حامد،ڈاکٹر،نواب شاہجہاں بیگم(نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار،۲۰۱۵ء)، ص ۱۵۸

۷۰۔ سیلم حامد رضوی،ڈاکٹر،اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ(نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار، ۱۹۶۵ء)، ص ۲۳۵

۷۱۔ رضیہ حامد،ڈاکٹر،نواب شاہجہاں بیگم(نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار،۲۰۱۵ء)، ص ۱۵۸

۷۲۔ ایضاً۔ ص ۱۶۰

۷۳۔ سیلم حامد رضوی،ڈاکٹر،اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ(نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار، ۱۹۶۵ء)، ص ۲۶۹

۷۴۔ ایضاً۔ ص ۲۵۰

۷۵۔ رضیہ حامد، ڈاکٹر، نواب شاہجہاں بیگم (نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار، ۲۰۱۵ء)، ص ۱۶۲

۷۶۔ سلیم حامد رضوی، ڈاکٹر، اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ (نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار، ۱۹۶۵ء)، ص ۲۴۴

۷۷۔ ایضاً۔ ص ۲۴۸

۷۸۔ ایضاً۔ ص ۲۴۹

۷۹۔ ایضاً۔ ص ۲۴۹

۸۰۔ رضیہ حامد، ڈاکٹر، نواب شاہجہاں بیگم (نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار، ۲۰۱۵ء)، ص ۱۶۶

۸۱۔ ایضاً۔ ص ۱۶۶

۸۲۔ ایضاً۔ ص ۱۶۷

۸۳۔ سلیم حامد رضوی، ڈاکٹر، اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ (نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار، ۱۹۶۵ء)، ص ۱۸۳۔ ۱۸۴

۸۴۔ ایضاً۔ ص ۱۸۳

۸۵۔ ایضاً۔ ص ۱۸۴۔ ۱۸۶

۸۶۔ ایضاً۔ ص ۱۸۵

۸۷۔ ایضاً۔ ص ۱۸۶

۸۸۔ ایضاً۔ ص ۱۸۷۔ ۱۸۶

۸۹۔ رضیہ حامد، ڈاکٹر، نواب شاہجہاں بیگم (نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار، ۲۰۱۵ء)، ص ۱۷۲

۹۰۔ ایضاً۔ ص ۱۷۳

۹۱۔ سلیم حامد رضوی، ڈاکٹر، اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ (نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار، ۱۹۶۵ء)، ص ۲۶۸

۹۲۔ ایضاً۔ ص ۲۴۴

۹۳۔ رضیہ حامد، ڈاکٹر، نواب شاہجہاں بیگم (نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار، ۲۰۱۵ء)، ص ۱۷۵

۹۴۔ ایضاً۔ ص ۱۷۵

۹۵۔ ایضاً۔ ص ۱۷۶

۹۶۔ ایضاً۔ ص ۱۷۷

۹۷۔ ایضاً۔ ص ۱۷۷

۹۸۔ سیلم حامد رضوی، ڈاکٹر، اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ (نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار، ۱۹۲۶ء)، ص ۲۹۵

۹۹۔ رضیہ حامد، ڈاکٹر، نواب شاہجہاں بیگم (نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار، ۲۰۱۵ء)، ص ۱۷۸

۱۰۰۔ ایضاً۔ ص ۱۷۹

۱۰۱۔ محمد نعمان خاں، ڈاکٹر، بھوپال میں اردو انضمام کے بعد (دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، ۲۰۰۶ء)، ص ۷۲

۱۰۲۔ ایضاً۔ ص ۷۲

۱۰۳۔ ایضاً۔ ص ۷۰

۱۰۴۔ و۔ اصاحبہ، بیگمات بھوپال (لاہور: دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۳۲ء)، ص ۳۸

۱۰۵۔ سیلم حامد رضوی، ڈاکٹر، اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ (نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار، ۱۹۶۵ء)، ص ۱۸۲

۱۰۶۔ نواب شاہجہاں بیگم، دیوان شیریں (مطبع نظامی کانپور، ۱۸۷۲ء)، ص ۱۱۲

۱۰۷۔ ایضاً۔ ص ۱۱۹

۱۰۷۔ ایضاً۔ ص ۱۹۲

۱۰۹۔ ایضاً۔ ص ۱۹۰

۱۱۰۔ ایضاً۔ ص ۱۲۰

۱۱۱۔ ایضاً۔ ص ۱۱۸

۱۱۲۔ ایضاً۔ ص ۳

۱۱۳۔ ایضاً۔ ص۹

۱۱۴۔ ایضاً۔ ص۱۵

۱۱۵۔ ایضاً۔ ص۴۱

۱۱۶۔ ایضاً۔ ص۱۳

۱۱۷۔ ایضاً۔ ص۱۳

۱۱۸۔ ایضاً۔ ص۸۸

۱۱۹۔ ایضاً۔ ص۱۱۴

۱۲۰۔ ایضاً۔ ص۱۵۱

۱۲۱۔ ایضاً۔ ص۱۶۴

۱۲۲۔ ایضاً۔ ص۱۶۷

۱۲۳۔ رضیہ حامد،ڈاکٹر،نواب شاہجہاں بیگم(نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار،۲۰۱۵ء)، ص۱۲۳

باب چہارم

باب چہارم

نواب سلطان جہاں بیگم کی تصنیفات اور ذوق علمی کا تنقیدی مطالعہ

نواب سلطان جہاں بیگم:

نواب سلطان جہاں بیگم کی ولادت ۹ جولائی ۱۸۵۲ء کو موتی محل بھوپال میں ہوئی۔ نواب سلطان جہاں بیگم گیارھویں فرمانروا اور سلسلہ فرمانروا بیگمات میں چوتھی خاتون تھیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم کی ولادت تمام خاندان اور ملک کے لیے باعث رحمت ثابت ہوئی کیونکہ اسی سال ہندوستان میں غدر سے امن وامان ہو چکا تھا۔ حکومت کمپنی کی ملکیت سے ملکہ وکٹوریہ کے ہاتھ میں منتقل ہو چکی تھی۔ ملکہ وکٹوریہ (Queen Victoria) نے حکومت سنبھالتے ہی ہندوستانیوں کے دلوں و دماغ سے بے اطمینانی، جہالت، بدامنی کی تاریکی کو ہٹا کر تہذیب و تمدن، تعلیم و ترقی، امن وآزادی کی روشنی پھیلانی شروع کی۔ نواب سلطان جہاں بیگم کی نانی نواب سکندر بیگم نے ان کی ولادت پر بڑی خوشی منائی کیونکہ ان کی ولادت کے بعد ہی نواب سکندر بیگم مستقل خود مختار حکمران تسلیم کی گئیں تھیں۔ ۱۸۵۱ء میں جبلپور کے مقام پر پرگنہ بیرسیہ کی سند "تملیک" ملکہ معظمہ کی گورنمنٹ سے عطا ہوئی اور ریاست کے رقبہ اور آبادی میں اضافہ ہوا۔ کچھ ہی عرصہ بعد نواب سکندر جہاں بیگم کو "اسٹار آف انڈیا" کا تمغہ عطا ہوا۔ ان وجوہات سے وہ نواب سلطان جہاں بیگم کو نہایت مبارک سمجھتی تھیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم اس حوالے سے لکھتی ہیں کہ

> سرکار قدسیہ مرحومہ، سرکار خلد نشین کو میرے پیدا ہونے سے پہلے یہ آرزو و تمنا تھی کہ لڑکا پیدا ہو، اور یہ تمنا اون کی بیجا نہ تھی، کیونکہ ۵۸ سال سے میرے خاندان مین اولاد نرینہ نہ ہوئی تھی مگر جب مین خلاف آرزو کے پیدا ہوئی تو سرکار خلد نشین کو مطلق افسوس نہ ہوا اونہوں نے جسوقت میری صورت دیکھی ---بے اختیار مجھے پیار کر کے فرمایا کہ "خدا کا شکر ہے کہ مین اون مین سے نہین ہون کہ جنکی نسبت خداوند کریم کا ارشاد ہے کہ --- یہ بچی تو مجھے سات بیٹوں سے بھی عزیز تر ہے۔(۱)

نواب سلطان جہاں بیگم کی پیدائش کے بعد تقریباً چھ ماہ تک جشن کا سماں بندھا رہا تھا۔ان کی پیدائش پر ایسے ہی جوش و خروش سے خوشی کا اظہار کیا گیا جیسا کہ ہمارے ہندوستانی معاشرے میں عموماً لڑکے کی پیدائش پر کیا جاتا ہے۔ مسکینوں، غریبوں کو انعام و اکرام سے نوازا گیا۔رعایا نے بھی نواب سلطان جہاں بیگم کی ولادت پر خوشی کا اظہار کیا کیونکہ ان کی ولادت سے ہر جانب حالات میں خوشگوار تبدیلیاں محسوس کی جارہی تھیں۔تاریخی طور پر یہ سال اس لیے بہت اہم رہا ہے کہ جب ریاست بھوپال کا ایک علاقہ "گڑھی آنبا پانی" پر سخت شورش ہورہی تھی، فاضل محمد خاں نے فتنہ برپا کرر کھا تھا اور نواب سکندر بیگم ان حالات میں بہت ذہنی انتشار کا شکار تھیں۔نواب سلطان جہاں بیگم کے پیدا ہونے میں ابھی چار ماہ باقی تھے کہ ایک دن بیٹھے بیٹھے اپنے جذبات کا اظہار اس انداز میں کیا کہ نواب سکندر جہاں بیگم نے کہا جو مولود پیدا ہونے والا ہے اگر اس کے پیدا ہونے سے پہلے یہ فساد رفع ہو گیا تو یہ علاقہ اس مولود کی جاگیر میں دے دیا جائے گا۔اس عہد کے فوراً بعد انہیں کامیابی ہوئی تو نواب سکندر بیگم نے وہ ریاست نواب سلطان جہاں بیگم کے نام کر دی۔ان حالت کے حوالے سے نواب سلطان جہاں بیگم کچھ اس قسم کے جذبات کا اظہار کرتی ہیں کہ

> میرا سال ولادت ۱۸۵۸ء ہے، جو واقعات و حالات کے لحاظ سے ایک ایسا سال ہے جس پر مجھے فخر کرنے کا حق حاصل ہے۔۔۔ گویا خدا عزوجل نے مجھے ایسے زمانہ کے آغاز میں پیدا کیا کہ جنگ و جدل کا خاتمہ ہو چکا تھا، میری پیدائش کا سال علم و تہذیب و تمدن کی ترقیوں کے لشکر کے ساتھ تاج و تخت برطانیہ کے آفتاب اقبال کے جلوس مین آگے آگے تھا جو افق مغرب سے اپنی سنہری شعاعین پھیلاتا ہوا ایشیا کی ایک بڑے حصے پر نمودار ہوا، اور تیرہ خاک ہند کو اپنے نور سے منور کرنا شروع کیا۔(۲)

غرض ان حالات کے لحاظ سے نواب سکندر بیگم اپنی نواسی نواب سلطان جہاں بیگم کو مبارک سمجھتی تھیں اور روز بروز ان کی شفقت بڑھتی گئی۔نواب سکندر بیگم اپنی زندگی کا کل اثاثہ نواب سلطان جہاں بیگم کو نہ صرف سمجھتیں بلکہ انہوں نے اپنی تمام امیدوں اور مسرتوں کو نواب سلطان جہاں بیگم کے ساتھ وابستہ کر دیا تھا۔اگر کبھی کہیں دورے پر جاتیں تو نواب سلطان جہاں کی کم عمری اور دشوار گزار راستوں کی تکالیف کے سبب انہیں نواب شاہجہاں

بیگم کے سپرد کرتیں تھیں۔ لیکن ایسا انتظام کرتیں کہ نواب سلطان جہاں بیگم کی خیریت کی اطلاع روزانہ پہنچتی رہتی تھی۔ نواب سلطان جہاں بیگم بہت کم سن تھیں لیکن نواب سکندر جہاں بیگم محبت بھرے خطوط اپنی نواسی کے نام ہی بھیجا کرتیں تھیں۔ یوں تقریباً پانچ برس تک انتہائی جانفشانی، ناز و نعمت کے ساتھ نواب سلطان جہاں بیگم کی پرورش ہوتی رہی تھی۔ عموماً برسات کے موسم میں بچوں کو پانی سے کھیلنے کا شوق ہوتا ہے دوسرے بچوں کی طرح نواب سلطان جہاں بیگم بھی کھیلا کرتیں تھیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ نواب سکندر جہاں بیگم نے نواب سلطان جہاں بیگم کو پانی سے کھیلنے سے منع کیا لیکن انہوں نے کہا نہیں مانا اور پھر سے کھیلنے لگیں۔ نواب سکندر جہاں بیگم اس رویے کے باعث شدید ناراض ہو گئیں اور اس وقت تک ناراض رہیں جب تک نواب سلطان جہاں بیگم نے معافی نہ مانگی اور معافی بھی تحریری صورت میں بطور اقرار نامہ کے تھی جو ان کے استاد نے لکھوائی۔

نواب سکندر جہاں بیگم تقریبات میں نمود و نمائش کے بجائے سادگی کے ساتھ شریک ہوتیں لیکن نواب سلطان جہاں بیگم کو ہمیشہ خوب اہتمام اور تیاری کے ساتھ لے کر جاتیں تھیں۔ جب نواب سلطان جہاں بیگم پانچ برس کی ہوئیں تو ۳نومبر ۱۸۶۲ء کو تقریب بسم اللہ ہوئی اور تعلیم کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ نواب سکندر جہاں بیگم نے شفقت اور محبت کے ساتھ نواب سلطان جہاں بیگم کی تعلیم و تربیت کا نہایت اعلیٰ پیمانے پر انتظام فرمایا۔ نواب سکندر جہاں بیگم نے تعلیم کا باقاعدہ خاکہ مرتب کیا تھا۔ نواب سلطان جہاں بیگم " تزک سلطانی " میں اس شیڈول کے متعلق تحریر فرماتی ہیں کہ

> پانچویں سال بڑی شان و شوکت کے ساتھ بسم اللہ کی تقریب ہوئی۔ میری تعلیم کا خود ضابطہ معین فرمایا۔۔۔۔اس انتظام کے ساتھ ہی میری نگرانی تعلیم و تربیت بھی اپنے ذمہ رکھی، اور میں دن رات اون کے پاس رہنے لگی ہفتہ میں صرف تین شب اپنی والدہ کے نزدیک رہتی تھی۔(۳)

۱۲۸۰ھ میں نواب سکندر جہاں بیگم حج کے لیے مکہ معظمہ گئیں۔ نواب سکندر جہاں بیگم ہرگز نواب سلطان جہاں بیگم کی جدائی کو نہیں برداشت کر سکتیں تھیں۔ انہوں نے نواب شاہجہاں بیگم اور نواب امراؤالدولہ کو بھی اسی سبب اپنے ساتھ لے جانا چاہا تاکہ سفر میں ہمراہ ہوں۔ نواب شاہجہاں بیگم سمندری سفر سے خائف تھیں لہذا راضی نہ ہوئیں۔ نواب شاہجہاں بیگم کے نہ جانے کی وجہ سے نواب سلطان جہاں بیگم اور نواب صاحب بھی نہ جا سکے۔ یوں

نواب سکندر جہاں بیگم نومبر ۱۸۶۳ء کو وہ مقدس فریضے کی ادائیگی کے لیے روانہ ہوئیں۔روانگی کے وقت انہوں نے نواب سلطان جہاں بیگم کو بہت پیار کیااوران کواس بات کااحساس دلایاکہ مقدس مذہبی فریضے کی وجہ سے وہ یہ جدائی برداشت کر رہی ہیں۔انہوں نےاس دوران جو خطوط لکھے نواب سلطان جہاں بیگم نے ان کے کچھ حصے اپنی کتاب" تزک سلطانی"میں کیاہے مثلاً

> الحمدللہ، کہ آج کہ تاریخ ہفتم ماہ شعبان۱۲۸۰ھ روزیک شنبہ ہے۔دس منٹ کم تین بجے جہاز دخانی اندوز مع تمام قافلہ حجاج کے بخیر وعافیت تمام مقام عدن مین پہنچا، جو تمہیں میری یاد آیا کرے تو تم وضو کر کے اور جانماز سرخ رنگ کی جو زعفران نے سی کر تم کودی ہے بچھاڑ ہاکرو،اور دعامانگاکرو کہ اللہ میری امان جان جان کاحج کراکے جلدی لے آوٗے فقط مورخہ ہفتم شعبان ۱۲۸۰ھ۔(۴)

ایک اور خط میں جذبات کااظہار کچھ اس طرح کیاہے۔

> ایک الماری تمہارے لکھنے کے واسطے جس مین دوات کاگھر بناہواہے اور دوسری الماری خط لکھے ہوئے رکھنے کے واسطے،ایک اورڈبیا منجن کے واسطے،ایک کیتلی چائے کے واسطے،اور پیالہ،اور پٹاری شیرینی رکھنے کے واسطے جسے جہاز مین سے خرید کیاہے،اور ایک گلاب سفید سمندر کا کہ از خود سمندر سے بنا ہوا نکلتا ہے،واسطے تمہارےاور اسی قدر سلیمان جہان بیگم کے واسطے اس خط کے ساتھ تمہارے نزدیک پہنچتی ہوں تمہاری چیزیں تم لے لینا۔۔(۵)

نواب سلطان جہاں بیگم کی تعلیم کے لیے ایک اور خط نواب سکندر بیگم نے لکھا جس میں کچھ اس طرح سے رقم طرازہیں کہ

> جس وقت تم رقم ہندسہ ایک لکھ تک بخشی عتیق اللہ ڈیوڑھی سلیمان جہاں بیگم سے لکھ چکوتو تم مشق اسمائے مرکبات مفصل ذیل کی بخشی موصوف سے کرنااور تفصیل اوس کی یہ ہے۔(۱) نام سراپا عضو انسان کے(۲) نام آدمیوں کے،(۳) نام کپڑے کے،(۴)نام ظروف کے(۵)نام ادویات کے(۶)نام جانورون کے(۷) نام زیور کے،اور انشااللہ جس وقت بھوپال ہم داخل ہون گے ہمارانام تم سے

لکھوائیں گے، ہمارے نام کا بھی لکھنا سیکھ رکھنا مورخہ ہشتم شوال ۱۲۸۰ھ مکہ معظمہ"(۲)

نواب سکندر جہاں بیگم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھیں کہ تعلیم کی سماجی حیثیت کیا ہے اس لیے انہوں نے نہ صرف نواب سلطان جہاں بیگم کے لیے تعلیم کو لازم و ملزوم قرار دیابلکہ ہر خاص و عام بالخصوص لڑکیوں کے لیے ناگزیر سمجھا۔ نواب سکندر بیگم جہاں کی جانب سے نواب سلطان جہاں بیگم کے اوقات زندگی کا خاکہ کچھ اس طرح سے مرتب کیا گیا تھا جس میں ان امور کو بالخصوص مد نظر رکھا گیا کہ ابتداء ہی سے ایسے اسباب جمع کیے جائیں جو شہرت، عزت اور اقتدار کی مخفی قوتوں کی نشو و نما کرتے ہیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم کے اوقات زندگی کا خاکہ درج ذیل ہے۔

قبل ظہر:

۵ بجے سے ۶ تک۔ ہوا خوری

۶ بجے سے ۷ تک۔ ناشتہ

۷ بجے سے ۱۰ تک۔ کلام مجید

۱۰ بجے سے ۱۱ تک۔ سرکار خلد نشین کے ساتھ کھانا

۱۱ بجے سے ۱۲ تک۔ چھٹی

بعد ظہر:

۱۲ بجے سے ایک تک۔ خوشنویسی کی مشق

ایک بجے سے ۳ تک۔ انگریزی

۳ بجے سے ۴ بجے تک۔ فارسی

۴ بجے سے ۵ تک۔ حساب

۵ بجے سے ساڑھے ۵ تک۔ بانک یا پشتو

ساڑھے ۵ بجے سے ۶ تک۔ سواری اسپ

۶ بجے سے ۷ تک۔ کھانا کھانا

۸ بجے سے سونے کو خوابگاہ چلے جانا

نواب سلطان جہاں بیگم کی تعلیم کے لیے جو اساتذہ مقرر کیے گئے تھے ان کے نام درج ذیل ہیں۔

۱۔ حافظ محمد سورتی۔ کلام مجید

۲۔ مولوی جمال الدین خاں مدار لمہام۔ ترجمہ کلام مجید و تفسیر

۳۔ مولوی رضا علی المخاطب بہ شریں رقم۔ خوشنویسی

۴۔ منشی حسین خاں ماسٹر۔ انگریزی

۵۔ مولوی حسین شاہ بخاری۔ فارسی

۶۔ مولوی محمد ایوب صاحب۔ فارسی

۷۔ پنڈت گنپت رائے گروجی۔ حساب

۸۔ سید امیر علی پھیکت۔ بانک

۹۔ حق داد خاں استاد۔ شہسواری

۱۰۔ اخوند صاحب۔ پشتو

نواب سکندر جہاں بیگم کے بنائے ہوئے اصولوں پر نواب سلطان جہاں بیگم کاربند رہیں اور وقتاً فوقتاً تمام تعلیمی مدارج میں کامیابی کی منازل طے کرتی گئیں۔ نواب سکندر جہاں بیگم کی جانب سے محل میں ایک چھوٹا سا اسکول بنایا گیا جس میں تمام امراؤ روسا بھوپال کے بچے زیر تعلیم تھے۔ نواب سکندر بیگم چونکہ خود انگریزی سے ناواقف تھیں لہذا انہوں نے یہ التزام رکھا تھا کہ اپنے یورپین احباب کو نواب سلطان جہاں بیگم کا امتحان دلوا کر ان کی ترقی کے متعلق اپنا اطمینان فرمالیتی تھیں۔ جب کوئی معزز مہمان یا صاحب پولیٹیکل ایجنٹ تشریف لاتے تو نواب سکندر جہاں بیگم اپنی نواسی نواب سلطان جہاں بیگم کا امتحان دلواتیں جس کا مقصد انگریزی تعلیم کے حصول کے ساتھ ساتھ ذوق تعلیم میں اضافہ کرنا تھا۔ مہمانوں کی جانب سے امتحان میں کامیابی پر سرٹیفیکیٹ بھی دیا جاتا تھا۔ نواب سلطان جہاں بیگم اس حوالے سے لکھتی ہیں کہ

> ترجمہ سارٹیفکیٹ میجر ہیجنسپن صاحب بہادر پولیٹیکل ایجنٹ گوالیار مین صاحبزادی سلطان جہاں بیگم صاحبہ کے سبق سننے کا موقع حاصل ہونے سے بہت خوش ہوا، وہ عالی مراتب انگریزی مین اول نمبر کاریڈر فصاحت ،اور صحت

> کے ساتھ پڑہتی ہین، اور اون کو کمال توجہ، خوبی کے ساتھ صرف و نحو کے قواعد و اصول کی تعلیم دی گئی ہے، اور اس زبان مین بہت اچھا علم رکھتی ہین۔۔۔۔ مین امید کرتا ہونکہ بعد چندروز کے صاحبزادی صاحبہ کو اس سے بہتر سارٹیفکیٹ دینے کا موقع ملے گا۔ اے ڈبلیو۔ سی ہچنسن میجر پولیٹیکل ایجنٹ، گوالیار (سال نو کا پہلا دن ۱۸۶۷ء)۔(۷)

۲۱ صفر ۱۲۸۴ھ کو نواب سلطان جہاں بیگم کے والد نواب امراؤ دولہ صاحب بہادر کا انتقال ہو گیا۔ ان کا انتقال نواب سکندر بیگم کے لیے شدید صدمہ ثابت ہوا۔ ڈاکٹر رضیہ حامد اس حوالے سے لکھتی ہیں کہ

> سرکار خلد نشین کو ایسا سخت صدمہ ہوا کہ دوم آخرین تک اون تک غم نے اون کو گھلا دیا، وہ جب تک زندہ رہین یہی کہتی رہین کہ "افسوس کیسے مددگار مطیع، فرمان بردار، داماد کا جو بیٹی سے بھی زیادہ عزیز تھا انتقال ہو گیا" لیکن کیا معلوم تھا کہ ۱۶ مہنیے بعد ہی اون کا ظل عاطفت بھی اوٹھ جائے گا۔"(۸)

نواب بہادر الدولہ باعتبار سیرت سب میں منفرد مقام رکھتے تھے اور انکی دلیری و بہادری کی مثالیں بطور نمونہ پیش کی جاتی تھیں۔ اپنے اعلیٰ اخلاق کی بدولت بچپن سے ہی سب کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ ان میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو ایک اچھے سپہ سالار میں ہونی چاہیے تھیں۔ نواب سکندر جہاں بیگم کو ابتداء ہی سے ان کی ذاتی و خاندانی خدمات کی بناء پر ان سے محبت تھی۔ اسی محبت کی وجہ سے نواب سکندر جہاں بیگم نے نواب شاہجہاں بیگم کے لیے شریک حیات کے طور پر نواب صاحب کو منتخب کیا۔ یوں گورنمنٹ کی منظوری سے ۲۶ جولائی ۱۸۵۵ء کو یہ عقد ہو گیا۔ نواب شاہجہاں بیگم سے شادی سے قبل نواب صاحب کی دو شادیاں اور ہو چکی تھیں۔ پہلی شادی "ملکہ بی بی" کی بیٹی سے ہوئی۔ جو نواب غوث محمد خاں کی بیٹی تھیں۔ ان سے ایک سال بعد لڑکی پیدا ہوئی اور ان کا انتقال ہو گیا، رحلت کے بعد ان کی دوسری شادی "سردار بی بی" قوم فیروز خیل سے ہوئی۔ ان سے چار بچے پیدا ہوئے۔ چونکہ نواب شاہجہاں بیگم کی شادی آخر میں ہوئی تھی اس لیے پہلے بیوی بچوں کے لیے چار ہزار جاگیر عنایت کی۔ نواب سلطان جہاں بیگم کو اپنے والد نواب باقی الدولہ سے بہت محبت تھی یہی وجہ ہے کہ وہ نواب شاہجہاں بیگم کے نکاح ثانی کو جو انہوں نے نواب صدیق حسن خان سے کیا تھا اس سے ناخوش تھیں۔ اس جذباتی صورتحال کے حوالے سے نواب سلطان جہاں بیگم لکھتی ہیں کہ

> دراصل میری زندگی کا سب سے بڑا منحوس سال ۱۲۸۸ھ ہے۔اسی سال سرکار خلد مکاں نے نواب صدیق حسن خاں سے نکاح ثانی کیااور میری تکلیفات کا زمانہ شروع ہو گیا، اندرونی طور پر ریشہ دوانیاں ہونے لگیں، مہرماوری کو سرد کرنے کی تدبیریں کی گئیں۔جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ روز بروز سرکار خلد مکاں کی محبت زوال پذیر ہونے لگی۔(۹)

نواب سلطان جہاں بیگم کی عمر دس ہی سال تھی اور اس سلسلہ تعلیم کو پانچ ہی برس گزرے تھے کہ ۳۰ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو نواب سکندر جہاں بیگم نے انتقال فرمایا۔ان کی وفات کا صدمہ بہت شدید تھا۔نواب سلطان جہاں بیگم اپنی نانی کی وفات کے بعد نواب شاہجہاں بیگم کے ساتھ رہنے لگیں لیکن ان کی طبیعت پر ہمہ وقت اداسی چھائی رہتی تھی۔نواب شاہجہاں بیگم کی چھوٹی بیٹی نواب سلیمان جہاں بیگم ۱۲۸۶ھ میں چیچک کی بیماری سے چار سال آٹھ ماہ کی عمر میں انتقال کر گئی تھیں۔نواب سلیمان جہاں بیگم کو ویکسی نیٹ کیا جا چکا تھا۔ان کو چیچک نکلی تو یونانی حکیم جان صاحب نے تشخیص مرض میں غلطی کی اور چیچک کو فساد خون سمجھا۔نواب سلیمان جہاں بیگم نواب سلطان جہاں بیگم سے تین سال چھوٹی تھیں۔اس پر آشوب دور میں تمام نظام درہم برہم ہو گیا اور اس کا اثر نواب سلطان جہاں بیگم کی زندگی پر بھی مرتب ہوا۔تعلیم کا وہ سلسلہ جو نواب سکندر جہاں بیگم نے ان کے لئے مرتب کیا تھا وہ منقطع ہو گیا دوسرا طریقہ شروع ہو گیا بقول نواب سلطان جہاں بیگم

> تعلیم کا جو نظام معین تھا۔اس میں درہمی و برہمی ہو گئی۔خوشخطی کی مشق بالکل جاتی رہی اگرچہ قرآن مجید ۱۱ سال ہی کی عمر میں ختم ہو چکا۔اور مولوی جمال الدین خاں صاحب بہادر مدارالمہام ایک گھنٹہ تفسیر اور ترجمہ پڑھاتے تھے مولوی محمد ایوب صاحب بھی ایک گھنٹہ فارسی کی تعلیم دیتے تھے۔دو گھنٹے تعلیم انگریزیہوتی تھی۔اسی کے ساتھ میری روبکاری میں صدور احکام کے لیے وہ کاغذات بھی پیش ہوتے تھے۔جن کی نسبت سرکار خلد مکان (نواب شاہجہاں بیگم) کا خاص حکم ہوتا تھا۔(۱۰)

اس نئے تعلیمی نظام پر بھی نواب سلطان جہاں بیگم سختی سے عمل پیرا ہوئیں اگر دیکھا جائے تو اعلی تعلیم و تربیت اور توجہ و نگرانی سے روشن دماغ کیوں نہیں اپنے جوہر منوائے گا۔نواب سکندر بیگم کے انتقال کے بعد جب

نواب شاہجہاں بیگم فرماوائے ریاست اور نواب سلطان جہاں بیگم باقاعدہ ولیعہد ریاست تسلیم کی گئیں۔ صدر نشینی و ولی عہدی ادا کرنے کے لئے ایجنٹ نواب گورنر جنرل بہادر نے بھوپال میں دربار منعقد کیا، حسب معمول تقریریں ہوئیں اور اس رسم سے متعلق تمام کاروائیاں عمل میں لائی گئیں۔ جب ولی عہدی کا اعلان ہوا۔ تو نواب سلطان جہاں بیگم نے اس کے شکریہ میں ایک نہایت موزوں تقریر فرمائی۔ اس موقع کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے نواب سلطان جہاں بیگم لکھتی ہیں کہ

> مین خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اوس نے اپنی عنایت سے مجھے اس مرتبہ پر پہنچایا اور پھر شکر ادا کرتی ہوں صاحب ایجنٹ گورنر جنرل بہادر سنٹرل انڈیا و صاحب پولیٹیکل ایجنٹ بہادر کا، جنہون نے بحکم صدر رفیع القدر مجکو ولی عہد اور میری والدہ کو والی ریاست بھوپال کیا۔(۱۱)

نواب سلطان جہاں بیگم کی اس تقریر سے حاضرین دربار، اور یورپین حضرات کو بہت خوشی ہوئی۔ کیونکہ بلحاظ عمر، ان کے لہجے کا صاف اور بے جھجک تقریر کرنا حیرت انگیز منظر تھا۔ تاریخ عالم میں شاید ہی کوئی ایسی مثال ملے گی کہ ایک شہزادی نے کسی دربار عام میں اس طرح متانت و سنجیدگی کے ساتھ بغیر کسی جھجک کے تقریر کی ہو اور تمام حاضرین کی زبان سے بے اختیار نعرہ تحسین و آفرین بلند کرا دیۓ۔ مسلمانوں میں بچے جب ختم کلام مجید کرتے ہیں تو خاص خوشی کی جاتی ہے۔ اور اس خوشی کے اظہار کے لیے نشرح کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کا نشرح سابقہ تمام بیگمات بھوپال کا کیا گیا اور نواب سلطان جہاں کا نشرح بھی بہت دھوم دھام سے کیا گیا تھا۔

نواب سکندر جہاں بیگم کو نواب سلطان جہاں بیگم سے خصوصی لگاؤ تھا اس لیے وہ نواب سلطان جہاں بیگم کی زندگی کے حال و مستقبل پر ہمیشہ نظر رکھتی تھیں۔ تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ ان کو نواب سلطان جہاں بیگم کے شوہر کے انتخاب کے متعلق بھی فکر تھی کیونکہ عورتوں کی زندگی کی خوشگوارای کا انحصار بہت زیادہ شوہر کی ذات پر ہوتا ہے۔ گو اس وقت ان کی شادی کی عمر نہ تھی۔ لیکن نواب سکندر جہاں بیگم اپنی زندگی میں ہی ان کے لیے شریک حیات کا انتخاب کرنا چاہتی تھیں۔ انتخاب میں عجلت کا سبب یہ تھا کہ شادی کے بعد اجنبیت نہ ہو بلکہ بچپن سے ایسی تربیت کی جائے کہ اعلی اخلاق اور انتظامی صلاحیتوں کا مالک بنایا جاسکے۔ تاکہ شادی کے بعد جس وقت نواب سلطان جہاں بیگم ملکی انتظام کو چلائیں تو ان کے شوہر ان کے مشیر و مددگار ثابت ہونے کی قابلیت موجود ہو۔ نواب سکندر جہاں بیگم ان

مراحل کی تکمیل کے لیے بہت بے چین تھیں۔انہوں نے اس کام کے لیے پولیٹیکل ایجنٹ بہادر سے خط وکتابت شروع کر دی۔اور اس سلسلے میں انہوں نے یہ بھی وضاحت کر دی تھی کہ فوجدار محمد خان، جمال محمد خان، اور فاضل محمد خان کے گھرانوں میں نواب سلطان جہاں کی شادی نہ ہو۔ذاتی و ملکی مفاد کی خاطر وہ ایسا نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ چنانچہ ہندوستانی طریق کے مطابق انہوں نے عملی کوشش شروع کر دی۔بقول نواب سلطان جہاں بیگم

> ہندوستان کا طریق معاشرت اس بات کا متقاضی ہے کہ والدین اپنی لڑکیوں کے لیے شوہر تلاش کریں، کیونکہ انسانی زندگی کے بڑے حصہ کی خوشحالی اور کامیابی کا دورومدار زوجین کی مواقفت مزاج، دلی محبت اور موانست پر ہوتا ہے اور اس کا اندازہ والدین اعزاء قربیہ ہی کر سکتے ہیں، اون کو جو خیال اپنے خاندانی ننگ وناموس کا اپنی لخت جگر کی زندگی کو پر لطف بنانے کا ہو سکتا ہے وہ کسی اور کو نہیں ہو سکتا۔(۱۲)

نواب سکندر جہاں بیگم نے معاشرتی رسم ورواج کے تحت چناؤ کا آغاز کیا، شریف خاندانوں میں علم و دولت کے ساتھ حسب ونسب بھی دیکھا جاتا ہے۔نواب سکندر بیگم کو شرافت اور اچھی سیرت کی طلب رہی، مال و دولت کی انہیں خواہش نہ تھی۔اس فریضے کی انجام دہی کے لیے عطا محمد خاں کا نام جو جلال آباد کے رہنے والے تھے منتخب کیا گیا۔عطا محمد خاں نے چند اعلیٰ خاندانوں اور معزز خاندانوں کا حال احوال لکھااور نواب سکندر بیگم کو آگرہ میں ہونے والے دربار کے حوالے سے بھی آگاہ کیا کہ دربار میں نواب سکندر بیگم کی خدمت میں چند منتخب لڑکے پیش کیے جائیں گے۔ان میں سے جو نوجوان منتخب ہوگا اسے بھوپال روانہ کر دیا جائے گا۔بقول محمد امین زبیر مارہروی

> چنانچہ بہت تلاش و تحقیق اور غور کے بعد دربار آگرہ کے موقع پر نواب احمد علی خاں صاحب بہادر کو منتخب کیا گیا جن کا معزز خاندان جلال آباد ضلع مظفر نگر میں مشہور اور سلسلہ نسب خاندان بھوپال سے ملتا ہے۔ان کو تعلیم کی غرض سے بھوپال لے آئیں۔(۱۳)

نواب سکندر بیگم نے اس دوران کوئی رسم ادا نہیں کی تھی۔ان کے انتقال کے بعد نواب سلطان جہاں بیگم کے لیے کئی پیغام آئے۔ نواب شاہجہاں بیگم نے جب نواب سلطان جہاں بیگم شادی کی عمر میں پہنچیں تو اراکین ریاست کو بلا کر پھر سے مشورہ کیا۔اکثریت نے اتفاق رائے سے نواب سکندر جہاں بیگم کی پسند کو حتمی قرار دیا۔ بالآخر

فیصلہ نواب سلطان جہاں بیگم کی صوابدید پر چھوڑا گیا۔ان میں سے جس کو مناسب سمجھیں اپنے دستخط اور مہر ثبت کر دیں۔نواب سلطان جہاں بیگم نے بھی نواب سکندر جہاں بیگم کی پسند کو حتمی مان لیا۔اس کاروائی کی تکمیل کے بعد بذریعہ خط وائسرائے کو اطلاع دی گئی۔وائسرائے نے معاملہ کی اہمیت کو مد نظر رکھ کر ایجنٹ گورنر جنرل سنٹرل انڈیا کو ہدایت کی کہ بذات خود جاکر زیر نظر تجویز کی نواب سلطان جہاں بیگم سے تصدیق کی جائے چنانچہ اس مقصد کے لیے گورنر جنرل بھوپال آئے۔ایک مشرقی بالخصوص ہندوستانی شہزادی سے وہ بھی نوے برس قبل ایسا سوال جس کا جواب دینا بہت مشکل عمل تھا لیکن نواب سلطان جہاں بیگم نے بہت اطمینان سے اپنی رائے سے آگاہ کیا۔محمد امین زبیری نے اس موقع کے حوالے سے نواب سلطان جہاں بیگم کے جذبات کو کچھ اس طرح سے بیان کیا ہے کہ

> اگرچہ اس سوال کا جواب دینا مجھ پر بوجہ اس رسم ورواج کے،جو ہندوستان میں ہے نہایت گراں تھا مگر سرکار خلد مکاں نے مجھ کو فہمائش کر دی تھی کہ یورپین معاشرت اور مسلمانوں کے مذہبی قواعد کی رو سے کوئی شرم کی بات نہیں ہے کہ آدمی صاف الفاظ میں اپنی خواہش کا اظہار کرے اس لیے میں نے جواب دیا کہ "واقعی میں نے اپنی خوشی سے یادداشت زیر بحث پر اپنی مہر و دستخط ثبت کیے ہیں"۔صاحب ممدوح نے مجھ سے انگریزی میں کہا کہ اگر آپ کی مرضی ہو تو اس یادداشت کو حضور وائسرائے کی خدمت میں بھیج دوں؟اس کا جواب میں صرف یہ لفظ "یس" دے کر خاموش ہوگئی۔صاحب موصوف نے فرمایا کہ کچھ اور کہنا ہے؟(۱۴)

ان مراحل کے طے ہونے کے بعد منگنی کی رسم کی گئی حسب رواج دولہے سے ایک اقرار نامہ بھی لیا گیا جس پر عمائدین و معززین ریاست اور پولیٹیکل ایجنٹ کے دستخط بطور شہادت لیے گئے۔یوں ایک سال چار ماہ بعد یکم فروری ۱۸۷۵ء کو نہایت دھوم دھام سے نکاح کیا گیا۔ریاست کی جانب سے دولہا کو "نظیر الدولہ سلطان دولہ" کا خطاب دیا گیا۔نیز چالیس ہزار روپیہ کی جاگیر عطا کی گئی۔٦ لاکھ ۳۶ ہزار آٹھ سو پانچ روپے کا جہیز دولہا دلہن کو دیا گیا۔۸۰ ہزار روپیہ کی سالانہ جاگیر جو ابتداء سے مقرر کی گئی بدستور قائم رہی۔

نواب صاحب بہادر نہایت دلیر شجاع خلیق و مدبر، فرزانہ و ہوشمند وجیہ و خوش شمائل تھے اور اپنی ذات و صفات کے لحاظ سے ہر طرح اس فخر کے اہل تھے جو ہر ہائنس کے شوہر ہونے کی حیثیت سے ان کو حاصل ہوا۔(۱۵)

اس تقریب میں تمام عزیز و اقارب شامل رہے لیکن خاندان کی محبوب ترین ہستی نواب قدسیہ بیگم شریک نہیں تھیں کیونکہ تقریباًان کے اور نواب شاہجہاں بیگم کے درمیان رنجش پیدا ہو چکی تھی۔اس لیے نواب قدسیہ گرہر بیگم کواس تقریب میں مدعو نہیں کیا گیااور جب انہوں نے شفقت سے مجبور ہو کر اپنے محل میں تقریب کرنے اور دولہا دولہن کو تحائف دینے کی خواہش کا اظہار کیا تو نواب شاہجہاں بیگم کی جانب سے یہ جواب دیا گیا تو بقول زبیر ماہروری

کئی بار گزارش کیا گیا کہ اب ضرورت ایسے رسوم کے ادا کرنے کی حضور کو نہیں ہے حضور کی دعا کافی ہے۔خدائے تعالی نے اپنے فضل و کرم سے نواب سلطان جہاں بیگم کو سب کچھ دیا ہے وہ کسی چیز کی محتاج وحاجت مند نہیں۔(۱۶)

۲۴ر مضان المبارک بمطابق ۲۵ اکتوبر ۱۸۷۵ء میں ہفتہ کو رات ۱ بج کر ۳۷ منٹ پر نواب سلطان جہاں بیگم کی بڑی صاحبزادی نواب بلقیس جہاں بیگم کی ولادت ہوئی۔نواب سلطان جہاں بیگم نے تمام رسوم ادا کیں۔بلقیس جہاں بیگم نام رکھااور خود ہی پرورش و تربیت شروع کی۔نواب بلقیس جہاں بیگم کی ولادت کی خوشی میں پانچ قیدی آزاد کیے گئے۔ریاست کی جانب سے ڈھائی سو روپیہ ماہوار نواب بلقیس کے لیے تنخواہ مقرر کی گئی۔گورنر جنرل وغیرہ نے ان کی پیدائش پر مبارک باد کے خطوط ارسال کئے۔بقول نواب سلطان جہاں بیگم

جب صاحبزادی صاحبہ چالیس روز کی ہوئیں تو سرکار خلد مکاں نے اپنا ارادہ ظاہر کیا کہ جس طرح سرکار خلد نشین نے اونکی "رسم چھٹی" ادا کی تھی اوسی طرح وہ میری بھی یہ رسم ادا کرین لیکن نواب صدیق حسن خان صاحب نے جو کہ ایک عالم تھے سرکار خلد مکاں کو یہ مشورہ دیا کہ اس قسم کی رسمیات داخل بدعت ہین،اور مسلمانوں مین ان کی ضرورت نہین۔سرکار خلد مکاں نے اس مشورہ کو مان لیا۔(۱۷)

اسی زمانہ میں نواب شاہجہاں بیگم کلکتہ ہز رائل ہائنس پرنس آف ویلز کی تشریف آوری ہند کے سلسلہ میں مدعو کی گئیں۔اگرچہ درباروں میں فرمانروائے ریاست کے ساتھ ولی عہد کا جانالازمی اور ضروری نہیں ہے۔نواب سلطان جہاں بیگم کااس وقت ساتھ جانا ممکن نہیں تھاکیونکہ اس وقت ان کی بیٹی بلقیس جہاں بیگم کی ولادت میں کچھ دن ہی ہوئے تھے لہذاسفر کر ممکن نہ تھا۔نواب شاہجہاں بیگم کے اصرار پر نواب سلطان جہاں بیگم اس سفر پر آمادہ ہو گئیں۔نواب سلطان جہاں بیگم نے نواب شاہجہاں بیگم کے دلی جذبات کو کچھ اس طرح سے بیان کیاہے کہ

> ولادت کے بیس روز بعد ایک مرتبہ مجھے فرمایاکہ تم ہمارے ہمراہ کلکتہ چلو کیونکہ ہم تم کو تنہا یہاں نہیں چھوڑ سکتے نہ ہماری صحبت یہ گوارا کر سکتی ہے کہ اس قدر عرصہ تک تم تنہااور جدارہو۔۔۔۔چونکہ میراشیوہ ہمیشہ بجاآوری احکام تھا میںنے سفر کو منظور کیا۔(۱۸)

چنانچہ دسمبر میں نواب سلطان جہاں بیگم،نواب احمد علی خاں،نواب صدیق حسن خاں اور دیگر اراکین کے ہمراہ سفر پر روانہ ہوئیں۔نواب سلطان جہاں بیگم نواب بلقیس جہاں بیگم کی پیدائش کی وجہ سے علیل تھیں اس لیے دربار میں شریک نہ ہو سکیں۔البتہ ایک رسمی ملاقات میں شرکت کی اس موقع پر شہزادہ ممدوح نے دوران گفتگو نواب سلطان جہاں بیگم سے دلچسپ جملہ فرمایابقول ڈاکٹر رضیہ حامد"اس وقت ہم اور آپ ایک ہی درجہ پر ہیں،آپ اپنی ریاست میں کرون پرنس،اور مین سلطنت انگلشیہ میں کرون پرنس ہون۔"(۱۹)

۴ دسمبر ۱۸۷۶ء کواس خاندان میں ۶۷ سال اور چار پشتوں کے بعد خدا کے فضل سے اولاد نرینہ یعنی نواب نصراللہ خاں کی پیدائش ہوئی۔نواب شاہجہاں بیگم نے ڈھائی سو روپے ماہوار نواب نصراللہ خاں صاحب بہادر کے مصارف ذاتی کے لیے مقرر کیےاور عقیقہ کے لیے الگ سے اخراجات مقرر کیے۔پیدائش سے ساتویں دن عقیقہ کیا گیا۔اور مولود کانام "محمد نصراللہ خاں" رکھا گیا۔ملازمین اورامرائے ریاست میں انعام واکرام تقسیم کیاگیا۔اس ولادت کی یوں تو تمام خاندان کو خوشی ہوئی لیکن سب سے زیادہ خوشی نواب قدسیہ بیگم کو تھی جن کاوجود ریاست بھوپال کے لیے باعث رحمت و برکت تھا۔نواب قدسیہ بیگم نے باوجود ضعیفی اور گوشہ نشینی کے خوشی اور مسرت کے موقع پر جوش کا مظاہرہ کیا تھا۔ملکی رواج کے مطابق محل کے ملازمین ڈیوڑھی پر آکر بندوقین سر کرتے اور نواب قدسیہ جہان بیگم کو مبارک باد دیتے اور وہ ان میں انعام واکرام تقسیم فرماتیں تھیں۔اس وقت تک بظاہر نواب قدسیہ بیگم کے اور

باقی تمام خاندان کے تعلقات خوشگوار تھے۔ لیکن جب محل میں ملازمین ڈیوڑھی پر بند وقیں سر کر رہے تھے تو نواب صدیق حسن خاں کی جانب سے سخت مراسلت کی گئی اور فوراً حکم نامہ بھیجا کہ ان لوگوں کو محل سے باہر نکلوایا جائے۔

اس صدمہ کا اندازہ وہ لوگ کر سکتے ہیں جن کے دلوں مین اپنے بزرگون کی شفقت کی خواہش اور تمنا رہتی ہے، اور وہ تمام چیزوں سے قیمتی چیز محبت کو سمجھتے ہین۔ زیادہ رنج اس سبب سے تھا کہ جو مجبوریاں پیدا ہو گئیں تھین، وہ بلاوجہ تھین، اور غیرون نے اپنے ذاتی اغراض کے لیے ہماری خاندانی خوشیوں کی قربانی کرائی تھی۔۔۔(۲۰)

نواب قدسیہ بیگم کے لیے یہ حکم نامہ باعث شرمندگی ثابت ہوا مگر وہ نواب شاہجہاں بیگم کی نواب صدیق حسن خان کے لیے بے جا حمایت کی وجہ سے خاموش رہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا نواب صدیق حسن خاں نے ہر معمولی اور غیر معمولی خوشی کے وقت اس قسم کے ناگوار واقعات پیدا کرنے کے لیے گویا قصد ہی کر لیا تھا۔ نواب سلطان جہاں بیگم کا نومبر ۱۸۷۸ء میں دوسرا بیٹا نواب محمد عبید اللہ پیدا ہوا۔ تمام رسومات حسب معمول ادا کی گئیں۔ نواب عبید اللہ خان کی ولادت کے تین سال بعد ۱۸۸۰ء نواب سلطان جہاں کی صاحبزادی آصف جہاں بیگم پیدا ہوئیں۔ آصف جہاں بیگم کی پیدائش سے نواب سلطان جہاں بہت علیل ہو گئی تھیں۔ تین مہینے بعد جب صحت بہتر ہوئی تو نواب قدسیہ بیگم اور نواب شاہجہاں بیگم نے خوشی میں مبرکات و صدقات کیے۔ نواب شاہجہاں بیگم اور نواب صدیق حسن خاں نے ایک ایک لاکھ روپیہ نقد بھی دیا لیکن نواب صدیق حسن خاں کا رویہ نواب سلطان جہاں بیگم سے نامناسب رہا تھا اس لیے روپے واپس کر دیئے۔ نواب شاہجہاں بیگم بعض اوقات نواب صدیق حسن خاں کے فیصلوں سے مطمئن نہیں ہوتی تھیں مگر جوش محبت کی وجہ سے روگردانی نہ کرتیں۔ اسی طرح ۱۸۷۷ء میں نواب شاہجہاں بیگم کی معیت میں نواب سلطان جہاں بیگم نے مشہور دربار قیصری دہلی میں شرکت کے لیے گئیں۔ مگر اپنی علالت کی وجہ سے درباری مراسم میں شریک نہ ہو سکیں البتہ نواب احمد علی خاں نے شرکت کی۔ بقول نواب سلطان جہاں بیگم

ہماری روانگی کی تیاری شروع ہو گئی، اکثر یورپین، اور اراکین واخوان نے میرے صعف و نقاہت پر خیال کر کے میرے ساتھ لے جانے کے متعلق اختلاف کیا، اور رائے نہ دی، مگر نواب صدیق حسن خاں چونکہ میرے ساتھ لے جانے پر اصرار تھا لہذا سرکار خلد مکاں نے ان کی رائے پر عمل کیا۔ اس اصرار مین یہ پیش بندی

> مرکوز خاطر تھی (جیسا کہ مجھے نہایت صحت کے ساتھ معلوم ہوا) کہ شاید خلد مکاں کی عدم موجودگی مین سرکار قدسیہ کے یہاں آمدورفت شروع ہو جائے۔۔۔۔(۲۱)

نواب شاہجہاں بیگم نے دہلی روانگی سے قبل اس چیز کا ارادہ کیا ہوا تھا کہ دہلی مین ایک شاندار دعوت ہز ایکسلنسی وائسرائے، یورپین حکام اور ان کی بیگمات کی دربار قیصرہ میں کی جائے۔ لیکن پولیٹیکل ایجنٹ دربار قیصری کے حوالے سے اتنے مصروف تھے کہ منصوبہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا تھا۔ طے یہ پایا کہ بھوپال میں دعوت کا انتظام کیا جائے گا۔ ۲۶ فروری ۱۸۷۷ء کو ایجنٹ گورنر جنرل بہادر نے اسی شاندار دعوت کے موقع پر مشورہ دیا کہ چیچک کے مرض کے انسداد کے لیے "ٹیکہ" کا انتظام کیا جائے۔ خاندان رئیس کے بچوں کو یورپین ڈاکٹر ٹیکے لگاتے تھے لیکن اس کے ساتھ یہ کوشش بھی کی گئی کہ عوام میں بھی اس کا شعور پیدا کیا جائے اور بچوں کو اس موذی مرض سے نجات دلائی جائے۔ اس دعوت میں جنرل سر ہنری ڈیلی (Sir Henury Daily) صاحب بہادر ایجنٹ گورنر جنرل سنٹرل انڈیا اور نواب شاہجہاں بیگم نے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے تقاریر کیں اور شکریہ ادا کیا۔

نواب سلطان جہاں بیگم کی زندگی میں زیادہ مایوسی اس وقت اثر پذیر ہونے لگی جب اس دعوت کے بعد روز بروز کچھ ایسے واقعات رونما ہونے لگے۔ جن سے پولیٹیکل عہدہ داران برطانیہ کی مداخلت ناگزیر لگ رہی تھی۔ نواب صدیق حسن خاں نے خطاب و سلامی حاصل ہو جانے کے بعد کچھ ایسی روش اختیار کی جس سے عوام ناخوش اور بددل ہونے لگے تھے۔ مراعات حاصل ہونے کے بعد سب سے پہلے انہوں نے یہ کوشش کی نواب قدسیہ جہاں بیگم کے عہد کو بدنام کیا جائے۔ انہوں نے اس عہد کو وحشیانہ دور حکومت قرار دیا اور گستاخانہ اعتراضات کیے تھے۔ مزید یہ کہ نواب صدیق حسن خاں نے دربار عام میں ایک نامناسب تحریری تقریر بھی پڑھی جس کا خلاصہ کچھ اس طرح سے تھا کہ

> سرکار خلد نشین کی حکومت ایک ظالمانہ حکومت تھی وہ اخوان واراکین کے ساتھ جابرانہ برتاؤ فرماتی تھین، سرکار خلد مکاں کا زمانہ حکومت نرمی اور رحم دلی کا ہے، وہ بیدار مغز، اور باخبر ہین، ہر شخص کو معلوم ہو کہ جو کچھ چشم پوشی کی جاتی ہے از راہ بے خبری نہین، بلکہ از راہ رحم دلی و بردباری ہے اور تحمل کا درجہ گزر گیا۔ ہر ایک

مفسد، و مفتری کو جانتی ہین۔۔۔اسی طرح اور بھی مفتریوں نے پارٹی بنائی ہے، جسکاانشاءاللہ ریاست جلد تدارک کرنے والی ہے۔(۲۲)

اس واقعہ کے بعد ۱۸۸۲ء میں کلکتہ میں دربار منعقد کیا گیا تھا۔اس دربار میں بھی کچھ ایسی بے ضابطگیاں کی گئیں جو روایات بھوپال کے خلاف تھیں۔نواب صدیق حسن خاں کی جانب سے کچھ ایسے تغیر و تبدل کیے گئے جو اس امر کی طرف شارہ کر رہے تھے کہ نواب سلطان جہان بیگم کو بطور ولی عہد کے عہدہ سے برخاست کیا جائے۔نواب سلطان جہاں بیگم کو جب ان تمام حالات کا علم ہوا تو انہوں نے نواب صدیق حسن خاں سے بازپرس کی کہ دربار میں پہلی نشست نواب شاہجہاں بیگم کی اور دوسری نواب سلطان جہاں بیگم کی ہوتی تھی لیکن اس دربار میں دوسری نشست نواب صدیق حسن خاں کی تھی۔یہ بے ترتیبی سہواً ہو تو نظر انداز کیا جاسکتا ہے لیکن اگر کسی تاریخی حکم نامے (نواب قدسیہ بیگم نے اپنے عہد میں یورپین ریزیڈنسی کے توسط سے یہ فیصلہ حتمی طور پر منظور کروالیا تھا کہ بھوپال میں بیگمات بطور فرمانروا حکومت کریں گی اور ان کے شوہروں کو کوئی اختیار نہیں دیا جائے گا) میں تبدیلی کی جارہی ہے تو آگاہ کیا جائے۔نواب صدیق حسن خاں نے نواب سلطان بیگم کے تمام استفسارات کا جواب دینے میں لاعلمی کا مظاہرہ کیا۔اس نارواروپے کے حوالے سے نواب سلطان جہاں بیگم لکھتی ہیں کہ

> مجھے اس تغیر و تبدل سے سخت رنج ہوا،کیونکہ اگر یہ خانگی معاملہ ہوتا تو مین کبھی رنج تو کیا خیال شکایت کو بھی دل مین جگہ نہ دیتی،اور سرکار کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کرتی لیکن چونکہ یہ معاملہ آداب مراتب دربار شاہنشاہی سے متعلق تھا،اس لیے مجھے حد تامل اور رنج ہوا۔مین نے سرکار خلد مکان کو حسب ذیل عرئضہ لکھا:۔۔۔۔۔میری نشست بعد نواب صاحب بہادر لکھی ہے،حالانکہ آجتک ایسا نہیں ہوا کہ میری نشست بعد نواب صاحب بہادر کے کسی دربار،یا ملاقات گورنری،یا دربار ریاست مین ہوئی ہو،پس اس بے ضابطگی یا غلطی کا سبب یا تو حضور ایجنٹ صاحب بہادر سے دریافت فرماویں،یا مجکو اجازت ہو کہ مین دریافت کرلوں،غرض اس مین کاروائی جلدی ہونا ضروری ہے،کیونکہ ملاقات قریب آگیا ہے۔۱۵ ربیع الثانی ۱۲۹۹ء۔(۲۳)

غرض اس قسم کے حالات نواب سلطان جہاں بیگم کے لیے بہت پریشان کن تھے۔نواب بلقیس جہاں بیگم اس وقت تک نواب شاہجہاں بیگم کے محل میں رہتی تھیں کسی وجہ سے نواب سلطان جہاں بیگم نے ان کو اپنے پاس واپس بلا لیا۔کچھ دنوں بعد وہ بیمار ہو گئیں اور ایک مہینہ تکلیف میں رہیں۔ان کی بیماری کے زمانہ میں نواب سلطان جہاں بیگم نے نواب شاہجہاں بیگم کی منت سماجت کی کہ وہ بلقیس جہاں بیگم محل میں تشریف لائیں اور نواب بلقیس جہاں بیگم کو تسلی دیں مگر وہ راضی نہ ہوئیں۔اور بالآخر ۱۲ سال ۶ ماہ کی عمر میں انتقال کر گئیں۔

نواب بلقیس جہاں بیگم کی وفات کا صدمہ ابھی مدہم بھی نہ ہوا تھا کہ تقریباً ڈھائی سال کی سخت علالت کے بعد نواب سلطان جہاں بیگم کی چھوٹی بیٹی نواب آصف جہاں بیگم نے ۲۲ جوالائی ۱۸۹۴ء میں ۱۴ سال کی عمر میں وفات پا گئیں۔ان دونوں غمناک مواقعوں پر اپنی والدہ نواب شاہجہاں بیگم کی تسلی سے محروم رہیں۔اسی غم والم کے زمانہ میں ۹ دسمبر ۱۸۹۴ء میں نواب سلطان جہاں بیگم کے ہاں نواب حمیداللہ خاں صاحب بہادر کی ولادت ہوئی۔ان کی پیدائش پر نہ ریاست کی جانب سے کسی خوشی کا اظہار کیا گیا نہ کوئی رسم ادا کی گئی۔نواب شاہجہاں بیگم بھی اس خوشی کے موقع پر تشریف نہیں لائیں۔نواب سلطان جہاں نے اس حوالے سے تحریر کیا ہے کہ

> اس مولود مسعود کی ولادت سے مجھے بے انتہا مسرت ہوئی کیونکہ صاحبزادی آصف جہاں بیگم کے انتقال کے بعد میری طبیعت ہر وقت غمگیں اور اداس رہتی تھی اس نعم البدل کے ملنے سے کسی قدر وہ اداسی اور افسردگی جاتی رہی۔خداوند کریم نے جو سب سے بڑا تسلی دینے والا ہے گویا میرے غم زدہ دل کی تسلی کے لیے اپنے فیض و کرم کا فرشتہ بھیج دیا۔(۲۴)

جب نواب نصراللہ خاں اور نواب جنرل محمد عبیداللہ خاں کی عمریں ۲۴ اور ۲۲ سال کی ہوئیں تو نواب سلطان جہاں بیگم کو ان کی شادی کی فکر ہوئی۔نواب سلطان جہاں بیگم نے بہت کوشش کی کہ نواب شاہجہاں بیگم کی رضامندی سے وہ نواب سلطان دولہا احمد علی خاں کی بھانجیوں سے نسبت طے کریں لیکن انہیں اس مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔مجبوراً ۱۹۰۰ء میں سادہ طور پر رسم عقد کر دیا گیا۔نواب صدیق حسن خاں اس صورت حال سے بہت مطمئن تھے انہوں نے دونوں ماں بیٹی کے درمیان دیواریں حائل کر دی تھیں۔نواب سلطان جہاں بیگم نے نواب صدیق حسن خاں کے حوالے سے لکھا کہ

اونہوں نے اپنے گرد وپیش ایسے لوگوں کو جمع کیا تھا جو اون کے ہم خیال اور اون کی کاروائیوں کے معاون تھے، اور اس مداخلت کی وجہ سے تقریباً تمام بڑے بڑے سرکاری عہدے ایسے لوگوں کے ہاتھوں مین آگئے تھے جنکو نہ ضرورت زمانہ کا احساس تھا اور نہ رعایا و ریاست سے ہمدردی تھی، اسلیے ریاست کے انتظامی صیغوں مین ایک عام بدنظمی پھیل گئی۔۔۔ایک طرف یہ مشغلہ جاری تھا، دوسری طرف اونکے آوردوون کے تشدد و ظلم کا سلسلہ طولانی ہوتا جاتا تھا، اور اس پر ان کی طرف داری کی جاتی تھی۔۔۔۔نواب صدیق حسن خاں کو تصنیف و تالیف کا بھی شوق تھا انکی تصانیف پر یورپین حکام نے نوٹس لیا تو وہ کتابیں ضائع کر دی گئیں۔۔۔(۲۵)

نواب صدیق حسن خان کی کتابیں جو انگریزوں کے عمل دخل کے خلاف سمجھی گئیں اور یہ یورپین حکام کے لیے قابل قبول نہیں تھیں۔ انہوں نے بارہا نواب شاہجہاں بیگم کو آگاہ کیا کہ وہ نواب صاحب کے اس عمل کی راہ میں روکاوٹ بنیں لیکن نواب شاہجہاں بیگم نے اس طرف توجہ نہیں دی کیونکہ انہیں نواب صاحب سے خصوصی لگاؤ تھا۔ سر لیفل گریفن صاحب بہادر نے جب نواب شاہجہاں بیگم سے کسی جوابی کاروائی کو کارگر نہ جانا تو انہوں نے صاحب ایجنٹ گورنر جنرل بہادر کو بھوپال بھیجا۔ ۱۸۸۵ء کو گورنر ایجنٹ نے شوکت محل میں دربار منعقد کیا۔ نواب صدیق حسن خاں کی تمام کتابوں کو اکٹھا کیا گیا اور مذکورہ اقتباسات کی وضاحت طلب کی مگر وہ کوئی صفائی نہ دے سکے۔ گورنر جنرل نے نواب شاہجہاں بیگم کو مخاطب کر کے تمہیدی گفتگو کی اور تمام صورت حال سے آگاہ کیا کہ نواب وائسرائے کی جانب سے یہ حکم صادر ہوا ہے کہ نواب صدیق حسن خاں کے خطاب و سلامی واپس لی جارہی ہے۔ اور وہ آئندہ کاروبار ریاست میں کسی طرح کی ظاہری و مخفی مداخلت نہیں کریں گے اور اگر کی تو دوسرا سخت حکم دیا جائے گا۔ لہذا ایک مدار المہام مقرر ہونا چاہیے جو کامل طور پر انتظام ریاست چلائے اور نواب شاہجہاں بیگم کے ساتھ مل کر کام کرے۔ یورپین حکام کی جانب سے اس فیصلے پر نواب صدیق حسن خاں اور نواب شاہجہاں بیگم کو بہت صدمہ پہنچا۔

یہ حالت خود مولوی صدیق حسن خاں نے اپنے افعال سے پیدا کی تھی لیکن ہماری طرف بڑے زور وشور سے منسوب کی جاتی تھی، مولوی صدیق حسن خاں صاحب نے سرکار خلد مکاں کے ذہن نشین کر دیا تھا کہ ہم لوگوں نے مخبریان کرا کے یہ ذلت دی ہے، اور ہر وقت یہ سمجھایا جاتا تھا کہ مجھے حقیر و ذلیل نہیں کیا بلکہ یہ جو

کچھ ذلت و حقارت ہوئی ہے وہ آپ کی ہوئی ہین، مین تو وہی مولوی صدیق حسن خاں ہوں "نواب ولا جاہ امیر الملک" صرف آپ کی ذات سے بنا ہوں۔۔۔(۲۶)

مندرجہ بالا نواب صدیق حسن خاں کے منفی رویے کی وجہ سے نواب شاہجہاں بیگم نے نواب سلطان جہاں بیگم اور نواب سلطان احمد علی کو قصوروار ٹھہرانہ شروع کر دیا۔ نواب سلطان جہاں بیگم کو جب ان حالات کی خبر ہوئی تو انہوں نے صفائی دیناضروری سمجھااور نواب شاہجہاں بیگم سے متعلقہ مسئلے پر گفتگو کی اور مکمل یقین دہانی کروائی کہ وہ اور ان کے شوہر اس معاملے کے بارے میں قطعاً بے خبر اور بے قصور ہیں۔ اگر اس سلسلے میں کوئی بھی صفائی لینا چاہیں اپنی تسلی کے لیے نواب شاہجہاں بیگم تو وہ تیار ہیں۔ نواب شاہجہاں بیگم نے آمادگی دکھائی اور فیصلہ یہ کیا گیا کہ نواب سلطان جہاں بیگم سر گریفن لیفل (Sir Lepel Griffin) اور گورنر ایجنٹ کے سامنے اس بات کی گواہی دیں۔ بقول نواب سلطان جہاں بیگم

> سرکار خلد مکاں نے اس کو منظور فرمایا،اور یہ قرار دیا کہ سر لیفل گریفن صاحب بہادر کے آنے پر وہ اور کرنل وارڈ صاحب بہادر ، کرنل کنکیڈ صاحب بہادر پولیٹیکل ایجنٹ انجیل ہاتھ مین لیکر قسم کھائین،اور ہم حلف کرین کہ ہم کو اس کاروائی سے کوئی تعلق نہیں، مینے بخوشی منظور کیا، لیکن چونکہ ہمارا قصور نہ تھا،اور ہم بالکل پاک تھے اور ہماری نسبت محض اتہام تھا،اور وہ جانتے تھے کہ پردہ فاش ہو جائے گا اور اگلی پچھلی تمام غلط بیانیاں اور اتہامات ظاہر ہو جائیں گے اس لیے مولوی صدیق حسن خاں صاحب نے سرکار خلد مکاں کو اس قرارداد کے اوپر مستقل نہ رہنے دیا۔(۲۷)

مندرجہ بالا صورت حال سے نواب شاہجہاں بیگم نواب صدیق حسن خاں کے خطابات اور سلامی واپس دلوانے کی کوشش کرنے لگیں اور اس دوران نواب شاہجہاں بیگم کی طبیعت ناساز رہنے لگی۔ نواب سلطان جہاں بیگم کو اپنی والدہ کی خرابی صحت کی وقتاً فوقتاً اطلاعات ملتی رہتی تھیں۔ نواب شاہجہاں بیگم کی بیماری سے نواب سلطان جہاں بیگم بہت بے چین رہنے لگیں اور صحت یابی کے لیے دعائیں مانگتی رہتی تھیں۔ اول تو وہ خود ان کے پاس جانے سے گھبراتی تھیں مگر بعد ازاں فرط جذبات میں بہہ کر ان کے محل کی طرف روانہ ہو گئیں۔ محل پاؤ میل کے فاصلے پر تھا مگر ان کے لیے ایک ایک قدم کوسوں میل کے فاصلے پر تھا۔ اس سے قبل بلقیس جہاں بیگم کی بیماری میں نواب شاہجہاں

بیگم کو بلانے آئیں تھیں۔ محل میں قدم رکھتے ہی خبر ہر سو پھیل گئی۔اس صورت حال کی منظر کشی محمد امین زبیر مارہروی نے کچھ اسطرح کی ہے

سرکار خلد مکاں کے کمرے میں پہنچی بوجہ ضعف کے لیٹی ہوئی تھیں میرا جی چاہا کہ ماں کے پاؤں سے لپٹ کر خوب روؤں۔ تلوؤں سے آنکھیں ملوؤں اور وہ جوش جو کہ ۲۷ برسوں سے دل میں بھرا ہوا دریا کی سی لہریں لے رہا ہے جی کھول کر نکالوں مگر سرکار کی خفگی کے خیال اور تکلیف کے خوف سے مجھے جرات نہ ہوئی اور دیوار حسرت بن کر کھڑی رہ گئی۔۔۔ سرکار خلد مکاں نے میری جانب نظر کرکے پوچھا "تم کون ہو؟" علالت سے ان کی نظر میں ضعف آگیا تھا اور کمرے میں بھی اندھیرا تھا۔۔۔ انہوں نے پھر کہا، "تم کون ہو؟ کیوں نہیں بولتیں؟ میں نے نہایت عاجزی سے دست بستہ عرض کیا کہ "سرکار میری خطائیں معاف فرمائیں"۔۔۔ تم اس وقت چلی جاؤ۔ ہمارے بعد آجانا" لیکن میں کھڑی رہی۔ بالآخر دوسرے کمرے میں چلی گئی لیکن ایک خواص نے آکر کہا کہ سرکار فرماتی ہیں کہ "تم اگر نہیں جاؤ گی تو میں اپنے باغ میں چلی جاؤں گی مجبوراً! ایک تازہ زخم لے کر بصد منزل کو واپس آئی۔"(۲۸)

نواب سلطان جہاں بیگم کے لیے یہ وقت بہت مشکل تھا اور ہمہ وقت اداسی کے عالم میں رہتی تھیں۔ بالآخر ۱۶جون ۱۹۰۱ء دن کے وقت ۱۲ بج کر ۷ امنٹ پر نواب شاہجہاں بیگم نے انتقال کیا تھا۔ نواب سلطان جہاں بیگم کو جس وقت علم ہوا دل میں بے شمار حسرتیں لے کر وہ فوراً روانہ ہوئیں، محل میں ھو کا عالم تھا ہر چیز پر عبرت و حسرت برس رہی تھی۔ نواب سلطان جہاں بیگم دیر تک اپنی والدہ نواب شاہجہاں بیگم کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہیں اور بے اختیاری کے عالم میں ان کے قدموں کے بوسے لیے کیونکہ اب انہیں کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ آخر میں تدفین کا انتظام کیا گیا اور جو لوگ بین کر رہے تھے انہیں سورۃ بقرہ اور کلمہ طیبہ پڑھنے کی تلقین کی تھی۔ تاج محل کے وہ لوگ جو نواب سلطان جہاں بیگم کے محل میں آنے پر افسردہ اور بھڑکتے تھے اب ان کے حضور میں کھڑے ہونے پر فخر محسوس کرنے لگے تھے۔ اس وقت ان کی برائیاں کرنا، الزامات لگانا واجبات میں سمجھتے تھے اب ان کو نواب سلطان جہاں میں خوبیوں کا وسیع خزانہ نظر آنے لگا تھا۔

تاریخ میں بہت سے ایسے واقعات ملیں گے کہ ملک و مال کی وجہ سے مفسدین کی فتنہ پردازیوں سے باپ بیٹیوں میں جدال و قتال اور ظلم و زیادتی کی آگ مشتعل ہوئی جس نے ہزاروں گھر اور حکومتیں برباد کر دیں اور دونوں میں سے کسی ایک کی جان جاتی رہی یا دونوں تباہ ہو گئے۔ لیکن تاریخ عالم کے کسی صفحہ پر ماؤں کی بے رحمی نظر نہ آئے گی۔ اکثر نافرمانی اور خود رائی اولاد ہی کی جانب سے ظہور پذیر ہوتی ہے مائیں اولاد سے دکھ سہتی ہیں' نافرمانیاں دیکھتی ہیں مگر ان کی محبت ہمیشہ رحم و کرم سے ان کا معاوضہ کرتی ہے۔۔۔ مگر میری اور سرکار خلد مکاں کی ایسی حالت تھی جو شاید ہی آج تک کسی کو پیش آئی ہو' نہ میرا قصور تھا نہ سرکار خلد مکاں میں صلہ رحم اور مہر مادری کا فقدان تھا لیکن وہ میرے مفروضہ تصورات پر اظہار ناراضی کے لئے مجبور تھیں اور اسی مجبوری کی وجہ سے یہ مستثنیٰ حالت نظر آتی ہے۔(۲۹)

نواب شاہجہاں بیگم تقریباً ستائیس برس نواب سلطان جہاں بیگم سے ناراض رہیں حتیٰ کہ ولیعہدی کے منصب سے ہٹا کر قدر محمد خاں کو ریاست کا ولیعہد مقرر کرنے کا سوچ رہی تھیں۔ انگریز پولیٹیکل ایجنٹ نے ماں بیٹی کے اختلاف سے فائدہ اٹھانے کا عزم کر رکھا تھا اور اس نے شاہجہاں بیگم کی خواہش پر قادر محمد خاں کا نام برائے ولیعہد ریاست سے منظوری کے لئے حکومت ہند کو بھیج دیا تھا۔ لیکن شاہجہاں بیگم کے انتقال کے بعد اور ان کی آخری رسوم ادا ہوتے ہی ریاست کے وزیر اعلیٰ عبدالجبار اور شاہجہاں بیگم کے معتمد خاص میر منشی احمد حسن نے جنھوں نے پہلے ہی سے مرکزی حکومت سے اس سلسلہ میں رابطہ قائم کر رکھا تھا' سلطان جہاں بیگم کے حکمران ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ اور میر منشی احمد حسن محلات اور خزانوں کی چابیاں اور دیگر لوازمات حکومت جو شاہجہاں بیگم ان کے سپرد کر گئی تھیں' لے کر سلطان جہاں بیگم کی خدمت میں پہنچ گئے۔ ان کے قدموں میں ڈال دیں جو پولیٹکل ایجنٹ کی کاروائیوں سے تقریباً مایوس ہو چکی تھیں اور اپنی قسمت کے فیصلے کی منتظر تھیں۔ اچانک یہ اعلان سن کر حیرت زدہ ہو گئیں۔ بقول بیگم عبدالغنی

نواب سلطان جہاں بیگم فوراً میر منشی کے ساتھ محل میں آئیں اور ماں کے متعلق سرکاری رسومات کو سنبھال لیا۔ اور ریاست کے کاموں کی بھی دیکھ بھال شروع کر دی۔ لیکن پولیٹکل ایجنٹ نے ان کو فرمانروا تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ تمام

عہدیدار جو شاہجہاں بیگم کے معتمد اور وفادار تھے انہوں نے سلطان جہاں بیگم کا
بھرپور ساتھ دیا۔ آخر کار مرکزی حکومت نے ان کوششوں کے باعث شاہجہاں
بیگم کے انتقال کے سترہ دن بعد سلطان جہاں بیگم کو بھوپال کا آئینی فرمانروا تسلیم
کرلیا گیا۔(۳۰)

جب کہ محمد امین زبیر مارہروی نے اپنی کتاب میں حالات کا ذکر اس طرح سے کیا ہے جس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ نواب شاہجہاں بیگم کی وفات کے فوراً بعد ہی نواب سلطان جہاں بیگم فرماں روا ہو گئیں تھیں۔ جیسے ہی نواب شاہجہاں بیگم کے انتقال کی خبر پھیلی تو اسی وقت گورنمنٹ کی جانب سے اطلاع آئی کہ نواب سلطان جہاں بیگم باضابطہ طور پر رئیسہ بھوپال تسلیم کر لی گئی ہیں۔ لیکن عملاً ۷ اجون ۱۹۰۱ء تاج پوشی ایجنٹ گورنر جنرل کی موجودگی میں ادا ہوئی۔ ایوان صدر میں رسمی دربار صدارت منعقد ہوا۔ پہلے ہزا کسیلنسی کو ائسرائے ہند کا خط پڑھ کر سنایا گیا اور پھر اس کے بعد ایجنٹ گورنر جنرل نے تقریر کی اور نواب سلطان جہاں بیگم کو مبارک باد دی۔ بقول محمد امین ماہروری

آج آپ اپنے بزرگوں کی مسند پر متمکن ہوئی ہیں گو مجھ کو امید نہیں ہے کہ آپ کو
داد شجاعت نمایاں کرنے کے اس قسم کے مواقع دستیاب ہو سکیں جیسے کہ آپ
کے متقدمین سے بعض کو ملے ہیں یعنی وزیر محمد خاں کی طرح شہر پناہ بھوپال
سے باغیوں کی یورش کو فرو کرنا یا مشہور زماں اپنی نانی نواب سکندر جہاں بیگم کی
طرح لشکر کا ساتھ دینا۔۔۔۔ میں آپ کو آپ کی مسند نشینی پر خلوص دل سے
گورنمنٹ ہند کی طرف سے اور تمام میم صاحبات وانگریز صاحبان موجودہ دربار کی
طرف سے اور از خود اپنی طرف سے مبارکباد کہتا ہوں۔۔۔۔(۳۱)

ایجنٹ گورنر جنرل کے مندرجہ بالا تقریری کلمات کے ختم ہونے کے بعد نواب سلطان جہاں بیگم نے جواباً تقریری کلمات ادا کیے۔ سب سے پہلے اپنی والدہ نواب شاہجہاں بیگم کے انتقال پر رنج وافسوس کا اظہار کیا۔ اس کے بعد ملکہ وکٹوریہ ملکہ معظم قیصرہ ہند اور میجر رچرڈ میڈ(Richard Meade) ایجنٹ گورنر جنرل کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد ریاست کی سقیم حالت کا تذکرہ کر کے برٹش گورنمنٹ کی وفاداری اور عایا کی فلاح وبہبود کے لیے اقدامات کرنے اور اپنے فیصلے پر ثابت قدم رہنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے مدد کی دعا کی تھی۔ اس کے بعد گورنمنٹ کی جانب سے نواب احمد علی خاں بہادر کے خطاب "احتشام الملک عالی جاہ" کا اعلان کیا گیا۔ اس وقت ریاست کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔

اس کا اندازہ میجر میڈ کی تقریر کے ساتھ نواب سلطان جہاں بیگم کی تقریر کے ان جملوں سے بآسانی ہو سکتا ہے۔بقول امین ماہر وری

> مالی حالت ریاست کی بوجوہ چند در چند نہایت قابل توجہ ہے اور رعایا میں افلاس و ناداہندی سرایت کر گئی ہے اگرچہ اس میں مجھے بہت ہی مشکلات کا سامنا ہو گا کیونکہ افتادہ زمینوں کا از سر نو آباد ہونا خصوصاً ایسی حالت میں کہ تقریباً ایک ثلث مردم شماری گھٹ گئی ہو بالضرور ایک اہم کام ہے مگر جس احکم الحاکمین نے اپنے ملک اور اپنی مخلوق کی حفاظت میرے سپرد کی ہے مجھے امید ہے کہ وہ ہر کام میں میرا معین و مددگار ہو گا۔(۳۲)

نواب سلطان جہاں بیگم نے ہمت واستقلال اور بیدار مغزی کے ساتھ کام کا آغاز کر دیا۔از خود دفاتر کا جائزہ لیااور تمام امور کی انجام دہی کے لیے زیادہ سے زیادہ واقفیت حاصل کی۔چونکہ وزیر ریاست مولوی عبدالجبار خاں صاحب بہادر سی،آئی،ای بوجہ ضعیف العمری اپنے عہدے سے مستعفی ہو چکے تھے اس لیے ریاست کے نظم و نسق کو بہتر طریقے سے چلانے کے لئے نواب سلطان جہاں بیگم نے بجائے وزیر ریاست کے دو اعلی عہدہ دار معین المہام اور نصیر المہام مقرر کیے تھے۔نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنے کام کا آغاز ہی کیا تھا کہ تاج پوشی کے پورے سات مہینے بعد ۱۹۰۲ء کو رات بارہ بجے نواب احتشام الملک دل کی حرکت بند ہونے کے سبب انتقال فرما گئے۔نواب احمد علی خاں کبھی کبھی گھوڑے کی سواری کرتے یا کوئی محنت طلب کام کرتے تھے لیکن سواری کے بعد ان کی طبعیت بہت خراب ہو جاتی تھی۔اکثر یورپین ڈاکٹروں کو بھی دکھایا مگر بیماری کی تشخیص نہیں ہو سکی۔نواب محمد عبید اللہ کے تراویح میں ختم کلام کی خوشی کے حوالے سے انتظامات رات گئے تک کرتے رہے۔اسی مصروفیت میں رہنے کے بعد سو گئے۔سحری کے وقت جگایا گیا تو نہ اٹھے۔ڈاکٹر کو بلایا گیا معائنہ کے بعد معلوم ہوا کہ دل کی دھڑکن رکنے کے سبب انتقال کر گئے۔نواب احمد علی سلطان کی وفات کی افسوس ناک خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل گئی۔ہر طرف رنج و غم کے بادل چھا گئے۔باًلا خر پولیٹکل ایجنٹ اور دیگر اراکین ریاست کے ہمراہ قدیم عید گاہ میں نماز جنازہ باغ حیات میں ادا کی گئی۔نواب سلطان جہاں نے ان ایصال ثواب کے لیے مولوی عبدالحق،مولوی اعظم حسین،مولوی عبدالرحمان صاحبان کو حج کے لیے مکہ معظمہ بھجوایا

ایک صاحب نواب صاحب کے حج بدل میں اور باقی دو صاحبان نواب شاہجہاں بیگم اور آصف جہاں بیگم کے حج بدل میں مکہ گئے۔ نواب صاحب کی جاگیر خالص ہمیں شامل کر دی اور جو جائیداد منقولہ تھی وہ تینوں صاحبزادوں پر تقسیم کی گئی۔ صدر منزل کی عمارت بھی کیوں کہ وہ نواب صاحبزادوں کی خاص جاگیر کے روپیہ سے تعمیر ہوئی ہے وہ تینوں صاحبزادوں کی ملکیت قرار دی گئی۔(۴۳)

نواب سلطان جہاں بیگم اپنے شوہر کی زندگی میں ہی دونوں بیٹوں کے فرض سے فارغ ہو چکی تھیں۔ صرف رخصتی کی رسم باقی رہتی تھی اس لیے نہایت سادگی کے ساتھ یہ فـــریضـــہ انجام دیا تھا۔ گورنر جنرل مسٹر بیلی ایجنٹ(MR.C.S.Bayley)نے بھی شادی میں شرکت کی۔ شادی کے تمام اخراجات ذاتی طور پر ادا کیے گئے کیوں کہ ریاست کی مالی حالت بہت خراب تھی۔ نواب سلطان جہاں بیگم کے لیے یہ وقت سخت آزمائش کا تھا لیکن انہوں نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور زمانہ عدت میں بھی بدستور ریاستی امور میں مصروف عمل تھیں۔ چونکہ ریاست کا نظام چلانے کے لیے حکمران کا اپنی رعایا سے اور ان کی تمام حالتوں کا ذاتی طور پر علم سب سے اہم اور ضروری ہوتا ہے۔ اسی صلاحی مقصد کے تحت انہوں نے ملکی دورے کو ترجیح دی تھی۔ بذات خود رعایا کی حالت کا مشاہدہ کیا، رعایا کی سہولت کے لیے متعلقہ شہر کے دورے سے قبل وہاں اپنی آمد کے حوالے سے خط روانہ کر دیا جاتا تھا۔ ان دوروں میں دلچسپ اور اہم نکتہ یہ سامنے آیا کہ دیہات کی عورتیں خود نواب سلطان جہاں بیگم کا استقبال کرتیں اور اپنے مسائل سے خود آگاہی دلاتیں تھیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم عورتوں کے مسائل کو بے حد توجہ سے سنتیں کیونکہ وہ ہندوستانی معاشرے اور یہاں عورتوں کی سماجی حیثیت سے بخوبی آگاہ تھیں۔۔اس حوالے سے نواب سلطان جہاں بیگم لکھتی ہیں کہ

میں نے اپنے دوروں میں یہ بھی التزام رکھا تھا کہ مستاجر اور کاشتکاروں کی عورتوں سے بے تکلفانہ ملاقات کروں کیونکہ علاوہ اس کے مجھے صحیح صحیح حالات کا علم حاصل ہو ان کو مجھ سے باتیں کرنے اور ملنے میں ایک خاص خوشی ہوگی جس گاؤں سے میری سواری کا گزر ہوتا تھا جوق در جوق عورتیں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو گود میں لئے ہوئے راہگزر پر اپنے رواج کے مطابق پانی کا برتن لے کر (جس کو وہ اپنے راجہ کے لئے عمدہ فال سمجھتی ہیں) کھڑی ہو جاتیں۔(۴۴)

نواب سلطان جہاں بیگم اپنے پہلے دورے کے بعد کے حالات کے متعلق لکھتی ہیں کہ جس سے ہمیں بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے بحیثیت حکمران انہیں ملکی دوروں کی اہمیت کا کس قدر شدت سے احساس تھا، کیونکہ جب تک حکمران عوام میں جا کر نہایت قریب سے ان کی زندگیوں اور مسائل کا جائزہ نہیں لیتے تب تک وہ ان کی فلاح و بہبود کے لئے مناسب اقدام نہیں اٹھا سکتے ہیں۔ بقول محمد زبیر امین ماہروری

> دورہ کے قبل جس قدر ضرورت مجھے دورہ کی معلوم ہوتی تھی اب اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی، ہر چیز قابل اصلاح معلوم ہونے لگی اور یہ اندازہ ہو گیا کہ مفصلات کے بھی ہر صیغہ پر مجھے بذات خاص کامل توجہ کی ضرورت ہے۔۔۔۔ معائنہ سے جو حالات معلوم ہو سکے اور تحقیقات سے جو نتائج میرے سامنے پیش ہوئے ان کے لحاظ سے جو انتظامات عمل میں آئے وہ نہایت مفید ثابت ہوئے اور ان پر رعایا کو اطمینان ہو گیا اور ان کی تکلیفیں کم ہو گئیں اور یہی میرے دورہ کی زحمتیں اٹھانے کا معاوضہ تھا۔(۳۵)

کسی بھی ریاست کی خوشحالی کا انحصار مالی وسائل کی کثرت پر ہوتا ہے۔ نواب سلطان جہاں بیگم کو اس اہمیت کا بخوبی احساس تھا کہ خزانے کا خالی ہونا ریاست میں انتشار کا سبب بنتا ہے لہذا انہوں نے اس طرف خصوصی توجہ مرکوز کی تھی۔ اس دور میں پے در پے قحط سالیاں ہو چکی تھیں۔ کاشتکار شدید پریشانی کا شکار تھے اور روز بروز تباہی کی طرف بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد رعایا کے اطمینان اور سکون کے لیے کچھ انتظامات لگان اور قوانین مرتب کیے۔ اس مقصد کے لیے کاشتکاروں کی مالی حالت کو ملحوظ خاطر رکھ کر ۵ لاکھ ۵۵ ہزار ۴۳ تیرہ آنے مقرر کیے۔ اس سہولت سے رعایا کو بہت فائدہ ہوا اور مالی حالت میں بھی بہتری آنے لگی تھی اور زیادہ سے زیادہ لوگ اس طرف متوجہ ہونے لگے۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے رعایا کی اس اطمینانی صورت حال کو مد نظر رکھتے ہوئے مزید ۱۹ سال اسی سلسلے کو جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔ اور اپنی تسلی کی خاطر ذاتی طور پر متعلقہ علاقوں کے دورے کیے۔ کھیتوں کی حالت اور زراعت سے سرمائے میں اضافے کے خاطر خواہ نتائج کا از خود مشاہدہ کیا۔

نواب سلطان جہاں بیگم نے اراکین ریاست کے باہمی صلاح مشورے سے قوانین کے نفاذ کی طرف بھی توجہ دی۔ اس سلسلے میں انہوں نے کمیٹی تشکیل دی جس کا کام مختلف امور کے حوالے سے قوانین کا نفاذ تھا۔ یوں نواب

سلطان جہاں بیگم نے ایک سو پچیس قوانین بارہ سال کے عرصہ میں نافذ کیے جو اس سے قبل کے حکمران احسن طریقے سے کرنے سے قاصر رہے وہیں نواب سلطان جہاں بیگم نے بحیثیت جج کئی فیصلے صادر کیے تھے۔

> غالباً نواب سلطان جہاں بیگم ہندوستان بالخصوص بھوپال کی واحد خاتون ہیں جنھوں نے ایک جج اور عدالت کے مرکز اعلیٰ کی صورت میں اپنے آپ کو نمایاں کیا ہے اور پھر اس کے فرائض کمال لیاقت کے ساتھ دیے ہیں۔آپ کے فیصلے بطور نظائر ریاست کی عدالتوں کی رہنمائی کے لئے شائع ہوتے رہتے ہیں۔(۳۶)

جدید قوانین کے نفاذ کے حوالے سے انہوں نے ۱۹۲۲ء میں ایک اسٹیٹ کونسل قائم کی اور مختلف ممبروں کے سپرد مختلف محکمے کیے تھے۔نواب سلطان جہاں بیگم کی ایک اور بڑی کامیابی محکمہ پولیس کو مضبوط بنانا ہے۔نواب سلطان جہاں بیگم نے اس شعبے کو فعال بنایا تاکہ جرائم کا سدباب موثر طریقے سے کیا جاسکے۔اس وقت محکمہ بھوپال کی صورت حال دیکھ کر یہ کہنا کچھ بے جا نہ ہوگا کہ بھوپال کا محکمہ پولیس ہندوستان کی تمام پولیس سے بہتر اور مضبوط نظر آتا ہے۔اس شعبے کی بہتر تنظیم کے حوالے سے متحدہ ہائے ریاست کے انسپکٹر جنرل پولیس کا بیان کچھ اس طرح سے محمد امین مارہروی نے درج کیا ہے۔

> ان کی صورت ظاہری دیکھ کر میں خیال کرتا ہوں کہ کسی دیسی ریاست کی اس سے بہتر پولیس اب تک میرے دیکھنے میں نہیں آئی۔جو کچھ اب دیکھنے میں آیا ہوں اس کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا اور ترقی یافتہ دیسی ریاستوں کو پولیس کی بابت میرا خیال ہی بدل گیا۔(۳۷)

جیل خانوں کی بھی اصلاح کی طرف توجہ مرکوز کی گئی۔قیدیوں کا کام سکھانے کے لیے کافی کارخانے بنائے گئے جہاں قالین، دریاں، تولئے، بنیان، موزے گھریلو دستکاری کی اشیاء تیار کی جاتی تھیں۔کھیتی باڑی، اور باغبانی وغیرہ بھی سکھائی جاتی تھی۔یہ تمام امور اس لیے بھی اہم تھے کہ قیدی جب جیل خانے سے باہر نکلیں تو اپنی معاشی زندگی بھی اچھی طرح گزار سکیں اور دوبارہ گناہوں، جرائم کی طرف مائل نہ ہوں۔قیدیوں کے رہنے، کھانے پینے کا صاف ستھرا انتظام کے متعلق اطہر صدیقی اپنی رائے کو کچھ اس طرح اظہار کرتے ہیں کہ

> کسی بھی ریاست کا نظام اچھے طریقے سے چلانے کے لیے قوانین، پولیس اور جیل، عدالت کا اہم رول ہوتا ہے۔ سرکار عالیہ نے اس ضرورت اور اصول کو بہت اچھی طرح محسوس کیا۔ آپ نے پرانے قوانین پر غور کیا اور جہاں ضرورت سمجھی وہاں اپنے قابل رفیقوں سے صلاح مشورہ کر کے ان میں ترمیم کی۔(۳۸)

کسی بھی ریاست کو بیرونی دشمن عناصر سے بچاؤ کی صورت میں اعلیٰ تربیت یافتہ فوج کی ضرورت درپیش ہوتی ہے۔ اسی طرح نواب سلطان جہاں بیگم نے فوج کی اعلیٰ تربیت اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق اس شعبہ کی طرف بھرپور توجہ مبذول کی تھی۔ فوج کسی بھی ریاست کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے اور عظمت و شان کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ نواب سلطان جہاں بیگم کے دور حکومت میں اول اول تو بہت خفیف سی تبدیلیاں کی گئیں بعد ازاں کامل اصلاحات کی گئیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنے بیٹے نواب محمد عبید اللہ بہادر سی۔ ایس۔ آئی کو عساکر ریاست کے عہدیداروں میں شامل کر دیا تھا۔ نواب صاحب اپنے ذاتی شوق اور والدہ کی خواہش کے مطابق کچھ ہی عرصہ میں فوجی تربیت میں مہارت حاصل کر گئے۔ جب تربیتی مراحل مکمل ہو چکے تو نواب صاحب کو سپہ سالار ریاست مقرر کر دیا گیا اور ان کی فکری بنیادوں میں پختگی کے سبب بہت سی اصطلاحات عمل میں آئیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم ایک فوجی ماہر کی طرح کبھی کبھی فوجی پریڈ کا معائنہ کرتیں اور پھر تقاریر کے ذریعے فوج کی حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔ ۱۹۰۸ء میں لارڈ منٹو (Lord Manto) نے دوران تقریر فرمایا کہ

> یور ہائنس میں یہ کہنے کی جرات کر سکتا ہوں کہ آپ کے دلاور خاندان کا جوش سپاہ گری خود آپ کو پوری طور پر ودیعت ہوا ہے۔ یور ہائنس اپنے امپیریل سروس ٹرپس کی اس آراستگی پر بجا ناز فرما سکتی ہیں جو ان کو اب حاصل ہوئی ہے اور جس کی تکمیل آپ کے صاحبزادے کرنل عبید اللہ کی سرگرمی کا نتیجہ ہے مجھے اس امر پر ناز ہے کہ وہ میرے ایڈیکانگ ہیں۔(۳۹)

۱۹۱۴ء میں جب یورپ میں جنگوں کے سلسلے شروع ہوئے تو نواب سلطان جہاں بیگم نے سلطنت برطانیہ کی حمایت و حفاظت کے لیے ہر قسم کی اخلاقی، مالی اور فوجی امداد ہی نہیں بلکہ ذاتی امداد بھی پیش کی تھی۔ ریلیف فنڈ کے متعلق ایک جلسہ میں تقریر فرما کر رعایا کو اس میں چندہ دینے کا اعلان کیا اور مختلف صورتوں میں سامان جنگ سے امداد بھی کی گئی تھی۔ گھوڑے، موٹر کاریں، کشتیاں، خیمے وغیرہ دیئے گئے مزید یہ کہ ایک ہوائی جہاز بھی خرید کر بھیجا

گیا۔ہزا کیسلنی وائسرائے کی تحریک کے مطابق بھوپال پریزنٹس (عطیہ بھوپال) موسوم کیا گیا۔ نواب سلطان جہاں بیگم کی اصلاحات فوج کے حوالے سے اطہر صدیقی لکھتے ہیں کہ

> ریاست عالیہ نے فوج کی اعلیٰ تربیت کے لیے زمانہ حال کے مطابق منظم کرنے کی طرف بھرپور توجہ دی۔۔۔۔ ریاست کی ورک شاپ میں توپوں کے گولے تیار کیے گئے گھوڑوں کی تربیت کے لیے خاص انتظام کیا گیا۔(۴۰)

نواب سلطان جہاں بیگم نے ان مالی امداد کے علاوہ سب سے بڑی اخلاقی امداد بھی کی تھی۔ ترکی کی جنگ میں شریک ہونے کی وجہ سے تمام مسلمانان ہند کے دلوں میں بے چینی پیدا ہو گئی جس سے ریاست میں عجب ہلچل مچ گئی تھی۔ اس صورت حال میں لارڈ نگ وائسرائے گورنر جنرل اس بے چینی سے پریشان تھے۔ انہوں نے نواب سلطان جہاں بیگم سے درخواست کی کہ وہ رعایا کی بے چینی کو رفع کریں۔ نواب سلطان جہاں بیگم خود بھی ہندوستانی مسلمانوں کی فلاح چاہتی تھیں کہ وہ ایسی غلطیاں ہرگز نہ کریں جو ان کے زندگیوں کو مشکلات میں ڈال دیں۔ بھوپال میں نواب سلطان جہاں بیگم کی واحد ذات گرامی تھی جس پر رعایا اندھا اعتماد کرتی تھی۔ لہذا اس موقع پر شاندار دربار منعقد کیا گیا۔ جس وقت نواب سلطان جہاں بیگم تقریر فرما رہی تھیں تمام حاضرین جلسہ انداز تقریر اور پرجوش لہجہ تھا۔ خصوصاً گیلری میں موجود جس قدر یورپین خواتین موجود تھیں انکی خوشی اور اظہار مسرت سے تمام ایوان گونج اٹھا تھا۔ ۳۰ جون ۱۹۱۹ء کو لارڈ چیمس فورڈ نے ایک خط لکھا جس میں نواب سلطان جہاں بیگم کی خدمات کی تعریف اور شکریہ ادا کیا بقول طیبہ بی

> جو زبردست اور محکم امداد ریاست بھوپال نے دوران جنگ میں کی اس کے لیے میں اپنی اور ہز مجسٹی کی جانب سے نہایت پرجوش شکریہ ادا کرتا ہوں۔ یور ہائنس نے مسلمانان ہند کے لیے ایک شاندار مثال قائم کر دی اور فیاضانہ عطیات نقد ہوائی جہازوں اور گھوڑوں کو پیش کر کے مادی اعانت کی۔ بھوپال لانسرز نے ہندوستان میں گریزن ڈیوٹی پر قابل قدر خدمات انجام دیں اور تمام ریاست میں بھرتی ہونے کا شوق پیدا کر دیا۔(۴۱)

۱۸۱۸ء کے معاہدہ کی رو سے ریاست نے مضافات سہیور (بھوپال سے ۲۲ میل پر واقع ہے) میں ایک وسیع و عریض رقبہ جو کہ دیہات پر مشتمل تھا۔ چھاؤنی کے لیے برطانوی افواج کو دیا گیا تھا۔ لیکن جب چھاؤنی توڑ دی گئی تو

نواب سلطان جہاں بیگم نے ان زمین کو واپس لینے کے لیے گورنمنٹ آف انڈیا سے درخواست کی۔ ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو باقاعدہ منظوری دے دی گئی جس سے ریاست بھوپال میں بالحاظ رقبہ مزید وسعت پیدا ہو گئی۔ نواب سلطان جہاں بیگم ایک ذہین و فطین خاتون حکمران تھیں۔ انہوں نے ریاستی امور کی بہتر سے بہتر حالت کے لیے یکے بعد دیگرے اعلی اقدامات کیے۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے ملک کی صنعتی حالت پر بھی بھرپور توجہ دی۔ صنعتی تعلیم کے لیے کثیر مقدار میں وظائف دیئے گئے۔ نوجوانوں میں صنعتی کاروبار کا شوق پیدا کیا گیا۔ نجی کارخانے قائم کیے گئے اور تجارت کے لئے جابجا قصبات میں اور اسٹیشنوں پر منڈیاں قائم کی گئیں۔ نواب شاہجہاں بیگم کے عہد سے ریاست بھوپال میں ڈاک خانے قائم تھے۔ اور بعض مقامات پر انگریزی ڈاک خانے بھی قائم تھے لیکن ریاست کے ڈاک خانوں میں انگریزی ڈاک خانوں جیسی سہولیات نہیں تھیں اور نہ امکاں تھا۔ بقول امین مار ہر وی

> سرکار عالیہ نے گورنمنٹ ہند سے تحریک کر کے ریاست کے ڈاکخانے برطانوی ہند کے صیغہ ڈاکخانجات میں ضم کرادیئے، سروس ٹکٹ اور اختیار سماعت جرائم کے متعلق ایک معاہدہ ہو گیا۔ (۴۲)

نواب سلطان جہاں بیگم کی تعلیمی خدمات:

جس وقت نواب سلطان جہاں بیگم نے حکومت سنبھالی اس وقت تک بھوپال جدید تعلیم کے لحاظ سے بہت پیچھے تھا۔ فرسودہ نظام تعلیم حال کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا لہذا نواب سلطان جہاں بیگم نے آغاز حکومت سے ہی بہت سنجیدگی کے ساتھ توسیع اشاعت تعلیم پر توجہ صرف کی تھی۔ ریاست میں در آنے والے سیاسی و سماجی حالات کی انتشاری، افراتفری کی بدولت شعبہ تعلیم بہت بری طرح متاثر ہوا اور بھوپال کی رعایا کو تعلیم سے کوئی رغبت و دلچسپی نہیں رہی تھی لیکن جس وقت نواب سلطان جہاں نے ملکی دورے کیے، شہروں اور دیہاتوں کے مدرسوں کی حالت زار دیکھی تو سخت مایوسی کا شکار ہوئیں تھیں۔ دیہات تو دور شہر میں بھی لوگ جدید تعلیم سے جو عہد کے تقاضوں کے عین مطابق تھی، سخت نالاں تھے۔ جو لوگ تعلیم سے رغبت رکھتے تھے وہ قدیم نصاب کے دلدادہ نظر آتے ہیں یا وظیفہ کے لالچ سے قرآن مجید اور قدرے عربی، فارسی پڑھ لیتے تھے۔ اس دور میں مشرقی علوم کی تعلیم بھی غنیمت معلوم ہوتی تھی۔

> ان انتظامات کے ساتھ صیغہ تعلیم پر بھی میری نظر تھی اور جس طرح کہ ریاست کی مالی مشکلات مجھے پریشان کر رہی تھیں اسی طرح رعایا کی وہ غفلت جو تعلیم سے تھی پریشان کیے ہوئے تھی۔اگرچہ میں پہلے سے واقف تھی ۔۔۔۔میں نے خصوصیت کے ساتھ اس طبقہ پر نظر ڈالی جو جاگیر داران و عمائد کا تھا جن کو مناصب سے بیش قرار تنخواہیں دی جاتی تھیں لیکن جس طرح رعایا کو تعلیم سے جدید نفرت تھی اسی طرح اس طبقہ میں بھی منافرت موجود تھی اور اس نفرت کے ساتھ تعصبات رسم ورواج کی پابندی نمائش اور فضول اخراجات کی کثرت اس درجہ پر پہنچ گئی تھی کہ اس نے اخلاق و معاشرت پر نہایت خراب اثر ڈالا۔۔۔۔(۴۳)

نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنے عہد میں اشاعت تعلیم کی طرف بہت توجہ فرمائی تھی۔اس کے مفید نتائج پر غور کر کے ۱۹۱۸ء میں تعلیمی اسکیم میں اور توسیع فرمائی اور خاص شہر بھوپال میں جبریہ تعلیم کا قانون نافذ کر دیا یوں تمام ایسے مقامات جو قصبہ کی حیثیت رکھتے تھے وہاں مڈل اسکول قائم کیے گئے تھے۔غرض ہر ۲۵ مربع میل میں کہیں دو اور کہیں ایک مدرسہ بنایا گیا۔۱۹۱۹ء میں ابتدائی جبریہ تعلیم کا قانون نافذ کیا گیا اور ساتھ ساتھ یہ تجویز بھی دی گئی کہ پہلے خاص علاقوں میں اس اسکیم کا اجراء کیا جائے۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ طلبا کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔

ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں یہ امر بھی ملحوظ خاطر رکھا گیا کہ صنعتی و حرفتی دلچسپی بھی پیدا کی جائے اور اس مقصد کے لئے صنعت و حرفت کے مدرسے قائم کیے گئے۔جن سے ابتدائی تعلیم کے ساتھ خطاطی، رنگ سازی وغیرہ کا کام سکھایا جاتا تھا۔مدارس کے لئے چند جدید عمارتیں تعمیر کرائی گئیں اور کئی پرانی عمارتوں میں ترمیم کرا کے مدرسوں کے لیے موزوں بنادی گئیں۔بقول اطہر صدیقی "سرکار عالیہ یہ چاہتی تھیں کہ صرف بھوپال ریاست میں ہی نہیں بلکہ ریاستسے باہر بھی کوئی شخص جاہل نہ رہے۔باصلاحیت اور ضرورت مند طلبہ و طالبات کے لیے وظائف کا انتظام کیا۔۔۔"(۴۴)

نواب سلطان جہاں نے اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے جاگیر داران و امراء ریاست کو تعلیم پر مائل کرنے کی خاص کوششیں اور تدابیر کیں،ان کو ہر موقع پر تعلیم کی نصیحتیں کیں۔تعلیم کے سلسلے میں کوتاہی کرنے والوں یعنی

منصب داروں کے بچوں کی غیر حاضری پر جرمانہ عائد کیااور زر جرمانہ کو غریبوں کے وظائف میں خرچ کئے جانے کا حکم دیا۔

نواب سلطان جہاں بیگم کے عظیم الشان کارناموں میں روسائے ہندوستان کی اعلی تعلیم کی ترقی و اصلاح ایک ایسی کاوش ہے جس کے احسان سے نہ صرف روسائے ہند بلکہ ملک کا کوئی فرد بھی کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا ہے۔ اس عہد کے سیاسی و سماجی حالات کے باعث تعلیم اور جہالت سے بلاواسطہ اور بالواسطہ سارے ہندوستان کا متاثر ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ اس طبقے کی تعلیم کے لیے ایک عرصہ سے اجمیر، اندور، اور لاہور میں چیفس کالج قائم کیے جاچکے تھے لیکن ان کا تعلیمی معیار عام یونیورسٹیوں کے کالجوں اور اسکولوں کے برابر بھی نہ تھا کیونکہ وہ زیادہ فعال ثابت نہیں ہو رہے تھے۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنے بیٹے نوابزادہ میجر محمد حمید اللہ کو چیفس کالج اندور کے نصاب کی تعلیم دلوائی تھی۔ انہوں نے نصاب اور تعلیمی معیار کا ہندوستان کی دیگر یونیورسٹیوں کے نصاب اور معیار سے موازنہ کیااور ہندوستان کے کالجوں کے معیار تعلیم اور طریقہ تعلیم پر غور کیااور ان کالجوں کی خامیوں اور تعلیم و تربیت کے نقائص کی وجوہات جب جان لیں تو ان کی اصلاحات کی جانب توجہ مرکوز کی۔ بقول محمد امین زبیری

> طبع شاہانہ کا خاصہ ہے کہ جب کسی اصلاح کا عزم بالجزم فرما لیتی ہیں تو ہمہ تن اس کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں چیفس کالجوں کی اصلاح ۔۔۔ اور کوشش کی کہ ان کا نصاب و معیار بلند درجہ کا ہو اور ان کو تکمیل کے اعلی درجہ تک بہ اسلوب جدید پہنچایااور تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کیا جائے کہ روسائے ہند کی آئندہ نسلیں تمام تعلیم یافتہ ہند میں بالحاظ اپنے علم و اخلاق اور ارتقاء ذہنی و دماغی کے اولین گروہ نظر آئے چنانچہ ہر ہائنس نے اپنے خیالات و تجویزات کو وقتاً فوقتاً متعدد رسالوں کی صورت میں امراء، روساء، برٹش حکام اور ماہرین تعلیم کی توجہ اور غور کے لیے شائع کیا ۔۔۔(۴۵)

مندرجہ بالا تجاویز جو کہ نواب سلطان جہاں بیگم نے تعلیمی صورتحال کی بہتری کے لیے شائع کروائی تھیں۔ ایک عرصہ تک ان پر تمام ہندوستانی اور اینگلو انڈین پریس نے عرصہ تک بحثیں کیں اور نواب سلطان جہاں بیگم کی مجوزہ تدابیر سے اتفاق کر لیااور مختلف ماہرین تعلیم کی آراء کو بھی شامل بحث کر لیا گیا تھا۔ نواب سلطان جہاں بیگم ان تمام جلسوں میں جو اندور دہلی میں تعلیمی بحثوں سے متعلق ہوتے ان میں بہت جوش و جذبے سے حصہ لیتی تھیں۔ اسی

طرح ہزا کسیلینسی لارڈ ہارڈ نگ (Lord Hardinge) نے ۱۹۱۲ء میں اسٹیٹ بینکوئٹ کے موقع پر جو تقریر کی تھی اس میں نواب سلطان جہاں بیگم کی خدمات کو بہت سراہا۔ بقول محمد امین

> تعلیم روساء والیان ملک پر جو پمفلٹ یور ہائنس نے لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس اہم مسئلہ پر آپ نے نظر غائر ڈالی ہے جس سے کہ تحریک تعلیم کا ایک جوش پیدا ہو گیا ہے۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس میں مجکو ذاتی دلچسپی ہے اور اس میں ہر طرح مدد دینے کو تیار ہوں۔(۴۶)

ایک اور مقام پر کچھ اس طرح فرمایا کہ

> ہر ہائنس پہلی فرمانروا ہیں جنھوں نے چیفس کالجوں کی تعلیمی اصلاح کے معاملہ کی اہمیت محسوس کر کے ایک خاص اسکیم پیش کی ہے۔(۴۷)

غرض پندرہ سال کے عرصہ میں نواب سلطان جہاں بیگم نے خستہ اور قدیم تعلیمی روش کو تبدیل کر دیا تھا۔ اس تعلیمی سلسلے میں انہوں نے مختلف اقدامات کیے جو کہ درج ذیل ہیں۔ مثلاً

وظائف وامداد تعلیم:

نواب سلطان جہاں بیگم نے یہ محسوس فرما کر کہ افلاس تعلیم میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہوتی ہے۔ غریبوں ناداروں کو برابر وظیفے عطا فرمائے اور بھی مختلف طریقوں سے امداد اعانت کی کہ ابتدائی تعلیم آسانی سے حاصل کر سکیں۔ اسی طرح انٹر پاس طلباء جو اعلیٰ تعلیم یا صنعت و حرفت حاصل کرنے کے لئے جانا چاہیں ان کے لئے معقول وظائف مقرر کیے گئے جن سے ہر سال سینکڑوں طلباء فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔

مذہبی تعلیم:

مذہبی تعلیم پر نواب سلطان جہاں بیگم کی توجہ سب سے زیادہ مبذول رہی ہے چنانچہ اس کے لیے نہ صرف الگ مدرسے جاری کیے بلکہ ان میں بھی اکثر طلباء وظیفے پاتے تھے۔ دستار بندی کا باقاعدہ جلسہ منعقد کر کے فارغ التحصیل طالب علموں کو دستار فضیلت اور سند دی جاتی تھی۔ قرآن مجید کی تعلیم میں احتیاط کی خاص تاکید کی گئی اور اسی سبب مدرسہ میں تجوید وقرات بھی سکھائی جاتی تھی۔

کتب حمیدیہ:

یہ لائبریری نواب شاہجہاں بیگم کے زمانے میں ایک مدرسے کی شاخ کے طور پر قائم ہوئی تھی اور اس میں نہایت نادر و نایاب کتابیں جمع کی گئی تھیں۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ان میں ایک بڑی تعداد مختلف طریقوں سے تباہ ہو گئی اور لائبریری صرف چند معمولی کتابوں کا مجموعہ بن کے رہ گئی تھی۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے نئے سرے سے مرتب کر کے ایک مستقل عملہ اور بجٹ معین فرمایا۔ ایک نہایت شاندار عالی شان عمارت اس کے لئے تیار کرائی گئی۔ اور ہر سال اس میں مفید اور کار آمد کتابوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ لائبریری نواب محمد حمید خاں صاحب بہادر کے نام سے موسوم ہے۔ ۱۹۱۲ء میں لارڈ ہارڈنگ (Lord Hardinge) وائسرائے ہند نے اس کا افتتاح کیا تھا۔

تعلیم نسواں کے فروغ کی کوششیں اور ادبی خدمات:

نواب سلطان جہاں بیگم کو اپنی صنف کے مسائل اور تعلیم و ترقی میں جو شغف تھا اس کا بھرپور اظہار قوم و ملک کے زنانہ و مردانہ جلسوں میں ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ انہیں ہندوستانی معاشرے میں عورت کے ساتھ ہونے والے نامناسب رویوں کا بخوبی احساس تھا۔ لہذا جن گونا گوں طریقوں سے طبقہ اناث کے لئے کوششیں کیں وہ زمانہ حاضرہ کی تحریکات اور مسائل نسواں کی ایک مستقل تاریخ ہے۔ نواب سلطان جہاں بیگم عورت کو معاشرے کے فعال رکن کے طور پر دیکھنا چاہتی تھیں۔ بحیثیت مجموعی انسانوں کی فلاح و بہبود کی بنیاد نواب سلطان جہاں کے نزدیک تعلیم کی صورت میں تھی۔ انہوں نے تعلیم کو مسلم، غیر مسلم مردوں اور عورتوں کے لیے ازبس ناگزیر قرار دیا ہے۔ انہوں نے عورتوں کو جہالت کی تاریکیوں سے نکالنے کے لئے تعلیم کے فروغ کے لئے اہم کردار ادا کیا کیونکہ ان کے نزدیک تعلیم سے دوری گمراہی کا سبب تھا۔ بقول رضیہ حامد

> اس وقت تم بالکل ظلمات میں گھری ہوئی ہو۔ اے خاتونو! کوشش کرو اور اپنے آپ کو ان ظلمات سے نکالو۔ کیونکہ ظلمات سے نکلنے کے بعد ہی آب حیات ملتا ہے۔۔۔۔ اب تمہاری حالت اس درجہ پر پہنچ گئی ہے کہ تم یہ بھی نہیں جانتیں کہ تعلیم میں تمہارا حق بھی تھا یا نہیں۔۔۔۔(۴۸)

ہندوستان میں آغاز تعلیم نسواں اور تحریک ترقی نسواں کو تقریباً ایک صدی کا زمانہ گزرا اور اس میں شبہ نہیں کہ ہندو، پارسی اور عیسائی قوموں کی عورتوں نے اس سے کم و بیش فائدہ اٹھایا تھا۔ اس دور میں مسلمان عورتیں ہمیں

تعلیم میں بہت پیچھے نظر آتی ہیں جس کی بنیادی وجہ مذہبی و جنسی تعصب اور تنفر تھا۔جب کہ غیر مسلم خواتین کی تعلیم کی خاطر بہت سی اصلاحات ہوئیں،انجمنیں جاری ہوئیں۔ان انجمنوں نے دن رات کوششیں کیں تھیں۔مگر مسلمان عورتوں کی تعلیمی کمزوریوں کے حوالے سے بقول محمد امین زبیری

> مسلمان عورتوں کے تعصبات کو خواہ خود ان میں ہوں یا مردوں میں تین چار نسلیں گزر گئیں اور اس طرح نہ توان میں قدیم طریقہ تعلیم باقی رہی اور نہ جدید طریقوں سے اس کا اجراء ہوا۔اس لیے نواب سلطان جہاں بیگم کی توجہ کو سب سے پہلے اسی طبقہ کی اصلاح کی طرف فطرتاًمبذول ہونا چاہیے تھا۔(۴۹)

نواب سلطان جہاں بیگم ایک نئی سوچ کی نمائندہ حکمران تھیں انہوں نے مذہبی و جنسی تخصیص کو پس پشت ڈال کر عورت کو اس کا حقیقی مقام دلانے کی ٹھانی۔انہوں نے عورت کے روایتی تصور کو بدلا اور لڑکوں کے انتظام تعلیم کے برابر لڑکیوں کی تعلیم کے لئے مناسب اقدامات کیے تھے۔نواب سلطان جہاں بیگم نے کثیر مقدار میں مدارس بنائے لیکن صرف مدارس کا اجرا کافی نہیں تھا بلکہ اور بہت سی ضرورتیں اور اصلاحات بھی مد نظر تھیں۔نواب سلطان جہاں بیگم کی نظر مستقبل پر جمی تھی انہوں نے زنانہ تعلیم اور عورتوں میں تہذیبی ترقی کی غرض سے ایک خاص تنظیم کی اشد ضرورت محسوس کی تھی۔ابتداً انہیں باقاعدہ تعلیم کے رواج اور اسکی اشاعت میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ریاست بھوپال میں تعلیم سے نفرت تھی اور نہ زنانہ تعلیم کوئی اجنبی چیز تھی کیونکہ تعلیم نواب سکندر جہاں بیگم اور نواب شاہجہاں بیگم کے ادوار سے شروع ہو چکی تھی۔مختلف مدارس میں مدرسے وکٹوریہ ،سلیمانیہ ،جہانگیریہ اور بلقیسیہ کے نام سے جاری تھے۔لیکن ان مدارس کی حالت یہ تھی کہ گھروں میں تعلیم صرف قرآن مجید کے ناظرہ پڑھانے یا کہیں کہیں معمولی اردو پڑھانے تک محدود تھی۔بعض خاندانوں میں فارسی کا شوق ضرور تھا اور چند فارسی داں خواتین بھی موجود تھیں۔بقول محمد امین

> سرکاری مدرسوں میں کوئی ترقی یافتہ نظام تعلیم نہ تھا دستکاری پر بے شک زیادہ توجہ تھی،مگر وہ اس قسم کی تھی جو خاص خاص اشخاص کے پسند طبع ہوتی ہے لیکن عام گھروں اور بازاروں میں اس کی کوئی پرسش نہیں۔سرکار عالیہ کو جدید مدارس کا اجراء اور ان دو قدیم مدرسوں کی اصلاح مد نظر تھی۔چنانچہ مسند نشینی کے تیسرے ہی سال سلطانیہ اسکول جاری فرمایا۔مدرسہ

وکٹوریہ اور مدرسہ بلقیسیہ میں بہت سی اصلاحات کیں اور وقتاً فوقتاً دوسرے مدارس جاری کیے۔(۵۰)

خواتین کی تعلیم و تربیت کے لیے نواب سلطان جہاں بیگم نے قطعی طور پر اس بات کو تسلیم کیا کہ تعلیم عورتوں کے لیے بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی مردوں کے لیے ہے۔ یہ مسئلہ انہوں نے اس زمانے میں اٹھایا جب عورتوں کی تعلیم کو ایک معیوب چیز تصور کیا جاتا تھا۔ عورت گھر کی چار دیواری تک محدود رہی اس کی نہ کوئی اپنی سوچ تھی اور نہ کوئی پہچان، اس بدترین رویے کا اظہار شاعروں اور ادیبوں نے اپنے فن پاروں میں بھی کیا ہے۔ لیکن انہوں نے اس تصور کے خلاف عملی قدم اٹھایا اور تعلیم کو عام کرنے کی ٹھان لی۔ تعلیم کی ضرورت اور اہمیت پر زور دینے کو انہوں نے فرض عین قرار دیا۔ جیسا کہ انہوں نے ایک مقام پر کہا کہ

> میں اپنی اس رائے پر نہایت مضبوطی سے قائم ہوں کہ کبھی کوئی ملک یا قوم یا خاندان حقیقی ترقی یا تہذیب کا ادعا نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کی عورتیں تعلیم و تربیت میں بحصہ مساوی سہیم سے شریک نہ ہوں۔ اس لیے تعلیم نسواں کی اشاعت میں جو کچھ کر رہی ہوں وہ میرا فرض ہے۔۔۔(۵۱)

خواتین کی تعلیم و تربیت کو نواب سلطان جہاں بیگم نے باقاعدہ مشن کے طور پر لیا۔ اس دور میں تعلیم نسواں کی پر زور ترجمانی کرنے والا اور کوئی نظر نہیں آتا ہے۔ انہوں نے اپنے خیالات کا سرعام بلا خوف خطر اظہار کیا کہ عورتوں کی تعلیم کی طرف جتنی بے توجہی برتی گئی ہے اس کے ذمے دار مرد ہیں۔ جبکہ خاندان کی فلاح و بہبود کے لئے عورتوں کا زیور تعلیم سے آراستہ ہونا ضروری ہے۔ عورتوں کی تعلیم کی طرف قوم کا متوجہ ہونا اس وقت ان کے نزدیک باعث خوشی تو تھا مگر باعث اطمینان نہیں تھا۔ تعلیم نسواں کے فروغ کے لئے کوشش کرنے والوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اور حوصلہ بڑھاتے ہوئے انہوں نے اپنی ایک تقریر ۵ دسمبر ۱۹۱۱ء کو ہوئی اس میں کہا کہ

> ابھی دقتوں کا حصہ باقی ہے اور وہ نہایت سخت ہیں۔ اگر آپ نے ان سے ہمت ہار دی تو نہ صرف ہمت مردانہ کے خلاف ہوگا۔ بلکہ وہ انصاف کے حق میں ظلم سمجھا جائے گا۔۔(۵۲)

۱۹۰۱ء میں جب بھوپال کی حکومت سلطان جہاں بیگم کے دست مبارک میں آئی تو انہوں اہل ریاست کی تعلیم کی طرف توجہ مبذول فرمائی۔ اس سے قبل تعلیم عام کرنے کی کوششوں کو پچاس سال کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن اس وقت تک کوئی نمایاں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ انگریزی زبان سے تو عموماً لوگ متنفر تھے۔ نواب سلطان جہاں بیگم

نے جاگیر داروں اور شاہی خاندان والوں کو تعلیم کا شوق دلانے کے لیے بہت جدوجہد کی۔ ہر موقع پر تعلیم کی نصیحت کے علاوہ عطیات انعامات اور وظائف کے زریعہ ان کو رضامند کرنے کی کوشش کی۔ اور ایسے طریقے بھی اختیار کئے جن سے ایک حد تک وہ تعلیم حاصل کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اپنے چھوٹے بیٹے کو اسی اسکول میں داخل کیا کہ وہ رعایا کے لئے نمونہ ہوں۔ ڈاکٹر رضیہ حامد کے بقول

> وہ عورتوں اور لڑکیوں کی تعلیم کو مردوں کی ترقی کے لئے بھی ضروری سمجھتی تھیں۔ جیسے انجن کے چلنے کے لیے اسٹیم کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ مسلمہ ہے کہ کسی قوم نے اسوقت تک حقیقی ترقی میں حصہ نہ لیا ہو۔ نواب سلطان جہاں بیگم کے تعلیمی کردار کو اگر دیکھا جائے تو ان کی توجہ تعلیم کی جانب ہمیشہ مرکوز رہی تھی۔ (۵۳)

نواب سلطان جہاں بیگم کے نزدیک رعایائے بھوپال زیور تعلیم سے آراستہ ہوئے بغیر کبھی ترقی نہیں کر سکتی تھی۔ غیر تعلیم یافتہ آدمی نہ اپنے دنیاوی فرائض کو اچھے طریقے سے انجام دے سکتا ہے اور نہ مذہب کو بخوبی جان سکتا ہے۔ انھوں نے شفیق ماں کی طرح اپنی رعایا کو تعلیم و تربیت کی طرف متوجہ کیا اور سہولتیں فراہم کیں۔ نواب سلطان جہان بیگم نے لڑکیوں کی تعلیم و تربیت اور اچھے اخلاق کو ان کا قیمتی زیور قرار دیا۔ عزت سے زندگی گزارنے کے لئے تعلیم ہی وہ چیز ہے جو اس اہمیت سے بآور کراتی ہے۔ جس لڑکی کے اندر یہ صفات ہوں گی وہ ہر چھوٹے بڑے کی نظر میں باعث عزت تصور کی جائے گی اور ان خوبیوں کے باعث دنیا کی کوئی تکلیف نہ اس کو مایوس کر سکتی ہے اور نہ ہی آرام و آسائش اس کو مغرور بنا سکتی ہے۔

نواب سلطان جہاں بیگم کے نزدیک خرابیوں اور برائیوں سے دور رہنے کا واحد حل تعلیم ہے۔ وہ اسلام کی طرف سے عورتوں کو دیئے گئے حقوق کی شدت سے قائل تھیں اور مغرب کی خواتین کی دی گئی بے جا آزادی سے خائف نظر آتی تھی۔ انھوں نے عورتوں کو دیئے گئے حقوق سے استفادہ کرنے کی تلقین کی۔ ان کا خیال تھا کہ لڑکیوں کی تعلیم ان کو آئندہ نسل کی ترقی یافتہ مائیں بننے میں اہم کردار ادا کریں گئیں۔ ان کا کہنا تھا کہ تعلیم نسواں سے قوم و ملک کی ترقی میں تیزی آئے گی۔ ان کی خواہش تھی کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد لڑکیاں ان کی تعلیم نسواں کی تحریک میں معاون بن جائیں۔ جس کا اظہار انہوں نے ان الفاظ میں کیا۔

> آج جو لڑکیاں ہیں وہی ایک دن آئندہ نسل کی مائیں ہوں گی اور یہی کمزور ہاتھ ہیں جو کل تمام قوموں کی تربیت کے معاون ہوں گے لیکن کس قدر افسوسکی بات ہے کہ انہیں تعلیم اس

وقت نہایت پست حالت میں ہے۔۔۔ تمہاری زندگی کا حقیقی مقصد یہ ہونا چاہیے جہاں تک تمہاری طاقت وقدرت ہو اپنی جنس کو تعلیم کی طرف مائل کرو۔ ہر قسم کی کامیابیوں اور ترقیوں کا سنگ بنیاد تعلیم نسواں ہی ہے۔ یاد رکھو اگر ایک نسل بھی تعلیم یافتہ ہو جائے گی تو انشاء اللہ تمہارے ملک، تمہاری قوم اور تمہاری جنس کا جہاز افلاس وادبار کے طوفان سے نکل جائے گا۔(۵۴)

نواب سلطان جہاں بیگم کے ذوق علمی اور ان تدابیر کا اتنا عمدہ اثر ہوا کہ بھوپال کے مدرسوں میں ہر طبقے کے طالب علم نظر آنے لگے تھے۔ وہاں کے لوگوں کو تعلیم کی قدر و منزلت اچھی طرح معلوم ہو گئی خاص کر لڑکیوں کے اسکول جیسے کہ بھوپال میں آباد تھے۔ شہر کے تمام لوگ شرفاء و معززین ان میں بغیر کسی ڈر اور جھجک کے اپنی بچیوں کو بھیجتے تھے۔ یہ بات اور شہروں میں کم نظر آئی، اس کی وجہ یہ تھی کہ نواب سلطان جہاں بیگم خود ان کا معائنہ کرتیں اور انکی ترقی میں بے انتہا دلچسپی لیتی تھیں۔ ان کے علمی شغف اور طالب علموں پر مادرانہ شفقت اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے بقول محترمہ و۔ اصاحبہ

سالگرہ کے دن طلبائے مدارس نے بھی اپنے اپنے اسکولوں میں جلسے کیے۔ جن میں پر جوش تقریریں کیں۔ جس وقت وہ میرے سلام کو حاضر ہوئے اور قصائد و قطعات پیش کئے۔ اس وقت میرے قلب پر ایک عجیب اثر تھا۔ اور بے ساختہ یہ دعا دی تھی کہ ان میں سے ہر ایک علم وہنر سے بہرہ یاب۔ میں نے ان طلباء کو جس خوشی سے انعام دیا ہے میں نہیں کہہ سکتی کہ اور کسی موقع پر انعام دیتے ہوئے مجھے اس قسم کی خوشی حاصل ہوئی ہو۔ کیونکہ فی الاصل حقیقی ترقی کی بہت سی امیدیں طلبائے مدارس سے ہی وابستہ ہیں۔(۵۵)

نواب سلطان جہاں بیگم بھوپال میں اپنے قائم کردہ اسکولوں کو نمونہ بنا کر تعلیم نسواں کو پورے ہندوستان میں رائج کرنے کی خواہاں تھیں۔ پورے ملک کے تعلیم یافتہ طبقے کو عورتوں کی تعلیم کے فقدان اور اس سے پیدا ہونے والے نقصانات سے آگاہ کرنے کے ساتھ ہی اپنے تعلیمی مشن میں شرکت کرنے کی طرف متوجہ کرتی رہیں۔ وہ اس بات پر زور دیتیں اور کہتی تھیں کہ ان کی شرکت سے پورے ملک میں ترقی کی لہر دوڑ جائے گی۔ وہ تعلیم نسواں کو ملک گیر تحریک بنانے پر بار بار زور دیتیں اور تعلیم یافتہ طبقہ کے ہر فرد کو اس مہم اور تحریک میں شامل کرنا چاہتی تھیں۔

نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے مزید مدرسوں، کتب خانوں کی بنیاد رکھی جہاں خواتین کی تعلیم کے لیے موثر تنظیم سازی کی گئی۔ جو کہ درج ذیل ہیں۔

مدرسہ وکٹوریہ:

اس مدرسہ میں قرآن مجید، انگریزی، اردو، حساب، خانہ داری، دستکاری کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اور ۱۹۱۷ء سے علی گڑھ کی کمیٹی نصاب کی تیار کردہ کتابیں کورس میں پڑھائی جاتی رہیں۔ اس مدرسہ میں عموماً غریب لڑکیاں تعلیم پاتی رہیں جن کے اخراجات کی نواب سلطان جہاں بیگم ہی کفیل تھیں۔

مدرسہ بلقیسیہ:

یہ مدرسہ بھی غریب لڑکیوں کے لئے تھا۔ قرآن شریف کی تعلیم، اردو، اور حساب عملی طور پر چیزوں کی ترتیب اور صفائی اور پھول پھل لگانا، پودوں کی حفاظت کرنا سکھایا جاتا تھا۔ مدرسہ کے پیچھے ایک خوش نما باغ تھا جس میں لڑکیاں یہ کام کرتی تھیں۔ انہیں بھی نواب سلطان جہاں بیگم کی طرف سے وظیفے دیئے جاتے رہے، مگر بعد میں اس کو توڑ کر مدرسہ حمیدیہ میں شامل کر دیا گیا تھا۔

مدرسہ سلطانیہ:

یہ مدرسہ الہ آباد کے نظام تعلیم سے ملحق تھا۔ یہاں انگریزی، اردو مڈل تک پڑھائی جاتی علاوہ ازیں قرآن شریف باترجمہ قرات کے ساتھ اور دستکاری کی تعلیم بھی لازمی تھی۔ ۱۹۱۵ء سے ایمبولنس اور فرسٹ ایڈ یعنی زخمیوں کی تیمارداری اور فوری امداد کی بھی کلاسیں کھول دی گئیں۔ اس میں سالانہ کامیابی کا نتیجہ بہت اچھا رہتا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں ایک لڑکی نے اپنی ذہانت و قابلیت سے انگریزی مڈل میں وظیفہ حاصل کیا اور دوسری ۱۹۱۸ء میں درجہ دوم میں کامیاب ہوئی۔ اور بھوپال امتحانوں کے لیے سنٹر بھی بنادیا گیا۔ جس سے ہر سال کچھ نہ کچھ لڑکیاں امتحان پاس کر کے انعام حاصل کرتی تھیں۔ اور یہی پاس شدہ طالبات اکثر مدرسہ سلطانیہ اور دوسرے اسکولوں میں استانی کا کام کرنے لگیں۔ نواب سلطان جہاں کو اس مدرسے کے قائم کرنے میں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا اس مدرسے کے حوالے سے نواب سلطان جہاں بیگم نے تقریر فرمائی تھی کہ

> مجھے پہلے اس مدرسہ کے قائم کرتے وقت یہی دقتیں محسوس ہو رہی تھیں اور ابھی تک
> میری حسب مرضی تعلیم کی عام اشاعت نہ ہونے میں بھی مشکلات در پیش ہیں اگر

استانیوں کی تعلیم کا انتظام ہوتا اور عمدہ نصاب تیار کر لیا جاتا تو بڑی حد تک یہ مشکلیں رفع ہو جاتیں۔۔۔۔خواتین! تمام پیشوں میں جو عورتیں اور مرد کرتے ہیں معلمی کا پیشہ سب سے زیادہ شریف اور اعلیٰ ہے کیوں کہ اس میں انسانوں کو بہت سے انسانوں کی سیرت اور عادات واخلاق اور آئندہ زندگی درست کرنے کا موقع ملتا ہے لیکن افسوس ہے کہ استانی لفظ ہی حقیر سمجھ لیا گیا ہے اور شریف وذی رتبہ خواتین اس پیشہ کو اپنے مرتبہ اور شرافت کی توہین سمجھتی ہیں۔۔۔اور وہ عورتیں جو اپنی مدد آپ کرنے کے لیے مجبور ہیں اس پیشہ کو اختیار کر کے ہم ثواب کا مصداق ہو سکتی ہیں۔خواتین! میں سمجھتی ہوں کہ جو نصاب تعلیم عام طور سے زنانہ مدارس میں جاری ہے وہ ہماری قومی وملکی ضروریات کے لیے ناکافی ہے اور ہم کو ایک ایسا نصاب درکار ہے جو تمام ضرورتوں پر حاوی ہو لیکن یہ ملک کے قابل ترین اصحاب کا ہے افسوس ہے کہ باوجود ضرورت سمجھنے کے مسلمانوں نے اس پر مطلق توجہ نہیں کی۔اب البتہ دس سال کی کوشش کے بعد چند کتابیں تیار ہوئی ہیں جو کچھ غنیمت معلوم ہوتی ہیں۔"(۵۶)

اس مدرسے میں ٹریننگ کی بھی شاخ تھی کہ معمولی پڑھی لکھی خواتین کو مکتب و مدرسے میں ٹیچنگ کے قابل بنایا جائے۔کیونکہ معقول تعداد اور اسٹاف کی ضرورت ہر وقت موجود رہتی کہ جس وقت کوئی نیا مدرسہ کھولا جائے تو استانیوں کا انتظام کرنے میں کوئی دقت نہ ہو۔اس مدرسہ میں داخل ہونے والی لڑکیوں کے لیے خاص وظیفے مقرر فرمائے اور دو سال ضروری مضامین کی تعلیم کے لئے اور ایک برس طریقہ عملی تعلیم کے لیے رکھا گیا تھا۔اس کے ساتھ ایک بورڈنگ ہاؤس بھی بنایا گیا۔اس مدرسے میں ۱۹۲۰ء سے انگریزی زبان لازمی کر دی گئی۔اس مدرسہ کو جب ۱۹۱۱ء میں لیڈی اوڈائر(Lady Owdaerd)نے معائنہ کیا تو تحریر کردہ رپورٹ کو و۔اصاحبہ نے یوں رقم کیا کہ:

اس مدرسہ سے علیا حضرت کی گہری دلچسپی امرائے ریاست کے آئندہ نونہالوں کے لیے تعلیم یافتہ اور سلیقہ مند بیویاں مہیا کرنے میں بہت مفید ہو گی۔اور اس اسکول کے افتتاح میں علیا حضرت کی دور اندیشی اس لحاظ سے اور زیادہ قابل قدر ہے کہ ریاست ہائے ہندوستان میں اس مدرسے کی کوئی نظیر ملنی مشکل ہے۔"(۵۷)

یکم اگست ۱۹۱۸ء کو ہزا یکسیلنسی لیڈی چیمسفورڈ (Lady Chemsford) نے مدرسہ سلطانیہ کا معائنہ فرمایا تھا۔اس موقعہ پر اسکول کی عمارت بڑی خوبصورتی آراستہ کی گئی تھی۔اس کے صحن اور وسیع دالانوں کو پھول پتوں جھنڈیوں سے بڑی نفاست کے ساتھ سجایا گیا۔ بیچ میں ایک شاندار پلیٹ فارم پر نواب سلطان جہاں بیگم کی سنہری کرسی تھی۔اس کے دونوں طرف درجہ بدرجہ معزز بیگمات اور خواتین کے صوفے،اور کرسیاں لگائی گئیں اوران کے پیچھے مدرسہ کی تمام طالبات ایک جیسالباس پہنے ہوئے بیٹھی تھیں۔پلیٹ فارم کے قریب دو میزوں پر انعام کی قیمتی چیزیں آراستہ تھیں۔

مسز بخش لیڈی سپر نٹنڈنٹ نے ایک مختصر تقریری پیغام ہرایکسیلینسی کے سامنے پڑھااور پھر طالبات کی طرف سے اردو انگریزی کی نظمیں سنائی گئیں۔اس کے بعد انعامات تقسیم کیے گئے۔سب سے پہلے ایک جاگیر دار کی لڑکی کو ایک سند اور جڑاؤ پہنچیاں دی گئیں اور سب لڑکیوں کو زنانہ ضرورتوں کی کتابیں تقسیم ہوئیں۔ان کتابوں کی بہت خوبصورت سنہری جلدیں بنی ہوئی تھیں۔انعامات تقسیم کرنے کے بعد ہرایکسیلینسی نے ایک مختصر تقریر کی۔جس میں لڑکیوں کے سب کام پروگرام کے مطابق انجام دینے پر اظہار خوشی کا اظہار کیا۔اوران کا تحفہ بہت خوشی سے قبول کیا۔نواب سلطان جہاں بیگم کی تعلیم نسواں سے خصوصی دلچسپی کے حوالے سے محمد نعمان لکھتے ہیں کہ

> نواب سلطان جہاں بیگم قومی تعلیم خصوصاً تعلیم نسواں کی زبردست حامی تھیں۔انکا خیال تھا کہ لڑکیاں انسانی سماج کا ایک لازمی حصہ ہیں۔ان کی تعلیم و تربیت کے بغیر صحت مند معاشرے اور خوشحال سماج کی تشکیل ممکن نہیں ہے۔اپنے مشاہدات، تجربات اور مطالعے کی بنیاد پر بعض امور پر مردوں کو ترجیح دیتے ہوئے انہوں نے یہ کام بطور فرض انجام دیا ہے۔(۵۸)

مدرسہ طبیہ آصفیہ:

نواب سلطان جہاں بیگم نے ایک مدرسہ طبیہ آصفیہ صاحبزادی آصف جہاں بیگم مرحومہ کے نام سے موسوم کر کے جاری کیا گیا۔اوراس شاخ میں یہ بھی ترقی اور اصلاح کی گئی کہ طب یونانی کے ساتھ ساتھ سرجری (جراحی) کی بھی تعلیم دی جاتی کہ جس کی اس فن میں اب تک سخت کمی تھی۔اوراسی وجہ سے طب یونانی باوجود بہترین علاج ہونے کے ڈاکٹری کے مقابلے میں کمزور ہو رہا تھا۔

تعلیم دایہ گری:

بھوپال میں ۱۸۹۲ء میں نواب شاہجہاں بیگم نے لیڈی لینسڈون ہاسپٹل قائم کیا تھا۔ جس میں دایہ گری کی تعلیم کا بھی انتظام تھا۔ یہ ہسپتال لیڈی لینسڈون کی یاد اور عورتوں کو طبی امداد دینے لیے بنایا گیا تھا۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے اس پر بھی خاص توجہ دی۔ وہ اس امر سے بخوبی آگاہ تھیں کہ بہت سی بیماریاں ایسی ہیں جو محض خواتین کی غفلت و جہالت اور اصول تیمارداری سے ناواقفیت کا نتیجہ ہیں۔ ان ضرورتوں کو مد نظر رکھ کر نواب سلطان جہاں بیگم نے ایسے مختلف انتظامات کیے کہ عورتیں اور بچے ان تکالیف سے محفوظ رہیں۔ سب سے پہلے انہوں نے ایک نرسنگ سکول کا اضافہ کیا کیونکہ ان کے خیال میں دراصل نرسنگ ہی تعلیم صحت انسانی کی کفیل ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ اپنی کتاب "اختر اقبال" میں فرماتی ہیں کہ

> مریضوں کے لیے جس طرح قابل طبیب وڈاکٹر اور بہتر ادویات کی ضرورت ہے اسی طرح باقاعدہ اور عمدہ تیمارداری ضروری چیز ہے لیکن ہندوستان میں اس ضروری چیز پر کم توجہ ہوتی ہے۔ میں نے جہاں تک غور کیا ہے اس کی وجہ طریقہ تیمارداری سے عدم واقفیت ہے۔ تیمارداری کو یورپ نے بجائے ایک مستقل فن بنادیا ہے۔ جس کو باقاعدہ طور پر عورتیں حاصل کرتی ہیں۔۔۔۔ لیکن ہندوستان میں یہ قابلیت مفقود ہے۔ یہاں نہ نرسنگ اسکول ہیں نہ عورتوں کی تعلیم اس درجہ اور ترقی پر ہے کہ وہ بطور خود واقفیت پیدا کرلیں اس لیے تیمارداری کی آخری خرابی کا نام موت ہے۔(۵۹)

دایہ گری کی تعلیم کو ترقی دے کر نرسنگ اسکول جاری کیا۔ اسی سکول میں دائیوں کی تعلیم کا انتظام کیا اور ایک حصہ وکٹوریہ میموریل اسکالرشپ کلاس کے نام سے قائم کیا گیا۔ اس حوالے سے ابتدا میں بہت مشکلات پیش آئیں کیونکہ ولادت تو روز ہی ہوتی تھی۔ اس لیے تجربہ کار نرسوں کی ضرورت تھی اور نرسنگ کی تعلیم کے لیے کم از کم ایک سال درکار تھا۔ لہذا طے یہ پایا کہ وہ دائیاں جو موروثی طور پر اس شعبے کے ساتھ منسلک تھیں روزانہ لیڈی ڈاکٹر کے پاس جاکر زبانی تعلیم حاصل کریں اور اپنی لڑکیوں کو ابتدا سے کلاس میں داخل کروائیں۔ اس میں طالبات کو وظائف دیئے جاتے تھے۔ یوں پانچ سال کے عرصہ میں پیشہ ور دائیوں نے تعلیم حاصل کی اور پھر یہ سلسلہ قائم ہو گیا۔ یہ طریقہ کار نہ صرف شہر کے لیے کیا گیا بلکہ دیہاتوں سے بھی پیشہ ور دائیوں کو بلا کر داخل کیا گیا۔ تعلیم کے بعد دائیوں کو سند بھی دی جانے لگی اور غیر سند یافتہ دائیوں کو کام کرنے کی قطعی ممانعت کر دی گئی۔ اس طرح تھوڑے عرصہ میں دائیوں

نے اچھی خاصی تعلیم حاصل کر لی جن کو ماہانہ وظائف بھی دیئے گئے۔اس موقع پر نواب سلطان جہاں بیگم کی تقریر کے چند جملے نقل کرتی ہوں۔جو نواب سلطان جہاں بیگم نے ایک مرتبہ جلسہ تقسیم اسناد کے وقت فرمائی تھی۔

> جو تعداد کہ شہر کی پیشہ وارانہ کاردائیوں کی کامیاب ہو کر نکلی ہے اس سے یقیناً باشندگان شہر کی ضرورتیں پوری ہوں گی۔۔۔لیکن مفصلات کے لیے ابھی بہت بڑی تعداد میں دائیوں کی ضرورت ہے۔اوران دائیوں کو جنہوں نے کوئی سند حاصل نہ کی ہو،اپنا پیشہ کرنے کی ممانعت کر دی۔۔۔مجھ کو اس وقت دایہ کے کاموں کی طرف سے اور مفصلات کی عورتوں کی جانب سے اطمینان کامل ہوگا۔جبکہ یہ معلوم ہوگا کہ مفصلات کی دائیوں کے کلاس مکمل ہو گئے۔۔(۶۰)

دائیوں کے امتحان میں ریاست بھوپال کی لیڈی ڈاکٹر کے علاوہ ایجنسی سرجن کو بھی شریک کیا گیا۔ہر ضلع میں اور ہر بڑے مقام میں لیڈی ڈاکٹروں کا انتظام ہوا جو عام حفظان صحت علاج معالجہ اور دوائیوں کی نگران تھیں۔دائیوں کے انتظام سے جس قدر فائدہ عورتوں کو ہوا اس کا اندازہ وہی کر سکتی ہیں۔لیکن مردوں نے بھی انتشار سے بھی نجات حاصل کیا جو جاہل دائیوں کے باعث ہر گھر میں پیدا ہوتا تھا۔بقول نواب سلطان جہاں بیگم

> مستورات ہند کو فی الواقع جاہل دائیوں کے ہاتھ سے کچھ بھی کم نقصان نہیں پہنچتا اکثر مہلک امراض تھوڑی سی بے احتیاطی سے پیدا ہو جاتے ہیں اور پھر تمام عمران کا ازالہ مشکل ہوتا ہے عموماً ولادت کے وقت اور نسائی امراض کے معالجہ میں ہوشیار دائیوں کی سخت ضرورت رہتی ہے۔(۶۱)

علاوہ ازیں پھر اسی سلسلہ میں غریب بچوں اور ان کی صحت کی نگرانی کے لیے ۱۹۱۲ء میں انفینٹ ہوم (دارالاطفال) بھی قائم کیا۔یہ خواتین کے ہسپتال کا ہی ایک سلسلہ تھا۔لیڈی ہارڈنگ(Lady Harding)نے اس کا سنگ بنیاد رکھا اور وہ ان ہی کی یادگار میں بنایا گیا تھا۔

۱۹۱۷ء میں نواب سلطان جہاں بیگم نے اسے اور ترقی دے کر سینٹ جانسن ایمبولنس کا نصاب جاری فرمایا۔اور پرنس آف ویلز لیڈیز کلب میں بھی اس کلاس کا بندوبست منظور فرما کر لیڈی ڈاکٹر بسم اللہ خانم صاحبہ سب اسسٹنٹ سرجن سپرنٹنڈنٹ زنانہ شفاخانہ آصفیہ کو نواب سلطان جہاں بیگم نے لیکچرار مقرر فرمایا۔چنانچہ ان کی رپورٹ کی بابت ۲۴ فروری ۱۹۲۸ء کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔کہ اس دس سال کے عرصے میں ۴۷ طالبان دایہ

گری و نرسنگ کے امتحانات میں کامیاب ہو چکی تھیں۔اور ۱۲ کا مزید اندراج کیا گیا۔ان کامیاب شدہ طالبات کو ۱۹۲۷ کو تقریب میں سرکار بھوپال اور گورنمنٹ آف انڈیا سے سونے کے تمغے عطا کیے گئے۔

مذہبی تعلیم:

نواب سلطان جہاں بیگم تعلیم کے میدان میں مذہبی تعلیم کی بہت زیادہ خواہشمند تھیں۔ان کے نزدیک مذہبی تعلیم کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوگا کیونکہ یہ تعلیم دین ودنیا دونوں میں نجات کا ذریعہ ہے۔مذہبی تعلیم کی بنیاد پر عورتوں کی عزت، ترقی اور نجات کا یقین دلاتی تھیں۔ان کے نزدیک انگریزی تعلیم بھی ضروری ہے۔لیکن تعلیم کا طریقہ کار مادری زبان یعنی اردو ہونی چاہیے۔جیسا کہ انہوں نے کہا کہ

> اے عزیز لڑکیوں! تم کو یاد رکھنا چاہیے کہ یہ تعلیم سب نکمی ہوگی اگر تم اپنے مذہب کی تعلیم اور اس پر عمل سے بے پروائی کرو گی، مذہبی احکام کی پابندی وہ چیز ہے جس پر تمہاری عزت، تمہاری حرمت، تمہاری ترقی اور آخر کار تمہاری نجات کا انحصار ہے۔(۶۲)

مندرجہ بالا اقتباس کو اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تعلیم جو مادری زبان میں نہ ہو ہرگز مفید نہیں، ہر ملک اور ہر جگہ کی تعلیم کی ترقی، اور تعلیم کا اصلی فائدہ صرف مادری زبان میں تعلیم سے حاصل ہوتا ہے۔

برجیسیہ کنیا پاٹ شالا:

یہ مدرسہ نواب سلطان جہاں بیگم نے خاص ہندو لڑکیوں کے لئے قائم کیا تھا۔ہندی، انگریزی اور حساب کی تعلیم دی جاتی تھی۔اور جن وجوہ سے یہ ایک قوم کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔وہ سلطان جہاں بیگم کے الفاظ میں حسب ذیل ہیں جن سے اسی مادرانہ شفقت کا اظہار ہوتا ہے جو بلا مذہب و تفریق اپنی رعایا پر فرماتی تھیں بقول و۔اصاحبہ

> ہندو لڑکیوں کے لیے جداگانہ مدرسہ قائم کرنے کی مجھے ایک عرصہ سے فکر تھی۔کیونکہ میں اپنی رعایا کو بلا امتیاز مذہب عزیز رکھتی ہوں۔اور کسی فرمانروا کو زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنی رعایا کے مابین مذہبی رواداری یا امتیاز کو جہاں تک ترقی و اصلاح اور انصاف و امن کا واسطہ ہے۔جائز رکھے بلکہ ہر صورت میں مساوات قائم رکھنا چاہیے۔اس لئے جس طرح مسلمان لڑکیوں کی تعلیم میں مجھے شغف ہے۔اسی طرح ہندو لڑکیوں کی تعلیم بھی میرا نصب العین ہے۔اور اگر میں خاص مذہبی ضرورتوں سے مجبور نہ ہوتی۔تو کبھی جداگانہ مدرسہ قائم نہ کرتی۔اگرچہ تعلیم دونوں کے لیے ایک ہی پیمانے اور طریقے پر ہے۔مگر چونکہ ابتدائی درجوں میں مذہبی تعلیم

> کا حصہ زیادہ ہے۔ پس لامحالہ دونوں کو ملا کر مذہبی تعلیم نہیں دی جاسکتی۔ لہذا میں اس سال برجیس جہاں بیگم کے عزیز نام سے موسوم کر کے ہندو لڑکیوں کے لئے ایک پاٹ شالا قائم کیا۔(۶۳)

علاوہ ازیں پھر ہندؤوں کے قومی مدرسہ "شوتامبر پاٹ شالا" کی غریب لڑکیوں اور لڑکوں کے لئے سالانہ وظائف کے لیے مقرر کیے گئے۔ اس وقت ہندوستان میں جہاں کہیں بھی ہندو لڑکیوں کے مدرسے، پاٹ شالے اور یتیم خانے عمدہ طریقے سے چل رہے تھے۔ ان کا جائزہ لینے سے یہ صورتحال واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی عورتوں نے ہمت کا مظاہرہ کیا، بعض نے اپنی زندگیاں ان اداروں کی کامیابی کے لیے وقف کر دیں اور نواب سلطان جہاں بیگم ان کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہتیں ہیں کہ

> ان کے حالات جہاں تک میں نے دیکھے ہیں یہی معلوم ہوا کہ عورتوں کی ہمت، لیاقت اور کوشش نے ان کو قائم کیا اور ترقی دی ہے۔ اکثر عورتوں نے تو اپنی زندگیاں وقف کر دی ہیں۔ یہ آپ کی بہنوں کی زندہ مثالیں ہیں اور مجھے امید ہے کہ بھوپال کی ہندو عورتیں بھی نیکی کے ان کاموں میں ہمت اور کوشش کریں گی۔ میں ایسی پرائیوٹ اور قومی پاٹ شالاوں کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھتی ہوں کیونکہ یہ اپنی قوم کی ہمدردی کا ایک ثبوت ہوتا ہے۔(۶۴)

نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنے ۲۶ سالہ دور حکومت میں مختلف النوع علمی، اصلاحی وادبی خدمات سرانجام دیں۔ تعلیمی امور خصوصاً تعلیم نسواں کے فروغ کے سلسلے میں مشن کے طور پر جو تاریخ ساز کوششیں کی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم سیکولر ذہن کی مالک خاتون تھیں انہوں نے ہندو لڑکیوں کی تعلیم کے لیے جو علیحدہ سے اسکول کھولا۔ اس کے مقاصد کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ بقول محمد نعمان

> اس سال (۱۹۰۸) میں ہندو لڑکیوں کے مفاد کے پیش نظر خاص سکول کھولا جن کا استحقاق میرے نزدیک ایسا ہی تھا جیسا ان کی مسلمان بہنوں کا، ہندووں کی مذہبی ضروریات مسلمانوں کی مذہبی ضروریات سے کلی طور پر مختلف ہیں اور مذہب سے بے بہرہ تعلیم میری نظروں میں بے وقعت چیز ہے۔(۶۵)

مدرسہ سکندری:

یہ مدرسہ نواب سکندر جہاں بیگم کے نام سے منسوب ہے اوراس کی عمارت قصر سلطانی کے احاطہ میں زنانہ محل کے قریب واقع تھا۔میدان بہت کشادہ اور سرسبز و شاداب پودوں سے خوشنما لگتا تھا۔اس میں صرف شاہی خاندانوں کی یا کسی مخصوص متوسل ریاست کی لڑکیاں قرآن مجید اردو انگریزی اور دستکاری کی تعلیم پاتی تھیں۔ان کے لئے مدرسے کے بورڈنگ ہاؤس میں رہنا لازمی تھا۔بقول و۔اصاحبہ

> معلمات میں ہندوستانی خواتین کے ساتھ ساتھ یورپین خواتین بھی شامل رہیں۔اس مدرسے میں خوشنویسی خاص طور پر سکھائی جاتی رہی ہے۔ایسے مدرسے جہاں قرآن مجید پڑھایا جاتا رہا وہاں ریاست سے منتخب مفتی صاحب مع دو یا ایک عالموں کے امتحان لیا کرتے تھے۔(٦٦)

مدرسہ اسلامیہ حمیدیہ:

نواب سلطان جہاں بیگم کو جہاں اپنی قوم اور بالخصوص اپنی صنف کی ترقی کا خیال تھا،اس کے ساتھ ہی انہیں اخروی فلاح و کامرانی کی بھی فکر تھی۔نواب سلطان جہاں بیگم بذات خود دینی و مذہبی امور کی پابند تھیں وہیں انہوں نے اپنی ریاست کی خواتین میں اس پابندی کی کمی کو شدت کے ساتھ محسوس کیا۔وہ مذہبی تربیت جو مسلمان خاندان کا ایک لازمی جوہر ہے اس کو یوں رائیگاں ہوتا دیکھ کر انہیں بہت مایوسی ہوئی۔اسی تناظر میں نواب سلطان جہاں بیگم نے دینی تعلیم جو مذہب کا تقاضا ہے لازمی قرار دی۔اور خواتین کے مدرسوں میں قرآن مجید کا ترجمہ نصاب میں شامل کروا دیا۔اگر بغور نظر دیکھا جائے تو اس تعلیم کو صرف شہروں تک محدود رکھا گیا،وسعت نظر نہیں آتی ہے۔

مذہبی تعلیم جو کہ لازم و ملزوم ہے اس کی محدودیت کی نواب سلطان جہاں بیگم کو بہت فکر تھی۔اس لیے انہوں نے بطور مثال ایک ایسے مدرسے کے بارے میں سوچا جہاں سے تمام اہلیان بھوپال مستفید ہو سکیں۔اس سلسلے میں پہلی دشواری یہ پیش آئی کہ بہت کوشش کے باوجود چند خواتین استانیاں بھی نہ مل سکیں جو عورتوں کو مذہبی تعلیم دیں اور نہ ہی ایسی کتابیں دستیاب ہوئیں جو بطور کورس پڑھائی جاسکتیں تھیں۔بالاخر یہ طے پایا کہ ناگزیر اسباب کے باوجود مدرسے کا قیام عمل میں لایا جائے۔اور جو کتابیں بھی اس وقت میسر آئیں ان سے تعلیمی سلسلہ شروع کیا جائے۔یہ مدرسہ خاص طور پر مسلمان لڑکیوں کی دینی تعلیم کے لیے ۵ فروری ۱۹۲۷ء کے مطابق محل میں قائم کیا گیا

تھااور اس کاافتتاح ہر ہائنس شاہ بانو بیگم صاحبہ نے کیا۔اس مدرسے کے عظیم الشان مقاصد اس تقریر سے ہی واضح ہو جاتے ہیں۔جو افتتاح کے وقت کی گئی تھی بقول و۔اصاحبہ

> خواتین! جو کوششیں کہ اس وقت تک عمل میں آئی ہیں خدا کا شکر ہے کہ وہ اس حد تک ضرور کامیاب ہوئی ہیں۔کہ جن کے لئے کوششیں کی گئی تھیں۔انہوں نے اپنی حالت کا احساس کیا۔۔۔آج ہندوستان میں کہیں اور کسی جگہ پر عورتوں کی مذہبی تعلیم پر توجہ نہیں کی جاتی اگرچہ علماء و فقرا اور صوفیا کے بڑے بڑے گھرانے موجود ہیں مگر وہاں بھی یہی بے پروائی نظر آتی ہے۔۔۔ہمیشہ عورتوں نے ہر موقع اور ہر حیثیت سے اسلام کی عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں، بہت سی خواتین گزری ہیں جن کے درس میں علاوہ عورتوں کے بڑے بڑے ممتاز عالم شریک ہوتے تھے۔اور بعض خاص طور پر بلا معاوضہ اور نفع کے عورتوں کو پڑھایا کرتی تھیں۔۔۔جب سے مسلمانوں کا دور تنزل شروع ہوا ہے انہوں نے اسلامی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا۔ مسلمان عورتوں کے مقام و مرتبے میں فرق آنا شروع ہوا۔۔۔اور علوم کو چھوڑ کر صرف مذہب کو ہی لیجیے۔یہاں علمی چرچے پر بھی عورتوں کی دنیاوی اور دینی تعلیم سے اس قدر غفلت برتی گئی کہ میں کہوں گی کہ ان کو جان بوجھ کر علم سے محروم کیا گیا ہے کہ آج ہم کو تفسیر و حدیث سے واقف بیبیاں انگلیوں پر شمار کی تعداد میں نہیں مل سکتیں۔ہاں دنیاوی تعلیم میں اب زمانہ کی زبردستی سے کچھ کوشش شروع ہوئی ہے۔۔۔۔شاید انہیں کی تربیت سے کچھ تو اولاد پابند مذہب ہوتی۔وہ مذہب کی محافظ بن جاتیں۔کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ہماری صنف ایسی ضروری تعلیم سے بھی اس قدر بے بہرہ ہو کہ کروڑوں کی آبادی میں چند افراد بھی نظر نہ آئیں۔اس لیے مدرسہ حمیدیہ یہ چوں قطرہ در دریا اس بڑے نقصان کو کسی نہ کسی حد تک تو ضرور پورا کرے گا۔۔۔ہماری خواتین مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مختلف طریقوں سے اس کی اشاعت میں کوشش کرینگی ، اور زیادہ تر مذہبی معلمات کے فرائض سرانجام دیں گی۔۔۔(٦٧)

مندرجہ بالا اقتباس کو اگر بغور دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی قوم کے تمدن اور معاشرت کی ترقی اسی وقت ممکن ہوتی ہے کہ جب مردوں کے ساتھ عورتیں بھی شریک ہوں۔لیکن جب مسلمانوں کا دور تنزل شروع ہوا انہوں نے اسلامی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ مسلمان عورتوں کے مرتبے اور وقار میں بھی فرق آنا شروع

ہوا۔اگرچہ ابتدائی انتظامات میں ضرور دقتیں پیش آئیں مگر نواب سلطان جہاں بیگم نے صبر سے کام لے کر ادارے کی ترقی کے لیے جدوجہد کی گئی۔ابتداً تعلیم کے لئے زریعہ تعلیم اردو زبان تھی بعد ازاں فارسی اور عربی کو فروغ دیا گیا۔اس مدرسے کے افتتاح کے دن چالیس لڑکیاں داخل کی گئی تھیں۔چھ ماہ بعد ان کی تعداد ۱۲۵ ہو گئی۔بھوپال کی مشہور عمارت ہوا محل کی بالائی منزل جہاں یہ مدرسہ قائم کیا گیا،اپنی شان و شوکت سے دیکھنے والوں کا دل لبھار ہی تھی۔نواب سلطان جہاں بیگم نے علم دین کو حاصل کرنے کو سب پر ترجیح دی۔ان کے اس حوالے سے حسرت آمیز کلمات کو محمد امین زبیری نے یوں قلمبند کیا ہے"کاش اس وقت ہماری قوم میں کوئی محدث، مفسر،عالم،فقیہہ خاتون ہوتیں کہ وہ اس مبارک تعلیم کا آغاز کرتیں۔"(۶۸)

سلطان جہاں بیگم اس فکر و خیال کے سخت خلاف تھیں کہ تعلیم صرف ملازمت حاصل کرنے کے لئے لی جائے وہ اس کو ناسمجھی پر محمول کرتی تھیں۔ان کا نظریہ تھا کہ جس طرح انسان کو ہوا اور پانی کی ضرورت ہے ایسے ہی تعلیم بھی لازمی ہے،عورتیں قوم کے جسم میں روح کی طرح ہیں اور قومی تنزل میں عورتوں کی جہالت کا بڑا حصہ ہے۔

> ان کا عقیدہ ہے کہ تعلیم حاصل کر کے عورتیں نہایت عظیم الشان کارنامے انجام دے سکتی ہیں۔ہماری قومی تاریخ ہم کو جتارہی ہے کہ مسلمان عورتوں نے اسلام اور شعائر اسلام کی پابند رہ کر دنیا میں کیسے کیسے کارہائے نمایاں کئے ہیں۔کیسے کیسے علوم وفنون میں دستگاہ حاصل کی، ان کی تربیت و تعلیم نے کیسے کیسے اولوالعزم اور مشہور اشخاص پیدا کئے۔(۶۹)

وہ بھوپال میں اپنے قائم کئے ہوئے اسکولوں کو نمونے کے اسکول بنانا چاہتی تھیں۔ان کا خیال تھا کہ اس نمونے کے اسکول قائم کرنے کے لئے بھوپال نہایت موزوں ہیں۔انہوں نے یہ اسکول بطور نمونہ قائم کیا اس لئے یہاں کی ہر طالب علم کو اپنے ہم جنسوں کے سامنے بطور مثال پیش کیا تاکہ تعلیم نسواں کی تحریک عام ہو جائے اور تعلیم مدرسہ کے متعلق جو لوگ اعتراضات کرتے ہیں وہ ان کے لئے ایک مجسم جواب ہوں۔یہ ادارہ بہت سی نظروں کا مرکز بنا ہوا تھا کیونکہ ہندوستان میں بھوپال ہی بحیثیت عورت کے فرمانرواہونے کے ایک ایسا مقام تھا جہاں عورتوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ہر قسم کے وسائل مہیا ہونے امکانات موجود رہے اور جہاں کے نتائج سے ہر جگہ سے ایک پر جوش تحریک کے پیدا ہونے کی توقع تھی۔

مدرسہ صنعت وحرفت اناث:

نواب سلطان جہاں بیگم تعلیم کی زبردست حامی تھیں۔انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد قوم کی بہبودی اور صنف اناث میں تعلیمی بیداری وشوق کو قرار دیا تھا۔انہوں نے اپنی تقاریر اور تصانیف میں اس کا بار بار اعادہ کیا تھا۔ان کی کوشش یہ تھی کہ ایک اچھا نصاب تعلیم تیار ہو کر رائج ہو جو لڑکوں اور لڑکیوں کی ذہنی نشوونما اور ان کی معیشت و معاشرت میں ممدو معاون بن سکے۔اس سلسلہ میں وہ ہر طرح کی امداد کرنے کو تیار رہتی تھیں۔اپنی کتاب "تندرستی" میں لکھتی ہیں کہ

> میں اپنے ملک اور اپنی قوم میں تعلیم نسواں کی بدل وجان حامی ہوں اور میری عین تمنا و آرزو یہ ہے کہ میں عورتوں کو اس تعلیم سے بہرہ ور دیکھوں جو ان کے لئے سخت ضروری ہے اس لئے رسالے کو طبع کرا کر شائع کرتی ہوں۔۔۔۔ہر تعلیم خواہ لڑکوں کی ہو یا لڑکیوں کی مذہب و اخلاق کی تعلیم سب سے زیادہ ضروری ہے۔مگر یہ تعلیم وہ ہے کہ جس کا انتظام ہر ایک قوم خود ہی کر سکتی ہے،اور میں نے جہاں تک غور کیا ہے ایسا انتظام کچھ مشکل بھی نہیں ہے۔(۷۰)

نواب سلطان جہاں بیگم نے خواتین کے لیے ایک صنعتی مدرسہ بھی بنایا جس میں دستکاری کے سلسلے میں نقاشی،مصوری چینی و جاپانی نقش نگار،چمڑے کے کام،صابن وعطر سازی وغیرہ کا کام شروع کیا گیا تھا۔سائنٹفک طریقہ سے اچار،چٹنیاں،مٹھائی بنانے کے لئے ایک خاص شعبہ کھولا گیا۔اس مدرسہ کے قیام اور اس کے اغراض و مقاصد کے حوالے نواب سلطان جہاں نے کچھ اس طرح اظہار خیال کیا ہے۔

> وہ جاہل اور بے ہنر عورتیں جو وارث اور والی نہ ہونے سے اپنے اور اپنے بچوں کے گزارہ کے لئے محتاج ہو کر اپنی زندگی بے انتہا مصیبتوں میں بسر کرتی ہیں۔۔۔۔بھوپال میں اس قسم کی عورتوں کی کمی نہ تھی لیکن ان پر وہ صعوبتیں نہ تھیں جو عام طور پر دوسری جگہوں پر پائی جاتی ہیں اور اس کی وجہ صرف زنانہ حکومت کی فیاضی اور رحمدلی تھی مگر فقر و فاقہ کو کسی فیاض کی فیاضی نہیں روک سکتی اور نہ داد و دہش۔۔۔کیونکہ اس قسم کی فیاضی اور داد و دہش سے لوگ اپنے آپ کو خود نکما اور اپاہج بنا لیتے ہیں میں نے اپنی ریاست میں ایک بڑا گروہ اس قسم کی عورتوں کا پایا ہے مجھے سخت ضرورت محسوس ہوئی کہ میں اصلاحات کے ساتھ اس طبقہ کی بھی اصلاح کروں۔۔۔میں نے بھوپال کی ایسی عورتوں کے لیے ایک ایسا مدرسہ جس میں

ضروریات زورمرہ میں کام آنے والی چیزوں کی صنعتی تعلیم دی جائے تاکہ وہ صنعت و حرفت سیکھ کر کچھ نہ کچھ اپنی مدد کر سکیں۔(۷۱)

مدرسے کے قیام کے کچھ ہی عرصہ بعد مدرسہ کو مزید وسعت دی گئی یوں مختلف مدارس کے طالبات کے لیے حفظان صحت، بچوں کی خبر گیری، خانگی تیمارداری، تندرستی، گرل گائیڈ، اور ایمبولنس کا اضافہ ہوا۔اس سکیم کو مزید وسعت دینے کا خیال اس وقت سے تھا جب نواب سلطان جہاں بیگم لندن دورے پر گئی تھیں۔ان مدارس نے کافی طور پر ترقی کی تھی۔طالبات کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔دستکاری میں اس ادارے نے مختلف نمائشوں میں تمغے اور سندیں حاصل کیں۔خواتین کے لیے فینسی بازاروں کا قیام عمل میں لایا گیا۔جہاں طالبات کی دستکاری کی اشیاء رکھی گئیں جو بہت مقبول ہوئیں اور مہنگے داموں فروخت ہوئیں۔

ذریعہ تعلیم انگریزی یا مادری زبان:

اگر بغور نظر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم اگر مادری زبان میں نہ ہو تو وہ ہرگز مفید نہیں ہوتی ہے۔ہر ملک اور ہر جگہ شعبہ تعلیم کی ترقی اور تعلیم کا اصلی فائدہ صرف مادری زبان سے حاصل ہوتا ہے۔لیکن انہوں نے تمام لڑکیوں اور ان کے والدین کو اس امر پر ضرور توجہ دلائی کہ انگریزی زبان کی تحصیل سے قطعاً بے پروائی نہ برتی جائے۔نواب سلطان جہاں بیگم کا مقصد صرف یہ تھا کہ لڑکیاں اس قدر انگریزی زبان دانی سے ضرور واقف ہو جائیں کہ وہ ان مفید کتابوں کا جن کا بدل اردو میں نہیں ہے مطالعہ کر سکیں۔بقول ڈاکٹر رضیہ حامد

> نواب سلطان جہاں بیگم اس بات کی قائل تھیں کہ تعلیم مادری زبان میں جاری کی جائے اور اگر ضرورت ہو تو ترقی یافتہ زبانوں سے کتابوں کا ترجمہ کروا کر رائج کیا جائے۔وہ اس بات پر زور دیتی تھیں کہ تعلیم دینے کے لئے اچھی ذہین اور تجربہ کار استادوں کا ہونا ضروری ہے۔مادری زبان میں تعلیم دینے پر بہت زور دیا۔(۷۲)

ان کا نظریہ تھا کہ غیر زبان میں باقاعدہ تعلیم مشکل کام ہے۔اسی طرح قابل استانیوں کی تعداد بھی کمیاب تھی۔جب تک اچھی کتابوں کے ساتھ اچھی پڑھانے والی خواتین نہ ہوں تب تک لڑکیوں کی تعلیم کا کام تشنگی کا شکار رہے گا۔اس کام کی تکمیل کے لیے انہوں نے فن تعلیمات اور اخلاق پر کتابوں کا ترجمہ شروع کرا دیا۔اس دور کی موجودہ ضرورت، مناسبت اور تہذیب و اخلاق نسوانی کا لحاظ رکھ کر ایک نصابی خاکہ تیار کیا جو صوبہ جات ہند کے ڈائریکٹروں کے پاس رائے طلب کے لئے بھیج دیا گیا تھا۔اس طرح انگریزی تعلیم کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے نواب

سلطان جہاں بیگم نے بار بار کہا کرتی تھیں کہ اگر لڑکوں کے لئے انگریزی اعلی نصاب میں داخل نہ کی جاتی تو ہمارے ملک کے آفتاب علم پر بہت سا گرد و غبار چھایا رہتا۔ان جذبات کا اظہار کچھ اس طرح سے ایک مقام پر یوں کیا ہے کہ

> حضرات! میں دعوے سے کہتی ہوں کہ جب ہندوستان میں تعلیم اناث کی زیادہ ترقی ہو گی اور ابتدائی مراحل طے ہو جائیں گے تو لڑکیوں کے اعلی نصاب میں انگریزی نہایت ضروری تصور کی جائے گی اور انگریزی کو داخل نصاب کئے بغیر اعلی تعلیم کے مدارج میں ہرگز کام نہ چل سکے گا۔(۴۳)

آج سے ڈیڑھ سو سال قبل جس وقت نواب سلطان جہاں بیگم نے تعلیم نسواں کی تحریک شروع کی تھی اس وقت کو ان بے شمار اور انتہائی اہم مسائل در پیش تھے جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ نصاب تعلیم اور اس کی پابندی

۲۔ قابل استانیوں کا انتظام

۳۔ طریقہ تربیت کا تعین

۴۔ ذریعہ تعلیم

۵۔ انگریزی زبان کی اہمیت اور اسے نصاب میں داخل کرنا

۶۔ پردہ اور اس سے متعلق ضروری انتظامات

۷۔ لڑکیوں کے لیے ہوسٹل کا انتظام

۸۔ غریب لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے رقم کی فراہمی

۹۔ دینی تعلیم کو نصاب میں داخل کرنا اور ان کا مناسب انتظام

۱۰۔ انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب کا بڑھتا ہوا رجحان اور اس کے اثرات سے مقابلہ

۱۱۔ دقیانوسی خیالات، غیر اسلامی رسوم، محدود وسائل کا بے جا استعمال، مغرب سے آنے والے خیالات اور فلاسفی پر بے روک ٹوک عمل در آمد، دینی و بنیادی اصولوں سے انحراف اور غیر ضروری امور میں مشغول و مصروف رہنا۔

۱۲۔ صنعت و حرفت، دستکاری اور ہنر کے حصول کی طرف سے بے توجہی

۱۳۔ انگریزی اور دیگر زبانوں کی اچھی کتابوں کے تراجم کی ضرورت

۱۴۔ جاگیردارانہ نظام کی کمزوریاں بالخصوص تعلیم سے دوری

نواب سلطان جہاں بیگم کی ان تمام مسائل پر ان کی نظر تھی اور متذکرہ بالا تمام مسائل کے ازالے کے لئے فکر مند بھی رہتی تھیں اور سب کو اس طرف توجہ بھی دلاتی رہتی تھیں۔ تعلیم نسواں کے مسئلے پر انہوں نے تشویش کا مظاہرہ کیا کہ سب سے پہلے ابتدائی اور بنیادی تعلیم کا انتظام کا ہونا ضروری ہے اور اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کی جانب توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے تعلیم نسواں کی ضرورت و اہمیت اور اس مسئلے کی سنگینی کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ

> جس قدر آپ کے زنانہ درس گاہوں کی تعلیم پر قوم کو زیادہ اعتماد ہوتا جائے گا۔ اسی قدر زیادہ تلامذہ زنانہ مدارس میں داخل ہوں گی اور پھر خود بخود اعلیٰ تعلیم کا مسئلہ بھی پیدا ہو جائے گا۔ نواب سلطان جہاں بیگم کو علی گڑھ کے ٹرسٹیوں پر بہت اعتماد تھا۔ شیخ عبداللہ صاحب اور ان کی اہلیہ صاحبہ کی قابل قدر کوششیں ان کے سامنے تھیں اور کہا کرتیں تھیں کہ ہماری تعلیم یافتہ خواتین جن کا قیام علی گڑھ میں ہے یا جو اس کو اپنی قومی ترقی گاہ سمجھتی ہیں، دلچسپی کا ثبوت دیں گی۔ (۷۴)

نواب سلطان جہاں بیگم کی شدید خواہش تھی کہ قوم کا کردار فروغ تعلیم نسواں کے حوالے سے عملی صورت میں نظر آنا چاہیے۔ تعلیم نسواں کے مقصد کے تحت نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنی قوم کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ اول حصہ ان امراء کا نظر آتا ہے جنہوں نے خواتین اتالیق کے ذریعہ اپنی لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام کیا اور دوسرا حصہ اس طبقے کا ہے جو اپنی لڑکیوں کو زنانہ مدرسوں میں بھیجتے تھے۔ تیسرا حصہ ان لوگوں کا ہے جو زنانہ مدارس کی تعلیم پر اس وقت تک مکمل اعتماد نہ کر پائے تھے اور جو استانیوں کے ذریعہ سے ہی اپنی بیٹیوں کو تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ نواب سلطان جہاں بیگم کو قوم کے پہلے حصے سے اس وقت بحث نہیں تھی اور جس قدر ہم غور کریں اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ اس وقت ہندوستان میں زنانہ مدارس و بورڈنگ ہاؤسیز کی تعداد زیادہ ہونی چاہیے کیونکہ استانیوں کا بھی بغیر عمدہ زنانہ مدرسوں اور بورڈنگ کے انتظام کے تیار ہونا ناممکن تھا۔ اس لیے خواہ طبقہ دوم ہو یا طبقہ سوم نواب سلطان جہاں بیگم کی رائے میں تعلیمی ضرورت مدرسوں ہی سے پوری ہو سکتی تھی۔ تعلیم چاہے لڑکوں کی ہو یا لڑکیوں کی وہی استاد بہترین نتائج پر پہنچ سکتا ہے۔ جو اپنے طلبا و طالبات میں تعلیم کے لیے دلچسپی کا سامان پیدا کرے گا۔

مسلمان لڑکیوں کی ضروریات سے متعلق بھی نواب سلطان جہاں بیگم کو فکر تھی کہان کے لیے پردے کے انتظام سے آراستہ مدرسوں اور بورڈنگ ہاؤسیز فراہم کیے جائیں۔صرف اچھے اساتذہ کی امید لیے رکھنا اور عملی اقدامات کچھ نہ کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے جدوجہد کرنی پڑے گی۔(۷۵)

آل انڈیا پرنسس آف ویلز کلب:

نواب سلطان جہاں بیگم کا ایک اور شاندار کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے خواتین کی فکری،ذہنی اور تہذیبی ترقی کے لیے آل انڈیا ایسوسی ایشن اور پرنسس آف لیڈیز کلب قائم کیے۔یہ حقیقت ہے کہ انسان کی شخصیت پر اس کے معاشرے کے اثرات ہمہ وقت مرتب ہوتے ہیں۔جتنا اچھا معاشرہ یا سوسائٹی ہوگی اسی قدر سوچ و فکر میں وسعت خیالی پیدا ہونے کے امکانات ہوتے ہیں اور یہی مثبت معاشرے کی پیداوار ہے۔نواب سلطان جہاں بیگم کے عہد میں انگلستان میں ایسی بہت سی سوسائٹیز اور کلب بنائے گے جن سے یورپین خواتین کی شخصیات میں نکھار پیدا ہوا اور اس سے گراں قدر فوائد سامنے آئے۔نواب سلطان جہاں بیگم خواتین کی تربیت کے حوالے سے انگلستان کے اس عملی قدم سے بہت متاثر ہوئیں لہذا ہندوستان میں بھی اسی قسم کے کلب اور ایسوسی ایشن کے قائم کرنے کی حامی نظر آتی ہیں۔

بدقسمتی سے عورتیں چونکہ تعلیم سے بہرہ ہین اس لئے سوسائٹی کے فوائد سے بھی محروم ہین۔مین نے سوسائٹی نہ ہونے کا نقصان یوں اور بھی محسوس کیا کہ عموماً جاہل اور لکھی پڑہی عورتیں یکسان فضول مراسم اور لغورواجات کی گرویدہ ہیں،اور اون کی نسلوں پر بطور ورثہ کے اوس کا خراب نتیجہ مرتب ہو رہاہے۔۔۔۔بہر حال میرا نصب العین یہی تھا کہ بھوپال مین عورتوں کی ایک سوسائٹی قائم ضرور ہو کیونکہ نہ بھوپال مین بلکہ جہان تک مجھے معلوم ہوا ہندوستان بھر مین پردہ نشین مستورات کی کوئی سوسائٹی نہین ہے اس لیے میں ادارہ کیا کہا پنے خاندان اور عہدہ داران ریاست و شرفا و شہر کی خواتین کا بلا خیال ان کی تعلیم و جہالت کے ایک کلب قائم کیا جائے اور مدارس کی لڑکیاں بھی خاص خاص موقعوں پر شامل کی جائین۔(۷۶)

نواب سلطان جہاں بیگم اگرچہ بہت پہلے سے ایک ایسا کلب بنانے کی خواہشمند تھیں مگر ہندوستانی سماج اور لوگوں کی بدمذاقی کے سبب ایسا قدم اٹھانے سے قاصر تھیں۔اور اس چیز کا انہیں شدید افسوس بھی تھا۔بعدازیں تعلیم کے موجب حالات نے تھوڑا رخ بدلا تو انہوں نے ایک ایسے پلیٹ فارم کی قائم کرنے کی طرف عملی اقدامات شروع

کر دیئے تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے اپنے خاندان کی چند مدبر خواتین سے مشاورت کی اور جب انہوں نے باخوشی آمادگی کا مظاہرہ کیا تو پھر باضابطہ طور پر خواتین کا ایک بہت بڑا جلسہ منعقد کیا گیا تھا۔ اسی جلسے میں کلب کا قیام کا اعلان کیا گیا۔ کلب کے نام کے حوالے سے نواب سلطان جہاں بیگم کا اپنی کتاب "اختر اقبال' میں کہنا ہے کہ

> ۱۹۰۵ء مین دیر رائل ہائینسز پرنس آف ویلز (موجودہ قیصر وقیصر ہند) کی سیاحت ہندوستان کے موقع پر جب مین بمقام اندور پرنسس آف ویلز (ملکہ میری) سے شرفیاب ملاقات ہوئی تھی تو جناب ممدوحہ نے جس قدر اخلاق وعنایات سے ملاقات فرمائی تہی اور جو خردانہ مہربانی مبذول کی تھی اوسکی شکر گزاری کے خیال سے اوسی وقت سے میرا ارادہ تھا کہ اپنی دارالسلطنت مین حضور ممدوحہ کی کوئی مفید یادگار قائم کرون۔ چنانچہ جس وقت اس کلب کا خیال آیا اوسی وقت یہ بات ذہن مین آئی کہ حضور ممدوحہ کے نام نامی کے منسوب کیا جائے۔۔۔ غرض اس کلب کا نام "پرنسس آف ویلز کلب" کہا گیا۔(۷۷)

نواب سلطان جہاں بیگم نے اس کلب کا نام رکھنے کے بعد اس کے قواعد مرتب کرنے کی طرف توجہ صرف کی۔ نواب آفتاب بیگم جو نواب احتشام الملک کی بھانجی تھیں انہیں کلب کی سکریڑی منتخب کیا گیا۔ بعد ازاں جس کی سیکریٹری مولانا ابوالکلام آزاد کی بہن آبرو بیگم تھیں۔ یورپین اور دیگر اینگلو انڈین لیڈیز کو بھی ممبر بنایا گیا۔ کلب کے لئے وسیع عمارت بنائی گئی۔ ریاست کی جانب سے کتب، اخبارات اور کھیلوں کا سامان دیا گیا۔ کافی کم مقدار میں داخلہ و ممبر شپ کی فیس رکھی گئی۔ اگرچہ کلب ۱۹۰۵ء میں قائم ہو گیا تھا لیکن اس کے افتتاح کی باقاعدہ رسم ۱۹۰۸ء میں لیڈی منٹو کے دست مبارک سے ادا ہوئی۔ اس موقع پر کلب خوب آراستہ کیا گیا تھا۔ مشرقی و مغربی آرائش کی آمیزش نے عجیب خوبصورت منظر پیدا کر دیا تھا۔ لیڈی منٹو کے لیے باغ میں ایک گوشہ میں ایک کڑھائی کیا ہوا شامیانہ چار سونے کے ستونوں پر نصب کیا گیا تھا۔ بقول نواب سلطان جہاں بیگم

> کلب کو عطیہ فیضی اور آبرو بیگم نے بہت اچھے سلیقے سے آراستہ کیا تھا اور آٹھ ممبران نے جن کے نام ذیل مین ہین استقبال کیا۔ قیصر دولہن (بیگم نواب نصر اللہ خان)، شہریار دولہن (بیگم کرنل عبید اللہ خان)، شاہ بانو (بیگم صاحبزادہ حمید اللہ خان)، سلطان دولہن، سردار دولہن، اہلیہ میاں یسین خان، اہلیہ میاں یار محمد خان، اہلیہ میاں نظیر محمد خان۔ کلب کی تمام خواتین ممبر تعظیما کھڑی ہوئی تھیں۔۔(۷۸)

یہاں وقتاً فوقتاً خواتین کے مسائل کے متعلق ممبران نے تقاریر کیں اور ان تقاریر کا آغاز نواب سلطان جہاں بیگم نے کیا۔ لیڈی منٹو نے بھی جوابی تقریر کی، تمام انتظامات اور بالخصوص نواب سلطان جہاں بیگم کی خواتین کے لیے کیے گئے اقدامات کو بہت سراہا۔ عطیہ فیضی نے لیڈی منٹو کی تقریر کا اردو ترجمہ کر کے ممبران کلب کو سنایا اور پھر لیڈی منٹو نے کلب کے افتتاح کی رسم ادا کی اور کلب ہال میں تمام خواتین سے تعارف کروایا گیا تھا۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے لیڈی منٹو کو ہال میں آویزاں اپنی والدہ نواب شاہجہان بیگم اور نانی نواب سکندر بیگم کی تصاویر دیکھائیں اس کے بعد نواب میمونہ سلطان شاہ بانو بیگم صاحبہ اور برجیس جہاں بیگم صاحبہ سے فرمائش کر کے انگریزی میں نظمیں پڑھوائیں۔ ان دونوں نے نظمیں ایسے خوبصورت لب و لہجے میں پڑھیں کہ لیڈی منٹو حیران رہ گئیں۔ بقول محمد امین زبیری

> دراصل یہ کلب صرف خواتین بھوپال کی دلچسپیوں کا ہی مرکز نہیں ہے بلکہ وہ خواتین جو سرکار عالیہ کی مہمان ہوتی ہیں خواہ کسی بھی قوم اور مذہب سے تعلق رکھتی ہوں ان کو بھی یہاں دلچسپی کا بڑا سامان ملتا ہے تمام وائسرایان ہند کی بیگمات جو بھوپال میں مہمان ہوئیں اس کلب میں بھی تشریف لا چکی ہیں کل زنانہ جلسے بجز خاص تقریبات کے سب یہاں ہوتے ہیں۔ سرکار عالیہ کی سال گرہ کے دن تو خاص دھوم دھام ہوتی تھی۔ خاندان شاہی کی بیگمات اور دیگر ممتاز خواتین کی طرف سے اسی کلب میں پارٹیاں بھی ہوتی تھیں۔ (۷۹)

مندرجہ بالا اقتباس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ "پرنسس آف ویلز کلب" خواتین کے لیے ایک ایسا پلیٹ فارم تھا جہاں ان کی صنف سے متعلق قومی و بین الاقوامی تمام مسائل کے ممکنہ حل کی طرف توجہ مرکوز کی جاتی رہی تھی۔ قومی سطح پر جو جلسے ہوئے ان میں پہلا جلسہ مسلم یونیورسٹی کا ہوا یوں یہ ہندوستان میں پہلا زنانہ جلسہ تھا۔ علاوہ ازیں لیڈی ہارڈنگ نے ترکی کے یتیموں اور بیواؤں کی امداد کے لیے تحریک چلائی تھی۔ اس کے لیے باقاعدہ طور پر یہیں جلسہ کیا گیا اور کافی مقدار میں چندہ جمع کیا گیا۔ جنگ عظیم جب شروع ہوئی تو اس کے اثرات تمام ملکوں پر مرتب ہوئے چنانچہ اسی تناظر میں نواب سلطان جہاں بیگم نے کلب میں تقریر کی اور اس میں جنگ کی وجوہات پر بحث کی اور مختلف امور پر بات کرنے کے بعد ہندوستانی سپاہیوں کی ہمدردی کے جذبات پیدا کیے۔ چنانچہ ان کی امداد میں اس کلب نے بہت زیادہ حصہ لیا۔

جنوری ۱۹۱۲ء کے آخری ہفتہ میں اس مقصد کے لیے ایک مینا بازار قائم کیا گیا تھا جس میں زنانہ مدارس بھوپال کی دستکاری کی چیزیں رکھی گئی تھیں۔ ہر مدرسہ کی دکان کے لئے جداگانہ شامیانے لگائے گئے۔ ریاست کے

باغات کے پھل پھول وغیرہ کی بھی دکانیں تھیں۔ یہ بازار صبح سے رات دس بجے تک کھلا رہتا تھا۔ اگر اس دور اور موجودہ حالات میں اگر تقابلی جائزہ لیا جائے تو یہ بہت بڑا قدم تھا۔ خواتین کا رات گئے تک بازار میں ہونا بالخصوص ان کو چلانا بہت بڑی تبدیلی تھی۔ اسی دوران ایک مرتبہ لیڈی منٹن (MINTON) نواب سلطان جہاں بیگم کی مہمان تھیں۔ بقول محمد امین زبیری

> لیڈی منٹن بھی سرکار عالیہ کی مہمان تھیں کلب میں تشریف لائیں اور مینا بازار کی محویت کے ساتھ سیر کی اس وقت خواتین بھوپال کا بڑا مجمع تھا، ان کی تہذیب اور پردہ کا انتظام دیکھ کر لیڈی مسٹن نے بے ساختہ فرمایا کہ میں نے اس سے پہلے اس قدر شائستہ و مہذب زنانہ جلسہ ہندوستان میں کہیں نہیں دیکھا۔۔۔ سرکار عالیہ عموماً مقاصد و مسائل نسواں پر یہاں معرکتہ الآرا تقریریں فرماتی تھیں۔ جو طبقہ اناث کے لئے مفید و موزوں ہیں۔ مشہور مقررہ سروجنی نائیڈو اور دیگر ممتاز خواتین نے یہاں تقریریں کیں۔(۸۰)

اس کلب کی خواتین میں ذوق پیدا کرنے کے لیے تقاریر و مضامین کے مقابلے بھی کروائے جاتے رہے اور جو خواتین مقابلہ جیت جاتیں حوصلہ افزائی کے لیے انعامات تقسیم کیے جاتے تھے۔ علاوہ ازیں مختلف شعبوں میں ماہر خواتین کو یہاں معلومات کی فراہمی کے لیے مختلف موضوعات پر لیکچرز دینے کے لیے بلایا جاتا تھا۔ لیکن ایک اور اہم کام جو نواب سلطان جہاں بیگم نے کیا وہ یہ کہ کلب میں جلسوں کے حوالے سے یہ حکم دیا کہ لباس سادہ رہے چاہے کوئی کتنا ہی مالی طور پر مضبوط کیوں نہ ہو۔ کیوں کہ نواب سلطان جہاں بیگم کی تمام تر توجہ خواتین کی شخصیات کو مضبوط بنانے پر تھی نہ کہ محض تفریح مہیا کرنے پر، اور کلب بنانے کا اصل مقصد بھی یہی تھا۔ جنوری ۱۹۱۷ء میں ایک تقریب میں نواب سلطان جہاں بیگم نے خواتین کو سوسائٹی اور کلب کا اصل مقصد بتایا۔ بقول محمد امین زبیری

> خواتین! عمدہ سوسائٹی ہمیشہ انسانی اخلاق کو جلا دیتی ہے اور اگر اسی کے ساتھ تعلیم بھی ہو تو نور اعلیٰ نور ہو جاتی ہے۔۔۔ کلب اور سوسائٹیاں عموماً کسی اصلاح یا ترقی یا کسی اور عمدہ مقصد کے لیے قائم کی جاتی ہیں لیکن اگر اس کو نمود و نمائش و خود بینی کا مرکز بنا لیا جائے تو وہ مقاصد پورے نہیں ہوتے بلکہ برعکس نتائج نکلتے ہیں یا اگر صرف سیر و تفریح کا ہی مقام قرار دے دیا جائے اور اس میں ہمدردانہ کاموں کے متعلق تبادلہ خیالات نہ کیا جائے یا کوئی اور مقصد پیش نظر نہ رکھا جائے تو وہ تضیع اوقات کی جگہ ہوتی ہے۔(۸۱)

نواب سلطان جہاں بیگم نے لیڈیز کلب میں دوران تقریر اپنے آپ کو کشتی کا ناخدا اور جہاز کا کپتان جیسی مثالیں دیتے ہوئے خواتین کے تعاون کو ضروری قرار دیتی تھیں۔انہیں ملکی امور کی انجام دہی میں سخت تکالیف کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے بعد آرام کی طلب ہوتی تھی لیکن انہوں نے اپنے مقاصد کی تکمیل کو آرام پر ترجیح دی۔وہ کہتی تھیں کشتی اسی وقت آسانی کے ساتھ کنارے لگے گی جب تم سب میری امداد میں دل و جاں سے مستعد ہو گی۔ مسلم ایجوکیشن کانفرنس کے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے سلطان جہاں بیگم نے زور دے کر کہا کہ لڑکیوں کو بھی تعلیم کی ضرورت ہے۔لڑکے کسب معاش کرتے ہیں تو لڑکیاں گھر کی چار دیواری کو جنت بنا دیتی ہیں۔جیسا کہ انہوں نے کہا

> دنیا کے ممالک میں عورتوں کی تعلیمی ترقی مردوں کے بعد شروع ہوتی ہے علم و فضل میں پہلا قدم مرد ہی ہمیشہ آگے بڑھاتے ہیں مگر تھوڑی دور چلنے کے بعد محسوس ہونے لگتا ہے کہ مرد اور عورت ترقی کی ایک ہی گاڑی میں دو پہیے ہیں اگر دونوں پہیوں کی رفتار برابر نہ ہو تو ترقی کی رفتار قائم نہیں رہ سکتی۔(۸۲)

علی گڑھ میں تحریک نسواں کی امداد:

نواب سلطان جہاں بیگم کی تعلیمی ترجیحات کا سلسلہ صرف بھوپال ہی میں نہیں رہا بلکہ ہندوستان کے ہر گوشے میں نظر آتا ہے۔ریاستی امور سے اطمینان حاصل ہونے کے بعد نواب سلطان جہاں بیگم نے مجموعی طور ہندوستان کے حالات کا جائزہ لیا اور قومی مرکز کو تقویت پہنچائی جہاں تحریک تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے بڑے بڑے ماہرین تعلیم عملی کوششیں کرنے کے حوالے سے جدوجہد کر رہے تھے، وہیں نواب سلطان جہاں بیگم کو اپنی تعلیم نسواں کی تحریک کو عام کرنے کی اتنی فکر تھی کہ وہ اسکو حکومت کے دائرہ اثر سے باہر نکال کر ایک عوامی تحریک بنانا چاہتی تھیں۔لہذا انہوں نے تعلیم کو عام کرنے کے لئے عوام سے اپنے مشن کو کامیاب کرنے کی درخواست پیش کی تھی۔بھوپال کی خواتین نے نواب سلطان جہاں بیگم کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کلب میں فنڈ جمع کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ان خواتین کی تعلیم نسواں کے فروغ کے سلسلے میں کی گئی کوششوں کی اطلاع نواب سلطان جہاں بیگم کو ہوئی تو انہوں نے بے پناہ خوشی کا اظہار کیا اور ان خواتین کی حوصلہ افزائی کی تھی۔نواب سلطان جہاں بیگم نے تجویز دی کہ جو رقم بطور امداد اکٹھی ہوئی اس کو ان لڑکیوں کی فلاح و بہبود کے لیے خرچ کیا جائے جو اس کا حق رکھتی ہیں۔نواب سلطان جہاں بیگم کی خواہش تھی کہ ان لڑکیوں کو رقم دی جائے جن کے والدین ان کے تعلیمی اخراجات

وغیرہ کے لئے پریشان ہیں لیکن سفید پوشی کے سبب کسی کے سامنے دست سوال نہیں کرتے لہذا اس مقصد کی تکمیل کی غرض سے فنڈ زنانہ اسکول علی گڑھ کے سکریٹری کے پاس بھیج دیا گیا تھا۔جہاں کہیں غریب لڑکیوں کو تعلیمی ضروریات پوری کرنے کے لیے مالی امداد کی طلب ہوا نہیں پورا کیا جاسکے۔

نواب سلطان جہاں بیگم نے محمڈن گرلس سکول علی گڑھ جو اس وقت خستہ حالت میں تھا عطیات سے اسے مضبوط بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔عمارت کے آرائش وزیبائش سے زیادہ اس وقت اہم مسئلہ نصاب کی تیاری تھی۔ اس وقت کے حالات کی مناسبت سے ایسا نصاب تیار کروانا تھا جو ہندوستانی خواتین کے لیے فعال ثابت ہو۔انگریزوں کی طرف سے دیا گیا سرکاری نصاب اس وقت کے ہندوستانی معاشرت کا ساتھ دینے سے قاصر تھا۔چنانچہ نواب سلطان جہاں بیگم نے بذات خود نصاب کی طرف بھرپور توجہ صرف کی اور نصاب کا ابتدائی خاکہ مرتب کیا تھا۔نواب سلطان جہاں بیگم کی بے لوث خدمات کو مولانا حالی نے اپنی نظم "چپ کی داد" میں کچھ یوں ادا کیا ہے

جو حق کے جانب دار ہیں بس ان کے بیڑے پار ہیں
بھوپال کی جانب سے یہ ہاتف کی آواز آئی ہے
ہے جو مہم درپیش دست غیب ہے اس میں پنہاں
تائید حق کا ہے نشان امداد سلطان جہاں (۸۳)

نواب سلطان جہاں بیگم نے نصاب کی تیاری میں بہت زیادہ کوشش کی تھی کیونکہ اس وقت جو نصاب رائج تھا وہ اس سے ہرگز مطمئن نہیں تھیں۔اس نصاب میں بہت سے نقائص تھے جن سے عورتیں ان تمام خوبیوں سے محروم رہ جاتیں، جو ان کی شخصیت کا نمایاں عنصر ہونی چاہیں تھیں۔نواب سلطان جہاں بیگم نے تقریباً اپنی تمام تقریروں میں اس کا اظہار کیا کہ مسلمان لڑکیوں کے لیے الگ سے نصاب مرتب کیا جانا چاہیے۔اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے علی گڑھ میں مالی امداد بھی دی اور اسی سلسلے میں ۱۹۱۵ء میں ایک تقریب منعقد کی گئی جس میں ہندوستانی خواتین کے علاوہ یوروپین خواتین بھی شامل ہوئیں جنہیں نصاب کی بناوٹ بالخصوص طبقہ نسواں کے لیے نصاب تیار کرنے میں مہارت حاصل تھی۔نصاب سازی میں ان کی آراء کے ساتھ سلطان جہاں بیگم نے اپنی رائے بھی ان کے سامنے پیش کی تھی۔نواب سلطان جہاں بیگم کی نظر اصلاح تعلیم پر بھی تھی۔کیونکہ یونیورسٹی کے نصاب

میں نہ صرف لڑکیوں کے لئے بلکہ عام مسلمانوں کے لئے بھی اصلاح کی ضرورت تھی۔اصلاح سازی نہ صرف خواتین کے تعلیمی نصاب و نظام بلکہ عام مسلمانوں کے لیے بھی اشد ضروری تھی۔

نواب سلطان جہاں چاہتی تھیں کہ ان کے بعد بھی ان کا جاری کردہ تعلیمی مشن برقرار رہے اور جو مدارس انہوں نے لڑکیوں کے لئے جاری کیے وہ ہمیشہ جاری رہیں اور زیر نظر مقصد کے حصول کی خاطر انہوں نے چار لاکھ روپیہ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے گورنمنٹ کے سپرد کیا تھا۔ضرورت پردہ کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ اصول بنایا کہ عورتوں کی تعلیم ان رہن سہن، ماحول و معاشرت کے لحاظ سے ہونی چاہیے۔نواب سلطان جہاں ایسی تعلیم کے حق میں کبھی نہیں تھیں کہ جس سے معاشرتی بگاڑ پیدا ہو، بلکہ لڑکوں اور لڑکیوں کو تقلیدی تعلیم کے بجائے ایسی تعلیم دی جائے جو ان کے لئے مفید ہو۔نواب سلطان جہاں بیگم کے نزدیک یہ کام خود تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ہے کہ وہ نصاب کی تیاری کے وقت بلکہ نصاب کے فوائد و نقصانات اور گورنمنٹ کو اپنی ضرورتوں سے آگاہ کریں۔نصاب سازی کے سلسلے میں گورنمنٹ کی مدد کریں۔

۱۹۱۸ء میں نصاب کی تیاری کے حوالے سے نواب سلطان جہاں بیگم کی ایک اور کوشش جو سامنے آئی وہ یہ کہ انہوں نے ہندوستان اور انگلستان کے نصاب پر غور و فکر کرنے کے بعد جدید نصاب کی تیاری کا ایک تجربہ پیش کیا تھا۔نصاب کو تیار کرنے کے بعد تمام ماہرین تعلیم کے پاس تنقید کی غرض سے بھیجا گیا تاکہ ممکنہ حد تک در آنے والے مسائل سے نمٹا جا سکے۔اس نصاب میں اول تا آخر جماعتوں کے لیے یہی زور دیا گیا کہ ایسے مضامین رکھے جائیں جن سے اخلاقیات کا عنصر طالب علموں کی شخصیت میں پیدا ہو۔نواب سلطان جہاں بیگم کی نصاب کی تیاری کے حوالے سے محمد امین لکھتے ہیں کہ

> اس نصاب کے علاوہ سرکار عالیہ نے اس ضرورت کو بھی محسوس کیا کہ ابھی تک بعض مسلمان خاندان مدارس کی موجودہ تعلیم کو پسند نہیں کرتے اور نہ ان میں لڑکیوں کو بھیجنا گوارا کرتے ہیں، تعلیم چاہتے ہیں لیکن گھر کے اندر،اس لیے ایک ایسے نصاب کی بنیاد ڈالی جو لڑکیوں کے لئے خانگی تعلیم میں مفید ہو۔(۸۴)

مندرجہ بالا اقتباس میں جس نوعیت کی نصاب سازی کے حوالے سے بحث کی گئی اس سلسلے کی پہلی تصنیف نواب میمونہ سلطان شاہ بانو بیگم کی کتاب "ذکر مبارک" کی صورت میں سامنے آتی ہے۔اس کتاب کا موضوع حضرت محمدؐ کی ذات مبارک تھی۔زیر نظر کتاب کی مقبولیت کی بناء پر دینی مدارس میں بھی شامل نصاب کیا گیا۔

نواب سلطان جہاں بیگم دور اندیش خاتون تھیں۔انہوں نے تعلیم نسواں کے سلسلے میں اس عنصر کی شدید کمی محسوس کی کہ عورتوں کی تعلیم کے لیے اخبارات ورسائل کی صورت میں کوئی متحرک چیز نہیں ہے۔اس وقت اردو میں تین زنانہ رسائل تھے جو کبھی وقت پر شائع نہیں ہوتے تھے۔اس افسوس ناک حالت میں نواب سلطان جہاں بیگم نے ۱۹۲۶ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (منعقدہ دہلی) کے ممبروں کو ایک پیغام کے ذریعے مسلمان عورتوں کی تعلیم کی اشاعت و توسیع پر خاص توجہ دلائی تھی۔اس اہم مقصد کی تکمیل کے حوالے سے اس وقت لاپرواہی برتی جارہی تھی۔

> یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ آزادی کے اس پر شور زمانہ میں مذہب کی مخالفت کے فرائض صرف وہی انجام دے سکتے ہیں جو مذہب سے واقف ہوں۔خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں اس لئے علم و شائستگی اور مذہب کی خاطر عورتوں کی ابتدائی تعلیم کا مسئلہ اور اس کا نصاب و نظام جلد طے ہو جانا چاہیے تاکہ مردوں کی حالت بھی درست ہو سکے اور اسلام اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ قوم و اسلام میں قائم رہے۔(۸۵)

تعلیم نسواں کے سلسلے میں نواب سلطان جہاں بیگم نے بہت کوشش وجدوجہد کی اور اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان میں عورتیں تعلیم کی طرف متوجہ ہو چکی تھیں۔لیکن اس کے باوجود اس چیز کی ضرورت محسوس کی گئی کہ عورتوں کے تعلیمی مسائل کے حل میں نہ صرف عورتوں سے مدد لی جائے بلکہ ان مسائل میں بھی جن سے مذہبی رو گردانی یا اختلافات پیدا نہ ہوں۔اور اس مقصد کے لیے صرف مسلمان خواتین ہی نہیں بلکہ تمام غیر مذاہب کی خواتین باہم مل کر جدوجہد کریں۔لہذا اس تجویز کو عملی جامہ پہنایا گیا اور مارچ ۱۹۱۸ء میں اس کا ایک ابتدائی جلسہ آل انڈیا لیڈیز ایسوسی ایشن کے نام سے بھوپال میں منعقد کیا گیا۔اس جلسہ میں ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی اقوام کی خواتین اور یورپین خواتین بھی شامل تھیں۔نواب سلطان جہاں بیگم نے اس جلسہ میں تقریر کی اور اس مشترکہ انجمن کے فوائد پر روشنی ڈالی اور اس کی ضرورت سے حاضرین محفل کو آگاہ کیا۔بقول محمد امین زبیری

خواتین! آپ سب قوت مشترکہ سے کام لے کر اس مقصد عظیم میں کامیابی حاصل کریں ہم کو اپنی کمزوری اور ضعف تخلیق کا خیال کرنا چاہیے کیوں کہ تاریخ شاہد ہے کہ "ان ہی ضعیف ہاتھوں نے دنیا میں بڑی بڑی مہمیں سر کی ہیں۔(۸۶)

یوں یکے بعد دیگرے اس انجمن کے اجلاس منعقد ہوتے رہے لیکن اس انجمن کی خواتین نے محسوس کیا کہ جب تک عورتوں کے پاس تعلیم نہیں ہو گی اس وقت تک وہ اپنا حقیقی مقام نہیں حاصل کر سکتی ہیں۔ لہذا اس کانفرنس کے ساتھ ایک شعبہ "شعبہ تعلیم نسواں" کو مستقل بنیادوں پر قائم کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔ یوں اس انجمن کا پہلا باقاعدہ اجلاس بمقام پونہ میں ۱۹۲۶ء میں ہوا اور دوسرے اجلاس کا انعقاد ۱۹۲۸ء میں دہلی میں ہوا۔ ان اجلاس کی صدارت نواب سلطان جہاں بیگم نے بذات خود کی تھی۔ انہوں نے تعلیم نسواں کے سلسلے میں مختلف مذاہب سے خواتین کے اکٹھے ہونے اور جدوجہد کرنے پر نہ صرف خوشی کا اظہار کیا بلکہ اسے نعمت قرار دیا تھا کیونکہ ان کے نزدیک عورتیں ہی عورتوں کے صنفی مسائل کا بہترین حل نکال سکتی ہیں۔ اس جلسے میں جہاں نواب سلطان جہاں بیگم نے تعلیم نسواں کے مسائل پر زور دیا اور ساتھ ہی انہوں نے معاشرتی رسوم پر بھی بات کی جو خواتین کی زندگیوں پر بہت گہرے اثرات مرتب کرتیں ہیں۔

لڑکیوں کی تعلیم میں ایک اور بہت بڑی روک کم سنی کی شادی ہے یہ بری رسم ملک کے ہر فرقہ میں کم و بیش موجود ہے اور اس وجہ سے لڑکیوں کی جسمانی، دماغی اور اخلاقی نشوونما کا بہترین زمانہ بیکار ہو جاتا ہے بلکہ اس کے سبب سے وہ اور گوناگوں آلام و افکار میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔۔۔ میری بہنو! میرا عقیدہ ہے کہ دنیا میں جہاں کوئی رسم جاری ہوئی ہے اس میں ضرور کچھ نہ کچھ فائدے اور مصلحتیں بھی ہوتی ہیں اس لیے ہم کو لازم ہے کہ ہم جس بات پر بحث کریں اس میں تصویر کے دوسرے رخ پر بھی نظر ڈالیں۔(۸۷)

مندرجہ بالا کانفرنس تین دن جاری رہی اور اس کانفرنس میں ۱۹ ریزولیوشن پیش کیے گئے جنہیں بہت غور و فکر کے ساتھ جانچا گیا اور پھر اسی کانفرنس میں ان کی منظوری بھی دے دی گئی تھی۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے خواتین کی ذہنی، فکری اور تہذیبی ترقی کے لیے تنظیمیں اور انجمنیں بنائیں کیونکہ ان کی شدید خواہش تھیں کہ خواتین کو اپنی صنف کے مسائل سے آگاہی حاصل ہو اور اسی لیے وہ چاہتی تھیں کہ وہ خواتین جو باشعور ہیں وہ آگے بڑھیں۔ اور اس

مہم میں شامل ہو کر مسائل کو دور کرنے میں مدد کریں۔یوں مرد و زن برابری کی سطح پر معاشرے میں اپنا فعال کردار ادا کریں۔

> تعلیم اناث کی ترقی و اشاعت کے لئے لائق معلمات کی ضرورت ناگزیر ہے اس لئے میں طبقہ شرفا کی خواتین سے یہ استدعا کروں گی کہ وہ اپنے ملک کی خستہ حالی کو محسوس کر کے اپنی بچیوں کی تعلیم کے انتظام میں حسب استطاعت اعانت کریں۔اور اگر اتنا ایثار کریں کہ اپنے خالی وقت کا کچھ حصہ اپنے محلہ کی بچیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے دے دیں تو بلاشبہ ایک بڑی حد تک یہ دقت رفع ہو سکتی ہے اور میرا ذاتی خیال ہے کہ جس طرح بعض خواتین ملکی و شہری خدمات ۔۔۔۔اسی طرح وہ اپنی جنس کی تعلیمی خدمت بھی انجام دے سکتی ہیں بہر حال یہ ضرورت عارضی اور چند روزہ ہے جب تعلیم عام ہو جائے گی تو معلمات کی یہ کمیابی نہیں رہے گی۔اور زیادہ آسانی سے اسکا انتظام ہو سکے گا۔(۸۸)

نواب سلطان جہاں بیگم وہ پہلی ہندوستانی خاتون ہیں جنہوں نے تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے ٹھوس اقدامات کیے ہیں۔اگر تنقیدی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو نواب سلطان جہاں بیگم کی زنانہ تعلیم گاہوں سے دلچسپی ایک قدرتی امر تھا لیکن دارالعلوم ندوۃ العلماء و دیوبند اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ بھی اس فیض سے برابر مستفید ہوتے رہے ہیں۔نواب سلطان جہاں بیگم ہمہ وقت قومی معاملات کو بہتری کی جانب لے جانے کی شدید خواہش مند تھیں۔وہ جب تک کسی چیز کی ضرورت و اہمیت کو اچھی طرح ذاتی طور پر سمجھ نہ لیتیں اس حوالے سے کوئی قدم نہیں اٹھاتیں۔نواب وقارالملک نے محمڈن کالج علی گڑھ کے حوالے سے نواب سلطان جہاں بیگم سے تین سے چار بار ملاقات کی اور کالج کے متعلق تفصیلی معلومات فراہم کیں تھیں۔کالج کے اغراض و مقاصد سے اچھی طرح واقف ہونے کے بعد انہوں نے اس کی بہتری کی جانب اقدامات اٹھانے کا آغاز کیا تھا۔ان کی فیاضیاں ان کے ذاتی شوق اور مفید کاموں کا نتیجہ ہیں۔ان کے معاملات میں کسی بھی سفارش، بااثر افراد کو کوئی دخل نہیں تھا۔نواب وقارالملک نے نواب سلطان جہاں بیگم کے حوالے سے کہا بقول ڈاکٹر رضیہ حامد "ہر ہائنس کی فیاضی خود موقع کی متلاشی رہتی ہے۔(۸۹)

نواب سلطان جہاں بیگم نے علی گڑھ کالج میں قائم آل انڈیا مسلم ایجو کیشنل کانفرنس کی کثیر مقدار میں امداد کی اور اس کی بنیادوں کو جلا بخشی تھی۔وہ ذہنی طور پر سرسید احمد خاں اور ان کے رفقائے کار کی اخلاقی و اصلاحی تحریک سے بہت متاثر تھیں۔انہوں نے اپنے بیٹے نواب حمید اللہ خاں کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے علی گڑھ کالج میں داخل

کروایا۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے ایجو کیشنل کانفرنس کے لیے اول اول پندرہ ہزار کا عطیہ دیا لیکن جب نواب آفتاب احمد خاں نے علی گڑھ کا دورہ کیا تو انہوں نے جائزہ لینے کے بعد نواب سلطان جہاں بیگم کو اخراجات سے متعلق آگاہ کیا تو عطیہ کی مقدار پچاس ہزار تک بڑھا دی گئی۔ بقول اطہر صدیقی

> نواب سلطان جہاں بیگم نے علی گڑھ کالج کے لیے بے شمار خدمات سرانجام دی جب کہیں کوئی پریشانی ہوتی تو خود علی گڑھ تشریف لاتیں تھیں اور مسائل کو حل کرتیں تھیں۔(۹۰)

۵ فروری، ۱۹۱۶ء کو علی گڑھ میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی عمارت کا افتتاح کیا۔ نواب سلطان جہاں بیگم کے نام سے منسوب یہ عمارت "سلطان جہاں منزل" کے نام سے مشہور ہوئی۔ مسلم یونیورسٹی کی تحریک کو قوم کے سامنے ۱۹۱۰ء میں جب پیش کرنا طے ہوا تو نواب سلطان جہاں بیگم اس وقت الہ آباد میں دورے پر تھیں۔ اس دوران ان کی ملاقات نواب وقار الملک اور پرنس آغا خاں سے ہوئی تھی۔ اس ملاقات کے احوال کے متعلق اطہر صدیقی کے بقول

> ایک لاکھ اس وقت دیتی ہوں مگر کہے دیتی ہوں کہ اور بھی دوں گی اس کے علاوہ میں نے خود دیکھا ہے کہ علی گڑھ میں ہماری قوم کے بچے گرمی میں سخت تکلیف برداشت کرتے ہیں۔ انہیں بجلی کی روشنی اور پنکھے بھی دوں گی اور ریاست کے جاگیرداروں اور عمال سے بھی روپیہ دلواؤں گی۔ اور اگر ہر ہائنس نظام سے بھی ملاقات ہوئی تو ان سے بھی مدد مانگوں گی۔(۹۱)

اسی طرح ادارہ ندوۃ العلما کو سالانہ چھ سو امداد دی لیکن چند سال بعد یہ امداد دو ہزار چھ سو تک بڑھا دی تھی۔ ۱۹۱۴، ۱۹۱۳ء میں دار العلوم دیوبند کے معاملات بد سے بدتر ہو گئے تو نواب سلطان جہاں بیگم نے اصلاح کی خاطر امداد روک دی۔ بعد ازاں جب حالات موافق ہوئے تو امداد بحال کی نیز ملتوی رقم بھی عطیہ کر دی تھی۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے انجمن ترقی اردو کو نہ صرف یک مشت چار ہزار روپے کی امداد دی بلکہ اس ادارے کی ماہانہ بھی امداد جاری کر دی تھی۔ اس وقت انجمن ترقی اردو کے سیکرٹری مولوی عبد الحق تھے۔ نواب سلطان جہاں بیگم کی درخواست پر انجمن کی کتاب "ہمارا ملک" میں ایک باب تعلیم نسواں کے متعلق تحریر کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اسی طرح ایک اور ادارہ "حالی میموریل سکول" کے لیے خواجہ سجاد حسین جب امداد کی غرض نواب سلطان جہاں بیگم سے ملاقات کے لیے بھوپال آئے تھے۔ خواجہ صاحب نے اس قیام کے دوران بھوپال کے سکولوں کا بغور معائنہ کیا اور واپس آکر تمام صورت حال سے نواب سلطان جہاں بیگم کو آگاہ کر کے رخصت طلب کی کیونکہ کہ یہ گفتگو بہت طویل ہو گئی تھی اس

لیے وہ اپنا مدعا بیان کرنے سے قاصر رہے تھے۔خواجہ صاحب رخصت طلب کر کے جب چل پڑے تو نواب سلطان جہاں بیگم نے انہیں خود فرمایا کہ

> خواجہ صاحب جس مقصد سے کہ آپ نے بھوپال کا سفر کیا ہے ابھی اس پر گفتگو ہی نہیں ہوئی مولانا حالی مرحوم کی یادگار قائم کرنا ہر مسلمان کا فرض سمجھتی ہوں میں نے ان کی قومی نظموں کا مطالعہ کیا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ قومی اصلاح میں ان نظموں کا کیا اثر ہے۔میں ضرور اس میموریل میں مدد دوں گی۔(۹۲)

نواب سلطان جہاں بیگم نے علم کے فروغ کے لیے کئی کتابوں کی اشاعت کے لیے نہ صرف مالی امداد دی بلکہ کتابوں کی تیاری پر انعامات سے بھی نوازتی تھیں۔اکثر مصنفین کی کتابوں کے کئی کئی نسخے خرید کر مفت تقسیم کرتیں تھیں۔مولانا شبلی نعمانی کی معروف تصنیف" سیرت النبی" کے تمام اخراجات نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنے ذمے لیے تھے۔"سیرت النبی "کی تکمیل کے لیے جس طرح نواب سلطان جہاں بیگم نے مدد کی محمد امین زبیری اس تناظر میں لکھتے ہیں کہ

> چونکہ اردو میں اس وقت تک آنحضرتؐ کی کوئی مفصل اور مستند سوانح عمری موجود نہیں ہے اس لئے جب مجھے معلوم ہوا کہ شمس العلماء مولانا شبلی جو تاریخ اسلام کے ایک باکمال اور مستند عالم ہیں سیرۃ نبوی مرتب کرنا چاہتے ہیں لیکن مالی امداد سے مجبور ہیں اور انہوں نے ایک اپیل کو دیکھا اور افسوس ہوا کہ ایک ایسی ضروری اور مذہبی تصنیف کے لئے پبلک سے اپیل کرنے کی نوبت پہنچی ہے میں نے ان کو مطلع کیا کہ وہ فوراً کام شروع کر دیں اور جس قدر روپیہ کے لئے اپیل کی گئی ہے وہ میں دوں گی لیکن اپیل میں ان کتابوں کے متعلق ذکر نہ تھا جو تالیف سیرۃ نبوی میں ضروری تھیں جب حمید اللہ خاں کو یہ ضرورت معلوم ہوئی تو انہوں نے اس ثواب میں حصہ لینے کے لیے فوراً دو ہزار روپے خرید کتب کے لیے مولانا موصوف کے پاس بھیج دیے اور اجازت دی کہ جس قدر مزید کتابوں کی ضرورت ہو وہ بھی خرید لی جائیں ان کی قیمت بھی ادا کی جائے گی۔(۹۳)

مولانا شبلی نعمانی اکثر نواب سلطان جہاں بیگم کی ملاقات کو بھوپال جاتے اور کئی کئی دن بطور مہمان رہتے تھے اور وہاں قیام کے دوران دونوں کی قومی، مذہبی معاملات پر گفتگو ہوتی تھی۔ایک مرتبہ مولانا صاحب کی طبیعت ناساز تھی اور اسی حالت میں وہ بھوپال تشریف لے گئے کیوں کہ سیرۃ کے اخراجات بہت بڑھ گئے تھے۔جب مولانا شبلی

نعمانی نے عرض کیا تو نواب سلطان جہاں نے فرمایا کہ "آپ مطمئن رہیے جو مصارف ہوں گے وہ میں دوں گی" (۹۴)
نواب سلطان جہاں بیگم نے اسی وقت فوراً خزانچی کو حکم دیا اور پھر مولانا سے فرمایا کہ

لیجئے میں نے اپنا فرض پورا کر دیا اور یقیناً میں اس ثواب کی مستحق ہو گئی جو اس نیک کام میں مجھے ملے گا لیکن آپ کی صحت تو اتنی خراب ہے کہ دو دو وقت کھانا نہیں کھاتے اگر آپ نہ رہے تو کتاب کیونکر پوری ہو گی۔ (۹۵)

نواب سلطان جہاں بیگم علمائے دین اور مصنفین کی ہر طرح حوصلہ افزائی فرماتی رہتی تھیں۔ ان کی اسی مہربانی کی وجہ سے مولانا شبلی نعمانی بہت متاثر ہوئے اور فرط جذبات میں انہوں نے نواب سلطان جہاں بیگم کے لیے ایک قطعہ کہا۔ بقول محمد امین زبیری

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر صورت
کہ ابر فیض سلطان جہاں بیگم زرافشاں ہے
رہی تالیف و تنقید روایت ہائے تاریخیت
تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہی مری جاں ہے
غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل
کہ جس میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطان ہے" (۹۶)

مولانا شبلی کے انتقال کے بعد سیرۃ کا کام جاری و ساری تھا۔ سید سلیمان ندوی اور مولانا حمید الدین نے احسن طریقے سے تمام کام انجام دیا تھا۔ سیرۃ کے مکمل ہونے پر جب دار المصنفین کے کاموں کی رپورٹ پیش کی گئی اور اسی سلسلے میں نواب سلطان جہاں بیگم نے فرمائش کی کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت خدیجہ الکبریٰ اور حضرت ام سلمہ کی سیر تیں مرتب کی گئی تھیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے ان کے کام کو بہت سراہا اور سید سلیمان ندوی کو خصوصی انعام سے نوازا۔ بقول محمد امین " تین ہزار روپیہ مولوی سید سلیمان صاحب کو بشکریہ کتاب سیرت نبوی دیئے جائیں تاکہ ایسی کتب ہائے خیر کا سلسلہ جاری رہ کر قوم کو استفادہ حاصل ہو۔" (۹۷)

علاوہ ازیں نواب سلطان جہاں بیگم نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کو مسلم یونیورسٹی کے قالب میں منتقل کیا اور اس کے قیام کے سلسلے میں خطیر رقم عطا کی تھی۔ نواب سلطان جہاں بیگم کو ان کی خدمات کے اعترافات میں جنرل ہند نے اپنے اختیارات سے اور پھر دو مرتبہ خود کورٹ نے انہیں چانسلر منتخب کیا تھا۔ ہندوستان میں یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی

فرماں روا مسلم یونیورسٹی کا چانسلر منتخب ہوا۔ نواب سلطان جہاں بیگم کا چانسلر منتخب ہونا عالم نسواں کے لئے بہت بڑا اعزاز تھا۔ اس علمی عہدہ پر منتخب ہونے کے بعد نواب سلطان جہاں بیگم نے مسلم یونیورسٹی کے معاملات پر بھرپور توجہ صرف کی۔ ۱۹۲۲ء میں پہلے کانووکیشن میں تقسیم اسناد کے فرائض انجام دیئے اور ایک پر مغز تقریر کی اور یونیورسٹی کے متعلق مختلف موضوعات پر گفتگو کی۔ انہوں نے یونیورسٹی کے شعبہ تعلیم نسواں پر اس طرح توجہ دلائی کہ

> جدید شعبوں میں تعلیم نسواں خاص طور پر توجہ کے قابل ہے کیونکہ اس سے آپ کی قوم کی نصف آبادی کا تعلق ہے اور گزشتہ زمانہ میں اس کی جانب سے سخت غفلت برتی گئی ہے اب جبکہ تعلیم کا انتظام آپ کے ہاتھوں میں ہے اور یونیورسٹی کو اختیار ہے کہ اپنی ضروریات کے مطابق نصاب بنایئے اور طریقہ امتحان میں ترمیم کریں تو آپ کو اس معاملہ میں ایک لمحہ کے لیے غفلت نہیں کرنی چاہیے آپ کے پاس ایک اچھا اسکول موجود ہے اور آپ اس کو اپنی یونیورسٹی کے شعبہ تعلیم نسواں کا عمدہ نمونہ بنا سکتے ہیں اگر اب بھی اس شعبہ پر پوری توجہ نہ کی گئی تو یہ ایک ناقابل تلافی ہو گی اور جو کچھ کیا جائے اس میں ہر ایک پہلو سے کامل اسلامی شان ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ (۹۸)

نواب سلطان جہاں نے اپنے دور حکومت میں سات مرتبہ علی گڑھ کا دورہ کیا تھا۔ اسی طرح یونیورسٹی کے دوسرے کانووکیشن میں نواب سلطان جہاں بیگم نے مسلم یونیورسٹی کے قیام کے اغراض و مقاصد اور اس کے مختلف شعبوں کی ترقی کے لیے لوگوں کو اور خاص طور پر نوجوانوں کو اس کی اہمیت کا احساس دلایا۔ مزید یہ کہ صنعت و حرفت کی ضرورت و اہمیت اور تعلیم نسواں کے مقاصد کی جانب توجہ دلائی اور تقریر فرماتے ہوئے کہا کہ

> زنانہ تعلیم کے متعلق بھی ہمارے دارالعلوم کو ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے اگرچہ مدرسہ نسواں علی گڑھ کو ملحق کر لیا گیا۔۔۔ یہ سچ ہے کہ بی۔ اے کے کامیاب طلبہ کی فہرست میں ایک مسلمان خاتون کا نام دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی لیکن اس کا سبب صرف اس کی ندرت و نایابی ہے کیونکہ علم و کمال کے میدان میں عورتوں کا مردوں کے دوش بدوش چلنا ہمارے لیے کچھ عجیب اور غیر معمولی بات نہیں ہے۔۔۔ (۹۹)

نواب سلطان جہاں بیگم کے علاوہ ان کے بیٹے نواب جنرل عبیداللہ خاں بھی علی گڑھ سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے تقریباً چار لاکھ روپیہ انجمن کے لیے عطیہ کیا تاکہ طالبعلم وظیفہ حاصل کر کے علی گڑھ یا بیرون ممالک جہاں تعلیم حاصل کرنا چاہیں بآسانی کر سکیں۔ اس امداد سے سیکڑوں طلباء نے علی گڑھ اور ہندوستان سے باہر

یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی۔اسی طرح نواب سلطان جہاں بیگم کے چھوٹے بیٹے نواب حمید اللہ خاں نے علی گڑھ میں سائنس کالج کی بنیاد رکھی تھی۔

اگر بغور نظر دیکھا جائے تو نواب سلطان جہاں بیگم نے تعلیم نسواں کے فروغ کو باقاعدہ ایک تحریک کی شکل میں قبول کیا ہے۔اس سلسلے میں انہوں نے جو عملی اقدامات کیے وہ قابل ستائش ہیں۔نواب سلطان جہاں بیگم لڑکیوں کے لئے تعلیم و تربیت اور حسن اخلاق کو ان کا اچھا کردار ان کی متاع بے بہا سمجھتی تھیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ عورتوں کی ترقی تو چاہتی تھیں مگر ان کی غیر معتدل آزادی کی بھی سخت مخالف تھیں۔نواب سلطان جہاں بیگم عورتوں کو صرف آزادی اور حقوق کی اس سطح پر لانا چاہتی تھیں جو اسلام نے تجویز کیا ہے۔ان کی کوشش رہی کہ وہ ہندوستان اور یورپ کے باہمی افراط و تفریط کو ایک نئی معتدل شاہراہ کی صورت میں دیکھنا چاہتی تھیں۔خود ان کی اپنی ذات اسی اعتدال کا مکمل نمونہ تھی۔وہ مذہبی نکات کو سامنے رکھ کر خواتین کی اصلاح کرنے کی ہمیشہ خواہش مند رہیں۔نواب سلطان جہاں بیگم نے کبھی اس امر کو تقویت نہیں بخشی جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ مردوں اور عورتوں کے حقوق کو ایک کسوٹی پر لے آئیں بلکہ وہ اس چیز کا مکمل علم رکھتی تھیں کہ مذہبی تعلیمات کے مطابق دونوں جنسوں کے درمیان جو تفریق ہے اس کے قائم کرنے میں اللہ تعالی سے بہتر کوئی علم نہیں رکھتا ہے۔نواب سلطان جہاں بیگم عورتوں کو جہالت کی پستیوں سے نکال کو اعلی تہذیبی سطح سے روشناس کروانے کی خواہشمند تھیں۔یورپ سے واپس آنے کے بعد ۱۹۱۲ء میں سفری حالات پر لیڈیز کلب میں جو تقریر فرمائی اپنی کتاب "سلک شہوار" میں لکھتی ہیں کہ

> لیکن میں اس تعلیم کے ساتھ اس آزادی کو پسند ہیں کرتی جو اعتدال سے متجاوز ہو چکی ہے اور ہمارے ہاں کی پردہ نشین ناخواندہ بلکہ خواندہ عورتوں کو کبھی اس کا خیال نہیں گزرتا ممکن ہے کہ یہ آزادی جو سرزمین یورپ میں ہے وہاں مناسب ہو یا آزادی مذہب عیسوی کی تلقین و ہدایت کے مطابق ہو مگر ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں کے لئے کسی طرح اور کسی زمانہ میں میرے خیال میں نہ موزوں ہو گی۔۔۔۔ہماری تاریخ ہم کو جتا رہی ہے کہ مسلمان عورتوں نے اسلام اور شعائر اسلام کا پابند رہ کر دنیا میں کیسے کیسے کارہائے نمایاں کئے کیسے کیسے علوم وفنون میں دستگاہ حاصل کی۔۔۔۔دور کیوں جاؤ خود بھوپال میں اسی نتیجہ تعلیم پر نظر ڈالو اور گزشتہ دونوں فرماں رواکے حالات دیکھو جو تعلیم کے اعلی نتائج ہیں۔(۱۰۰)

نواب سلطان جہاں بیگم کی نظر میں پردہ عورتوں کے لیے مضبوط ڈھال کی مانند ہے۔وہ عورت کو گھر کی ملکہ تصور کرتی تھیں اور یہ کہ شرعی پردے میں رہ کر ہر جائز کام کر سکتی ہے۔وہ پردہ کو عورت کی عصمت کا محافظ تسلیم کرتی ہیں جو اس کی راہوں کو متزلزل نہیں ہونے دیتا ہے۔اپنے نظریے کی تائید میں انہوں نے متعدد اور پرزور تقاریر کیں۔اس سلسلے میں نواب سلطان جہاں بیگم کی تقاریر کے کچھ اقتباسات پیش کرنا بے جا نہ ہوگا جس سے ان کے نظریات کی مزید وضاحت ہو سکے مثلاً "پردہ خواتین کے لیے محافظ کا کام دیتا ہے، خصوصاً مسلمانوں میں تو ایک شرعی حکم ہے۔پس پردہ میں رہ کر کمال حاصل بڑا کمال ہے۔"(۱۰۱)

ایک اور مقام پر پردہ کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے فرمایا کہ

> خواتین! مسلمانوں میں پردہ مذہبی حکم اور مذہبی شعار ہے اور خواہ کسی خیال کا مسلمان ہی کیوں نہ ہو مسلمان رہ کر اس سے اختلافات نہیں کر سکتا۔یہ دوسری بات ہے کہ جن الفاظ میں وہ حکم ہے اس کے معنوں پر بحث کر کے سختی یا نرمی کی جائے گی مگر یہ کام بھی علمائے امت کا ہے عام آدمیوں کا نہیں ہے۔میں بذات خود اپنی موجودہ حالت میں پردہ کی حامی ہوں اور حکم پردہ کو ازروئے مذہب مسلمانوں کی معاشرتی حالت کی عمدگی کے لئے ضروری سمجھتی ہوں اور باوجود یہ کہ میری عمر پردہ کے حکم سے مستثنیٰ ہو چکی ہے لیکن پردہ کا احترام قائم رکھنے کے لئے پردہ کرتی ہوں۔۔۔(۱۰۲)

خواتین شرعی پردے میں رہ کر وہ تمام علمی سرگرمیاں اور فکر و فن ،انتظامی امور الغرض ہر کام کر سکتی ہیں۔نواب سلطان جہاں بیگم نے اس سلسلے میں واضح طور پر اسلامی افکار و نظریات کی روشنی میں مسلمان عورتوں کے لیے پردہ کی پابندی لازم قرار دی۔اور انہوں نے یہ بھی باآور کرانے کی کوشش کی کہ پردہ اعلیٰ اخلاقی اقدار کی پاسداری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔عورت پر اسلامی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ہر محاذ سر کرنے اور ہر کام میں حصہ لینے کے لیے کوئی پابندی نہیں لگائی گئی۔اس حوالے سے اسلامی تاریخ سے مثالیں پیش کی مثلاً اپنی کتاب "سلک شہوار " میں رقمطراز ہیں

> یہ بالکل صحیح ہے کہ پردہ تعلیم کا مانع اور حارج نہیں ہو سکتا، ہمارے سامنے قرون اولیٰ یعنی صحابہ کے وقت سے لے کر اس وقت تک کی ایسی مثالیں موجود ہیں کہ پردہ میں تعلیم ہوئی اور جو فرائض عورت کے ذمے عائد کیے گئے ہیں، ان سے وہ عہدہ برآ ہو گئی اور اس میں وہ تمام صفات

موجود ہیں جو تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ وطن کی محبت، غریب اور عزیزوں کے ساتھ ہمدردی، عفت و پاکدامنی، اخلاقی جرات، صداقت و راست بازی کی بڑی روشن مثالیں ان ہی پردہ نشین خاتون میں ملتی ہیں۔(۱۰۳)

نواب سلطان جہاں بیگم اپنی رعایا کے لئے بہت ہمدردی اور فیاضی سے کام لیتی تھیں۔انھیں اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ عوام کی حالت اور خصوصاً خواتین کی حالت تسلی بخش نہیں ہے۔ان کی مذہبی، روحانی، جسمانی اور معاشرتی اصلاح کی سخت ضرورت ہے۔خود ان کی تربیت نواب سکندر بیگم کی زیر اثر ہوئی جن کے پیش نظر یہ بات بخوبی تھی کہ نواب سلطان جہاں بیگم نے ریاست کو مستقبل میں سنبھالنا ہے۔ لہذا ان کی تربیت کرتے وقت ان امور کو خاص طور پر ملحوظ خاطر رکھا گیا کہ ان میں حکمرانی کے اوصاف اور ایک عورت کی ذمہ داری بیک وقت پیدا ہو جائے۔اس وجہ سے نواب سلطان جہاں بیگم کو پوری زندگی مسلم رعایا کے ساتھ ساتھ غیر مسلم رعایا کی ترقی، فلاح و بہبود کا بھی بہت خیال رہتا تھا۔ان کی ضروریات اور ترقی کے لئے مسلسل کوشاں رہتی تھیں۔ مسز جی۔ بخش نے "سلک شہوار" کتاب کے دیباچہ میں لکھا کہ

ہر ہائنس نے صنفی مسائل پر کسی قدر عمیق اور کیسا کامل غور و مطالعہ فرمایا ہے اور بحث کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو ناتمام ہو۔۔۔۔ہر ہائنس جدید خیالات کے ساتھ ساتھ اپنے مذہبی اور قدیم معاشرتی خیالات کی بے انتہا موید ہیں۔ وہ جدید طرز کی عمارت کو اسی مستحکم بنیاد پر دیکھنا چاہتی ہیں۔۔۔۔ معاملات مذہب میں غیر متعصب ہیں اور ہر مذہب کا احترام ان کے دل میں جاگزیں ہے۔ وہ مذہبی مسائل پر اس طرح بحث فرماتی ہیں کہ غیر مذہب لوگوں کو بھی بغیر کسی عقیدے کے تبدیل کئے ہوئے بھی خاص دلچسپی ہوتی ہے۔(۱۰۴)

وہ عورتوں کی تعلیم و ترقی اور خوشحالی پر زور دیتی تھیں۔انہوں نے خواتین کی ترقی کے لیے اور بے راہ روی سے بچانے کے لئے واضح تصورات پیش کیے۔ یہ تصورات عقل کی کسوٹی پر پورا اترنے اور فکر اسلامی کے موافق تھے۔سلطان جہاں بیگم نے ہر ممکن کوشش سے عورتوں کو اوپر اٹھانے، ان کو بہتر بنانے اور معاشرے میں بلند مقام دلانے کے لئے سرگرداں رہیں۔ وہ اپنے خیالات کا اظہار زبان سے ہی نہیں کرتیں، بلکہ اس کے لئے عملی طور پر ہمیشہ تیار رہتی تھیں مثلاً" میں صاف صاف کہتی ہوں کہ میں ہر ممکن طریقے اور ان زریعوں اور وسیلوں سے جو فضل خداوندی سے مجھے حاصل ہیں اپنی صنف کی امداد کے لیے تیار ہوں۔"(۱۰۵)

نواب سلطان جہاں بیگم کی ادبی خدمات و تصنیفات:

نواب سلطان جہاں بیگم ایک روشن خیال اور زمانہ کی نبض شناس فرمانروا تھیں۔ انہوں نے وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق بھوپال کی عوام کو ترقی سے روشناس کرانے اور ان کو ترقی یافتہ اقوام کے روبرو کھڑا کرنے کے لیے بہت کوشش کی۔ نواب سلطان جہاں بیگم کے حکمران ہونے سے پہلے بھوپال کے علمی اور تمدنی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سیلم حامد رضوی نے لکھا ہے کہ

> نواب شاہجہاں بیگم کے دور حکومت میں بھوپال مشرقی تہذیب و تمدن کا گہوراہ بنا ہوا تھا۔ قدامت پرستی مذہب پرستی و مشرقی علوم و فنون کی حکومت تھی۔ تصورات و عقائد اور زندگی میں جو انقلاب برٹش انڈیا میں برپا ہوا تھا بھوپال اس سے قطعی بیگانہ تھا۔ مولوی صدیق حسن خاں کی مساعی جمیلہ نے جہاں بھوپال کی مذہبی اصلاح کی وہاں ایک ایسا نظام تعلیم بھی مسلط کر دیا۔ جس نے مولوی تو بہت پیدا کیے مگر دماغوں کو اسانقلاب کے لیے تیار نہیں کر سکا جو پورا ہندوستان میں نمودار ہو رہا تھا۔(۱۰۶)

نواب سلطان جہاں بیگم نے بھوپال پر حکمرانی کے ساتھ علم و ادب کے فروغ میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ انہیں جہاں سے بھی اچھی بات بہتر طریقہ سے معلوم ہوتی اس کو عوام میں رائج کرنے کی زبانی اور تحریری دونوں طرح سے کوشش کرتی تھیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم کے عہد میں ریاست بھوپال نے ہمہ جہت ترقی کی منازل طے کیں۔ سلطان جہاں بیگم محض ادب نواز ہی نہیں بلکہ خود بھی مصنفہ تھیں۔ بھوپال میں تاریخ لکھنے کا رواج سردار دوست محمد خاں کے روزنامچہ کی شکل میں ابتداء ریاست سے ہی تھا۔ نواب سکندر بیگم کے عہد سے اس روایت کو تقویت ملنا شروع ہو گئی۔ نواب سکندر بیگم نے دفتر تاریخ قائم کیا تھا۔ انہوں نے بھوپال کی منضبط تاریخ لکھنے کے لئے کافی مواد جمع کیا مگر عمر نے ان سے وفا نہیں کی اور ان کے انتقال کے بعد نواب شاہجہاں بیگم نے اپنی والدہ کی تاریخ' تاج الاقبال تاریخ بھوپال'' کے نام سے ایک کتاب ترتیب دے کر شائع کروائی تھی۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے اس تاریخی سلسلہ کو آگے بڑھاتے ہوئے اس میں "دختر اقبال" اور "گوہر اقبال' کے نام سے دو کتابیں تصنیف کر کے اضافہ کیا تھا۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے تزک بابری کی طرز پر "تزک سلطانی'' لکھی۔ ان کی مصنفہ اور مولفہ کتب کی تعداد ۴۰ تک پہنچ گئی تھی۔ ان کی کتب کے خاص موضوع تاریخ ریاست بھوپال، فرمانروایان بھوپال، ریاست

کی سوانح، بچوں اور خواتین کے صحت عامہ، معیشت اور معاشرت، اور تعلیم کا فروغ اس کے علاوہ مذہب و اخلاق اور امور خانہ داری سے متعلق ہیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے حج کا سفر نامہ بھی لکھا ہے۔

نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنی تصانیف میں قدیم و جدید علوم سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ ان کا طریقہ کار یہ تھا جب کسی کتاب کو لکھنے کا ارادہ کرتیں تو دفتر تاریخ اس موضوع پر مواد اکٹھا کر کے انہیں دے دیتا تھا۔ وہ اس کا مطالعہ کر کے تصنیف و تالیف کا کام کرتیں تھیں۔ اگر ان کو کسی انگریزی کتاب سے اقتباس کی ضرورت ہوتی تو اس متعلقہ حصے کو نشان زد کر دیتی تھیں تو دفتر تاریخ اس کا ترجمہ کر کے دے دیتا، بعض اوقات خود ترجمہ کر لیا کرتیں اور اس میں حذف و اضافہ کرتی تھیں۔ کتاب مکمل ہونے کے بعد اپنی کتاب کا مسودہ اسی موضوع سے مناسبت رکھنے والے کسی ذی علم کے پاس تنقیدی رائے کے لئے بھیج دیتی تھیں۔ اور اپنی کتاب پر آنے والی رائے پر سنجیدگی سے غور و فکر کرتیں اور مشورے کے مطابق ترمیم و اضافہ کر دیا کرتی تھیں۔ ریاست کے امور کی انجام دہی، مختلف امراء اور ملاقاتیوں کی بھوپال آمد پر ان سے ملاقات کے باوجود سلطان جہاں بیگم کا مطالعہ اور تصنیف و تالیف کا کام جاری رہتا تھا۔ اپنے تصنیف و تالیف کے کام کے متعلق نواب سلطان جہاں بیگم لکھتی ہیں کہ

> جب ریاست کے کاموں سے اور تمام انتظامات کے غور و فکر سے طبیعت میں اضمحلال پیدا ہوتا ہے تو یہ مشغلہ بہبودی صنف نازک باعث ہماری راحت و آرام کا ہوتا ہے۔(۱۰۷)

نواب سلطان جہاں بیگم میں قومی و ملکی ترقی، انسانی ہمدردی کے ساتھ ساتھ انسانیت کے فروغ کا مقصد اور جذبہ کار فرما تھا۔ ان کی تمام تالیفات و تصنیفات مقصدیت سے پر ہیں۔ وہ سب اپنے عہد کی ضروریات کو مد نظر رکھ کر لکھی گئی۔ سلطان جہاں بیگم کی کتب کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ وہ جیسا بولتی ویسا ہی تحریر کرتی تھیں۔ ان کا انداز تحریر حشو و زوائد سے پاک، شستہ اور دلنشین ہے۔ طرز بیان مدلل، پر زور اور پر اثر ہے۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے روکھے اور خشک مضامین دلچسپ اور دلپذیر ہیں۔ وہ ثقیل الفاظ اور مشکل اصطلاحات سے گریز کرتی تھیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم کی تحریریں ان کی فکر، درد، خلوص اور ہمدردی کے جذبات و احساسات کی آئینہ دار ہیں۔ ان کی اکثر کتب کی ابتداء میں سرورق کی پیشانی پر اس موضوع سے مطابقت رکھتی ہوئی کوئی نہ کوئی قرآنی آیت لکھی ہوئی ہے۔

نواب سلطان جہاں بیگم نے وقتاً فوقتاً کتابیں تصنیف کیں۔ان کی تصانیف معمولی قصے کہانیوں پر مشتمل نہیں ہیں بلکہ تمام مختلف اور مفید مضامین سے بھری پڑی ہیں مثلاً کوئی خانہ داری پر ہے تو کوئی سائنس پر، کوئی باغبانی پر اور کسی میں تیمار داری کا بیان ہے۔ کہیں مستورات کے حقوق و مراتب پر بحث ہے تو کہیں انہیں مذہب کی پابندی پر متوجہ کیا ہے۔ کسی میں اخلاقی سبق ہے، کسی میں عیدین کا بیان ہے غرض جس کتاب کو لیں وہ کسی نہ کسی مفید موضوع پر لکھی گئی ہے۔ انہوں نے بچوں کے لیے بھی کتب تحریر کیں۔ عورتوں کے متعلق کتابوں میں دلچسپ معلومات کا خزانہ ہے۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے ریاست بھوپال کے قوانین وضع کئے اور ان کو کتابی شکل میں طبع کروایا۔ ذیل میں نواب سلطان جہاں بیگم کی چند کتب پر تبصرے پیش کیے گئے ہیں۔

ا۔ سبیل الجنان:

"سبیل الجنان" یہ کتاب ۴۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۹۱۷ء کو مطبع سلطانی بھوپال سے مولوی محمد اللہ کے زیر اہتمام طبع ہوئی۔ مذہب اسلام کے متعلق کی گئی تقاریر کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ حمیدیہ اسکول کے کورس میں شامل رہا ہے۔ ان تقاریر میں انہوں نے شعائر اسلام پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس میں ایمان، اسلام، نماز، شرائط نماز، روزہ، لیلۃ القدر، عید الفطر، عید الاضحی، زکوۃ، حج وغیرہ ارکان کی طرف توجہ فرمائی ہے۔ اور ہر رکن کو علیحدہ علیحدہ نہایت مدلل اور دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ جس کو ذی علم خواتین کے علاوہ معمولی لکھی پڑھی خواتین آسانی سے سمجھ سکیں۔ یہ تقاریر مختلف مواقع پر پرنسس آف ویلز لیڈیز کلب میں کی گئی تھیں۔ انہوں نے خواتین کو یاد کرایا کہ اسلام نے عورت کو جو مرتبہ عطا کیا ہے اور مختلف حقوق دیئے ہیں وہ دوسرے مذاہب میں نہیں دیئے گئے۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے اسلام کی حفاظت کی ذمہ داری مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی قرار دی ہے۔ انہوں نے خواتین سے کہا کہ ان کا عمل اور ان کی تربیت کا بچوں پر خاص اثر پڑتا ہے۔ وہ خاموشی سے غیر محسوس انداز میں بچوں کی مذہبی تربیت بھی کر سکتی ہیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم خواتین کو زیور تعلیم سے آراستہ اور اپنے مذہب کا پابند دیکھنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے تمہید میں لکھتی ہیں کہ

> خواتین اسلام کو زمانہ حال کی تعلیم اور بہترین تمدن و معاشرت سے بہرہ یاب دیکھنے کا یقیناً مجھ سے زیادہ کوئی شخص آرزومند نہ ہوگا۔ اور اس مقصد کے لیے میں اپنی ہر امکانی کوشش خواہ اس میں مجھ کو تکلیف بھی برداشت کرنی پڑے عمل میں لاتی ہوں۔ لیکن اس مقصد سے ایک اور

بھی اعلیٰ مقصد میرے پیش نظر ہے اور وہ یہ ہے کہ ان میں مذہبی روح، مذہبی پابندی، اور مذہبی حمیت بھی بدرجہ اولیٰ ہو کیونکہ تمام شائستہ اور اعلیٰ اوصاف کی بنیاد مذہب کی ہی زمین پر قائم ہوتی ہے۔ اور مذہب ہی نجات آخروی کا باعث ہے۔(۱۰۸)

۲۔ سیرت المصطفیٰ:

نواب سلطان جہاں بیگم کی زیر نظر کتاب "سیرت المصطفی " بھی ان کے لیکچروں کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب ۱۵۸ صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۹۱۹ء کو مطبع سلطانی بھوپال سے طبع ہوئی تھی۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے ۱۹۱۷ء میں رسول اکرم کی سیرت مبارکہ پر بھوپال کے پرنسس آف ویلز لیڈیز کلب میں تقاریر کیں اور یہ کتاب ان تقاریر کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ نواب سلطان جہاں بیگم کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ ان لیکچروں کے دلکش طرز بیان کا اندازہ کتاب کے دیکھنے سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ نواب سلطان جہاں بیگم کی اس کتاب کو مولوی سعید الدین نے اصلاحی نقطہ نظر سے دیکھا اور اپنی آراء پیش کیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم اپنی تمام تصانیف جو مذہب سے متعلق ہوتیں مولوی صاحب سے ہی اصلاح کرواتی تھیں۔ اپنی تقاریر میں نواب سلطان جہاں بیگم نے اس بات کا خاص طور پر التزام کیا ہے کہ یہ تقاریر خواتین کے لیے مفید ہوں۔ اس کتاب کے دیباچہ میں لکھتی ہیں۔

> میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ اس میں جس قدر حالات لکھے گئے ہیں وہ انتہائی تحقیق و تنقید کے بعد لکھے گئے ہیں لیکن جہاں تک ہو سکا ہے صحیح روایات کا لحاظ رکھا ہے۔ اور زیادہ تر وہ نتائج نکالے گئے ہیں جو خواتین کے لیے مفید ہیں۔ آج تک جس قدر حضور سرور کائنات کی سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں ان میں کوئی سوانح عمری ایسی نہیں ہے جو مخصوص خواتین کے لیے مفید ہو۔ اس ضرورت کو ملحوظ رکھ کر میں نے یہ لیکچر مرتب کئے ہیں اور ایک حد تک وہ حالات و واقعات تلاش کر کے جمع کر دیئے ہیں جن کا خواتین کو جاننا ضروری ہے۔(۱۰۹)

اس کتاب کے موضوعات ولادت سے بعثت تک، بعثت سے ہجرت، ہجرت سے فتح، غزوہ حنین تا وفات تک تمام واقعات کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اور ان خصوصی موضوعات کے بھی ذیلی عنوانات قائم کر کے سیرت کی تکمیل کی گئی ہے۔ دنیا میں جتنی بھی اہم شخصیات گزری ہیں ان میں سب سے بلند و برتر شخصیت حضرت محمدؐ کی ہے۔ آپ کی ذات مبارک پر جس قدر سوانح عمریاں اور حیات مبارکہ پر کتابیں لکھی گئی اتنی کسی اور شخصیت پر اور مذہب میں نہیں

لکھی گئی ہیں۔ حیران کن بات یہ ہے کہ حضرت محمدؐ کی سیرت و کردار پر جتنا کام ہوا ہے اس میں زیادہ تر غیر اقوام اور غیر مذہب کے مصنفین کا ہے۔ جن مصنفین نے تعصب سے آزاد ہو کر آپؐ کے حالات زندگی مرتب کئے انہوں نے آپ کی علمی شخصیت کا اعتراف کیا ہے اور اس بات کو بھی تسلیم کیا ہے کہ آپ کی زندگی ایک بہترین اسوہ حسنہ ہے۔ بقول نواب سلطان جہاں بیگم

> آپ ایک مقنن بھی تھے، ایک سپہ سالار بھی تھے آپ ایک قاضی بھی تھے ایک تاجر بھی تھے، اور آپ ایک صاحب اہل و عیال بھی تھے۔ اگر مذہبی عقیدت اور تھوڑی دیر کے لئے اس حیثیت سے کہ آپ خدا کے برگزیدہ پیغمبر تھے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو آپ کی اعلیٰ سے اعلیٰ شخصیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔۔۔ تین سال ہوئے کہ میں نے خواتین کی آگاہی و واقفیت کے لئے میں نے سیرت نبوی پر لیڈیز کلب بھوپال میں چند لیکچر پڑھے تھے جن کا یہ مجموعہ "سیرت مصطفےٰ" کے نام سے شائع کرتی ہوں۔(۱۱۰)

نواب سلطان جہاں بیگم نے اس کتاب میں تمام اسلامی تعلیمات جو ہمیں آپؐ کی حیات مبارکہ سے ملیں ان کا مفصل بیان کیا ہے۔ ان کی کوشش تھی کہ وہ ہندوستان میں بسنے والی تمام خواتین کو مذہبی باریکیوں سے روشناس کروائیں اور اس اہم کام کو سرانجام دینے کے لئے انہوں نے سب سے اہم اور مقدس ہستی کی شخصیت کو عملی نمونہ کے طور پر پیش کیا ہے۔

۳۔ عفت المسلمات:

نواب سلطان جہاں بیگم کی کتاب "عفت المسلمات' ۱۹۱۸ء مفید عام پریس آگرہ سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب ۲۰۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ نواب سلطان جہاں بیگم کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ دیباچہ و مقدمہ کے علاوہ اس کتاب کو سات ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ باب اول پردہ اور شریعت، باب دوم عفت و حیا ہماری نیکیوں کی بنیاد ہے، باب سوم بے پردگی کے نتائج، باب چہارم دنیائے اسلام میں بے پردگی، باب پنجم مشرق اور مغرب کے گھر، باب ششم عورت کی خانگی اور بیرونی معاشرت، باب ہفتم مخالفین پردہ کے دلائل اور ان کی تردید پر مشتمل ہے۔ جب عورتوں کی تعلیم اور اصلاح کا چرچا ہندوستان میں پھیلا اس وقت سے آج تک اور کسی مسئلہ پر اتنی بحثیں نہ ہوئی ہونگی جتنی کہ پردے پر ہوئی ہیں۔ اور ابھی تک جاری ہیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے کتاب لکھنے سے پہلے علمائے اسلام کی کتابیں اور مغربی مصنفین کی تصانیف کا بغور مطالعہ کیا جنھوں نے اپنے ملک کی آزادی اور ان کے مسائل پر

مضمون لکھ کر اپنے ملک میں شائع کروائے۔اس میں سب سے پہلے پردہ کی تاریخ بے حد تفصیل کے ساتھ لکھی گئی ہے۔اور خواتین اسلام میں پردہ کی جو پابندی رہی اس کے موثر واقعات سے اسلام میں پردہ کی حمایت میں جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں ان کا بہت خوب جواب دیا ہے۔نواب سلطان دیباچہ میں اس حوالے سے لکھتی ہیں کہ

> یہ کتاب جس میں پردہ کے مضمون پر ہر پہلو سے بحث کی گئی ہے صرف اس غرض سے لکھی گئی ہے کہ یہ مسئلہ آج کل خواتین اسلامی کے لئے ایکسوال بن گیا ہے۔۔۔۔میں نے اس کتاب میں اپنی ذاتی رائے کو بہت مدخل دیا ہے احکام مذہب یعنی آیات قرآنی اور احادیث نبویؐ کو درج کرنے کے بعد ان کے متعلق مشاہیر علماء کی جو رائیں ہیں وہ نقل کر دی ہیں۔ان میں قدیم علماء کے طبقہ میں شاہ ولی اللہ صاحب اور مولانا بحر العلوم بڑے فقیہہ اور محدث ہیں۔روشن خیال اور جدید طبقہ میں مولانا شبلی اور مولانا نذیر احمد نہایت ممتاز اور مستند ہیں اور جدید تعلیم یافتہ گروہ میں ان کا تجربہ علمی مشہور ہے۔(۱۱۱)

نواب سلطان جہاں بیگم نے اس کتاب میں ہر پہلو پر بحث کی ہے۔اور حقیقت یہ ہے کہ اس تصنیف کو جو چالیس سال کے غور و فکر کا نتیجہ ہے اس موضوع کی تمام دوسرے کتابوں پر فوقیت حاصل ہے۔اس کتاب میں پردہ کے مسئلہ پر ہر پہلو سے بحث کی گئی ہے۔نواب سلطان جہاں بیگم نے عورتوں کے لئے عفت و حیا کو پورے دلائل کے ساتھ ضروری قرار دیا ہے۔انہوں نے اس کو قرآن و حدیث سے ٹھوس دلائل پیش کرنے کے بعد کئی ممالک میں پیش آئے واقعات بھی تحریر کئے ہیں۔انہوں نے واضح طور پر اس کتاب میں تحریر کیا ہے کہ اکثر روشن خیال لوگوں کا یہ کہنا ہوتا ہے کہ پردہ لڑکیوں کی تعلیم کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے،اس میں وہ اعلیٰ تعلیمی مدارج پر اعتماد طریقے سے طے نہیں کر پاتی ہیں۔گویا پردہ ایک تسلیم شدہ وجہ مانع قرار دے دیا گیا جبکہ یہ ایک صریح غلطی ہے۔تعلیم کی راہ میں پردہ رکاوٹ نہیں بلکہ انداز تعلیم میں کچھ نقائص ہو سکتے ہیں۔تعلیم جو برے اثرات سے صاف و پاک ہو ہمیشہ انسان کے لئے مفید ہوتی ہے۔اگر ان اسباب کو جو بداخلاقی کی تحریک کرتے ہیں دور نہ کیا جائے تو شر انگیزی کا سبب بن جاتے ہیں۔

> زمانہ قدیم میں بھی بہت سی عورتیں ایسی گزری ہیں جنہوں نے علم اور فن تقریر میں کمال حاصل کیا ہے لیکن آزادی اور غلط اصول کی بدولت ان کی وقعت زن بازاری سے زائد نہ تھی چنانچہ یونان میں جبکہ سقراط جیسے مشہور حکیم کا زمانہ تھا۔اور یہ ملک اپنی ترقی و تہذیب اور قوت کے لحاظ سے نہایت عروج اور اوج پر تھا۔ایک فاحشہ عورت اساس یہ فلسفہ اور علم

> خطابت اور اپنے قوت بیان میں اس قدر بے عدیل و یکتا تھی کہ اس کے زمانے کے بعض فاضل و ماہر لوگ بھی اس کے لیکچر میں حاضر ہوتے تھے جس میں سقراط کا نام بھی شامل ہے۔(۱۱۲)

مندرجہ بالا اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ خواتین کسی بھی درجہ پر مردوں سے پیچھے نہیں رہیں مگر شریعت اور مذہبی روسے پردہ بہت اہم عنصر ہے کیونکہ پردہ سماج میں ہونے والی خرابیوں کو پیدا ہونے سے روکتا ہے۔نواب سلطان جہاں بیگم نے قدیم تہذیبی روایات کو مد نظر رکھ کر عورتوں کے علمی مشاغل اور تعلیم نسواں کے حوالے سے لکھا ہے کہ

> اگر اہم کو اپنی گزشتہ تاریخ کا کچھ علم ہو تو معلوم ہو سکتا ہے کہ پہلے زمانہ میں مسلمان خاتونیں پردہ کی پابندی کے ساتھ علمی مشاغل میں کس طرح بے تکلف تعلیم حاصل کر سکتی تھیں اور دوسروں کو تعلیم دیتی تھیں،بلکہ ان کی یہ سب سے بڑی فضیلت ہے کہ باوجود ان پابندیوں کے وہ کسب کمالات علمیہ کرتی تھیں۔تاریخ اسلام یں بہت سی ایسی عورتیں گزری ہیں جنھوں نے اعلی تعلیم حاصل کی اور لوگوں کو تعلیم دی۔(۱۱۳)

اس سے پہلے کوئی کتاب ایسی نہیں لکھی گئی۔جو عام فہم اور سلیس ہونے کے ساتھ ہی اس قدر جامع بھی ہو۔یعنی اس میں تمدنی ،مذہبی،اخلاقی ، طبّی ،معاشرتی غرض ہر پہلو سے پردہ پر بحث کی گئی ہے۔اور اس کے ساتھ احادیث قرآن فقہ اور علمائے اسلام کے فتوے بھی ہوں یوں زیر نظر مقصد کے پورا کرنے کے لیے یہ کتاب تالیف کی گئی۔قرآن مجید کی تعلیم جو خاص طور پر مسلمانوں کے لئے ہے اس سے دوسری قومیں استفادہ کر رہی ہیں اور مسلمان خواب غفلت میں مبتلا ہیں۔

۴۔ مدارج الفرقان:

قرآن مجید کا ادب اور اس کے پڑھنے میں جن جن باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔وہ سب ترتیب وار بیان کی گئی ہیں۔

۵۔ افضال رحمانی:

اس کتاب میں کلمہ طیبہ ،بسم اللہ ،قرآن مجید ،سورۃ فاتحہ اور درود شریف کے فضائل نہایت صحیح روایات سے لکھے گئے ہیں۔نواب سلطان جہاں نے اس رسالہ میں بسم اللہ ،سورۃ فاتحہ ،قرآن مجید اور درود و سلام کے بعد احادیث

سے فضائل بیان کیے ہیں۔انہوں نے یہ رسالہ اپنی پوتیوں صاحبزادی عابدہ سلطان اور صاحبزادی ساجدہ سلطان کے نشرہ کی تقریب کے وقت تقسیم کرنے کے لیے تالیف کیا تھا۔

۶۔ فضائل شہور:

قمری مہینوں میں جو عبادتیں اور صدقے کئے جاتے ہیں۔ان کے متعلق صحیح حدیثیں اور روائتیں جمع کر کے نہایت دلچسپ طریقے سے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

۷۔ خانہ داری کا پہلا حصہ ہدیۃ الزوجین:

"خانہ داری کا پہلا حصہ ہدیۃ الزوجین "یہ کتاب ۱۹۱۵ء میں مطبع سلطانی باہتمام مولوی حمیداللہ بھوپال سے چھپی۔اس کتاب کا دیباچہ نواب سلطان جہاں بیگم کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔یہ کتاب سلسلہ وار کئی حصوں میں شائع ہوئی۔اس کتاب کے ۳۵۶ صفحات ہیں۔تمام حصے ضروریات خانہ داری کے حوالے سے مختلف عنوانات کے تحت ترتیب دیئے گئے ہیں۔زیر نظر کتاب خانہ داری کا پہلا حصہ ہے کیونکہ خانہ داری و معاشرت کی ابتداء ان تعلقات سے قائم ہوتی ہے جو شوہر و بیوی کے درمیان ہوتے ہیں۔اس کتاب کے وجود میں آنے کا پس منظر ہندوستان کے سماجی حالات بالخصوص خانہ داری کے مسائل تھے۔نواب سلطان جہاں بیگم نے جب زمانے کی بدلتی روش کا گہرائی میں جائزہ لیا تو انہیں ان مسائل کے مختلف اسباب نظر آئے۔ایک تو یہ کہ اس عہد میں انگریزوں کی آمد سے ہندوستانیوں کی زندگیاں بہت شدت سے متاثر ہو رہی تھیں اور ساتھ ہی جدید تعلیم و تمدن کے اثرات بھی معاشرت اور خانہ داری پر گہرے اثرات پرتب ہوئے۔بقول نواب سلطان جہاں بیگم

> روز بروز اسلامی معاشرت اور سلیقہ مین تنزل ہوتا جاتا ہے،اگر یہ کہا جائے کہ مسلمانوں میں سلیقہ معاشرت و خانہ داری نہ تھا تو بالکل غلط ہے، بات یہ ہے کہ ہمارے مورخین نے ہمارے اسلاف کی خانگی معاشرت و طریق زندگی کے بیان کرنے کی تکلیف نہیں اٹھائی،یہی وجہ ہے کہ بالکل پتہ نہیں چلتا کہ اسلاف کا کیا طریق تھا،کیسی معاشرت تھی اور کیسا سلیقہ تھا۔۔۔ہمارے ہاں یا تو لکیر کے فقیر رہ کر زندگی بسر کرنا جانتے ہیں یا جدید چیزوں کی ایسی تقلید کرتے ہیں کہ بالکل اسی رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔(۱۱۴)

مندرجہ بالا اقتباس کے تناظر میں اگر دیکھا جائے تو ترقی یافتہ ممالک میں ہر چیز کو جہاں ایک فن بنالیا گیا ہے وہیں ان لوگوں نے معاشرت اور خانہ داری کے لیے بھی باقاعدہ اصول و ضوابط مقرر کیے۔یوں نواب سلطان جہاں بیگم کے دل میں ایسی ایک باقاعدہ کتاب لکھنے کی خواہش اس وقت شدت سے ابھری جب ان کی نظر خانہ داری کے حوالے سے کتاب "دی بک آف سی ہوم" پر نظر پڑی۔یہ کتاب ۶ جلدوں میں شائع کی گئی اور تقریباً دو ہزار صفحات پر مشتمل تھی۔نواب سلطان جہاں بیگم نے اس کتاب کا ترجمہ کروایا تھا۔اس کتاب کی اہمیت کے حوالے سے بقول نواب سلطان جہاں بیگم

> میرا بے اختیار دل چاہتا تھا کہ ایسی ہی کتاب اردو مین ہو جس سے اردو دان خواتین فائدہ حاصل کر سکیں لیکن اس کام کو مین نے اپنی طاقت سے باہر پایا۔۔۔چونکہ میں نے اس امر کو بھی اپنا قومی اور ملکی فرض سمجھا کہ جب تک مجھے ذرا بھی فرصت ملے کچھ نہ کچھ ملک و قوم کے لیے کروں خصوصاً خواتین کے لئے اپنا وقت صرف کرون۔اسی بناء پر مین "بک آف دی ہوم" اور مثل اس کے دوسری کتابون کو پیش نظر رکھ کر اس کام کو شروع کر دیا۔۔(۱۱۵)

نواب سلطان جہاں بیگم نے اس کام کی تیاری میں اپنی والدہ نواب شاہجہاں بیگم کی کتاب "تہذ یب النسواں و تربیت الانسان" اور شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد خاں کی کتاب "الحقوق و فرائض" سے بھی مدد لی تھی۔اس میں شوہر اور بیوی کے شرعی اور قانونی حقوق تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔نکاح، تعداد ازدواج، حقوق الزوجین، مہر، نان ونفقہ، حسن سلوک تعلیم مسائل دینی، حقوق شوہر اختیارات زوجین، باہمی اخلاص و محبت، زوجین میں تفریق، وفات، طلاق، خلع، ایلاء، ظہار، لعان، عدت ترکہ وغیرہ کا نہایت واضح بیان ہے۔اس کتاب کے مطالعے سے زوجین کو اپنے حقوق و فرائض اور اختیارات سے پوری آگاہی ہو جاتی ہے۔جو خانہ داری کی پہلی منزل ہے۔نواب سلطان جہاں بیگم کتاب کے دیباچہ میں لکھتی ہیں کہ

> تمدن معاشرت کا یہ ایک عام مسئلہ ہے کہ جس قدر ایک آدمی کے خانگی معاملات میں خرابی اور ابتری پیدا ہوتی ہے ۔اسی قدر اس کے بیرونی مشاغل میں فتور پڑ جاتا ہے اور گھر کی بدانتظامی کا اثر اس کے ملکی و قومی فرائض پر بھی پڑتا ہے۔دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کا راز ان کے گھروں کے باقاعدہ انتظام ہی میں مضمر ہے۔(۱۱۶)

اردو میں اس موضوع پر بہت کم کتابیں لکھی گئی تھیں وہ خانہ داری کے کل مضامین پر حاوی نہیں تھیں۔ عورتوں کو ان باتوں کا جاننا ضروری اور مفید ہے کیونکہ ان ہی پر گھر کی راحت اور مسرت کا انحصار ہوتا ہے۔ گھریلو زندگی کی خوش انتظامی، حسن معاشرت پر قومی اور ملکی بہبودی کا دارومدار ہے۔ اس لیے سلطان جہاں بیگم نے یہ کتابی سلسلہ شروع کیا تھا۔ اصول خانہ داری کے متعلق وہ لکھتی ہیں کہ

> بلاشبہ اصول خانہ داری کا مضمون نہایت وسیع ہے۔ کیونکہ جس طرح انسان خلاصہ عالم یا عالم صغیر ہے اسی طرح گھر کو خلاصہ دنیا یا دنیائے صغیر سمجھنا چاہیے۔ گھر دنیا میں ہوتا ہے اور دنیا گھر میں ہوتی ہے۔ اس لیے خانہ داری کے کل اجزاء پر تفصیلی بحث کی جائے تو بہت ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔ مگر یہ کام ایک فرد واحد کی طاقت سے باہر ہے اس کے لئے اجتماعی قوت کی ضرورت ہے تاہم میں نے جہاں تک ہو سکا ہے اصولی اور کار آمد باتوں کو پیش نظر رکھا ہے۔(۱۱۷)

نواب سلطان جہاں بیگم نے تیسرے حصہ میں آداب معیشت و معاشرت وغیرہ کے اصول بیان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ان میں ایک معیشت دوسرا معاشرت ہے۔ اس زیر نظر کتاب میں مکان، آرائش کے اصول، فرنیچر کے اقسام، روشنی، صفائی، گھر کے اخراجات، سبزی ترکاری، باورچی خانہ، مختلف برتن، باغ کی آرا، آداب خورد و نوش، لباس، زیور، کپڑے کے اقسام، داغ دھبے دور کرنا، کپڑے رنگنے کی ترکیب، مختلف اقسام کے کپڑوں کی حرمت، پرانے کپڑوں کو کار آمد بنانا، جواہرات اور زیور کی حفاظت و صفائی، بچوں کا لباس اور بستر، کپڑوں کا کیڑوں سے بچاؤ موضوعات پر ہدایات اور طریقے بتائے ہیں۔ خواتین کے لباس کے بارے میں نواب سلطان جہاں بیگم لکھتی ہیں کہ

> عموماً جو لباس آجکل مروج ہیں اون کے علاوہ جدید لباسوں کی وضع میں بیشتر ساڑی اور لہنگے کا رواج ہوتا جاتا ہے۔ لہنگے کی وضع میں اگرچہ طرح طرح کی تراش خراش کر اس کو عام قسم کے لہنگے سے جو ہندوؤں میں مروج ہے تبدیل کر دیا ہے لیکن پھر بھی لہنگا ہی نام ہے۔ میرے خیال میں نہ ساڑی ہو نہ لہنگہ نہ غرارہ دار پانجامہ، بلکہ معمولی قسم کا تنگ مہری کا پانجامہ ہو، نہ چست ہو اور نہ بد نما۔۔۔۔ میں نے بھی اپنے بھوپال کی بیبیوں کے واسطے ایجاد کیا ہے اور تمام بیبیاں اسکو پہنتی ہیں اول اول اسکی تراش اور سینے میں وقت ضرور ہوئی لیکن دو ایک دفعہ کے بعد آسانی ہو گئی۔۔۔۔(۱۱۸)

۸۔ خانہ داری کا تیسرا حصہ موسوم بہ معاشرت: (جزدوم)

نواب سلطان جہاں بیگم کی کتاب "خانہ داری کا تیسرا حصہ موسوم بہ معاشرت" بہت اہم ہے۔ اس کتاب کے ۲۹۱ صفحات ہیں۔اس کتاب میں ضمیمہ جات بھی شامل ہیں۔۱۹۱۶ء کو مطبع سلطانی بھوپال سے مہتمم مطابع منشی مولوی محمد حمید اللہ کے زیر اہتمام طبع ہوئی۔زیر نظر کتاب میں معاشرت کے اصول و قواعد اور بہتر طور پر زندگی گزارنے کے گر سمجھائے ہیں۔یہ کتاب تربیت الاطفال کے سلسلہ کی ایک کڑی کہی جا سکتی ہے۔نواب سلطان جہاں بیگم بچوں کی تربیت کو خانہ داری کا ایک جزو قرار دیتی ہیں۔ماں کی تربیت کو اس سلسلہ میں ضروری سمجھتی ہیں۔بچہ اپنے ابتدائی سات سال ماں کی گود اور اس تیار کردہ ماحول میں گزارتا ہے۔اور اس ماحول کا اچھا یا برا اثر بچہ پر پڑنا لازمی ہے۔لہذا ماحول کو بہتر بنانا ضروری عنصر ہے اس حوالے سے نواب سلطان جہاں بیگم لکھتی ہیں کہ

> یہ کتاب خانہ داری کے تیسرے حصہ ادوسرا جزو ہے۔پہلا جزو معیشت کے نام سے ہے جس ایسے امور کا بیان ہے کن کا دائرہ عمل صرف گھر کے اندر محدود ہے۔اور اس دوسرے جزو میں زیادتر ان امور سے بحث کی گئی ہے جو گھر کی بیرونی زندگی سے متعلق ہیں اور معاشرتی تعلقات کو بہتر اور عمدہ بنانے کے لئے ضروری ہیں۔(۱۱۹)

معیشت خانہ داری کے تیسرے حصے کا پہلا جزو ہے۔تدبیر منزل، مکان کی وضع و قطع، چھت، صحن، اور اس کے مختلف حصوں کی بابت الگ الگ مفید ہدایتیں ہیں مثلا مکان کی آرائش ،رنگوں کی اقسام اور ان کا تناسب وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔اس کتاب میں تمام مضامین چون باب اور ۴۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

خانہ داری کے دوسرے جزو معاشرت اس کتاب میں ۴۹ا ابواب ہیں۔ان ابواب میں بچوں کی تعلیم و تربیت ،بچوں کی تعلیم اور سزائیں،گھر کی ضروری تعلیم اسکول کے کام کی نگرانی ،گھر کے ملازم ، مہمان نوازی کے آداب ،آداب ملاقات ، پارٹیاں ناشتہ لنچ اور ڈنر میں سلیقہ مندی ،کتب خانے ،خط و کتابت ، مضمون نویسی ،گھروں میں پیشے، گھوڑے گاڑی کی احتیاط،گھر کے پالتو جانور ، وغیرہ وغیرہ کا بیان کیا ہے۔ مہمان نوازی کے ساتھ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ میزبانوں کا کیا فرض بنتا ہے۔اس حوالے سے نواب سلطان جہاں بیگم لکھتی ہیں کہ

> مہمان نوازی ایک ایسا اخلاقی جوہر ہے جو ہر آدمی کی طبیعت میں مختلف درجہ کا ہوتا ہے اور اسکی جذبات مہمانوں کی خاطر اور تواضع کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں لیکن اگر ان کے جذبات کو خود

نمائی اظہار فیاضی، نمود و نمائش کے ساتھ آلودہ کیا جائے تو وہ اصلی جوہر خاک ریاکاری کے نیچے دب جاتا ہے۔(۱۲۰)

آداب ملاقات بتاتے ہوئے انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ مشرقی اور یورپین طرز معاشرت کے مطابق کس طرح آپس کے تعلقات کو استوار رکھا جا سکتا ہے۔اس کتاب میں انہوں نے دعوت نامے پارٹیاں، کلب، کھیل، کتب خانے، خط و کتابت، مضمون نویسی، گھریلو صنعتیں، مصوری و نقاشی کے طریقے، گھوڑا گاڑی کی احتیاط، گھر کے مویشی، پرند اور پالتو جانور، تبدیلی مکان، ریلوے سفر کے لئے ضروری احتیاطیں بتائی ہیں۔ ضمیمہ کے طور پر قواعد ڈاک خانہ، سیونگ بینک کے ضروری قواعد اور ریلوے قواعد بتائے اور سمجھائے ہیں۔اس کے ساتھ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ مذہب کے قائم کئے گئے آداب تمدن، معاشرت اور تہذیب کے اصولوں کو دوسری اقوام کے اصولوں میں جذب نہیں کرنا چاہیے۔اپنے اصول و شعار کو قائم رکھنا بہت ضروری ہے۔ بہتر تعلقات قوم کی کامیابی کی دلیل ہوتے ہیں اس لئے آداب ملاقات کا جاننا ہر فرد کے لئے ضروری ہے بقول نواب سلطان جہاں بیگم

> اگرچہ ہر قوم اور ملک میں تمدن و تہذیب اور معاشرت کے جداگانہ طریقے ہوتے ہیں اور ہر جگہ اپنے ہی طریقے کی پابندی کی جاتی ہے۔جب مختلف ممالک کے باشندوں میں تعلقات روابطہ پیدا ہو جاتے ہیں تو لا محالہ ایک کو دوسرے کے تمدن و تہذیب اور طریقہ معاشرت کو مد نظر رکھنا پڑتا ہے۔ہندوستان ہمیشہ غیر اقوام اور غیر ممالک کے باشندوں کے طریق تمدن و معاشرت اور تہذیب سے متاثر رہا ہے اب روز بروز انگریزوں کے ساتھا یسے روابط و تعلقات بڑھ رہے ہیں کہ یورپین و ہندوستانی خواتین باہم رسم و رواد رکھتی ہیں اور ایک دوسرے کے جلسوں میں شریک ہوتی ہیں، تمام ہندوستانی اقوام پر ان کے تمدن و تہذیب اور معاشرت کا اثر پڑ رہا ہے۔۔۔(۱۲۱)

خانہ داری کے تیسرے حصے میں بچوں کی تعلیم و تربیت، ان کے اسکولوں کی نگرانی، گھر تعلیم کا طریقہ، تعلیم میں صحت جسمانی کا خیال۔ غرض ہر قسم کی ضروریات کے متعلق مفید ہدایتیں ہیں۔

۹۔ باغ عجیب: (باب اول)

نواب سلطان جہاں بیگم کی اس کتاب "باغ عجیب" میں ۱۸۶ صفحات ہیں۔ حمیدیہ آرٹ پریس بھوپال سے منشی سراج الدین کے زیر اہتمام دوسری مرتبہ طبع ہوئی۔زیر نظر کتاب کے اوپر سن اشاعت کا اندراج نہیں

ہے۔ کتاب کے تین حصے ہیں۔ اس کتاب میں بچوں کے لئے نہایت مفید اور سبق آموز کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ اور ایسے خوبصورت ودلاویز طریقے سے کہ ایک آدھ حصہ پڑھ کر بغیر پوری کتاب ختم کئے رکھنے کو دل نہیں چاہتا ہے۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے یہ کتاب خاص طور سے بچوں کے لیے لکھی تھی۔ اس کتاب کا موضوع اخلاق ہے یعنی بچوں کے اخلاق اچھے ہوں۔ اس کتاب میں سبزی ترکاری، پھول مجسموں کی زبانی بچوں کو کہانی قصے کے ذریعے سبق آموز باتیں بتائی ہیں۔ بچے ہنسے کھیلتے کار آمد باتوں سے اور اس کے معائب ومحاسن سے واقف ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ایک کہانی جس میں دو بچے صالحہ اور امتیاز گھومتے ہوئے ایک جگہ پہنچتے ہیں۔ وہاں ایک حسین عورت سے ان کی ملاقات ہوتی ہے، وہ اس عورت سے دریافت کرتے ہیں کہ جادو کے باغ میں کیسے جاتے ہیں؟ اس کے بتائے ہوئے طریقہ پر عمل کر کے دونوں بچے اس باغ میں پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں ناریل کے درخت نے ان کو اپنی طرف متوجہ کیا اور انہیں ایک کہانی سنائی اور یوں سبق آموز کہانیوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کتاب میں کہانیاں گل داؤدی، بڑکا درخت، بنفشہ، گل عباس، مٹر، چمبیلی وغیرہ کی زبانی بھی بیان کی گئی ہیں۔ کتاب کی زبان سادہ اور آسان اور طرز تحریر دلچسپ ہے۔ جس سے بچوں کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔

۱۱۔ باغ عجیب (حصہ دوم):

باغ عجیب حصہ دوم اس کتاب میں ۱۶۰ صفحات ہیں۔ ۱۹۲۴ء میں دوسری مرتبہ محمد بشیر الدین خان کے زیر اہتمام سے شمسی مشین پریس آگرہ میں طبع ہوئی۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے یہ کتاب بھی اخلاق کی تعلیم دینے کے سلسلہ میں لکھی ہے۔ اس کی ابتداء صالحہ اور امتیاز کے اپنے گھر واپس آنے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ بچوں کو یہ احساس تھا کہ وہ طویل مدت گھر سے غائب رہ کر باغ عجیب کی سیر کرتے رہے اور کہانیاں سنتے رہے جبکہ ان کی والدہ نے ان سے دریافت کیا کہ

> تم دونوں کہاں چلے گئے تھے کہ صبح کے نکلے گئے اب شام کو آئے ہو تمہارا انتظار کرتے کرتے تھک گئی آج تم نے نہ تو چاشت کے وقت کھانا کھایا اور نہ سہ پہر کو چائے پی۔ علی الصباح ناشتہ کر کے گئے اور اب رات کے کھانے کے وقت آئے۔ (۱۲۲)

اس حصہ میں صالحہ اور امتیاز اپنے ہم عصر ساتھیوں کے ساتھ مخصوص گلاب کی پتیوں کے لباس پہن کر باغ عجیب جاتے ہیں۔ ان بچوں نے بھی پھولوں کی زبان سے نصیحت آمیز کہانیاں سنیں۔ جیسے گیندے کی کہانی، کہانی گل

لالہ کی زبانی، کہانی نشترن کی زبانی، کہانی فلاکس کی زبانی کہانی پتونیا کی زبانی، کہانی کنول کی زبانی، کہانی داؤدی کے زبانی، کہانی گلاب کی زبانی، کہانی چنبیلی کی زبانی شامل ہیں۔ان کہانیوں کو بیان کرنے کا انداز بہت دلچسپ اور دلپذیر ہے۔ یہ سب سبق آموز کہانیاں ہیں۔

باغ عجیب:(حصہ سوم)

نواب سلطان جہاں بیگم کی کتاب باغ عجیب حصہ سوم شمسی پریس آگرہ سے ۱۹۲۴ء میں چھپی۔اس کتاب کے ۶۷ صفحات ہیں۔دیباچہ میں نواب سلطان جہاں بیگم نے " باغ عجیب" کی کہانیوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ

> "باغ عجیب" حصہ اول کی جس کہانی سے ابتداء کی گئی تھی اسی کہانی پر یہ تیسرا حصہ ختم ہوتا ہے،ان تینوں حصوں میں ۳۳ مختلف کہانیاں ہیں جو تمام اخلاقی نصیحتوں سے معمور ہیں۔میں نے دوسرے حصہ میں چند تصاویر بھی جس سے بچوں کو خاص طور پر دلچسپی ہوتی ہے بنوائی تھی لیکن افسوس ہے کہ اردو مطابعہ بھی اس قسم کی تصویروں کا کافی سامان مہیا نہیں ہے'اس لئے حصہ سوم میں اس خیال کو ترک کرنا پڑااور اس کو بلا تصویر شائع کیا جاتا ہے۔کوشش اور نتیجہ کے لحاظ سے تصویر و بلا تصویر دونوں یکساں ہیں اور یہ دونوں باتیں اس ایک بات پر منحصر ہیں کہ والدین اپنے بچوں کو اس قسم کی کتابیں دیکھنے کی ہدایت کرتے رہیں، بلکہ بہتر طریقہ تو یہ ہے، کہ اپنے فرصت کے اوقات میں بلکہ فرصت کا وقت نکال کر خود بچوں سے سنیں تاکہ ان کی استعداد بھی بڑھے اور ان میں دلچسپی پیدا ہو۔(۱۲۳)

اس کتاب میں دیباچہ کے علاوہ پانچ کہانیاں ہیں جن میں کہانی گلاب کی زبانی، کہانی سورج مکھی کی زبانی، کہانی گل نیلوفر کی زبانی، کہانی گل عباس کی زبانی، پھولوں کا مباحثہ شامل ہیں۔ حصہ سوم سوسن کی کہانی کے اختتام سے شروع ہوتا ہے۔

۱۰۔ اخلاقی سلسلہ:

اس سلسلہ میں چار حصے ہیں۔ جن میں نہایت دلکش طریقے سے اعلی اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔حالانکہ اس میں کہانیاں نہیں ہیں۔ صرف بعض بعض جگہ مثالیں اور روائتیں آگئی ہیں۔ لیکن اس کا ایک ایک لفظ پر اثر ہے۔اول تو مضمون فکری سطح پر بہت اعلی ہے اور دوسرا فنی نقطہ نظر سے نہایت نفیس ہے۔اس کے چار حصے درج ذیل ہیں۔

حصہ اول:

ہمت۔ سچائی۔امانت، پاکیزگی۔زبان۔ تندرستی۔ کفایت شعاری۔ جانوروں پر مہربانی۔شکر گزاری۔ محبت۔ گھر اور وطن۔خوش خلقی۔انصاف۔کام۔فرمانبرداری۔

حصہ دوم:

پاکیزہ ۔تندرستی۔ کفایت شعاری۔عزت و انکساری۔جانوروں پر مہربانی۔شکر گزاری۔محبت۔حب وطن۔ خلق۔اپنے اوپر بھروسہ۔عادت۔امن وامان۔

حصہ سوم:

کام ۔کوشش ۔فرض کی تکمیل۔انسانی مساوات۔حب وطن۔ کفایت شعاری۔خوداعتمادی۔ہمت۔امن و جنگ کے اثرات۔

حصہ چہارم:

ارادہ۔خیالات انسانی۔صداقت کی حقیقت۔خیر خواہی ملک۔اجتماعی ذمہ داریاں

۱۱۔ مہذب زندگی:

نواب سلطان جہاں بیگم کی کتاب "مہذب زندگی" مطبع سلطان سے شائع ہوئی۔زیر نظر ایڈیشن پر سن اشاعت نہیں دیا گیا ہے۔اس کتاب کو اخلاق کی پانچویں کتاب بھی کہا جاتا ہے۔یہ کتابیں اکثر سرکاری و غیر سرکاری مدارس کے کورس میں داخل رہی ہیں۔یہ کتاب چھوٹے سائز کے ۲۹۰ صفحات اور ۲۲ابواب پر مشتمل ہے۔اس کتاب کا دیباچہ نواب سلطان جہاں بیگم کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔نواب سلطان جہاں بیگم کتاب لکھنے کی اہمیت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہتی ہیں کہ

> میں نے ان کتابوں میں جہاں تک ممکن ہوا جابجا اسلامی احکام وہدایات اور مسلمانوں کی تاریخی حکایات کو بھی درج کیا ہے تاکہ مسلمان بچے ابتداء سے کچھ نہ کچھ اپنے مذہب کے اخلاقی احکام سے اور بزرگوں کے اخلاق وعادات حسنہ سے واقفیت حاصل کر لیں۔میری یہ کوشش محض ۔۔۔قوم کے بچے ابتداء سے ہی فضائل اخلاق سے آراستہ ہوں تاکہ وہ اسلامی زندگی کا ایک سچا

نمونہ بنیں اگر ان کتابوں سے چند بچوں نے بھی کچھ فائدہ حاصل کیا تو وہی میری محنت کا صلہ ہو گا۔(۱۲۴)

دنیا میں ہر انسان پر مختلف قسم کی کچھ ذمہ داریاں اور فرائض ہوتے ہیں جن کو وہ اسی صورت میں پورا کر سکتا ہے جب اس کے اندر ہمت و طاقت موجود ہو گی۔ہمت ایک ایسی صفت ہے جس کی نشو و نما انسان زندگی کے ساتھ وقتاً فوقتاً اور درجہ بدرجہ ہوتی رہتی ہے۔مثلاً ہمت کا پہلا درجہ یہ ہے کہ حق کی راہ میں کسی کو خاطر میں نہ لائے خواہ اس کو کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو مگر وہ راست بازروز مرہ کے معاملات بلا خیال سود و زیاں خوشی سے انجام دے۔اس کو اگر تکلیف پہنچے تو برداشت کرے اپنے فرائض کو فرائض سمجھ کر انجام دے۔اپنا کام ہو یا کسی دوسرے کا خود غرضی کو دل میں نہ لائے۔اس حوالے سے نواب سلطان جہاں بیگم کا کہنا ہے کہ

> دنیا میں محبت ہی ہمت پیدا کرنے والی چیز ہے اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ جنگ نہ ہونے کے سبب مخلوق کے دلوں میں بہادری کے جذبات فنا ہو جاتے ہیں کیونکہ ہمت اور بہادری کا وجود بھی نہ ہونا چاہیے حالانکہ کون ایسا شخص ہے جو یہ کہے کہ عورتوں میں ہمت اور بہادری نہیں ہوتی۔مصیبتوں میں ہمت سے کام نہیں لیتیں یا تکالیف کے برداشت کرنے کی ان میں قوت نہیں ان عورتوں کے واقعات اور سوانح عمریاں دیکھو جنہوں نے اپنے جوش میں اپنی عزیز جان کی پرواہ نہ کی اور کیسی کیسی مصیبتوں کو ہمت و قوت کی بناء پر برداشت کیا۔(۱۲۵)

ہر گھر بذات خود ایک سوسائٹی ہوتا ہے کہ اگر اس میں کسی قسم کی خرابی نہ پیدا کر دی جائے تو اس کی بدولت بچوں میں ابتداء ہی سے اعلیٰ اخلاق پیدا ہو جاتا ہے۔اور یہ تو مسلمہ حقیقت ہے کہ عورتوں میں شفقت، ہمدردی اور ایثار و مہربانی کا ایک خاص جذبہ ہوتا ہے اور اس کے اثرات محسوس اور غیر محسوس دونوں طریقوں سے بچوں پر مرتب ہوتے ہیں۔اور یہی وجہ ہے کہ ماں، بہنوں اور گھروں میں موجود دوسری بزرگ خواتین سے بہت سی خوبیاں بچوں میں پیدا ہو جاتی ہیں نواب سلطان جہاں بیگم اس حوالے سے لکھتی ہیں کہ

> اس سے یہی مقصد ہے کہ انسان ان ہی عورتوں میں اٹھ بیٹھ سکتا ہے اور ان کے ہم جلیس بننے سے جو اچھے سبق اور نصیحتیں حاصل ہو سکتی ہیں ان سے بہرہ ور ہو سکتا ہے جن سے خطرہ کا اندیشہ نہ ہو اور غیر محرموں کے میل جول سے برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔اونسے مرد و عورت دونوں محفوظ ہیں۔(۱۲۶)

۱۲۔ تربیت الاطفال:

نواب سلطان جہاں بیگم کی کتاب "تربیت الاطفال" مطبع دارالاقبال بھوپال سے ۱۹۱۴ء کو طبع ہوئی۔ یہ کتاب چھوٹے سائز میں ہے اس کے کل ۱۳۴ صفحات ہیں۔ اس کتاب کا دیباچہ نواب سلطان جہان بیگم کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس موضوع کی اہمیت سے کون واقف نہیں ہے۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے دیباچہ میں اس کتاب کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> عمدہ تربیت کی ضرورت اور اس کی اہمیت سے ہر شخص جو عقل سلیم رکھتا ہے واقف ہے لیکن مختصراً اس قدر ضرور کہوں گی کہ تربیت ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے ہم بچوں میں وہ تمام فضائل مثلاً شائستگی، تہذیب اخلاق پاکیزگی خیال اور دیگر صفات حسنہ پیدا کر سکتے ہیں جن کی ہر زمانہ اور ہر جگہ قدر کی جاتی ہے۔ جن کی وجہ سے انسان ہر سوسائٹی میں وقعت و عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، اسی سے وہ روح یا جوہر بھی پیدا ہو جاتا ہے جو دنیا کے بڑے آدمیوں کا مایہ امتیاز ہے اور جس کی وجہ سے انہوں نے دنیا کی تاریخ بدل دی۔ (۱۲۷)

ماؤوں کی آسانی کے لئے اس کو نہایت عام فہم اور واضح عبارت میں لکھا ہے۔ اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ بچوں کی تربیت میں اس کا خاندان والدین اور نوکر پر تربیت کا دارومدار ہے۔ والدین عزیز و اقارب اور ملازمین کے حرکات و سکنات، اخلاق و عادات، اشغال و خیالات اور ان تمام امور کو جن کا تعلق محسوسات سے ہے بچے کی تربیت اخلاق میں داخل ہیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے تربیت اطفال کی ضرورت، اصول تربیت، والدین کو بچوں کے دلوں میں اپنی عظمت و محبت قائم کرنا، والدین خود بچوں کے لئے بطور مثال بنیں، تعلیم و تربیت، مشاغل کا انتخاب، خواہشوں کو مغلوب کرنا، دوسرے بچوں کے ساتھ میل جول وغیرہ کا بیان اس کتاب میں کیا ہے۔ اس کتاب میں بچوں کی تربیت کی ضرورت و اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے نواب سلطان جہاں بیگم میں لکھتی ہیں کہ

> والدین کی یہ سب سے بڑی عقلمندی ہے کہ وہ یہ بات بچوں کی ذہن نشین کر دیں کہ وہ ان کے صادق اور رازدار دوست اور شفیق ناصح ہیں۔ عموماً بچوں کی خراب خصلتوں یا برے افعال سے والدین کو صدمہ ہوتا ہے، لیکن اکثر محض اس لئے کہ بچوں کو رنج نہ ہو اظہار ملال نہیں کرتے اور اس طرح وہ اپنے بچوں ہی کو ایک قسم کا دھوکا دیتے ہیں۔ اصلاح کا

سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ بچوں کو ان کے قصور اور غلطی کی نسبت یہ ذہن نشین کرادیا جائے کہ جو کچھ انہوں نے کیا ہے برا کام ہے اور برے کام سے احتراز لازم ہے۔(۱۲۸)

اردو ادب میں ایسی کتابوں کی کمی کو محسوس کرنے پر نواب سلطان جہاں بیگم نے یہ کتاب تحریر کی۔اس کو لکھنے کے لئے انہوں نے انگریزی کتابوں سے بھی مدد لی۔اس کتاب میں تربیت کے صحیح اور کارآمد اصولوں پر بحث کی ہے۔نواب سلطان جہاں بیگم نے اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔پہلے حصہ میں تربیت اولاد کے متعلق رہبری کی ہے اور دوسرے حصہ میں انبیاء وصالحین اور مشاہیر کے قصے وحالات کو بچوں سے قصے کی طرح بیان کیے ہیں تاکہ تمام اقوال وافعال میں صداقت یعنی ہر ایک بات اور ہر ایک کام میں سچائی شخصیت کو نکھار دیتی ہے ایسے ہی ان کی نکھر جائے گی۔اگر تنقیدی نظر سے دیکھا جائے تو نواب سلطان جہاں بیگم نے اسی اصول کو مد نظر رکھ کر قصے شامل کیے کیوں کہ انسان کی فطرت میں اللہ نے یہ بات رکھ دی ہے کہ وہ مثال سے متاثر ہو اور قصوں سے عبرت ونصیحت حاصل کرے مثلاً نواب سلطان جہاں بیگم اس میں لکھتی ہیں کہ

حضرت عمر فاروق اپنے زمانہ خلافت میں تنہا رات کو مدینہ طیبہ کی گلی کوچوں مین گشت کیا کرتے تھے۔۔۔آپ نے سنا کہ ایک ماں اور بیٹی میں گفتگو ہو رہی ہے ماں نے بیٹی سے کہا کہ اٹھ !اور دودھ میں پانی ملادو لڑکی نے کہا کہ ایسا مت کرو امیر المومنین نے ممانعت فرمائی ہے،ماں نے کہا کہ امیر المومنین کو کیا معلوم ہو گا،بیٹی نے جواب دیا کہ اگر ان کو معلوم نہ ہو گا تو خدا تو دیکھتا ہے۔اس گفتگو کو سن کر امیر المومنین چلے گئے اور جب صبح ہوئی تو آپ نے اپنے صاحبزادہ حضرت عاصم کو اس لڑکی کا گھر بتلا کر فرمایا کہ عاصم وہاں جاؤ اور اگر اس لڑکی کی شادی نہیں ہوئی تو اپنا پیغام دو۔۔۔۔اب خیال کرو کہ محض صدق وراستی کے سبب سے خدا نے اس لڑکی کو کتنا بڑا درجہ عطا کیا۔(۱۲۹)

۱۳۔ مقصد ازدواج:

نواب سلطان جہاں بیگم کی کتاب "مقصد ازدواج" ۱۹۲۰ء کو مطبع سلطانی بھوپال سے شائع ہوئی۔اس میں ازدواج کے متعلق ضروری اور مختصر ہدایتیں ہیں۔یہ کتاب چھوٹے سائز میں ۱۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ازدواج کے تمام پہلوؤں پر ایک گہری نظر ڈالی ہے۔اس کتاب میں شادی سے متعلق تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے کیونکہ اس

دور کے معاشرے میں جلد شادی کرنے کا رواج تھا۔ لڑکے لڑکیاں شادی کے مقاصد سے ناواقف ہوتے تھے۔ سلطان جہاں بیگم اپنی کتاب کے مقدمے میں لکھتی ہیں کہ

> ناکتخدا لڑکوں اور لڑکیوں کو شادی کے اصل مقاصد اور حسن معاشرت کے نکات سے ازروئے عقل و مذہب آگاہ کرنا چاہیے اور ان کے دل میں نقش کر دینا چاہیے کہ ازدواجی زندگی ہی ایسی زندگی ہے جو انسان کو ہر قسم کی دنیاوی واخروی مصیبتوں سے نجات دیتی ہے اور سرمایہ راحت و آسائش بنتی ہے۔ تاکہ قوم میں ان مقاصد حصول کا سلسلہ جاری اور قائم ہو جائے اور جو نقصان کہ مدت جدید سے نسلاً بعد نسلاً متواتر چلے آرہے ہیں دفع ہو جائیں۔(۱۳۰)

کتاب کے آخری حصہ میں نواب سلطان جہاں بیگم نے عورتوں کو نصیحتیں کیں ہیں۔ مختلف ممالک مثلاً جاپان اور عرب کی ماؤں کی اپنی بیٹیوں کو رخصتی کے وقت کی جانے والی نصیحتوں کا درس دیا۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو نواب سلطان جہاں بیگم نے اس کتاب میں مردوں اور عورتوں کو نصیحت کی ہے کہ شوہر اور بیوی کیونکر اپنی ازدواجی زندگی کو خوشحال اور کامیاب بنا سکتے ہیں۔

۱۴۔ اسلام میں عورت کا مرتبہ:

اس کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ عورتوں کے حقوق پر لکھی گئی ہے۔ ہر مسلم مرد و عورت کو اس کا مطالعہ ضروری ہے کیونکہ کو عورت معاشرے کا اہم حصہ ہے جب تک اس کو شریعت کے مطابق طے شدہ مساویانہ سطح پر حقوق حاصل نہ ہوں گے وہ معاشرہ کامیاب نہیں ہو سکتا ہے۔

۱۵۔ خانہ داری کا دوسرا حصہ حفظ صحت:

نواب سلطان جہاں بیگم کی یہ کتاب "خانہ داری کا دوسرا حصہ حفظ صحت" ۱۹۱۶ء میں مطبع سلطانی بھوپال سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب خانہ داری کا دوسرا بڑا حصہ ہے۔ زیر نظر کتاب میں زیادہ تر ان امور کا ذکر کیا ہے جن کا تعلق خواتین سے ہے۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے حفظان صحت سے متعلق چند اہم کتابوں سے استفادہ کرنے کے بعد اس کتاب "حفظ صحت" کو ترتیب دیا ہے۔ اور اس کی تیاری کے سلسلے میں مختلف لوگوں سے آراء بھی لی ہیں۔ یوں انہوں نے تمام مفید باتیں صحت سے متعلق اس کتاب میں یکجا کر دی ہیں۔ اس میں خانہ داری کے متعلق وہ سب باتیں آگئی ہیں۔ جن کا تعلق حفظ صحت سے ہے۔ بقول نواب سلطان جہاں بیگم

(۱)صفائی و پاکیزگی جس میں ہوا، پانی، غذا، جسم لباس اور مکان کی صفائی شامل ہے۔ (۲) اعتدال اور میانہ روی، ہر ایک کام میں اور خاص کر کھانے پینے میں۔(۳) روزانہ ورزش اور چہل قدمی۔(۴) ضبط اوقات۔ یہ چاروں باتیں قصر تندرستی کی چار دیواریں ہیں اور جب تک ان میں کوئی رخنہ نہیں پڑے گا انشاءاللہ کوئی بیماری آدمی پر غلبہ نہیں کرے گی۔(۱۳۱)

نواب سلطان جہاں بیگم نے دیباچہ اور تمہید کے بعد مختلف موضوعات کے تحت مثلاً متعدی امراض کے بعد ڈس انفکٹ کرنا یعنی صاف کرنا، کثافت ہوا کو دور کرنا، گھر کی صفائی، غذا، جسم کی صفائی، ورزش، لباس، تیمارداری وغیرہ پر بالکل آسان اور سلیس عبارت میں لکھا ہے۔اس کتاب میں ۱۳۹ صفحات ہیں۔

۱۶۔ تندرستی:

نواب سلطان جہاں بیگم کی کتاب "تندرستی" ۱۹۱۳ء کو مطبع سلطانی بھوپال سے طبع ہوئی۔ یہ کتاب ۱۴۷ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کتاب کو درسی کتابوں کے طریقے پر لکھا گیا ہے۔ تین باب اور سینتالیس مضامین ہیں۔ پہلے باب میں حفظان صحت کی مفصل ہدایتیں ہیں جن میں ہوا، پانی، غذا، سونا، مکان، باورچی خانہ گودام اجناس خوردنی، پاخانہ، لباس، غسل حمام، غسل خانہ، ورزش، استراحت وغیرہ۔ دوسرے باب میں متعدی امراض پیلگ (طاعون)، کالرا (ہیضہ)، چیچک، ملیریا، ٹائیفائیڈ، کھانسی، آشوب چشم وغیرہ سے بچنے کی تدبیریں بتائی گئی ہیں۔ تیسرے باب میں اصول تیمارداری ان سے واقفیت کی ضرورت اور ناواقفیت کی وجہ سے نقصان کی چند مثالیں دے کر تیمارداری کی ضروری باتوں کا بیان کیا گیا ہے۔ پانی کو فلٹر کرنے کے طریقے بتائے ہیں۔ حفظان صحت کے متعلق بہت باریکی سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی دھیان دینے کی تائید کی ہے جس سے غیر شعوری طور پر انسان چشم پوشی کر لیتا ہے، انہوں نے کئی جگہ چیزوں کے خاکے کھینچ کر قاری کو ذہن نشین کرایا ہے۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے اس کتاب میں صحت کی حفاظت کرنے کے اصول بیان کیے ہیں۔ تاکہ خواتین اس سے مستفید ہوں اور ان کی معلومات میں اضافہ ہو۔ خاص طور لڑکیوں کو اسکی تعلیم دی جائے۔ کیونکہ انہیں کسی نہ کسی سطح پر تیمارداری کے مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس حوالے سے نواب سلطان جہاں بیگم لکھتی ہیں

طرز معاشرت میں نہایت تیزی کے ساتھ تبدیل ہو رہی ہے۔ آج کی لڑکیاں جو کل مائیں بنیں گی ان کو بہت کچھ اصلاح و ترقی یافتہ حالت ملے گی اور وہ بہت زیادہ ان اصولوں کے اختیار

کرنے کی محتاج ہوں گی۔ اس لئے ان کی تعلیم میں توان مضامین کا خیال رکھنا بے انتہا ضروری اور لازمی ہے(۱۳۲)

صحت و تندرستی کے فوائد بتاتے ہوئے نواب سلطان جہاں بیگم ایک اور مقام پر لکھتی ہیں کہ

اگر تم چاہتے ہو کہ صحت و تندرستی تمہارے چہرے کو منور اور تمہارے جسم کو توانا کر دے تو اس کے لئے روری ہے کہ عالی خیال سے تمہارا دماغ روشن اور نیک مزاجی سے تمہارا دماغ روشن اور نیک مزاجی سے تمہارا دل مطمئن ہو۔ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ زندگی بہت سے لمحوں کا مجموعہ ہے اور ہر ایک لمحہ کو کسی مفید کام میں گزارنا چاہتے ہیں وہ اپنے جسم کی مشین بھی اچھی حالت میں رکھتے ہیں۔(۱۳۳)

مندرجہ بالا اقتباسات کو اگر تنقیدی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ موت کا وقت مقرر ہے اس سے قبل موت کا آنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک و شبہ ہر گز نہیں ہے کہ بیماری میں اگر حفظان صحت کے اصولوں کو مد نظر رکھ کر تیمار داری کی جائے توانسان کی صحت بہتر ہو جاتی ہے۔ موت سے قبل موت کا انتظار مایوسی ہے۔ صحت مند انسان صحت مند قوم کی نشانی ہے۔اس حوالے سے نواب سلطان جہاں اپنی کتاب "تندرستی" میں لکھتی ہیں کہ

میں نے یورپ کے سفر میں وہاں کے لوگوں کو خواہ وہ کسی طبقہ کے ہوں اصول و قواعد حفظان صحت کا پابند پایا اور بارہا مجھ کو اپنے ہندوستان کی حالت پر افسوس آیا۔ ہمارے ملک میں عالیشان محلوں میں بھی وہ صفائی نہیں ہوتی جو وہاں کے ایک غریب مزدور کے چھوٹے سے مکان میں نظر آتی ہے۔(۱۳۴)

۱۷۔ ہدایات تیمارداری:

نواب سلطان جہاں بیگم کی ایک اور اہم رسالہ "ہدایات تیمارداری " ہے۔ یہ کتاب ۱۹۱۴ء میں مطبع دارالاقبال بھوپال سے شائع ہوئی تھی۔ اس رسالے کے صفحات کی تعداد ۳۴ ہے۔ اس مختصر رسالہ میں ان ڈاکٹری طریقوں کو بیان کیا گیا ہے جن سے واقف رہنا ہر عورت کے لیے ضروری ہے اور جن باتوں کا جاننا ڈاکٹری علاج میں اس قدر ضروری ہے کہ ان کے جانے بغیر علاج کرنے سے کوئی فائدہ نہیں وہ سب جمع کر دی گئی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ بیماری میں جب تک علاج کے ساتھ ساتھ تیمارداری کے درست طریقے معلوم نہیں ہوں گے تو مریض کو آرام ملنا اور صحت کا

جلد ٹھیک ہونا ناممکن ہے۔ تیارداری کے حوالے دیکھا جائے تو خاص طور پر بچوں کی تیارداری کے بارے میں ماؤں کا واقف ہونا ضروری ہے۔ لہذا اس اہم ضرورت کے پیش نظر نواب سلطان جہاں بیگم نے مستند کتابوں سے استفادہ کر کے خواتین کے لیے یہ رسالہ شائع کرنے کا اہتمام کیا تھا۔ مثلاً تیارداری کے لیے جن اشیاء کی ضرورت رہتی ہیں ان کے متعلق ہدایات دیتے ہوئے ایک مقام پر لکھتی ہیں کہ

> ایک لکڑی کی میز ہو جس کے خانہ پر آلہ مقیاس الحرارت لگا ہو تا کہ گرمی، سردی کی موسمی حالت معلوم ہو سکے۔ پینسلیں، کاغذ اور روشنائی بھی ہو جو فوراً کام میں آسکے، دوسرے خانے مین تیارداری کے متعلق اور چھوٹی چھوٹی اشیاء ہونی چاہیے ، مثلاً پنین Pins، کاٹن وول Cotton Woul لنٹ Lint، سیفٹی پنین Safety Pins، دو جوڑ قینچیاں بھی ہوں جسمین سے ایک نہایت مضبوط اور کم قیمت ہو تا کہ یہ مرہم پٹی وغیرہ کے لیے کاٹنے کا کام دے سکے۔۔۔(۱۳۵)

۱۸۔ درس حیات:

نواب سلطان جہاں بیگم کی کتاب "درس حیات" میں قصے کے پیرایہ میں فزیالوجی کے وہ تمام ضروری مسائل جن کا تعلق عورتوں سے ہے، بیان کیے گئے ہیں۔ اس میں تشریح کے لئے تصویریں اور ایسے فوٹو گراف بھی ہیں۔ جن کا خانہ داری سے اور خاص کر غذا سے تعلق ہے۔

۱۹۔ بچوں کی پرورش:

نواب سلطان جہاں بیگم کی یہ کتاب "بچوں کی پرورش" ۱۹۳۱ء میں مفید عام آگرہ پریس سے منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں ۳۰۵ صفحات ہیں اور نو ابواب اور ایک سو گیارہ مضامین پر منقسم ہے۔ بچوں کی پرورش ایک مشکل اور توجہ طلب کام ہے اگر اسے ہنر کا نام دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ بچوں کی پرورش میں خصوصی توجہ کی ضرورت ہوتی ہے کیوں بچے کسی قوم کا آنے والا مضبوط اور روشن مستقبل کہلاتے ہیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم اس حوالے سے دیباچہ میں لکھتی ہیں کہ

> بلاشبہ عورتوں کے لئے بچوں کی پرورش کے ابتدائی اصول طب جاننے کیسے انتہا ضرورت ہے کیونکہ جب تک مائیں اون اصولوں کو نہ جانیں گی وہ کسی طرح بچوں کی عمدہ طور پر پرورش نہیں

> کر سکتیں۔۔۔علاوہ ازیں میرا ذاتی تجربہ ہے اور روز مرہ کے حالات دیکھنے سے ثابت ہوا ہے کہ
> عورتوں میں اس تعلیم کی نہایت معقول صلاحیت موجود ہے۔(۱۳۶)

پہلے باب میں زچہ کی ضروریات، پیدائش اور ابتدائی احتیاطیں، ابتدائی نگہداشت کے متعلق بتایا گیا ہے مثلا بچہ نہلانا دھلانا، بچے کے ملبوسات، بچے کی جلد وغیرہ۔ باب دوم میں قدرتی رضاعت، ماں کا دودھ، ماں کا دودھ چھڑانا شامل ہیں۔ باب سوم میں مصنوعی رضاعت اور عام غذا کے متعلق معلومات دی ہیں، مصنوعی دودھ اور بچوں کی غذا میں انڈا، گوشت، عام اصول صحت، غذائیں اور ان کے اوقات وغیرہ پر بحث ہے۔ چوتھے باب میں سونے کا طریقہ، بچہ کا وزن، قد، سر، حواس خمسہ، دماغ اور بچوں کے نشوونما کے قواعد سے واقف کرایا ہے۔

پانچویں باب میں ننھے بچوں کے امراض کے متعلق ہدایات ہیں جس میں زمانہ طفولیت کی عام بیماریوں ان کے علامات واسباب اور ان سے بچنے کی تدابیر بیان کی ہیں۔ چھٹے باب میں دوا علاج، بیماری کی ابتدائی علامتیں جن میں ننھے بچوں کے پیٹ کی خرابی سے متعلق امراض بیان کیے گئے جن سے تھوڑی سی معلومات حاصل ہونے کے بعد بچوں کو بچایا جاسکتا ہے۔

> بچہ کی تندرستی مین جب ذرا بھی فرق ہوتا ہے تو ماں کو فوراً پتہ چل جاتا ہے لیکن بعض امراض کی علامات خفیہ ایسی ہوتی ہین کہ اگر ماں کو علامت مرض پہچاننے کی تعلیم نہ دی گئی ہو اور ہمیشہ وہ ہوشیاری سے دیکھتی نہ رہے تو ممکن ہے کہ اوس کی نظر خطا کر جائے۔۔۔بچوں کی پرورش اور تربیت کرنے مین انکو بہت سے سبق حاصل ہوتے ہین اور جو سبق وہ اسطرح حاصل کرینگی وہ آئندہ ماں بننے کے اہم فرائض کی انجام دہی کے لئے ان کو بہت مضبوط کر دیں گے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ بغیر اس کے مائین تعلیم یافتہ ہوں کوئی قوم معراج ترقی پر نہیں پہنچ سکتی، اور قومی تنزل کی اصلی وجہ صرف ماؤں کی جہالت ہوتی ہے۔(۱۳۷)

ساتویں باب میں زمانہ شیر خواری کے بعد طفولیت کے زمانہ میں بچوں کی روزانہ زندگی کے لیے چند آسان اور سادے قواعد بتائے ہیں۔ جن سے اصول تربیت کی بنیاد قائم ہو جائے۔ آٹھویں باب میں بچوں کی بیماریوں اور اس میں زمانہ طفولیت کے امراض اور ان سے محفوظ رہنے ددفاع کرنے اور ان میں جو ضرورتیں پیش آتی ہیں ان کی تدابیر بتائی گئی ہیں۔ نویں باب میں بچے کی نگرانی، صحت کے اصول، متعدی امراض اور ان کی علامات، انسداد کی تدابیر، زہر کی

شناخت وغیرہ کا ذکر ہے۔ عورتوں کے لئے بچوں کی پرورش کے ابتدائی اصول جاننا از حد ضروری ہے، مثلاً تعلیم کے حوالے سے نواب سلطان جہاں بیگم کہتی ہیں کہ

> اگرچہ آج کل بچوں کو تعلیم دینا باپ کا فرض نہیں سمجھا جاتا ہے، تاہم یہ فرض تو ضرور ہے کہ وہ یہ بات بچوں کو ذہن نشین کر دے پڑھنا لکھنا بھی انکی زندگی کا ایک حصہ ہے، اور یوں ہو سکتا ہے کہ باپ کتابوں کا مطالعہ کرتا رہے اور بچوں کو سمجھاتا رہا کہ کتابیں بھی ایسی ہی بیش بہا چیزیں ہیں جیسے گھر میں باقی چیزیں قیمتی ہیں۔ یہ بات مسلمہ ہے کہ بچے کی تعلیم کا سلسلہ گہر ہی سے شروع ہوتا ہے، کیونکہ وہیں سے بچہ چیزوں کو پہچانتا ہے، چنانچہ وہ اپنے بہن اور بھائیوں کو دیکھ کر مرد اور عورت کی شناخت کرتا ہے وہ تعلیم جو اسکو گھر میں ملے گی بہ نسبت اوس تعلیم کے جو اسکول اور کالج وغیرہ میں ملتی ہے زیادہ مستحکم اور باثر ہوتی ہے۔۔۔(۱۳۸)

اس کتاب میں وہ تمام ضروری امور جو بچوں کی پرورش کے متعلق ہو سکتے ہیں تحریر کیے ہیں تاکہ بچے کی پرورش میں کوئی کوتاہی نہ ہو اور اس کے جسمانی قوی میں طاقت، دل و دماغ میں شگفتگی پیدا ہو۔ آخر میں ڈاکٹری طبّی اوزان و پیمانے اور انکا باہمی مقابلہ دیا ہے۔ اور وہ ادویات جو گھر میں ہونی چاہیے ان کی فہرست دی ہے۔ سب سے آخر میں بچوں کو دینے کے لئے ہلکی اور سادہ غذائیں اور مشروبات بنانے کے طریقے بتائے ہیں۔

یوں نواب سلطان جہاں بیگم نے اردو میں خواتین کے لیے بہترین معلومات اکٹھی کی ہیں جو اس ذمہ داری سے نبرد آزما ہیں یا آئندہ ہونے والی ہیں۔ اس کتاب کی تیاری کے حوالے سے کہتی ہیں کہ

> یہ کتاب چند انگریزی کتابوں کے ترجموں کا ایک مجموعہ ہے جس میں جابجا مین نے اپنے تجربات کا اضافہ کیا ہے اور صرف اس غرض سے طبع کی گئی ہے کہ عورتیں اسکے مطالعہ کے بعد ضروری امور سے مطلع ہو جائیں لیکن مین یہ تاکید کرون گی کہ ہمیشہ بچوں کی علالت کی حالت مین ڈاکٹر یا طبیب سے مشورہ لیے بغیر کتابی نسخوں پر عمل نہ کرنا چاہیے اور مین نے اس ہدایت کو جابجا اس کتاب مین بھی تحریر کر دیا ہے۔(۱۳۹)

۲۱۔ ہندوستانی گھروں میں تیمارداری:

"ہندوستانی گھروں میں تیمارداری"اس کتاب میں ۲۴۲ صفحات، ۴۰ نقشے اور ۳ ضمیمے شامل کیے گئے ہیں۔ یہ تاب مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہوئی۔ کتاب کا دیباچہ آر۔جے۔بی کا لکھا ہوا ہے۔اس کتاب میں بارہ باب شامل ہیں۔زیر نظر کتاب میں کتاب میں تیمارداری کے مفید طریقے بتائے گئے مثلاً مریض کا کمرہ، کمرے کی درستگی اور فرنیچر، مریض کا بستر، مریض کے کمرے کو گرم کرنا، ٹھنڈا کرنا، روشن کرنا اور ہوادار بنانا، صفائی وغیرہ۔ کمرے میں موجود سامان کے حوالے سے ضروری اقدامات کا بیان کرتے ہوئے کہا کہ

> مریض کے لئے جو کمرہ تجویز کیا گیا ہو اس کو سب سے پہلے بالکل خالی کر دینا چاہیے اور جو چیزیں اور سامان غیر ضروری ہو اس کو نکال کر دوسری جگہ رکھ دینا چاہیے تاکہ کمرہ کے اندر صرف ایک پلنگ اور اس کے متعلقہ سامان کے سوا کچھ نہ رہے۔ دیواروں کے اوپر جس قدر آرائشی اشیاء ہوں ان کو اتار لینا چاہیے۔۔۔(۱۴۰)

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کمرے میں موجود اشیاء چھوت لگنے والی بیماریوں کا باعث بھی بن سکتی ہیں۔اس لئے مریض کا کمرہ ایسا ہونا چاہیے جو صرف ضروری اشیاء کا حامل ہو۔ غیر ضروری اشیاء کی سجاوٹ سے پرہیز کرنی چاہیے۔ علاوہ ازیں زیر نظر کتاب میں مریض اور تیماردار کے لباس کو بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ نرسوں کے لیے سفید لباس تجویز کیا گیا اور لباس کے لئے کس قسم کا کپڑا استعمال کیا جائے وہ تمام ضروری ہدایات اس کتاب میں درج کی گئی ہیں۔ ہسپتال میں زیورات پہننے کی ممانعت کی گئی کیوں کہ مریضوں کی دیکھ بھال اور ان کو اٹھانے، بٹھانے میں تکلیف کا سبب بن سکتا ہے۔ پیشہ ور اور غیر پیشہ ور تمام نرسوں کے لئے اور کوٹ کو ضروری قرار دیا گیا۔اسی طرح اس کتاب میں مریض کی عیادت کے سلسلے میں بھی ضروری قواعد مرتب کیے گئے ہیں۔ جن پر اگر عمل کیا جائے تو مریض کی صحت جلد بحال ہونے میں مدد ملے گی۔ مثلاً

> شدید بیماریوں میں نرس کے لئے لازم ہے کہ مریض کے کمرے میں عیادت کے لئے لوگوں کے آنے جانے کے متعلق ضروری ہدایات حاصل کر لے، عام قاعدہ یہی ہے کہ جہاں کم لوگ آئیں اسی قدر اچھا ہوتا ہے اور متعدی امراض میں کم لوگوں کو مریض کے پاس آنے دے۔ جو لوگ آئیں لازم ہے کہ مریض سے دور رہیں اور رخصت ہونے کے وقت اپنے ہاتھوں کو صابون اور دیگر ادویہ سے دھولیں۔۔۔ بلا اطلاع یکایک مریض کے کمرے میں نہ

چلے آنا چاہیے مریض کے جذبات میں ہیجان ہو جائے گا۔۔۔ملا قاتی جانے کے بعد مریض کی حالت کو بغور دیکھ لینا ہو گا(۱۴۱)

تیمار داری کی تفاصیل کے بعد پٹی باندھنا، پرہیزی کھانوں کے پکانے کی ترکیب، چھوت لگنے والی بیماریوں کے نقشے کے بعد اس کتاب میں یہ ضروری ہدایات بھی دی گئیں ہیں کہ ناگہانی آفات کی صورت میں ہر گھر میں ایک الماری یا گھر میں ایک حصہ ایسا ہونا ضروری ہے جہاں ادویات رکھی جائیں جو فوری طبّی امداد میں کام لائی جاسکیں۔

۲۱۔ فرائض باغبانی:

''فرائض باغبانی'' یہ مختصر رسالہ ۱۹۲۳ء میں شمسی مشین پریس آگرہ سے چھپا۔اس کے صفحات کی تعداد ۴۹ ہے اور رسالے کے آغاز میں دیباچہ ہے جو نواب سلطان جہاں بیگم کا اپنا لکھا ہوا ہے۔ یہ رسالہ ان لوگوں کے لئے ہے جنہیں باغات کی پیداوار سے دلچسپی ہے۔ سلطان جہاں بیگم کو بذات خود باغبانی سے خاص دلچسپی تھی۔ اور بعض موسموں میں خود اپنے باغات کی نگرانی میں اپنا بہت سا وقت صرف فرماتی تھیں۔اس لئے سلطان جہاں بیگم نے اس فن کے متعلق بہت سی معلومات جمع کر کے اردو میں یہ رسالہ شائع فرمایا۔بقول نواب سلطان جہاں بیگم

باغات کی سرسبزی و شادابی کا دارومدار مالکوں کے شوق و دلچسپی اور باغبانوں اور مالیوں کی اپنے پیشہ میں ہوشیاری پر منحصر ہے۔اگر ایک اچھا باغ ایک ناتجربہ کار مالی کے سپرد کر دیا جائے تو تھوڑے دنوں میں وہ خارزار ہو جائے گا۔یہ رسالہ میں نے مختلف کتابوں سے امداد لے کر اس غرض سے مرتب کیا ہے کہ مالکان باغ اور ایسے مالی جن کو اردو نوشت خواند میں کسی قدر بھی مہارت ہو،اسے فائدہ حاصل کریں۔(۱۴۲)

علاوہ ازیں وہ خواتین جو اپنے وسیع مکانوں میں بنگلوں اور کوٹھیوں کے احاطوں میں باغ وغیرہ لگانے کی خواہشمند ہوں تاکہ ان کو رہنمائی حاصل ہو سکے۔ زیر نظر رسالے کے مقدمہ میں باغبانی کے لیے زمین کے انتخاب کے بارے میں، زمین کی درستگی کے متعلق کہ اگر کسی جگہ مٹی خراب ہو تو کھاد اور کچرے سے درست کی جاسکتی ہے۔ علاوہ ازیں بیجوں کی جانچ، سورج کی روشنی، مختلف موسموں کی احتیاطیں کیونکہ ہندوستان میں تین موسم سردی، گرمی، برسات ہوتے ہیں۔اور موسم کے اثرات درختوں، پودوں پر شدید مرتب ہوتے ہیں۔ باغبانی کے حوالے سے اس رسالے میں اہم چیز کھاد کا بھی ذکر موجود ہے اور یہ کہ پھل دار درخت لگانے کے طریقے، درختوں کے امراض اور انکے علاج کے لئے حفاظتی اقدامات وغیرہ بتائے گئے ہیں۔اس کے بعد زیر نظر رسالے میں ہر مہینے میں وہ چیزیں جن

کی پیداوار کرنی چاہیے اور جن موسموں میں جس طرح ان کی دیکھ بھال ہونی چاہیے۔ وہ اسی طرح ماہوار سلسلے سے لکھا گیا ہے۔

۲۳۔ مطبخ کنگ جارج:

نواب سلطان جہاں بیگم کی کتاب" مطبخ کنگ جارج "باہتمام محمد بشیر الدین خاں شمسی مشین پریس آگرہ سے طبع ہوئی۔ سن اشاعت نامعلوم ہے۔اس کتاب میں ۵۱۶ انگریزی کھانوں، مٹھائیوں، اچار چٹنی وغیرہ کی ترکیبیں مفصل لکھی گئی ہیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے خواتین کی معلومات میں اضافہ اور کھانے کی تیاری میں مدد دینے کے مقصد کے تحت یہ کتاب مرتب کی ہے۔اس کتاب میں دو باب ہیں۔ان ابواب میں کئی فصلیں ہیں۔ ہر فصل میں مختلف چیزوں کے بنانے کی ترکیب بتائی گئی ہے۔ابتدا میں ایک دیباچہ اور مبسوط مقدمہ تحریر کیا ہے۔

مقدمہ میں انہوں نے نظام ہضم کے بارے میں بتایا ہے۔یورپ کے کھانے جو گیہوں سے تیار ہوتے ہیں۔پراٹھے، پیڈنگ، کیک، بسکٹ کی مختلف قسمیں اور ان کے بنانے کی ترکیب بتائی ہے۔اس کے بعد سوپ اور سٹاک بنانے کی ترکیب اور قاعدہ بتایا ہے۔بچوں کے لئے تیار کی جانے والی خوراک میں احتیاط کرنے کے لئے بار بار ہدایت دیتی ہیں۔اس کتاب میں مختلف قسم کے سینڈوچ بنانااور کئی قسم کے سلاد بنانے کی ترکیب بتائی ہے۔ مختلف قسم کے ساس بنانے کی ترکیبیں بھی درج ہیں۔ چکن کی مختلف ڈشز تیار کرنے کی ترکیبیں بتائی ہیں۔آخر میں انگریزی مٹھائیاں اور اچار چٹنی بنانے کی ترکیبیں لکھی ہیں۔کتاب میں پڑھ کر آسانی سے یہ کھانے بنائے جا سکتے ہیں۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔

۲۴۔ سلک شہوار:

نواب سلطان جہاں بیگم کی یہ کتاب "سلک شہوار "۱۹۱۹ء میں مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج سے طبع ہوئی، دفتر ظل السلطان بھوپال سے شائع ہوئی۔اس کتاب میں ۱۸۸ صفحات ہیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے مختلف مواقع پر تعلیم نسواں اور دیگر خواتین کے مسائل سے متعلق تقاریر کیں ان کو مسز جی بخش نے ترتیب دیا ہے۔انہوں نے ان تقاریر میں سے اکثر سلطانیہ اسکول بھوپال، برجیسیہ کنیا پاٹھ شالا بھوپال، تعلیم نسواں سے متعلق آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، دہلی، نمائش خواتین ہند بھوپال، مسلم گرلس اسکول لکھنو، انجمن خواتین، دکن، بمقام شبیر باغ

حیدر آباد وغیرہ میں کی تھیں۔ان کی کل تعداد ۳۸ ہے۔نواب سلطان جہاں بیگم کی تقاریر میں ان کی روشن خیالی اور بیدار مغزی نمایاں نظر آتی ہے۔

> اس مجموعہ میں نواب سلطان جہاں بیگم کی وہ تقریریں درج ہیں جو وقتاً فوقتاً عورتوں کے جلسوں میں مختلف مسائل نسواں پر ہر ہائنس نے ارشاد فرمائی ہیں۔ان تقریروں میں ہر ہائنس نے جو خیالات ظاہر فرمادیئے ہیں ان سے حضور ممدوحہ کی بیدار مغزی روشن خیالی کے علاوہ یہ خوبی بھی نمایاں ہے کہ ہر ہائنیس نے اپنی صنفی مسائل پر کس قدر عمیق اور کیسا کامل غور و مطالعہ فرمایاہر ہائنیس معاملات مذہب میں غیر معتصب ہیں۔اور ہر مذہب کا احترام ان کے دل میں جاگزیں ہے۔۔۔۔(۱۴۳)

مندرجہ بالا اقتباس سے محسوس ہوتا ہے کہ معاشرے میں ہونے والی تبدیلیاں کس طرح آہستہ آہستہ اپنا وجود قائم کر رہی تھیں۔سلطان جہاں بیگم ان تبدیلیوں کے فروغ واستحکام کے لئے کیسے کیسے صبر آزما کام اور محنت و جدوجہد سے سماج کو تیار کر رہی تھیں۔نواب سلطان جہاں بیگم کے تعلیم نسواں کے سلسلے میں افکار و نظریات مختلف مواقعوں پر تقاریر کی صورت میں تھے انہیں "سلک شہوار" میں یکجا کر دیا گیا ہے،تاکہ آئندہ آنی والی نسلوں تک ان کے خیالات ورجحانات کو پہنچایا جاسکے۔نواب سلطان جہاں اس عہد میں تعلیم نسواں کے سلسلے میں کوششوں کے حوالے سے سب سے بڑی حامی و مددگار کی صورت میں سامنے آتی ہیں۔وہ اپنی صنف کو ترقی کی راہوں پر گامزن دیکھنا چاہتی تھیں۔مثلاً بھوپال میں افتتاح بورڈنگ ہاؤس وٹرینگ کلاس کی تقریب ۱۳ جنوری ۱۹۱۷ء کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ

> خواتین! اپنی صنف کی تعلیم کا مسئلہ جہاں میری دلچسپی کا باعث ہے وہاں اس کے تذکرہ سے خواہ وہ کسی محل و موقع پر کیوں نہ ہو مجھے یہ افسوس بھی ہوتا ہے ابھی عموماً تعلیم کی جانب رفتار ترقی بہت ہی آہستہ ہے اور اس پر وہ توجہ نہیں کی جاتی جو مردانہ تعلیم پر ہوتی ہے حالانکہ ہر جگہ اس کے فوائد اور ضرورت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔(۱۴۴)

اسی طرح ایک اور موقع پر خواتین دکن بمقام بشیر باغ حیدر آباد ۳ ستمبر ۱۹۱۸ء تقریر کرتے ہوئے کہا کہ

> خواتین! یہ امر مسلمہ ہے کہ تمام اصلاحات تمدن معاشرت کا انحصار صرف تعلیم پر ہے اور جس طرح مردوں کو اس کی ضرورت ہے اسی طرح عورتوں کو بھی اور جب تک دونوں کے

دل ودماغ تعلیم سے منور نہ ہوں چھوٹے چھوٹے خاندانوں سے لے کر بڑے بڑے گھروں تک حقیقی ترقی کا گزر نہیں ہو سکتا اسی لئے مذہب اسلام جو تکمیل تمدن و معاشرت کا بھی داعی ہے دونوں اصناف پر حصول علم لازم کردیا۔(۱۴۵)

۲۵۔ تزک سلطانی (دفتر چہارم) تاج الاقبال تاریخ بھوپال:

حکمرانی کے ساتھ تاریخ نویسی بہت مشکل کام ہے۔نواب سکندر بیگم اور نواب شاہجہاں بیگم نے بھوپال کی تاریخ"تاج الاقبال تاریخ بھوپال" تالیف کی۔یہ تاریخ تین جلدوں میں طبع ہوئی۔اس میں ۱۸۸۲ء تک کے حالات ہیں۔نواب سلطان جہاں بیگم نے تاریخ کے اس سلسلہ کو آگے بڑھایا۔تزک سلطانی بڑی تقطیع پر ۴۲۴ صفحات پر مشتمل ہے مطبع ریاست بھوپال سے باہتمام مولوی محمد حمید اللہ طبع ہوئی۔

اس کے لئے انہوں نے بہت تحقیق و محنت سے کام لیا اور ۱۹۰۱ء تک کے حالات کو قلمبند کیا۔انہوں نے کتاب کی ابتداء حمد و نعت سے کی ہے۔اس کے بعد تمہید ہے۔تمہید میں تاریخ کی کتاب لکھنے کی وجہ اور تاریخ کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

> اگرچہ اس تاریخ میں صرف بھوپال کے روزمرہ کے واقعات اور ریاست کے مفصل حالات ہی درج ہوں گے، لیکن ان ہی روزمرہ کے واقعات اور حالات سے اہم تاریخی نتائج اخذ کئے جائیں گے اور اہل بھوپال کے لئے قومی و ملکی تاریخ ہوگی اور بالخصوص میرے آئندہ جانشینوں کے لئے۔جبکہ وہ تمام کاغذات و اثلہ جن میں یہ واقعات درج ہیں دفتر پارینہ ہو کر برباد ہو جائیں گے اور وہ لوگ اٹھ جائیں گے جنہوں نے ان حالات کا مشاہدہ کیا ہے۔اور یہ اوراق ان کے متقدمین کی عزت و مساعی کی ایک دستاویز ہوں گے۔(۱۴۶)

واقعات کے لحاظ سے تاریخ بھوپال کے دو حصے اور ۵۴ مضامین ہیں۔حصہ اول جس کا سلسلہ خاندان بھوپال کے مورث اعلیٰ نواب دوست محمد خاں بہادر کی زندگی،اور فتوح کے حالات سے شروع،اور گورنمنٹ برطانیہ کے ساتھ پہلے عہد پر ختم ہوتا ہے۔دوسرا حصہ جس کا آغاز گورنمنٹ برطانیہ کے ساتھ عہد نامہ ہونے کے بعد شروع ہوا۔نواب سکندر بیگم کا عہد آئینی عہد کہلاتا ہے۔نواب سلطان جہاں بیگم نے تاریخ کی ابتداء میں نواب سکندر بیگم کی زندگی واصلاحات کا ذکر کیا۔

> تاریخ بھوپال میں نواب سکندر بیگم صاحبہ کا وہی مرتبہ ہے جو تاریخ ہند میں شہنشاہ اکبر اعظم کو حاصل ہے، جب اکبر سریر آرائے سلطنت ہوا تھا تو ملک کی حالت نہایت نازک تھی، اسی طرح نواب سکندر جہاں ایسے زمانہ میں پیدا ہوئیں تھیں اور ایسے دور میں نشو و نما پائی جو تاریخ میں سب سے زیادہ تاریک اور ہولناک ہے۔۔۔(۱۴۷)

نواب سکندر جہاں بیگم نے حکومت ہاتھ میں لیتے ہی اصلاحات سازی کا عمل شروع کیا، اور اس گروہ کا جو بھوپال میں فتنہ و فساد کا سبب بنا ہوا تھا ان کا قلع قمع، قوانین کا نفاذ، تنخواہوں میں اضافہ اور اداروں کو مستحکم بنایا تھا۔ تمام ریاست کی پیمائش کروائی، یہ وہ کام تھا جو اکبر اعظم کے عہد کے ہندوستان میں پھر کبھی وجود نہیں آیا تھا۔ عورت ہونے کے باوجود تمام ملک کا دورہ کیا اور رعایا سے ان کے مسائل کی بذات خود جانچ پرکھ کی اور ان کے حل کی تدابیر پیش کیں تھیں۔ غدر کے دنوں میں حکومت برطانیہ کو ساتھ کا یقین دلایا اور تمام شر پسند عناصر کو بغاوت سے روکے رکھا۔ نواب سکندر جہاں بیگم کے انتظام ریاست اور ان کی خدمات کا اعتراف سلطنت برطانیہ نے بھی کیا۔ علاوہ ازیں نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنی والدہ نواب شاہجہاں بیگم اور اپنے والد باقی محمد خاں کے حالات بھی بیان کیے ہیں۔ جیسا کہ ایک مقام پر کچھ اس طرح سے رقمطراز ہیں کہ

> سرکار خلد نشین نے نواب باقی کے چہرہ پر سرکار خلد مکاں کے شوہر ہونے کی قابلیت دیکھی، اور نیز جو وفاداریاں اون کے خاندان سے عمل میں آئیں تھیں اون کا صلہ بھی اس طریق پر دینا مناسب سمجھا کہ سرکار خلد مکاں کا عقد اون سے کر کے اپنے خاندان میں اون کو شامل کر لیں، چنانچہ با اطلاع، منظوری گورنمنٹ ہند ۲۶ جولائی ۱۸۵۵ء کو یہ عقد ہو گیا۔(۱۴۸)

نواب سلطان جہاں بیگم کی تربیت نواب سکندر جہاں بیگم کے زیر اثر ہوئی تھی۔ زیر نظر کتاب میں انہوں نے اپنے بچپن کے حالات و واقعات نواب شاہجہاں بیگم کے نکاح ثانی کا ذکر، اپنی شادی، بچوں کی پیدائش، نواب صدیق حسن خاں کے غیر معتدل رویے، نواب قدسیہ بیگم اور نواب شاہجہاں بیگم کے درمیان کشیدگی غرض تمام حالات کو تفصیل کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ نواب صدیق حسن خاں کے بارے میں زیادہ واقعات کا اندراج کیا گیا ہے کیونکہ ان کے غیر مساوی رویے سے ریاست بھوپال شدید متاثر ہوئی تھی اور ان سے خطابات و سلامی واپس لے لی گئی۔ اس حوالے سے نواب سلطان جہاں بیگم لکھتی ہیں کہ

نواب صدیق حسن خان صاحب ایک متعصب شخص تھے اور اس کے ساتھی وہ استعداد علمی بھی رکھتے تھے انہوں نے حالت بینوائی سے نکل کر اپنے آپ کو ایک ملک پر حکمران کی طرح پایا، خزانہ کی کنجیاں ان کے دست اختیار میں، اس اطمینان کے ساتھ انہوں نے عربی وغیرہ میں تصنیف وتالیف کا سلسلہ قائم کر دیا، اور اپنی کتابوں کو عرب و مصر میں مشتہر کروایا جیسا کہ خود سرکاری رپورٹ میں تسلیم کیا گیا۔ سرکار خلد مکاں کو ان کتابوں کے مضامین سے آگاہی نہ تھی۔ چونکہ ان دنوں سوڈان میں بغاوت پھیلی ہوئی تھی، اس لئے گورنمنٹ ان کتابوں سے کھٹکی۔۔۔"(۱۴۹)

۲۶۔ گوہر اقبال (تاریخ بھوپال حصہ اول)

اس کتاب میں نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنی صدر نشینی (۱۹۰۱ء۔۱۹۰۸ء) اور بھوپال کے تاریخی حالات و واقعات کو قلمبند کیا ہے۔ اس کتاب کو لکھنے کا مقصد بھوپال کی تاریخ اور بتدریج ہونے والی ترقی کو ظاہر کرنا ہے۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ

سرکار خلد مکاں (نواب شاہجہاں بیگم) نے اپنے دور حکومت کے حالات تاج الاقبال بھوپال میں لکھے ہیں ان سے یہ مطلب اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ انہوں نے سرکار خلد نشین (نواب سکندر بیگم) کے نظام حکومت سے مقابلہ کر کے اپنی بیدار مغزی اور کوشش و سرگرمی کو ترجیحاً دکھایا ہے۔ اسی طرح جو حالات میری اس کتاب میں درج ہیں وہ بھی اس غرض سے ضبط تحریر میں نہیں لائے گا کہ سرکار خلد مکاں کے عہد کی تنقیص کر کے اپنے زمانے کو ایک ترقی یافتہ زمانہ اور اپنی اصلاحات کو کامیاب اصلاحات کی شکل میں پیش کروں۔ بلکہ یہ حالات فی الحقیقت بھوپال کی تدریجی ترقی کا آئینہ ہیں جن کے دیکھنے سے ہر فرمانروا کی کوشش و سرگرمی اور اس کے زمانہ کی اصلاحات و ترقی کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ (۱۵۰)

نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنے دور حکومت کے پندرہ دن کے عنوان سے پہلا باب تحریر کیا ہے۔ اس میں کل ۵۶ عنوانات قائم کر کے اپنے خاندان کے حالات و واقعات، بیوگی، بیٹوں کی شادی، پوتا پوتیں کی پیدائش، ریاست کی ترقی کے مدارج، اسفار اور اعزازات کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب ان کی حکومت کے سات سال کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کے کل ۳۵۳ صفحات ہیں بڑی تقطیع پر ۱۹۱۳ء میں مطبع سلطانی ریاست بھوپال سے باہتمام مولوی حمید اللہ مہتمم مطابع طبع ہوئی۔

۲۷۔ اختر اقبال یعنی حصہ دوم گوہر اقبال:

یہ کتاب ۱۹۱۳ء میں مطبع عام آگرہ سے شائع ہوئی۔اس کتاب کے مضامین کی تعداد ۴۲اور صفحات کی ۲۴۰ ہیں۔نواب سلطان جہاں بیگم نے "تاج الاقبا ل تاریخ بھوپال" کے سلسلہ کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنی صدر نشینی کے آٹھویں سال ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۳ء تک کے حالات و واقعات تحریر کئے ہیں۔یہ تاریخی سلسلہ ۱۲ سالہ حکومت کا احاطہ کرتی ہے۔

> گوہر اقبال مین تاج الاقبال سے جو میری والدہ ماجدہ خلد مکاں نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ تاج ہند، جی۔سی۔ایس۔آئی کی مصنفہ تاریخ بھوپال ہے حالات کا سلسلہ ملا دیا گیا ہے۔اس طرح ان تینوں کتابوں سے بھوپال کی پوری تاریخ پر عبور حاصل ہوتا ہے اور وہ تمام انقلابات جو ریاست میں ہوئے اور عہد میں جو جو اصلاحات اور ترقیاں ہوئیں ان کی شرح کیفیت معلوم ہو سکتی ہے اور اس کا بھی اچھی طرح اندازہ ہو سکتا ہے کہ اب ریاست کی انتظامی، اقتصادی اور مالی اور فوجی حالت کس درجہ پر ہے اور آئندہ کس درجہ پر پہنچے کی توقعات کی جا سکتی ہیں اور ریاست و رعایائے بھوپال کے مستقبل کی نسبت کیا امیدیں ہو سکتی ہیں۔(۱۵۱)

اس میں انہوں نے ریاست بھوپال میں کی گئی اصلاحات و ترقیات مثلاً ڈاک خانوں کا انتظام، لیڈی منٹو نرسنگ اسکول اور انتظامات، تعلیم دایہ گری، پرنسس آف ویلز کلب، ایڈورڈ میوزیم، معائنہ محمڈن کالج، کوئن میری زنانہ کالج، وغیرہ اور اپنے اسفار کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اس سے ریاست کی اقتصادی یا انتظامی حالات کا بیان ہے۔ عموماً ٹیکسوں کی آمدنی ہمیشہ رفاہ عام وغیرہ کے کاموں میں بڑی مدد دیا کرتی ہے لیکن رعایا کی حالت کے لحاظ سے بہت کم ٹیکس رکھے جو تھے وہ بہت ہی کم مقدار میں تھے۔ علاوہ ازیں دیگر انتظامات کے حوالے سے وہ لکھتی ہیں کہ

> اسٹیشنری کا انتظام بہی کر دیا گیا ہے۔محاسبی اور خزانہ کا کام خوش اسلوبی سے چل رہا ہے۔قواعد حسابی جاری ہیں۔بجٹ مرتب ہوتا ہے اور ہر ایک کام ایک قاعدہ کے تحت مین ہے۔عہدہ دار اور عمال کی قابلیتوں کا معیار قائم کر دیا گیا ہے۔تنخواہوں کا معیار بلند کیا گیا ہے، گریڈ قائم کیے گئے اور بمقابلہ سابق قریباً تنخواہیں ہو گئی ہیں۔(۱۵۲)

نواب سلطان جہاں بیگم نے تمام واقعات سلسلہ وار لکھے ہیں۔تاریخ، دن اور وقت کا بھی اکثر جگہ ذکر کیا ہے۔زیر نظر کتاب "اختر اقبال" کے آخر میں خاتمہ الکتاب کے عنوان سے باب قائم کیا ہے اس میں ریاست کے

مختلف عہدہ داروں کے نام اوران کے متعلق چند تعارفی جملے لکھے ہیں۔اس کے بعد مختلف شعبوں میں ریاست کی ترقی کا اجمالی جائزہ لیا ہے۔

۲۸۔ حیات قدسی:

نواب سلطان جہاں بیگم کی اس مرتبہ کتاب میں ۲۳۴ صفحات ہیں۔۱۹۱۷ء میں باہتمام مولوی محمد حمید اللہ مہتمم مطابع ریاست بھوپال نے مطبع سلطانی ریاست بھوپال سے طبع کروائی۔نواب قدسیہ بیگم خواتین فرمانروا بھوپال کے سلسلہ کی پہلی خاتون فرمانروا تھیں۔ان کے عہد سے دور جدید کا آغاز ہوتا ہے۔نواب سلطان جہاں بیگم نے ان کے انتقال کے بعد ان کی سوانح عمری بہت تحقیق کے ساتھ تصنیف وتالیف کی۔دیباچہ میں نواب سلطان جہاں بیگم نے لکھا کہ

> حیات شاہجہانی سے پہلے اس کو شائع ہونا چاہیے تھا لیکن وہ ایسے زمانہ میں تھیں جس کے واقعات بہت کم دستیاب ہوتے ہیں اور جس قدر اسلنہ وکاغذات جنسے ان کے حالات ترتیب دیئے جائیں مرور زمانہ سے تلف ہو چکے ہیں،اور جو باقی ہیں وہ بہت کم ہیں اس لئے ان کے حالات کی تلاش وجستجو کی وجہ سے دیر ہوگئی بہرحال کاغذات کے معائنہ سے اور معتبر اشخاص کی زبانی جو کچھ واقعات معلوم ہوئے یا جو میرے ذاتی علم میں تھے،وہ سب بعد تحقیق وتنقید ایک جگہ جمع کردیئے گئے ہیں۔(۱۵۳)

نواب قدسیہ بیگم نے طویل عمر پائی ہے۔انہوں نے نواب سلطان جہاں بیگم کی اولاد کو بھی دیکھا تھا۔نواب قدسیہ بیگم کی سوانح عمری کو تین ابواب میں تقسیم کیا۔حصہ اول میں ولادت ، تعلیم وتربیت ،شادی، اولاد، بیوگی، مختاری ریاست ، ترک پردہ،واقعات مابعد تفویض ریاست ،غدر،زنانہ ڈیوڑھی کے استقلال کا خیال ،نواسی کے ساتھ تعلقات کی کشیدگی،انتقال تک کے حالات درج کیے ہیں۔تاریخ میں عورتوں کی حکمرانی کے حوالے سے زیادہ روشن باب نہیں ملتا ہے۔انگلستان میں خواتین حکمران گزری ہیں مگر بعد از حکومت ان کے یہی نتیجہ نکالا گیا جو منفی آراء پر مشتمل تھا۔کیونکہ عام طور پر یہی عقیدہ پایا جاتا ہے کہ عورتوں میں سیاست اور تدبیر حکومت کا مادہ اول تو ہوتا ہی نہیں لیکن اگر ہو بھی تو بھی اس سے پورا کام نہیں لے سکتیں۔خواتین کی فطری کمزوریاں ان کے فرائض حکومت میں حائل ہوتی ہیں مگر باوجود اس کے عورتوں کی تاریخ حکومت اس طریقہ سے مرتب نہیں کی گئی جس طرح مردوں کی کی جاتی ہے۔پھر بھی تاریخ عالم میں اس کی اچھی مثالیں موجود ہیں بقول نواب سلطان جہاں بیگم

مسلمانوں میں ایسی بہت خواتین گزری ہیں جن کے حسن انتظام تدبیر مملکت اور شجاعت و بہادری کے کارناموں سے تاریخیں بھری ہوئی ہیں۔خاندان ایوبیہ مصر کی شجرۃ الدر، رضیہ سطانہ سلطان التمش کی بیٹی خاندان دیلم کی ام المجد خاندان نظام شاہی احمد نگر کی چاند سلطانہ۔۔۔بمقابلہ جہانگیر محمد خان کے نواب قدسیہ بیگم کی حکومت بھوپال کے لئے ایک رحمت و برکت تھی۔ازخود واقعات نے مسٹر ولکنسن سے اس امر کا اعتراف کرالیا کہ قدسیہ بیگم کے زمانہ میں رعایا محفوظ مطمئن ہیں۔۔۔(۱۵۴)

مندرجہ بالا اقتباس دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنے خاندانی تجربات اور تاریخ عالم کے دیکھنے سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ بہ نسبت مردوں کے عورتوں میں مادہ انتظامی قدرتی طور پر موجود ہے۔مردوں کو زور و قوت جس سے کہ معاش پیدا ہو سکے یا جنگ و جدال کے واسطے پیدا کیا ہے۔عورتوں میں ہمدردی، تحمل، وفاداری، استقلال کے مادے ایسے پیدا کیے ہیں جو حکومت کے واسطے ضروری ہیں۔بے شک تعلیم اور تربیت کی دونوں جنس کو ضرورت ہے۔اگر تعلیم و تربیت ہو تو میرے نزدیک عورتیں مردوں کی نسبت بہت اچھی طرح حکومت کر سکتی ہیں۔کوئن وکٹوریہ نے بھی ہندوستانی فرمانرواخواتین کی بیدار مغزی، تدبر کا اعتراف کیا ہے۔اگر دیکھا جائے تو انگلستانی ملکہ وکٹوریہ کی سوانح عمریاں شرح وبسط کے ساتھ متعدد مصنفین نے لکھیں جبکہ ہندوستانی حکمران خواتین کی باقاعدہ سوانح عمریاں مرتب نہیں کی گئی ہیں مگر ہندوستان کی تاریخوں میں جابجا ان کا تذکرہ موجود ہے۔حصہ دوم میں انتظام ریاست اور ان کی قومی و ملکی خدمات کا احاطہ کیا ہے اور آخر میں اخلاق وعادات کے عنوان سے نواب قدسیہ بیگم کی صفات اور کمالات بیان کئے ہیں۔جیسا کہ نواب سلطان جہاں بیگم اس حوالے سے رقمطراز ہیں کہ

بے انتہا متقی اور دیندار ہونے کی وجہ سے ان میں تعصب کا نام تک نہ تھا۔قریب قریب نصفا نصف ہندوٗ مسلمان ملازم تھے۔تقریبوں اور تہواروں میں ان کو بھی خلعت و انعام تقسیم ہوتے تھے۔۔۔وہ اپنی دولت و ثروت کو خدا کی ایک پاک امانت سمجھتی تھیں اور ان کے نزدیک اس کا مصرف مخلوق خدا کی رفاہ اور ادارے حقوق ذوی القربی تھا۔(۱۵۵)

۲۹۔ حیات شاہجہانی:

نواب سلطان جہاں کی کتاب "حیات شاہجہانی "کل ۱۶۳ صفحات پر مشتمل ہے۔۱۹۱۴ء کو مطبع مفید عام آگرہ سے باہتمام محمد قادر علی خاں صوفی طبع ہوئی۔نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنی والدہ نواب شاہجہاں بیگم کی

سوانح عمری کو بہت احتیاط اور تاریخی حوالوں کے ساتھ لکھی ہے۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے اس کتاب کی اہمیت کے حوالے سے دیباچہ میں لکھاہے کہ

> نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ تاج ہند کی سوانح عمری لکھنا نہ صرف میرا فرض ہے بلکہ اسے میں اپنی سعادت سمجھتی ہوں اور ایسے کام کو ایک خدمت جانتی ہوں جو دعا کے بعد میں ان کی کچھ کر سکتی ہوں۔ دنیا مانتی ہے کہ وہ ایک اولی العزم فیاض رحیم المزاج اور مدبر خاتون تھیں پس ایسی خاتون کے کارناموں کو زندہ رکھنے کے لئے ایک سوانح عمری کی اشد ضرورت تھی، ممکن تھا یہ کتاب کسی قابل آدمی سے لکھواتی لیکن مجھے یہ سعادت کیوں کر حاصل ہوتی کہ میں اپنی عزیز و شفیق والدہ کی یہ خدمت بجالاتی۔۔۔ میں نے اس لائف میں عمداًاور قصداًان تمام درد انگیز واقعات کو درج نہیں کیا جو میرے اور ان کے مابین پیش آئے کیونکہ ان کا فراموش کر دینا ہی بہتر ہے۔(۱۵۶)

اس کتاب میں سات ابواب ہیں۔ باب اول میں نواب شاہجہاں بیگم کی پیدائش ، تعلیم و تربیت ، ، شادی اول، اولاد، استحقاق حکومت سے دستبرداری، بیوگی، صدر نشینی، ملکہ معظمہ قیصرہ ہند کا پیغام تعزیت، نکاح ثانی، بیوگی بار ثانی وغیرہ کا ذکر ہے۔ باب دوم میں انتظام و اصلاح ملک اور مختلف علاقوں کے دورے وغیرہ شامل ہیں۔ باب سوم میں انتظام ریاست میں گورنمنٹ کی مداخلت، باب چہارم میں سلطنت برطانیہ کے ساتھ تعلقات اور نواب شاہجہاں بیگم کا انتظام ریاست شامل ہے۔ باب پنجم میں مختلف تقریبات کا اہتمام اور ان میں شرکت ، باب ششم میں درباروں میں شرکت اور خطابات کا ذکر وغیرہ۔ باب ہفتم میں نواب شاہجہاں بیگم کے مشاغل، طرز معاشرت، شعر و سخن کا ذوق، تصانیف، بیماری و انتقال کا ذکر کیا گیا ہے۔

ریاست بھوپال کی حکمراں ہونے کے بعد نواب شاہجہاں بیگم کی قومی اور ملکی خدمات، تعمیرات اور اصلاحات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ تعلیمی خدمات کے حوالے سے نواب سلطان جہاں بیگم نے لکھا کہ

> سرکار خلد نشین کے زمانہ میں اشاعت تعلیم کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا لیکن سرکار نے نہایت فیاضی، اور اولی العزمی کے ساتھ اس سلسلہ کو بڑھایا انہوں نے اس امر کو محسوس کیا کہ جاگیرداروں واخوان ریاست کی تعلیم نہایت ضروری ہے اس خرورت کو پورا کرنے کے واسطے ،اس طبقہ کی تعلیم کے لیے نہ صرف ایک مدرسہ قائم کیا، بلکہ ذاتی طور پر رغبت بھی دلائی۔(۱۵۷)

نواب شاہجہاں بیگم سرکاری تقاریب کو کس طرح منعقد کرتی تھیں۔انہوں نے ریاست کے مفصلات کے دوروں کے علاوہ ہندوستان کے مختلف علاقوں کا سفر کیا۔انگریز حکومت کے درباروں میں شریک ہوئیں۔ حکومت برطانیہ نے ان کی اعلی مدبرانہ صفات کو دیکھتے ہوئے کئی خطاب دیئے،اسکی تفصیل لکھی ہے۔نواب سلطان جہاں بیگم نے کتاب کے آخری باب میں نواب شاہجہاں بیگم کی ذاتی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی عادات،مشاغل، طرز معاشرت،فیاضی، تقریبات و جشن،خانگی تعلقات،عزیزوں سے مہر و محبت کا تذکرہ کیا ہے۔بقول نواب سلطان جہاں بیگم

> اپنے تمام اعزا کے ساتھ خواہ دور دور کے ہوں، یا قریب کے نہایت محبت تھی،انہوں نے تمام عزیزوں کی بیش قرار تنخواہیں مقرر کر دی تھیں،اور ان میں جو قریب تھے۔ان کو تنخواہ کے علاوہ بڑی بڑی جاگیریں عطا کی تھیں،پھر عطیات کا نامتناہی اور غیر محدود سلسلہ برابر جاری تھا۔(۱۵۸)

نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنی والدہ نواب شاہجہاں بیگم کی تصنیف وتالیف کے شوق کا ذکر کیا ہے اور ان کے شعر و سخن و تصنیف وتالیف کی گئی کتابوں کا مختصر تعارف پیش کیا جن میں دو مطبوعہ دیوان "تاج الکلام" اور "دیوان شیریں" چھپ چکے ہیں۔اس کتاب میں نواب شاہجہاں بیگم کی پیدائش سے ان کے انتقال تک کے حالات وواقعات بیان کیے ہیں۔

۳۰۔ آئین سکندری:

نواب سکندر بیگم کی سوانح عمری میجر جنرل محمد عبید اللہ خاں مرتب کر رہے تھے۔ان کے انتقال سے پہلے مسودہ تیار ہو گیا تھا۔نواب سلطان جہاں بیگم نے اس مسودہ پر نظر ثانی کر کے طبع کروایا۔اس کتاب کے ۱۰۵ صفحات ہیں اور تین حصے ہیں۔اول حصہ ولادت،خاندان، تعلیم و تربیت کے متعلق ہیں۔اس میں ۱۱۳بواب ہیں۔ جبکہ دوسرا حصہ ان کی ذاتی زندگی ان کی شخصیت کے متعلق ہے،اس میں چھ باب ہیں۔ تیسرا حصہ نظام حکومت کے متعلق ہے۔اس میں دس باب ہیں۔اس کتاب میں ۲۵۰ صفحات ہیں۔ باہتمام محمد بشیر الدین ۱۹۳۰ء شمسی پریس آگرہ سے طبع ہوئی۔نواب سکندر جہاں بیگم کی ذات مختلف النوع قابلیتوں اور صفات کا مجموعہ تھی۔ان کی صلاحیتوں کے باعث بھوپال میں بہت ترقی ہوئی۔نواب سلطان جہاں بیگم اس حوالے سے لکھتی ہیں کہ

وہ خود جنس ضعیف کی ایک فرد تھیں،اس لئے اپنی جنس کی صحیح عظمت مرکوز خاطر تھی۔گھر کے باہر وہ ایک بارعب حکمران تھیں،گھر نے اندر ایک شفیق و کریم رب البیت تھیں اور ان تمام خصوصیات سے ممتاز تھیں جو اس صنف ضعیف کا نشان خلقت ہیں۔(۱۵۹)

نواب سکندر جہاں بیگم مذہب کی پابند، مگر مذہبی امور میں تعصب کا شکار نہیں تھیں۔حب وطن اور اہل وطن کی ترقی کا خیال ہمیشہ ان کے دل میں جاگزیں رہتا تھا۔علاوہ ان کے علمی ذوق اور مسٹر جوزف ڈوی (M.Joshep dovi) کی حوصلہ افزائی نے ان کو تاریخ بھوپال کی ترتیب وتدوین پر آمادہ کیا،اگرچہ یہ کام چند قابل اشخاص کے ہاتھوں میں رہالیکن ان کے اصل مسودات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خود انہوں نے واقعات کی تحقیق اور حالات کی تنقید میں کس قدر محنت کی ایک مورخ کی حیثیت سے تاریخ نگاری کے فرض کو کس خوش اسلوبی سے انجام دیا۔چنانچہ اس کتاب کا ایک حصہ فارسی میں "تاریخ سکندری "کے نام سے شائع بھی ہو گیا تھا۔اس کتاب میں نواب سلطان جہاں بیگم نے نواب سکندر بیگم کی علم دوستی کے حوالے سے لکھا کہ

اگرچہ وہ خود عالم نہیں تھیں مگر علم کی قدردان تھیں اور باوجود عدیم الفرصتی اور فرائض حکومت کے 'وقت کا کچھ حصہ مطالعہ کتب کے لئے وقف تھا اور ان کے مطالعہ میں مذہبی و اخلاقی کتابیں زیادہ رہتی تھیں،ان کی تعلیم زبان فارسی میں تھی جو اس عہد کے دفاتر کی عام زبان تھی،اس لئے انہوں نے بھی فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی اور اس لٹریچر کے ساتھ خاص ذوق پیدا ہو گیا تھا۔(۱۶۰)

۳۱۔ تذکرہ باقی:

نواب باقی محمد خاں امراؤلدولہ کی سوانح عمری نواب سلطان جہاں بیگم نے ترتیب دی۔اس کتاب کے ۹۲ صفحات ہیں۔باہتمام مولوی محمد حمید اللہ مہتمم مطبع ۱۹۱۵ء میں مطبع سلطانی دارالاقبال ریاست بھوپال سے طبع ہوئی۔زیر نظر کتاب کی تیاری کے حوالے سے نواب سلطان جہاں بیگم نے لکھا

میں نے جب اپنے زمانہ کی تاریخ مرتب کرنے کا ارادہ کیا تو اس کے ساتھ یہ خیال بھی آیا کہ نواب قدسیہ بیگم، نواب سکندر بیگم ،نواب شاہجہاں بیگم اور اپنی نامور اسلاف کی سوانح عمریاں بھی جو تاریخ بھوپال میں عظیم الشان مرتبہ رکھتے ہیں مرتب کروں۔۔۔۔نواب بھوپال میں دوست محمد خاں،وزیر محمد خاں، نظر محمد خاں اور نواب باقی محمد خاں،نواب نظیر

الدولہ احمد علی خاں احتشام الملک کی سوانح بھی اس قابل ہیں جن کو مرتب کر کے شائع کیا جائے۔ چنانچہ میں نے سب سے پہلے اپنے والد ماجد نواب امراؤالدولہ باقی محمد خاں صاحب بہادر نصرت جنگ کی سوانح عمری مرتب کیجو "تذکرہ باقی" کے نام سے شائع کی جاتی ہے(۱۶۱)

اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ حصہ اول میں پیدائش، تعلیم و تربیت اور ملازمت، عہدہ بخشی گری پر سرفراز ہونا، نواب شاہجہاں بیگم کے ساتھ شادی، خدمات زمانہ غدر، اسٹیٹ کونسل کی ممبری، درباروں کی شرکت اور مشہور مقامات کی سیر، سفر حج اور سفر آخرت وغیرہ کے حالات تحریر کئے ہیں۔ نواب باقی محمد خاں جن کی یہ سوانح عمری ہے ان بزرگوں کی اولاد میں سے تھے جن کے ہاتھ ریاست کی بنیاد قائم کرنے اور استحکام میں شریک رہے ہیں۔ ان کے آباؤاجداد نے ہر رئیس بھوپال کے عہد میں جو خیر خواہیاں اور وفاداریاں کی ہیں ان کے تذکرہ سے ریاست بھوپال کی تاریخ بے نیاز نہیں رہ سکتی ہے، یوں نواب سلطان جہاں بیگم نے ابتدائی حصہ میں مختصراًان بزرگوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ نواب باقی محمد خاں کی شادی نواب شاہجہاں بیگم سے قبل اور بھی شادیاں ہو چکی تھیں۔ پہلی شادی ملکہ بی بی کی بیٹی سے ہوئی تھی جو نواب غوث محمد خاں کی بھتیجی تھیں، اس کے علاوہ دیگر نکاحوں کا ذکر کے نواب سلطان جہاں بیگم نے ان کی نواب شاہجہاں بیگم سے نکاح کا بھی ذکر کیا ہے۔ نواب شاہجہاں بیگم کی شادی کے حوالے سے لکھا کہ

> نواب شاہجہاں بیگم کی شادی ایسے زمانہ میں ہوئی تھی کہ تمام ہندوستان جنگ وجدل کا عادی ہو رہا تھا، بات بات پر تلوار میان سے نکلتی تھی۔ مفسدہ پردازی کے لوگ خوگر تھے۔۔۔غدر میں جو شادی سے قریباًدو سال کے بعد ہندوستان میں برپا ہوا ریاست بھوپال بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ رہی تھی۔ نواب امراؤ دولہ صاحب بہادر نے بھی اس شورش کے رفع انسداد میں بہت بڑا حصہ لیااور اپنی حسن تدابیر اور اثر سے فوج کو سرکشی سے باز رکھا۔ چونکہ نواب امراؤ دولہ سے فوج کو بہت عقیدت تھی اور لوگ ان کے احکام کی تعمیل بلاچون وچرا کرتے تھے ۔۔۔(۱۶۲)

حصہ دوم میں ذاتی اوصاف اور اخلاق و عادات، شجاعت و بہادری، خوراک، فنون سپاہ گری، جرات و ہمت، علمی ذوق، خانگی تعلقات، ازدواج واولاد، مخفی خیرات، صلح پسندی، تجارت کا شوق وغیرہ کا ذکر ہے۔ اس سوانح کو نواب سلطان جہاں بیگم بہت تحقیق کے بعد تفصیلاً لکھنا چاہتی تھیں۔ مگر اس زمانے کے ضروری کاغذات و فائلیں

تلف ہو گئیں۔ جو تھوڑے بہت کاغذات اور مثلیں تلف ہونے سے بچ گئے انہی سے کچھ حالات زبانی روایتوں سے حاصل کر کے تحقیق و تنقید کے بعد ایک جگہ جمع کر دیا۔ انہیں اس کے نامکمل رہ جانے کا بے حد افسوس تھا۔ نواب امراؤ الدولہ صاحب بہادر بہت سے کمالات اور خوبیوں کا مجموعہ تھے۔ نواب صاحب کا خاندان مکمل طور پر سپاہی پیشہ تھا مگر علمی و ادبی سطح پر بھی ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ان کے خاندان میں اکثر لوگ اہم ادیبوں کی فہرست میں بھی شامل رہے۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے نواب باقی محمد خان کے علمی ذوق و شوق کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ

> نواب صاحب نہ صرف ایک سپاہی تھے بلکہ وہ بہت بڑے علم دوست اور ہنر پرور بھی تھے، طب کا ان کو بہت شوق تھا اور اس فن میں انکی معلومات بہت وسیع تھیں اور فن طب کی کتابوں کا بہت اچھا ذخیرہ انہوں نے جمع کیا تھا طب کے علاوہ انہوں نے دیگر علوم و فنون کی نہایت نادر کتابیں عربی، فارسی کی جمع کی تھیں اکثر کتابیں ان کے کتب خانے میں ایسی تھیں جو اب نایاب ہیں، علامہ ابن رشد کے بعض فلسفیانہ رسالے بھی تھے جو اب کہیں بھی دستیاب نہیں ہو سکتے۔۔۔(۱۶۳)

۳۲۔ روضۃ الریاحین یعنی کشور حجاز:

نواب سلطان جہاں بیگم نے سفر حج سے واپسی پر اس سفر نامہ کو تحریر کیا۔ یہ کتاب بڑی تقطیع پر لکھی ہوئی ہے، ۲۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ مطبع سلطانی بھوپال سے باہتمام حافظ کرامت اللہ طبع ہوئی۔ اس میں روداد سفر بیان کی گئی۔ ۲۸ اکتوبر ۱۹۰۳ء کو ایک بڑے قافلے کے ساتھ نواب سلطان جہاں بیگم بھوپال سے بمبئی کے لیے روانہ ہوئیں اور ۴ اپریل ۱۹۰۴ کو بھوپال واپس پہنچیں۔ اس سفر نامہ کی کتاب کے دو دفتر ہیں۔ دفتر اول میں عرب کا جغرافیہ، کعبہ و مکہ معظمہ، مسجد نبوی کا مفصلاً ذکر ہے۔ دفتر دوم میں سفر حجاز کے واقعات اور حالات اور ان کے متعلق کاغذوں کی نقلیں ہیں۔ پہلے باب کے اختتام پر نواب سلطان جہاں بیگم نے مسجد بنوی کی تعمیر کے سلسلہ میں ایک واقعہ تحریر کیا ہے کہ

> ایک عجیب قدرتی واقعہ اس موقع پر قابل ذکر ہے کہ جب ستون توبہ اور ستون سریر کے مابین کھودی جارہی تھی (جو حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کے سرہانے ہے) نیو میں ایک چشمہ نمودار ہوا جس کی خوشبو پھیل گئی۔ لوگوں نے تبرکاً اسکا پانی پیا تو نہایت اور عموماً اہل مدینہ منورہ اس پانی سے فیضیاب ہوئے۔ جب عمارت کے کام میں ہرج ہونے لگا تو متوفی عمارت نے اسکا منبع تعمیر ذریعہ بند کرادیا اور نیو بھروادی جس میں پانی کی جگہ عرق گلاب استعمال کیا گیا۔ آخری ذی

الحجہ ۱۲۷۷ھ میں مسجد متبرکہ کی عمارت بہ صرف چھ لاکھ پچاس ہزار گنی مجیدی مکمل
ہوئی۔(۱۶۴)

آغاز سفر سے پہلے انہوں نے اپنے ساتھ سفر کرنے والے ہمراہیوں کے لیے ہدایت نامہ جاری کیا۔اس ہدایت نامہ کو جاری کرنے کا مقصد مبارک سفر میں کسی قسم کی بد نظمی کا سامنانہ کرناپڑے۔ قواعد وضوابط کی پابندی کی جائے جو غیر ممالک کے عائد کردہ ہیں۔ ممالک مذکورہ کے کسی شخص کے ساتھ خلاف احتیاط و تہذیب کوئی برتاؤنہ کیا جائے بلکہ ہر معاملہ میں اپنی جانب سے حلم ومتانت ونرمی وفروتنی عمل میں آتی رہے اگر کسی کی طرف سے کوئی سختی بھی دیکھی جائے تب بھی ہمیشہ اس سفر مبارک کی غرض پاک کو ہر قدم پر ملحوظ رکھ کر برداشت کیا جائے۔زیر نظر کتاب میں ان خطوط اور فرامین کی نقل بھی دی ہے جو سفر کے درمیان لکھے گئے یاان کے پاس آئے۔مثلاً لارڈ کرزن(Lord Karson)صاحب بہادر وائسرائے ہند کی جانب سے لکھے گئے خط کا متن کا ترجمہ کچھ اس طرح سے تھا کہ

میری معزز دوست۔آن مکرمہ کا خریطہ ۵ اکتوبر ۱۹۰۳ء مجکو ملا جس میں آن مکرمہ نے اپنی زیارت مکہ معظمہ کے جانیکی بابت اطلاع دی ہے آن مکرمہ اطمینان رکھیں کہ برٹش سلطنت کی جواطاعت ووفاداری آن مکرمہ فرماتی ہیں اوسکی قدر ہمیشہ گورنمنٹ کرتی ہے اور مجکو یقین ہے کہ اس مبارک ومقدس کاسے فارغ ہوجانے کے بعد مجکو یہ خبر ملے گی کہ آن مکرمہ کا پیغام حسب ضابطہ خدمت میں ہے سکریٹری آف اسٹیٹ یعنی وزیر ہند کی مرسل ہوگا ساتھ بہت بہت مراسم اسلام کے۔میں ہوں آن مکرمہ کادوست صادق دستخط کرزن۔(۱۶۵)

اس سفر نامے میں وہ سب حالات بیان کیے گئے کہ اس زمانے میں سفر کی کیاکیا دشواریاں انہیں پیش آئیں۔ان کو رفع کرنے کے لیے کیااقدامات کیے گئے۔ تمام معلومات اس میں درج ہیں۔گھوڑے اونٹ پر سفر اور پانی کے جہاز کے سفر کی دشواریاں بیان کی ہیں۔انہوں نے عرب معاشرت کا بھی بغور جائزہ لیااوراس کے متعلق معلومات بیان کیں۔اس وقت حجاز پر ترکی سلطان کی حکمرانی تھی،نواب سلطان جہاں بیگم نے اپناسفر ترکی فوج کی نگرانی میں طے کیا۔نواب سلطان جہاں بیگم کے ساتھ تبرکات بھی بھوپال لائے گئے تھے جن کا ذکر بھی اس کتاب میں کیا گیا ہے۔

۳۴۔ فرائض النساء:

نواب سلطان جہاں بیگم کی کتاب "فرائض النساء "چھوٹے سائز کے ۲۲۹صفحات پر مشتمل ہے۔۱۹۲۱ء میں مطبع سلطانی گورنمنٹ بھوپال سے طبع ہوئی۔اس کتاب میں گیارہ ابواب ہیں جن میں خواتین کے فرائض کو مختلف عنوانات کے تحت بیان کیا گیا ہے۔گھر کیسے بنتا ہے ؟اس موضوع سے ابتداء کی گئی ہے۔سلیقہ خانہ داری، مکان اور اس کا سامان، ملازم، صفائی، لباس کی دھلائی، پانی اور دیگر مشروبات، غذا، تیمارداری، بچوں کی پرورش، بچوں کی تربیت جیسے مفید موضوعات جو انسانی زندگی میں لازمی ہیں بہت اچھے ڈھنگ سے بیان کیے ہیں۔آخری موضوع علمی کھیل ہے جس میں مختلف کھیلوں کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

۳۵۔ رہبر نسواں حصہ اول، جلد دوم درس حیات:

نواب سلطان جہاں بیگم نے یہ کتاب "رہبر نسواں حصہ اول، جلد دوم درس حیات" ان لڑکیوں کے لئے لکھی گئی جو مدرسہ میں داخل ہو کر تعلیم حاصل کرتی ہیں۔اس حوالے سے نواب سلطان جہاں بیگم دیباچہ میں لکھتی ہیں کہ

> وہ لڑکیوں جو مدارس میں تعلیم پاتی ہیں اس تعلیم سے محروم رہ جاتی ہیں جو عورتوں کی ضروریات زندگی اور معاشرت کے لحاظ سے مقدم اور ضروری ہے۔ہندوستانی لڑکیوں کے لئے مختصراًسب سے مقدم اور روری تعلیم یہ ہے کہ مذہبی تعلیم ،اصول حفظان صحت اور تیمارداری، پرورش و تربیت اولاد، خانہ داری جن میں کھانا پکانے کے اصول اور ترکیبیں، کپڑوں کے قطع و برید اور سلائی بھی شامل ہے۔(۱۶۶)

اس کتاب میں اولاد کی تعلیم و تربیت کو بطور قصہ کے بیان کیا ہے۔خشک موضوعات کو مکالماتی انداز سے دلچسپ بنادیا ہے۔اس کتاب سے اصول معاشرت ،اصول خانہ داری، معلومات عامہ سے تسلی بخش آگہی حاصل ہوتی ہے۔کتاب کے ۳۲۶صفحات ہیں۔۱۰۲۱ء میں مطبع سلطانی گورنمنٹ بھوپال سے چھوٹے سائز میں طبع ہوئی۔

۳۶۔ اخلاق کی پہلی کتاب:

نواب سلطان جہاں بیگم نے بچوں کی بہترین تربیت، تہذیب و اخلاق کی تعلیم کے پیش نظر اخلاق کے سلسلے میں ۴ کتابیں تیار کی تھیں۔نواب سلطان جہاں بیگم اس تناظر میں کتاب کے دیباچہ میں لکھتی ہیں کہ

اگرچہ اخلاقی سبقوں کا یہ سلسلہ میں نے اپنے خاندان کے بچوں کے لئے شائع کیا ہے لیکن میرا یہ مدعا ہے کہ اور بچوں کو بھی اس سے فائدہ ہو۔اردو میں اس موضوع پر بہت کم کتابیں ہیں جو نصاب کے طور پر کام آئیں حالانکہ ضرورت ہے کہ بہ کثرت ایسے سلسلہ ہوں جو مسلمانوں کے مدرسوں کی ابتدائی جماعتوں میں پڑھائے جائیں اور جہاں ایسے مدرسے نہ ہوں،وہاں گھروں پر التزام رکھا جائے۔ مسلمانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ عام طور پر ایسے اخلاقی اسباق تعلیم کا جزو اعظم ہونے چاہیے۔(۱۶۷)

انہوں نے اس کتاب میں سبقوں کو خالص مذہبی نقطہ نظر سے لکھا ہے کیونکہ انسان کے دل پر وہ بات جلد اثر کرتی ہے جو مذہب کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔اس لئے اس میں جابجا آیات و احادیث سے کتاب کو زینت دی ہے۔اور مثال کے طور پر مسلمانوں کے صحیح اور تاریخی واقعات لکھے ہیں۔ان کی رائے میں ابتداً سے بچوں کو چھوٹی چھوٹی آیتیں اور حدیثیں برزبان ہونا چاہیں۔تاکہ وہ موقع بہ موقع ان کو استعمال کریں۔ جس سے تحریر و تقریر میں زور پیدا ہو جاتا ہے اور اس سے ان کو اپنی مقدس کتاب زیادہ دیکھنے اور یاد رکھنے کا شوق پیدا ہو گا۔اسی طرح اسلامی روایات و حکایات سے دل میں جوش اور اتباع کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ بہر حال اگر تنقیدی نقطہ سے دیکھا جائے تو انہوں نے ان مقاصد کو ملحوظ رکھ کر یہ خاکہ تیار کیا ہے اور وہاں کے قابل اشخاص کے قلم سے قوم کے بچوں کے لئے شاندار کتابیں تیار ہوں۔انہوں نے فرصت کے لمحات میں اس کتاب کے مسودے پر بہت محنت کی اور انگریزی کتابوں سے مدد لی۔

زیر نظر کتاب میں جس قدر نظمیں ہیں وہ منشی محمد یوسف قیصر کا نتیجہ طبع ہیں جو اعلی درجے کے شاعر تھے۔ان کے بچوں کے لئے اخلاقی نظمیں یتار کرنے سے کتاب کی وقعت بڑھ گئی۔ یہ کتابیں اس قابل ہیں کہ بچوں کو زبانی یاد کروائی جائیں۔تاکہ بچوں کو خوش الحانی کے ساتھ موزوں پڑھنے کی مشق کروائی جائے اور ان کا اثر دل پر ہو جائے۔

۳۶۔ اخلاق کی تیسری کتاب:

نواب سلطان جہاں بیگم نے بچوں کے نصاب کے لئے اخلاق کی چار کتابیں تیار کی تھیں۔ان میں آسان زبان اور سادہ طریقہ سے بچوں کے اخلاق و عادات کو سنوارنے،ان کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے چھوٹے چھوٹے مضمون لکھے۔اخلاق کی تیسری کتاب کے عنوانات ہیں۔کال ، کوشش، فرض، تکمیل،انسانی مساوات،حب وطن ، کفایت شعاری،وقت اور اس کا انداز،نیک مزاجی، محبت،اعزاز، خود اعتمادی، عادت، ہمت،امن و جنگ کے اثرات ،

نمونہ اور صحبت کا اثر، گھر اور گھر کے اثرات۔اس کتاب کے ۱۶۶ صفحات ہیں۔ محمد بشیر خاں کے زیر اہتمام مطبع شمسی پریس آگرہ سے ۱۳۴۲ھ میں دوسری مرتبہ طبع کی گئی۔

۳۸۔ پردہ ایک تصنیف:

نواب سلطان جہاں بیگم نے اس کتاب میں تمدنی، مذہبی، اخلاقی، طبّی اور معاشرتی نقطہ نظر سے بے پردگی کے نقصانات دکھائے ہیں۔انہوں نے اس کتاب میں سب سے پہلے پردہ کی تاریخ غایت تفصیل کے ساتھ لکھی ہے اور خواتین اسلام میں پردے کا جو التزام تھا اس کے متعلق غایت اور موثر واقعات جمع کئے گئے ہیں۔اس کے بعد احادیث و قرآن میں پردے کی فضیلت اور اس کا وجود ثابت کیا ہے۔ پھر بے پردگی کے تمام نقصانات دکھائے ہیں۔اور بے پردگی کی حمایت میں جو دلائل پیش کیے جاتے تھے ان کا زبردست جواب دیا ہے۔ جس حصہ میں مذہب کا ذکر ہے اس میں علمائے حال کے مضامین فتوؤں کو بطور تتمہ شامل کر دیا ہے جس سے یہ بات ثابت کرنا مقصود ہے کہ جدید و قدیم دونوں نے پردہ کی پابندی پر اتفاق کیا ہے۔نواب سلطان جہاں بیگم نے ان حیثیتوں کو جن سے پردہ کا وجود ثابت ہوتا ہے محنت کے ساتھ جمع کر دیا ہے۔

۳۹۔ ہدایات باغبانی حصہ اول:

فن باغبانی پر سلطان جہاں بیگم نے خصوصی توجہ دی۔ہدایات باغبانی کتاب انہوں نے لوگوں میں باغبانی کے فن کو فروغ دینے کے لیے لکھی ہے۔تاکہ عوام باغبانی کے فن سے پوری طرح واقف ہو جائیں۔دیباچہ میں لکھتی ہیں کہ

> دور جدید میں اب انگریزی تعلیم اور تمدن کے ساتھ ہی ساتھ باغات کے متعلق بھی بہت کچھ تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔۔۔فن باغبانی ایک مستقل فن بن گیا ہے، بڑے بڑے شہروں میں سرکاری باغات سائنٹفک طریقوں سے لگائے گئے یا درست کئے گئے ہیں۔(۱۶۸)

اس مقصد کے لیے انہوں نے مختلف رسالوں کے مضامین منتخب کر کے ترجمہ کروائے اور انتخاب کے بعد ایک کتاب تیار کی ہے۔ جن لوگوں کو ہر وقت ان مفید معلومات سے استفادہ کرنے کی ضرورت رہتی ہے۔یہ کتاب ان کے لیے بہت مفید ہے۔اس کتاب میں اصطلاحات باغبانی، اقسام زمین اور فرائض باغبانی کے متعلق ضروری باتوں کو

مختصر بیان کر دیا ہے۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے بتایا ہے کہ معلومات کی کمی اور باغبانوں کو اس قسم کی معلومات حاصل رہیں اور وہ مستعدی سے عمل پیرا ہوں تو ایسے نقصانات سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں دس ابواب ہیں۔

۱۔ نارنگی، لیمو، چکوترہ کاشت ۲۔ انار کی کاشت ۳۔ کیلے کی کاشت ۴۔ انگور کی کاشت ۵۔ بیر کی کاشت ۶۔ آم کی کاشت ۷۔ شفتالو ۸۔ کشمکش ۹۔ لوکاٹ ۱۰۔ ناریل کی کاشت۔ پھلوں میں پیوند ایسے لگائے جاتے ہیں۔ کونسا پھل کس موسم میں بونا چاہیے اور کتنا پانی اس کے لیے ضروری ہے۔ پھل کس موسم میں آتے ہیں۔ کھاد کتنی اور کونسی ڈالنی چاہیے کس پودے کے درخت کے لیے کونسی زمین زیادہ بہتر ہوتی ہے۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے چھوٹی چھوٹی باتوں کو بہت آسان زبان میں بتایا اور سمجھایا ہے۔ انہوں نے اکثر مضامین کے نیچے ان کے مصنفین کے نام لکھ دیئے ہیں۔ اس کتاب کے ۱۷۷ صفحات ہیں۔ مطبع سلطانی ریاست بھوپال سے ۱۹۲۱ء کو طبع ہوئی۔

۲۲۔ ہدایات باغبانی: (حصہ دوم)

اسی سلسلے کی دوسری کتاب ہے۔ جس میں پھلوں کی کاشت کے متعلق تمام معلومات درج ہیں۔

۴۰۔ ہدایات سلطانی (حصہ اول):

نواب سلطان جہاں بیگم کے وہ احکامات جو قوانین کی شکل میں ان کی گیارہ برس کی حکومت میں مدون ہو کر نافذ ہوئے۔ یہ کتاب ان کا مجموعہ ہے وہ چھوٹے بڑے ہر معاملہ کو غور و فکر اور مشورہ کے بعد طے کرتی تھیں۔ یہ احکامات مہتمم تنظیمات ریاست بھوپال ۱۴ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو مدون کیے گئے۔ ان کی ضرورت ریاست میں بہت عرصہ سے محسوس کی جارہی تھی۔ اس کتاب میں اس بات کا خاص طور پر اہتمام کیا گیا ہے کہ جو ہدایات و احکام ایک دوسرے کے ناسخ و منسوخ ہیں ان پر ناسخ و منسوخ کا نوٹ درج کر دیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ ہدایات چار حصوں میں منقسم ہے۔ حصہ اول میں فنانشل، اموال سرکاری وغیرہ۔ حصہ دوم میں پولیٹکل ایجنٹ، فوج، پولیس اور جیل کے متعلق۔ حصہ سوم میں عدالت، وضع قوانین، میڈیکل ایجنٹ شفاخانہ وغیرہ۔ حصہ چہارم میں ملازماتی انتظام عام، متفرق ڈیوڑھیاں، وظائف، ڈاک خانے کے متعلق ہدایات درج ہیں۔ اس مجموعہ ہدایات میں نواب سلطان جہاں بیگم کی حکمرانی کے ابتدائی سال کے ۵ جولائی ۱۹۰۱ء سے ۳۰ ستمبر ۱۹۱۲ء تک کے احکامات و ہدایات درج ہیں۔ مولوی محمد حمید اللہ مہتمم مطابع کے زیر اہتمام ۱۹۱۳ء میں مطبع سلطانی ریاست بھوپال سے طبع ہوئی۔

۴۰۔ تہذیب النسواں و تربیت الانسان:

نواب سلطان جہاں بیگم کی مرتبہ کتاب "تہذیب النسواں و تربیت الانسان" دراصل ان کی والدہ نواب شاہجہاں بیگم کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔ نواب شاہجہاں بیگم کی کئی اور بھی تصانیف ہیں مگر اپنی جنس کی ترقی و تعلیم کا جذبہ بمطابق اسلام ان کے دل میں بہت زیادہ تھا اور اسی بنیاد پر یہ کتاب منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کی پہلی اشاعت ۱۸۸۲ء میں سامنے آئی اور مقبولیت عام حاصل کی۔ اس کتاب میں بیس باب اور ۴۲۸ صفحات شامل ہیں۔ اس کے بعد دو، تین سال کے فرق سے مزید دو مرتبہ اس کی اشاعت کی گئی۔ اردو زبان میں اس وقت یہ پہلی تصنیف شائع ہوئی تھی۔ اس کو چوتھی بار مرتب کرنے کی اہمیت و افادیت کے حوالے سے نواب سلطان جہاں بیگم کتاب کے دیباچہ میں لکھتی ہیں کہ

> چونکہ اب تعلیم نسواں کی طرف بمقابلہ گزشتہ ۳۲ سال کے زیادہ توجہ ہو رہی ہے لیکن اس توجہ میں مذہبی بے پروائی کا اثر بھی ہے اس لئے میں نے اس کتاب کو جس میں مذہبی اصول پر تدبیر منزل کی تعلیم ہے بعد حذف و زوائد شائع کرنا ضروری سمجھا ہے تاکہ میری جنس اور قوم کی خواتین کو فائدہ پہنچے اور والدہ مرحومہ کی روح کو مسرت و ثواب حاصل ہو۔ مجھے یقین ہے کہ جو خواتین اس کتاب کا مطالعہ کریں گی وہ جناب مرحومہ کو اور مجھے دعائے خیر سے یاد کریں گی۔(۱۶۹)

عہد سلطانی میں ادبی صورتحال:

نواب سلطان جہاں بیگم نے مشرقی علوم کی ترقی کے ساتھ ساتھ مغربی زبان و ادب سے واقفیت پر بھی خصوصی توجہ صرف کی تھی۔ وہ ادب کو معاشرے کی تعمیر و اصلاح کا ایک موثر ذریعہ تصور کرتی تھیں۔ وہ ادب کو محض درباری یا امراء کے محلات تک محدود رکھ کر اس کے دائرہ کار کو محدود کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ چنانچہ ان کے عہد میں ایسے شعراء و ادباء کو کوئی تعاون حاصل نہیں ہو سکا جو نوابین و روساء کی مدح سرائی کر کے کسب معاش کے قائل تھے۔ انہوں نے شعراء کو ترغیب دی کہ وہ ایسی اخلاقی نظمیں لکھیں جن کے ذریعے اصلاح و تعمیر کی راہیں ہموار ہو سکیں۔ اس دور کی نمایاں خصوصیت یہی ہے کہ زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات اور مصلحت کے پیش نظر ادبی رجحانات میں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ عصر حاضر کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر شعر و ادب کی تخلیق و تصنیف کا کام انجام دیا گیا۔ جس

کے نتیجے میں بے جا مبالغہ آرائی، فرسودہ اور روایتی موضوعات کے بجائے ایسا ادب جو حقیقت نگاری پر مبنی ہو اس کی تخلیق نیز سادہ طرز نگارش پر توجہ صرف کی جانے لگی تھی۔ یہی اصلاحی رجحان اس دور کی نثر میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس عہد کی ادبی صورت حال کے حوالے سے ڈاکٹر نعمان لکھتے ہیں کہ

> عہد سلطانی رجحانات کے لحاظ سے گزشتہ ادوار سے اس لئے ممتاز ہے کہ اس کے آغاز سے ہی بھوپال کے علم و ادب پر مغربیت اثر انداز ہونا شروع ہو گئی اور یہ بھی ہوا کہ شعراء درباری سرپرستی سے محروم ہو گئے۔ نواب سلطان جہاں بیگم اپنے اصلاحی رجحانات اور مشاغل کے اعتبار سے سرسید کے گروہ سے تعلق رکھتی تھیں۔۔۔ وہ شعرائے رنگ قدیم جو اس مطالبہ کو پورا نہیں کر سکتے تھے، اپنی ناقدری کو برداشت نہیں کر سکے اور بھوپال چھوڑ کر چلے گئے۔ جو موجود رہے انہوں نے ادب برائے زندگی کے نظریے کو قبول کرنے کی جدوجہد شروع کر دی اور غزل کے فرسودہ راستے کو ترک کر کے نظم گوئی کی طرف متوجہ ہوئے۔(۱۷۰)

نواب سلطان جہاں بیگم نے برسر اقتدار آنے کے بعد شعراء کو قصیدہ لکھنے سے منع کیا تھا۔ انہوں نے شعراء کو قومی تربیت اور اصلاحی نظمیں لکھنے کی ترغیب دی۔ نواب سلطان جہاں بیگم فرسودہ رسم ورواج، روایتی شاعری کی تخلیق کو وقت کا زیاں سمجھتی تھیں۔ ان کے عہد میں بھوپالی علم و ادب اور معاشرے میں تبدیلی آئی اور کسی حد تک مغربی اثرات پڑنا شروع ہو گئے۔ نواب سلطان جہاں بیگم علم کے فروغ، اصلاحی رجحانات و نظریات و مشاغل کے اعتبار سے سرسید کے گروہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس دور میں نوجوان شعراء حالی کے نظریات ادب سے متاثر تھے۔ انہوں نے نظم کے ذریعہ اصلاحی ادب کی تخلیق کی۔ جنگ عظیم کے بعد ادبی رجحانات میں نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے۔ جن لوگوں نے غزل کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا تھا انہوں نے غزل کے لئے فنی سطح پر تبدیلیاں کیں مثلاً لفظیات کے بجائے شعر میں سادہ گوئی، حقیقت نگاری اور موسیقیت کو داخل کیا تھا۔ نظم میں عشقیہ جذبات کے بجائے فلسفیانہ عناصر ابھرنے لگے۔ ذیل میں عہد سلطانی کے اہم اور نامور شعراء کے بارے میں فرداً فرداً معلومات فراہم کی جائیں گی۔

امراؤ علی عیش بھوپالی:

میر ضامن علی لکھنوی زورؔ کے بیٹے تھے۔ بھوپال میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے شاعری کی طرف مائل تھے۔ ابتداء میں اشہریؔ کے شاگرد ہوئے، پھر داغ دہلوی (۱۸۳۱ء۔۱۹۰۵ء) سے اصلاح لینے لگے اور حوصلہ افزائی کی

وجہ سے استاد کے جانشین بننے کے دعویدار ہو گئے۔ لیکن داغؔ کے شاگردوں سے اعتراضات اٹھنے لگے تھے۔ بعدازاں پیشہ ور نقاد بن گئے اور" آگرہ اخبار" کے ذریعہ امیر مینائی اوران کے شاگروں سے معرکے شروع کر دیئے۔ عیشؔ کے شاگردوں کا ایک بہت بڑا حلقہ تھا۔ ان کے اشعار برجستہ ہوتے تھے۔ ایک دیوان مکمل کیا مگر مالی حالات کی خرابی کی بناءپر شائع نہ کرواسکے بقول ڈاکٹر سلیم حامد رضوی

> مولانا ارشد تھانوی کا قول ہے کہ سر راس مسعود عیشؔ کے بہت قدر دان تھے اکثر ان سے کلام سنا کرتے تھے۔ دیوان بھی شائع کرنے کے لیے مانگا تھا مگر بدقسمتی سے ان تک پہنچنے ہی نہیں پایا کہ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ عیشؔ کے کوئی اولاد نرینہ بھی نہیں تھی اس لئے کلام ضائع ہو گیا۔ عیشؔ کے یہاں ایک طرف تو داغؔ کی طرح زبان لطف ہے دوسری طرف مضامین کی شوخی ہے۔ لیکن یہ شوخی پھکڑپن یا فحش کی حد تک نہیں آتی۔ زاہد و واعظ پر پھبتیاں ہیں مگر متانت کے ساتھ۔(۱۷۱)

عیشؔ کی مختلف مطبوعہ کتابوں "انبار غلط" میں ہم عصروں کے کلام پر اعتراضات، اصلاحی خاکے وغیرہ شامل ہیں۔ دوسری کتاب "معرکہ سخن" اس میں امیر مینائی اوران کے شاگروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ تیسری کتاب "تحفہ عیش" مجموعہ نظم ہے، اس میں اخلاقی مسائل کو بچوں کے لئے نظم کیا مثلاً تکبر، بخل، مذمت، سخاوت وغیرہ شامل ہیں۔ نمونہ کلام

حضرت شیخ جانتے ہیں ہمیں
ہم سے شیخی یہ کیا بگھاریں گے
اہل دنیا ہیں حرص کے پتلے
کیا یہ دنیا پہ لات ماریں گے

☆

پاؤں اٹھ بھی نہیں سکتا ہے ترا اے مجنوں
کیا اسی پاؤں کے نیچے سے بیاباں نکلا (۱۷۲)

منشی انور علی انورؔ بھوپالی:

منشی انور علی انورؔ بھوپالی "مرزا داغ"ؔ کے مشہور شاگرد اور زندہ دل انسان تھے۔ کافی عرصہ تک گورنمنٹ پریس بھوپال میں ملازم رہے۔ آخری عمر میں ان پر دیوانگی کے دورے پڑنے لگے جس کی وجہ سے مشق سخن جاری نہ رہ سکی۔ ابتداء ہی سے داغؔ کا کامیاب تتبع کر رہے تھے۔ اگر دیوانے نہ ہوتے تو شاید داغؔ کے ممتاز شاگردوں میں شمار کیے جاتے کیونکہ یہ بھی داغ کی جانشینی کے دعویدار تھے۔ کچھ کلام گلدستوں کی شکل میں شائع بھی ہو چکا ہے۔ جس میں انہوں نے اپنا بطور جانشین داغؔ تعارف کرایا ہے۔ نمونہ کلام

عمر بھر کا یہ مشغلہ ہے خوب
تیرے وعدے شمار کرتے ہیں
بازی عشق میں ہم اے انورؔ
جان ہاریں گے جی نہ ہاریں گے
نگاہ شوق نے کچھ بھی تو نہ چھوڑا دل میں
رہ گئی ایک تمنا ہی تمنا دل میں (۱۷۳)

عبدالوسع صفاؔ:

بھوپال کے ادیب اعظم مولوی محمد یوسف کے بیٹے تھے۔ ابتداء میں مدرسہ سلمانیہ میں عربی ادب کے استاد مقرر ہوئے۔ امیر مینائیؔ کے شاگردوں میں سے تھے۔ صفاؔ کا حلقہ شاگرد بہت وسیع تھا۔ ۱۹۱۲ء میں حیدر آباد چلے گئے جہاں اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ صفاؔ کی نگرانی میں امیر مینائی کی یادگار کے طور پر بھوپال سے ماہانہ گلدستہ "گلبن سخن" نکلتا تھا۔ صفاؔ کا نمونہ کلام درج ذیل ہے

چومتے لب ساقی گلفام کے
میرے لب ہوتے کنارے جام کے
گالیاں کھائیں گے تجھ کو چھیڑ کر
ہم تو بھوکے ہیں تری دشنام کے
مئے پلا ساقی کہ آئی فصل گل

منتظر تھے رند انہیں ایام کے

دل دیا اس خود غرض کو اے صفاؔ

کچھ نہ ہاتھ آیا سوا الزام کے(۱۷۴)

حافظ سلیمان خاں خالصؔ:

خالصؔ نابینا شاعر کے نام سے مشہور تھے۔"موتی مسجد"بھوپال کے حجرے میں ساری زندگی گزار دی تھی۔حدیث اور تفسیر کا اچھا علم رکھتے تھے۔شعر و شاعری سے بھی خاص لگاؤ تھا۔کوئی مشاعرہ ایسا نہیں ہوتا تھا کہ جس میں شریک نہ ہوتے ہوں۔معشوق علی خاں کے شاگرد تھے۔خالصؔ کا نمونہ کلام ذیل میں پیش کیا جائے گا۔

طور پر نہ کبھی کوئی جسے دیکھ سکا

میرے ہر گوشہ خاطر میں وہ پنہاں نکلا

معتقد شیخ کے اب خاک رہیں ہم

وہ تو شائق حور جناں ، مائل غلماں نکلا (۱۷۵)

شاکر حسین نگہت سہسوانی:

صابر حسین صباؔ سہسوانی کے بیٹے اور جمیل سہسوانی کے شاگرد تھے۔شاکر حسین نگہت سہسوانی دس سال کی عمر میں بھوپال آ گئے تھے۔ساری عمر بھوپال میں رہ کر علم و ادب کی خدمت کرتے رہے لیکن جب پنشن کے بعد وطن چلے گئے ۱۹۵۲ء میں انتقال فرمایا۔صاحب دیوان شاعر ہونے کے علاوہ اعلی درجہ کے نقاد اور انشاء پرداز بھی تھے۔دیوان ثاقب لکھنوی میں ان کا لکھا ہوا تعارف شامل ہے۔ان کا کلام "منشور سخن"میں بھی ملتا ہے۔نمونہ کلام

خوش کن تصورات سے ہو ہو کے مطمئن

کیا کیا فریب خود کو دیے جا رہا ہوں میں

نکہتِ قفس میں سن کے رفیقوں کے زمزمے

خاموش اپنا خون پیے جا رہا ہوں میں

***

ضعف سے تھا جنہیں دشوار لبوں تک آنا

بن گئیں عرش کے تاری وہی آہیں کیونکر (۱۷۶)

سید محمد میاں شہیدؔ:

دور سلطانی کے نامی گرامی اساتذہ میں شمار کیے جاتے تھے۔۱۹۰۹ء میں ٹونک سے بھوپال آ گئے تھے اور یہیں شادی کر لی تھی۔کچھ عرصہ طباعت کا کام کرتے رہے تھے۔پھر نواب عبیداللہ خاں کی ڈیوڑھی میں ملازم ہو گئے۔۱۹۲۵ء میں انتقال ہو گیا لیکن جب تک زندہ رہے مشاعروں میں کثرت سے شرکت کرتے تھے۔بقول ڈاکٹر سلیم حامد رضوی

> جس میں بزم اکبر آبادی، نظیر محمد خاں وفاؔ، مفتی فضل اللہ شفیقؔ، سید ابن علی عالیؔ، سید محمد اسمٰعیل رخشاںؔ، قاضی محمد مکرم مائلؔ وغیرہ ہم جیسے مقتدر شعراء شرکت کرتے تھے۔جو شعراء باہر سے آتے تھے وہ بھی ضرور شریک ہوتے تھے اور اکثر انہیں کے مکان پر قیام بھی کرتے تھے۔ارشد تھانوی نے کہا کہ "بڑی صاف ستھری صحبت ہوتی تھی"۔شہید کو فن اور زبان دونوں پر بڑی قدرت حاصل تھی ۔۔۔مضمون آفرینی ،سادگی زبان،جذبات اور ندرت کا کا بیان۔شہید اکثر چھوٹی بحروں میں مختصر غزلیں کہا کرتے تھے۔۔۔(۱۷۷)

ادبی ذوق کی اصلاح میں جوہرؔ شاہجہان پوری کے بعد اگر کوئی نام بہت معروف نظر آتا ہے تو وہ شہیدؔ کا ہے۔شہید کے شاگردوں میں ابن علی عالیؔ، منیر بھوپالیؔ، سید محمد اسمٰعیل درخشاںؔ وغیرہ معروف ہیں۔نمونہ کلام

خوشامد کرتے کرتے تھک گئے ہم
مگر ٹوٹا نہ تار ان کی نہیں ۔۔۔ کا
وہ وعدہ اور وفا ہو توبہ توبہ
مگر کیا کیجئے اپنے یقیں کا

***

اس کشمکش میں ہجر کی شب میں رہا کہ بس
نکلا جو سانس اس پہ یہ گماں ہوا کہ بس
کچھ اقربا کو آس تھی اب وہ بھی مٹ گئی
خود چارہ گر نے دیکھ کے جب کہہ دیا کہ بس (۱۷۸)

محمد کریم ذکی وارثی:

ذکیؔ صاحب سراج خاں منیر سحرؔ کے سب سے معروف شاگرد تھے۔اور استاد کی زندگی میں خود بھی استاد کا درجہ حاصل کر لیااور خوش گو شعراء میں شمار ہونے لگے تھے۔ جگرؔ مراد آبادی ان کی بہت عزت کرتے تھے جب کبھی بھوپال آتے تھے تو ان کے مکاں پر ضرور جاتے تھے۔جہاں گھنٹوں شعر و سخن کی گفتگو یا شطرنج کا مشغلہ رہتا تھا۔ ذکیؔ مختلف جگہوں پر ملازم رہے اور باالآخر عبید اللہ خاں اسکالر شپ کمیٹی کے دفتر میں کام کرنے لگے۔عام طور پر اہل کمال کا جو شیوہ نظر آتا ہے اس کے مصداق ساری زندگی عسرت میں گزار کر ۱۹۵۰ء میں انتقال فرما گئے۔دو دیوان چھوڑے ہیں جو آج تک چھپ نہ سکے۔بقول ڈاکٹر سلیم حامد رضوی

> اہل بھوپال کوشش کر رہے ہیں کہ ان کی کوئی یادگار قائم ہو جائے۔ذکیؔ صاحب بیرونی اساتذہ کی صف میں بھی مقبول تھے۔وفات کی اطلاع نے سب کو ہی مغموم کر دیا تھا۔علامہ سیمابؔ اکبرآبادی نے توو فور جذبات میں ان کی موت کو بے موقع لکھا ہے۔ذکیؔ صاحب قدیم رنگ کے شاعر تھے۔لیکن شعر وادب کے رجحانات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ خود بھی بدلتے رہے اور آخر تک رونق محفل رہے چنانچہ ان کی ابتدائی اور آخری دور کی شاعری میں صرف فنکارانہ پختگی اور کہنہ مشقی ہی کا فرق نظر نہیں آتا بلکہ اسلوب بیان،طرز ادااور خیالات کا بھی بین فرق ہے جو ان کی برتری کا ثبوت ہے۔"(۱۷۹)

ذکیؔ کے شاگردوں میں باسطؔ بھوپالی،شعریؔ بھوپالی،وکیلؔ بھو پالی،اسدؔ بھوپالی،کیفؔ بھوپالی وغیرہ بہت معروف ہیں۔نمونہ کلام

مجھے ضد ہے کہ وعدہ لیکر اٹھوں
وہاں تار اس نے باندھا ہے نہیں کا
کیا اس بت نے وعدہ تو ہنس کر
نکلا "ہاں" میں بھی پہلو "نہیں" کا

***

بچایا دست جور آسماں سے
بڑا احسان ہے مجھ پر زمیں کا
گھلایا دل کو اس نے ،تن کو اس نے

وہ حصہ چرخ کا تھا، یہ زمیں کا

***

جب سے انوار نظر بھر کے تمہارے دیکھے
چاندنی دیکھی نہ چھٹکے ہوئے تارے دیکھے
پاؤں کے خون سے پر لطف نظارے دیکھے
خار صحرا کی جگہ سرخ ستارے دیکھے
منظر نور ترے حسن کی دنیا پائی
ذرہ ذرہ میں چمکتے ہوئے تارے دیکھے (۱۸۰)

سید حسن سید ظہیری:

سید صاحب ظہیر دہلوی کے ان شاگردوں میں سے ہیں جن کے وہ بہت قدردان تھے۔ ۱۳۰۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۸ء میں انتقال کیا تھا۔ شاعری میں زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ان کا رنگ بھی بدلتا رہا ہے۔ آخری دور کے کلام میں پہلے سے زیادہ رنگینی اور زور محسوس ہوتا ہے۔ سید صاحب کا تعلق "ذوق اسکول" سے ہے۔ سید کی شاعری کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم حامد رضوی لکھتے ہیں کہ

> زبان سلیس اور بامحاورہ ہے اور اسلوب بیان صاف اور نکھرا ہوا ہے۔ سید صاحب غزل اور نظم دونوں کے ماہر ہیں۔ "زمانہ جنگ میں "ہندوستانی سپاہی کی نشان کے عنوان سے ایک نظم لکھی تھی۔ جو بے حد مقبول ہوئی اور "آل انڈیا ریڈیو" سے بار بار نشر کی گئی۔ ایک اور خصوصیت قابل ذکر ہے ان کے یہاں حسن بھی ہے اور حسن ظن بھی۔ چنانچہ غالب کے دیوان کو سامنے رکھ کر اس کی ہر غزل کا جواب بڑی محنت سے لکھا ہے۔ (۱۸۱)

سید کا نمونہ کلام درج ذیل ہے

نالوں پہ مرے ان کا ہے ناحق یہ گماں اور
فریاد کی لے اور ہے اور طرز فغاں اور
جوش تپش دل کا کروں کیا میں بیاں
کرتا ہوں اگر ضبط تو اٹھتا ہے دھواں اور
تم سینہ کے چند آبلوں کو داغ نہ سمجھو

جو داغ مرے دل میں ہیں ان کے ہیں نشان اور
کیا پوچھتے ہو عمر دو روزہ کی کہانی
دیکھی ہیں بہاریں ابھی دیکھیں گے خزاں اور (۱۸۲)

سید ابن علی عالیؔ:

ان چند شاعروں میں سے تھے جن کی بھوپال میں بہت زیادہ شہرت تھی۔ شہیدؔ کے شاگرد تھے اور استاد نے اپنی زندگی میں ہی ان کو "فارغ اصلاح" قرار دے دیا تھا۔ ایک عرصہ تک تحصیلدار رہے۔ غالب کی زمینوں میں طبع آزمائی کی۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

محبت میں کچھ ایسا اہتمام شوق رسوا ہوں
تماشا تو نہیں لیکن بہ عنوان تماشا ہوں
کہیں معمور جلوہ سے کہیں طالب ہوں جلوہ کا
کسی جا حسنِ یوسف ہوں کہیں خوابِ زلیخا ہوں
وفورِ بے خودی میں بھی میں وہ شانِ خود آرا ہوں
جو گم ہو جاؤں حیرت ہوں نظر آؤں تو جلوہ ہوں (۱۸۳)

مفتی فضل اللہ شفقؔ:

مفتی خیر اللہ صدیقی کے بیٹے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے۔ شعر و شاعری میں بزمؔ اکبر آبادی اور سحرؔ بھوپالی کے شاگرد تھے۔ مفتی صاحب کو شاعری پر مہارت حاصل تھی۔ کلام میں پختگی، سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔ نمونہ کلام

فرق یہ سمرن کے اور تسبیح کے دانوں میں تھا
کوئی داناؤں میں تھا اور کوئی نادانوں میں تھا
شوق عریانی میں تھمتا ہی نہ تھا کوئی یہاں
ایک میرا ہی گلا لاکھوں گریبانوں میں تھا

***

شباب آتے ہی شوخی پر حیا کا پڑ گیا پردہ

وہی تو ہے ترا کل تک کسی سے بھی نہ تھا پردہ
نمایاں شانِ قدرت سے یہاں رنگِ حقیقت ہے
نئی بے پردگی ہے آپ کی سب سے نیا پردہ
بجا ہے حسرتِ دیدار پر اب فاتحہ پڑھنا
نگاہِ شوق کا روکے ہوئے ہے راستا پردہ (۱۸۴)

ظفر حسن وفاؔ:

عربی اور فارسی کے ماہر اور شاعری میں جوہرؔ شاہجہاں پوری کے شاگرد تھے۔ سلسلہ ملازمت دیہات رہا اس لئے جب کبھی شہر تشریف لاتے غزلیات کا ایک پلندہ ساتھ ضرور لاتے جس کو استاد کے سامنے اصلاح کے لئے پیش کرتے تھے۔ ان کے کلام میں پختگی پائی جاتی ہے۔ نمونہ کلام

وہ عالی ظرف ہوں فرق میں تیری
دھواں بن کر جہاں پر چھا گیا ہوں
مٹے گی کیا بھلا بدنامی اپنی
میں برسوں عشق میں رسوا رہا ہوں

***

رکھتے نہیں ہیں کام کسی بخیہ گر سے ہم
زخمِ جگر کو سیتے ہیں تارِ نظر سے ہم
مرتے ہی ہو نہ جائے قیامت کہیں بپا
ڈرتے ہیں اس لیے نگہِ فتنہ گر سے ہم
دھونی رما کے بیٹھ گئے ہم تو اے وفاؔ
اب اٹھ کے جائیں گے نہ کبھی ان کے در سے ہم (۱۸۵)

پیرزادہ محمد اسمٰعیل رخشاںؔ:

پیرزادوں کے خاندان سے تھے اور بھوپال کے سب سے زیادہ مشہور نعت گو شاعر شہیدؔ ٹونکی کے شاگرد تھے۔ابتدائی دور میں عاشقانہ غزل کہا کرتے تھے۔بعدازاں صرف نعت کہنے لگے۔مقبولیت کی وجہ سے کلام وقتاً فوقتاً شائع ہوتا رہا۔ان میں مجموعہ ''قندیل رخشاںؔ'' بہت مشہور ہے۔ایک نعت گو کے کلام میں جو بنیادی عناصر موجود ہونے چاہیے وہ سب ان کے کلام میں موجود ہیں۔رخشاںؔ کی بہت سی نعتیہ غزلیں گائی جاتی رہی ہیں۔نمونہ کلام

کیا کیا نہ محمد کی نظر لے کے گئی ہے
دل ہوگیا مجروح جگر لے کے گئی ہے
دنیا سے بہت زخمِ جگر لے کے گئی ہے
ہستی مری کیا کیا گلِ تر لے کے گئی ہے
اک حضرتِ منصور پہ کیا ظلم و ستم تھا
اظہارِ حقیقت کئی سر لے کے گئی ہے
روضہ پہ نبی کے دُرِ نایاب چڑھائے
ہستی جو وہاں دیدۂ تر لے کے گئی ہے

***

عالم سے نرالی ہو یا رب مجھے بے ہوشی
ہر وقت نبی جی سے ہوتی رہے سرگوشی
اے موجِ کرم اب تو دریائے حقیقت سے
اس قطرۂ ہستی کو دے شوقِ ہم آغوشی
مجرم بھی اس امت کے سب لائقِ جنت ہیں
اے رحمتِ بے پایاں ، اے شانِ خطا پوشی (۱۸۶)

شاہ اسدالرحمن قدسی بھوپالی:

اسد الرحمن قدسی بھوپالی کی تمام زندگی کشف اسرار معرفت میں گزر گئی ۔قدسیؔ صاحب کے دو مجموعے "آیات قدسی، دوسرا ''نغمات" شائع ہو چکے ہیں۔ یہ دونوں مجموعے زبان وادب کے لحاظ سے بہت قابل قدر ہیں۔ جن میں جذبات وکیفیات، معرفت اور حقیقت کو عشق ومحبت کی زبان میں بڑے خوبصورت انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ اگر قدسیؔ معرفت وطریقت کے سالک نہ بھی ہوتے تو بھی بحیثیت شاعر بہت مقبول اور منفرد انداز کے مالک ہوتے قدسی صاحب کا نمونہ کلام درج ذیل ہے

ذوق دیدار اگر رہبر کامل ہوتا
چل کے دوچار قدم میں سر منزل ہوتا
حسن کا حسن یہی ہے کہ رہے طالب عشق
عشق کیوں بندگی حسن سے غافل ہوتا
دیکھتا میں انہیں قدسی مگر اس شرط کے ساتھ
ان کے جلوہ کے سوا کوئی نہ حائل ہوتا

***

قطرہ انگور کا شراب بنا
ذرہ چمکا تو آفتاب بنا
میری بربادیوں کی وسعت سے
منظر عالم خراب بنا
رگ جاں کھینچ کے تار ساز بنی
ہر نفس نغمہ رباب بنا (۱۸۷)

منیرالدین منیرؔ بھوپالی:

منیرؔ بھوپال کے بہت پرانے اور کہنہ مشق شاعر، شہیدؔ کے شاگردوں میں امتیازی خصوصیت رکھتے تھے۔ منیرؔ کے کلام میں داغ دہلوی کا رنگ پایا جاتا ہے۔ آخری عمر میں بینائی جانے کی وجہ سے گوشہ نشین ہو گئے مگر مشاعروں میں لازماً شرکت کرتے تھے۔ بقول ڈاکٹر سلیم حامد رضوی

> ان کی زبان شستہ اور صاف ہے۔ بھرپور تغزل اور پر کیف ترنم کے ساتھ بندش، چستی اور روانی ان کے کلام کا جوہر ہے۔ حلقہ شاگردان بہت وسیع ہے جن میں ذکری بھوپالی موجودہ دور کے اچھے شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں۔(۱۸۸)

منیرؔ کا انتقال ۱۸۵۸ء میں ہو گیا تھا۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

یقیں ان کے وعدے پہ لانا پڑے گا
یہ دھوکہ تو دانستہ کھانا پڑے گا
یہی ہے اگر بے نیازی کا عالم
تو ہر در پہ سر کو جھکانا پڑے گا
منیرؔ ان بتوں کو نہ کس طرح پوجوں
خدا کو مجھے منہ دکھانا پڑے گا

***

بھول کر یا جان کر میں غرقِ عصیاں ہو گیا
اب بہر صورت تری رحمت کا شایاں ہو گیا
درد بن کر دل میں آیا پہلے وہ تیرِ نظر
درد سے حسرت بنا حسرت سے ارماں ہو گیا

***

میکدہ اس کا ہے مے اس کی ہے مستی اس کی
عمر بھر تیری نگاہوں سے جو مدہوش رہے
فکرِ پردہ ہے عبث آپ اٹھائیں تو نقاب
میرا ذمہ ہے کسی کو بھی اگر ہوش رہے(۱۸۹)

سید حامد حسین ترمذیؔ:

ڈاکٹر سید عابد حسین کے والد تھے۔ بھوپال کے شعراء میں سب سے زیادہ ذی علم سمجھے جاتے ہیں۔ تاریخ گوئی میں ممتاز تھے اور عموماً سلام اور مرثیے لکھتے رہے ہیں۔ بھوپال کا کوئی اہم واقعہ ایسا نہیں ہوا جس کی تاریخ انہوں نے نہ لکھی ہو۔ بقول ڈاکٹر سلیم حامد رضوی

> کمال یہ تھا کہ ۴۰ شعراء واقعہ سے متعلق بے تکلف کہہ جاتے تھے اور ہر مصرعہ سے تاریخ نکالتے تھے۔ نواب عبید اللہ خاں کے انتقال پر ایک تاریخی مرثیہ افکار غم "لکھا تھا۔۔۔ حامد رضوی صاحب کا کلام جس میں قصائد اور مرثیہ زیادہ۔۔۔ جب انتقال ہو تو تمام کاغذات داماد کے قبضہ میں چلے گئے اور وہاں سے لاپتہ ہو گئے۔ (۱۹۰)

بھوپال میں ہونے والی نمائش سہیور میں ایک طرحی مشاعرہ منعقد کیا گیا تھا اس میں ترمذیؔ صاحب نے غزل کہی تھی۔ وہ غزل بھی کسی کو یاد نہ رہ سکی لیکن گرہ یاد رہ گئی جو کچھ اس طرح سے ہے۔

طرح: بڑی مشکل سے ارمانِ دلِ مضطر نکلتے ہیں
گرہ: نکالے سے بھی قسمت کے کہیں چکر نکلتے ہیں

ترمذی صاحب کا مرثیہ جو نواب عبید اللہ کی وفات پہ لکھا۔ اس کا نمونہ کلام درج ذیل ہے

وہ حاملِ ستارۂ ہندوستاں گئے
تھی جن سے روشنی وہ جہاں میں کہاں گئے
سرکار عالیہ پہ الم ٹوٹ پڑا مہیب
اوصاف و تاب و طاقت سلطان جہاں گئے
بھوپال کیوں نہ خاک اڑائے قلق سے ہائے
بھوپالیوں کے خلق سے وہ قدر داں گئے
وہ حوصلہ ہمارا وہ جرات نہیں رہی
صدق و کرم کے زیب عبید اللہ خاں گئے
لیکن یہ وقف لاکھوں کا تعلیم قوم پر

دکھلا کے علم و شوکت و جلال و شاں گئے
وہ حاتم زمانہ خود حیف ناپدید
مانند ابر دہر سے کل درفشاں گئے
حامد کوئی تلاش کرے اب جہاں کرے
تھے وہ گل نیاز بہ حق خزاں گئے (۱۹۱)

صفدر مرزاپوری:

صفدر مرزا۱۹۰۵ء میں بھوپال آکر محکمہ بندوبست میں ملازم ہوگئے اور تقریباً ۱۹۱۲ء تک یہیں رہے بعدازاں لکھنو چلے گئے۔ صفدرؔ کی وجہ سے بھوپال کے مشاعروں میں بہت چستی آگئی تھی۔ان کی تصانیف "مشاطہ سخن "،"مرقع ادب"ہیں۔"مشاطہ سخن "دوجلدوں میں شائع ہوئی اس میں شاگردوں کاکلام اساتذہ کی اصلاح کے نمونوں کے ساتھ دیا ہے۔"مرقع ادب " جس میں دوستوں اور عزیزوں کے نام مولانا ابوالکلام آزادؔ،عبدالرزاقؔ،مولانا شبلیؔ،ارشد تھانوی، محمد یوسف قیصرؔ،شوق قدوائی ، محویؔ صدیقی،ابوالحسن بھوپالی وغیرہ کے خطوط ہیں۔ان کے دودیوان "بزم خیال"،اوردور فلک"مطبوعہ صورت میں موجودہیں۔نمونہ کلام

جگر کے زخم کی کیا فکر چارہ جو کرتے
تمہیں نے چاک کیا ہے تمہیں رفو کرتے
چمن میں آپ سے کیا کھل کے گفتگو کرتے
یہ منہ گلوں کا جو دعوائے رنگ و بو کرتے
ہمارے آئینہ دل سے کوئی بحث نہ تھی
تم اپنے مد مقابل سے گفتگو کرتے
یہ لفظ ہے وہ معمہ کہ حل نہ ہو سکتا
تمام عمر اگر شرح آرزو کرتے
گرے ہوئے تھے ہماری ہی آنکھ سے صفدرؔ
ان آنسوؤں کی وہ کیا خاک آبرو کرتے

***

اکیلی جلوہ گاہ ناز سے اس کی بلا نکلے
دل وارفتہ کو لیتی نگاہ فتنہ زا نکلے
جدھر ان شوخ آنکھوں سے نگاہِ فتنہ زا نکلا
قیامت تک نہ اس رستہ سے اے قاتل قضا نکلے
جسے تم کوستے ہو مہرباں میری قضا کہہ کر
جو دیکھو غور سے شاید تمہاری ہی ادا نکلے (۱۹۲)

عبدالباقی وفاؔ سہسوانی:

عبدالباقی وفاؔ کے والد ملازمت کے سلسلہ میں بھوپال آگئے تھے۔وفاؔ بھی بچپن سے یہاں مقیم رہے اور پھر آخری عمر میں بھوپال یہاں سے چلے گئے۔انہیں ابتدا ہی سے شعر گوئی سے بہت دلچسپی رہی اور غزل، قصیدہ، مثنوی میں طبع آزمائی بھی کی ہے۔ جمیل سہسوانی کے شاگرد تھے۔غزل میں قدامت پسندانہ رنگ اختیار کیے رکھا تھا۔ان کی مثنویوں میں "رتبہ نامہ" ،قید فرنگ"ہے۔"قید فرنگ" یہ مثنوی ۱۹۳۲ء یا اس کے قریب زمانہ کی تصنیف ہے۔اس میں وفاؔ نے انگریزوں کی سیاست اور ریاستی حکمرانوں کی چاپلوسی پر کڑی تنقید کی ہے۔ان کی تنقید کی وجہ سے انگریز بہت ناراض ہوئے اور کتاب ضبط کر لی اور آئندہ اشاعت پر پابندی لگادی۔اس مثنوی کو بہت اہمیت حاصل ہوئی کیونکہ جب پہلی مرتبہ "مہاتما گاندھی" نے جنگ آزادی کی کمان اپنے ہاتھ میں لے کر ہڑتال ستیہ گرہ اور قانون شکنی کے حربوں سے سامراج کا وسیع پیمانہ پر مقابلہ شروع کیا تھا۔اس مثنوی کی بدولت وفاؔ کو جنگ آزادی کے مجاہدوں کی صف میں جگہ حاصل ہوگئی۔بقول ڈاکٹر سلیم حامد رضوی

> وفاؔ نے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو، کی پالیسی کو بھی خوب دل کھول کر ہدف ملامت بنایا ہے۔ یہ دلیرانہ تبصرہ بڑے دردانگیز پیرایہ میں کیا گیا ہے۔غدر کی داستان غم ہندو مسلم و شیعہ سنی فسادات اور ہندوستان کی مفلسی وغیرہ کا انگریزوں کو ذمہ دار قرار دیتے ہوئے خوب دل کا بخار نکالا ہے۔وفاؔ غزل اور قصیدے پر بھی بڑی قدرت رکھتے تھے۔(۱۹۳)

نمونہ کلام درج ذیل ہے

حکومت سے غیروں کی ہم کو بچا

یہی ہے غرض اور یہی مدعا
حکومت کو تثلیث کی دے مٹا
تو کر تین تیرہ اسے اے خدا
جو سو راج کر دے تو ہم کو عطا
حکومت شریعت بھی دے برملا

***

ہر ادنی سا انسان بسمارک ہو
ہر اک کوچہ وکٹوریہ پارک ہو
بھروسا جنہیں عقل روشن کا ہے
جنہیں ادعا مکر پر فن کا ہے
جنہیں اپنی ایجاد پر ہے غرور
ہے تہذیب خونی پہ جن کو سرور
فتوح فریبی ہی ہے جن کو ناز
جو ہیں حیلہ گر اور جو حقہ باز
ہے اتواپ آتش فشاں پر غرور
ہے طیارہ ہائے رواں پر غرور
مگر ان کا قبضہ ہے سب جبریہ
مگر ہے تسلط یہ سب قدریہ
تمامی ممالک ہیں نفرت کناں
مظالم سے ان کے ہیں سب نیم جاں
کریں ہوم رول ایک جہاں کو عطا
مسلح ہو پھر ہر کوئی برملا

ناقص نظام تعلیم کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

ولے یہ گورنمنٹ ایسی نہیں

مفید ہم کو تعلیم دیتی نہیں
نہ سائنس ہم کو سکھاتی ہے وہ
نہ طرز تجارت بتاتی ہے وہ
جو تعلیم ہے وہ غلامی کی ہے
جو ہے تربیت وہ سلامی کی ہے
مصارف بھی تعلیم کے سخت ہیں
عجب ہند کے لوگ بدبخت ہیں
پڑھائیں وہ کس طرح اولاد کو
کہاں سے وہ زر لائیں امداد کو
جو پڑھ سکتے ہیں اک مہینہ میں ہم
پڑھاتے ہیں دو سال میں کم سے کم (۱۹۴)

عبدالجلیل مائل نقوی:

بھوپال کے اہم شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں۔ سر راس مسعود کے بہت قریبی افراد میں سے تھے۔ سر راس مسعود کی امداد کی بنا پر انہوں نے سحر بھوپالی کا کلام جمع کر کے "بیاض سحر" کے نام سے شائع کیا تھا۔ مشاعروں میں بہت کم شرکت کرتے تھے۔ غزل کے علاوہ قصیدہ اور تاریخ کہنے میں بھی مہارت تھی۔ ابتدا میں شعری بھوپالی نے انہیں سے اصلاح لی تھی بعد ازاں ذکی وارثی سے اصلاح لینے لگے۔ کلام میں قدیم و جدید ہر دو رنگ کا امتزاج ہے۔ عموماً غزل میں مضامین بھی شامل کر دیتے ہین جن کا تعلق حالات حاضرہ سے ہو۔ نمونہ کلام

حکم ترک شراب ہوتا ہے
کس غضب کا عذاب ہوتا ہے
منع کر دو تم اپنی آنکھوں کو
ایک عالم خراب ہوتا ہے
دل کا جانا تو کوئی بات نہیں
دل کا آنا عذاب ہوتا ہے

***

کیا غضب ہے در توبہ تو کھلا ہے ساقی
اور در میکدہ یوں بند پڑا ہے ساقی
مست و مخمور گرفتار ہوا ہے مائلؔ
در میخانہ پہ میلا سا لگا ہے ساقی (۱۹۵)

شریف محمد خاں فکری:

شریف محمد خاں فکریؔ بھوپال کے اہم شعراء میں تھے۔ پہلے سحر بھوپالی سے اصلاح لی بعد ازاں احمد علی شوق قدوائی کے شاگرد ہو گئے۔ بھوپال کے علمی وادبی حلقوں میں بھی بہت مقبول تھے۔ "بصائر" نام کا علمی و مذہبی پرچہ نکالتے رہے ہیں۔ ۱۹۴۳ء میں حرکت قلب بند ہونے کے سبب دنیا سے رخصت ہو گئے۔ فکری نے جب شاعری کا آغاز کیا اس وقت امیرؔ مینائی اور داغؔ کا بہت چرچا تھا اس لیے ان کی شاعری پر بھی ان دونوں کی شاعری کے اثرات نظر آتے ہیں۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

کہیں کیا ہم، ادائے حسن کیا معلوم ہوتی ہے
یہ محسوسات سے بھی ماورا معلوم ہوتی ہے
تمہاری جلوہ گاہ ناز وہ فردوس محشر ہے
جہاں سے ہٹ کے دنیا غم کدا معلوم ہوتی ہے

***

مشعل بنا کے تابش داغ جگر کو میں
راتوں کو ڈھونڈتا ہوں تری رہگزر کو میں
کہتے ہیں وہ دکھاؤں جو زور نظر کو میں
دنیا الٹ دوں آنکھ اٹھاؤں جدھر کو میں

***

دل سے ان کی یاد بھی یہ کہہ کر رخصت ہو گئی
کون اجڑے ہوئے گھر کی نگہبانی کرے

***

ہم وہ نہیں جو عشق کو بار گراں کہیں

جب ٹھان لی تو چرخ کو سر پر اٹھا لیا (۱۹۶)

محمد اسمعیل ہاتف:

ہاتفؔ کے والد لکھنو سے بھوپال آئے تھے اور پھر یہیں رہائش اختیار کر لی تھی۔ ہاتفؔ کی پیدائش لکھنو میں ہوئی۔ حصول علم کا بہت زیادہ شوق تھا اس لئے مدرسے میں سب سے اچھے طالب علم تھے۔ شاعری میں ذکیؔ وارثی کے بعد سراج خاں سحر کے سب سے زیادہ مشہور شاگرد تھے۔ بقول ڈاکٹر سلیم حامد رضوی

> غزل اور نظم دونوں پر قادر ہیں۔کلام زیادہ تر رسائل میں نکلتا رہا ہے۔ان کے قطعات اور نظمیں زور بیان اور خوبی ادا کا دلکش نمونہ ہوتی ہیں۔عربی فارسی کے الفاظ سے عموماً گریز کرتے ہیں اور قدیم اشاریت مثلاً حشر نشر، لیلی مجنوں، گل و بلبل، شمع و پروانہ ، زلف و گیسو وغیرہ سے کام نہیں لیتے۔معنوی گہرائی کے ساتھ حسن صوری اور حسن صوتی کی ان کے یہاں کمی نہیں ہے۔(۱۹۷)

انہیں نام و نمود سے کوئی لگاؤ نہیں رہا اس لیے گمنامی کی زندگی بسر کی۔ مشاعروں میں بھی بہت کم لوگوں نے ہاتفؔ کا کلام سنا تھا۔ نمونہ کلام

باتیں ہیں نہ عشوے ، نہ کنائے ، نہ اشارے

تم روٹھ گئے ہو تو جییں کس کے سہارے

خاموشی کا اک درس ہے یک سوئی کا اک وعظ

یہ چاند یہ سورج یہ چمک دار ستارے

یہ سبزہ یہ اشجار یہ پھول اور یہ کلیاں

بے دوست نظر آتے ہیں دوزخ کے شرارے

***

کبھی مغموم ہوتا ہے کبھی مسرور رہتا ہے
محبت میں دل ناداں کی نادانی نہیں جاتی
وہیں رنگین فضائیں ہیں ، وہی مستی بھرے نغمے
بہار زندگی کی فتنہ سامانی نہیں جاتی

***

یہی ہے سوچ کہیں کا کہیں نہ جا پہنچوں
چھٹا قفس سے تو بھولا ہوں آشیانے کو(۱۹۸)

محمد ہیبتہ اللہ صاحب گویاؔ:

گویاؔ میر منشی عبدالحیی صاحب کے بیٹے تھے اور ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے۔ان کے بڑے بھائی منشی عبدالقیوم کاتب نواب سلطان جہاں بیگم کے ہم مکتب تھے۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے

مجھ کو مجبوری شرف ہے اسکو ان کے پاس کا
ہے مقدر رشک کی جا پرچہ قرطاس کا
بس اب تخفیف تصدیقہ مجھے فرصت نہیں واعظ
یہ اسباب جہالت دور ہوں پیمانہ آتا ہے (۱۹۹)

عہد سلطانی کے نوجوان شاعر:

نواب سلطان جہاں بیگم کے عہد میں نوجوان شعراء نے قدیم شاعری کے ساتھ جدید طرز کو بھی ایجاد کیا ہے۔ غزل کے میدان کو وسعت دی اور نظم کو اصلاح اور تعمیری مقاصد کے لئے استعمال کیا۔مشاعروں اور انجمنوں کی بنیاد ڈالی اور طرحی مشاعروں کا آغاز کیا تھا۔انگریزی نظموں کے ترجمے کیے گئے اور ان کو مختلف رسائل میں شائع کروایا۔اس طریقہ کار سے ادبی رسائل خریدنے اور پڑھنے کا رواج چلا۔اس دور کی مشہور و معروف انجمنوں میں جو اہمیت "سبعہ سیاران" اور "دائرہ ادبیہ" کی ہے اور کسی کو نصیب نہ ہو سکی۔ ذیل میں ان دونوں انجمنوں "سبعہ سیاران" اور "دائرہ ادبیہ" کے اہم شعراء کا تعارف اور نمونہ کلام پیش کیا جائے گا۔

سید محمد یوسف قیصر بھوپالی:

سید محمد یوسف قیصر بھوپالی کو ابتداء ہی سے جدید ادب سے لگاؤ اور گہری دلچسپی تھی۔ بھوپال میں جدید نظریات و افکار کو فروغ دینے میں ان کی کوششوں کا بہت عمل دخل ہے۔ ۱۹۰۳ء میں شاعری کا آغاز کیا اور جوہرؔ کے شاگرد ہوئے۔ غزل سے زیادہ نظم کو وسیلہ اظہار بنایا تھا جو "تنویر الشرق، ادیب الہ آباد، دکن ریویو، الناظر، زمانہ کانپور وغیرہ میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ان کی تصانیف میں "خیابان ادب"، "اوراق گل"، "بیاض گل"، "گلبانگ" شامل ہیں۔ علاوہ ازیں جدید طرز پہ قصیدے بھی لکھے ہیں۔ قیصرؔ کے قصیدے مداح سرائی سے پاک ہیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم کے لیے بھی قصیدہ لکھا

جب ہوئی فرمانروا نواب سلطان جہاں
جنکی ہیں ذات گرامی میں وہ ساری خوبیاں
انفرادی حیثیت سے جوہر اک میں نہیں کہاں
اجتماعی طور پر ان سے ہوئیں وہ سب عیاں
تربیت سے پائی ہے تینوں بیگموں کی گود میں
ان کے دامان محبت میں ملیں یہ خوبیاں
حق تعالی نے وہ بخشے ان کو اوصاف نکو
جس سے مخلوق خدا نے فیض پایا بیکراں
خلق و ہمدردی میں اور ایثار میں ہیں بے نظیر
ان کی ہر اک بات ہے بیدار مغزی کی دلیل
ان کے ہر اک کام سے فہم و فراست ہے عیاں
اور ہیں روشن خیالی کی وہ اک روحِ رواں
انتظام مملکت شاہد ہے ان اوصاف کا
ان کا نظم و نسق ہے فہم و تدبر کا نشاں
ملک و ملت کا ہے ان کے دل میں بے حد احترام
وہ رعایا پر رہی ہیں مثل مادر مہرباں

ہر طرح سے علم و فن کو ملک میں پھیلا دیا
کیا اٹھے گا ان کے اس احسان کا بار گراں (۲۰۰)

قیصرؔ نے اس دور میں انگریزی نظموں کے اردو ترجمہ کیے جب لوگ مکمل طور پر انگریزوں اور انگریزی زبان اور جدید خیالات سے نفرت کا اظہار کرتے تھے۔ انہوں نے انگریزی شاعر ورڈز ورت(Words Worth) کی نظم کا اردو ترجمہ کیا جو بہت دقت طلب کام تھا لیکن ایسا ترجمہ کیا کہ وہ طبع زاد معلوم ہونے لگی۔ یہ نظم جنگل میں رہنے والی لڑکیوں کے معصومانہ انداز اور دلفریبیوں کی عکاسی کرتی ہے۔ نمونہ کلام

اچھی ہیں لڑکیاں یہ جنگل کی رہنے والی
سادی طبیعتیں ہیں ، دنیا سے ہیں نرالی
اس سادگی میں پیدا وہ جذب فطرتی ہے
دل کو لگاؤ جس سے اک امر قدرتی ہے
وہ بہنے والی نہریں ، وہ چوڑے چکلے صحرا
جس سے کہ شان وحدت ہوتی ہے جلوہ آرا
ان کے مکاں ہیں کیسی سر سبز وادیوں میں
آنگن ہیں ان کے کیسے عمدہ پہاڑیوں میں (۲۰۱)

خواتین کے حوالے سے قیصرؔ نے خود کئی ایک نظمیں لکھیں ہیں جن میں انہوں نے خواتین کی عظمت کو پیش کیا ہے۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

اے خواتیں ! راز میں ہستی کے وہ مستور ہے
ساری دنیا اک تمہاری ذات سے معمور ہے
عالم امکاں کو کس درجہ منور کر دیا
محفل ہستی تمہارے دم سے بزم نور ہے
تم سے دنیا میں مکمل ہو گئی انسانیت
تم میں راز آفرینش کس قدر مستور ہے
کر دیا ہے تم نے سب دنیا کو سرگرم عمل
ہر جگہ جاری تمہاری کوشش مشکور ہے

تم نے پھیلائی جہاں میں نکہتِ شائستگی

تم وہ گلشن ہو خزاں کا رنگ جس سے دور ہے (۲۰۲)

رشید احمد ارشد تھانوی:

بیسویں صدی کے نوجوان شعراء میں ارشدؔ کا بہت بلند مقام ہے۔ بھوپال کے ادبی رجحانات کو نیا رخ دینے میں ان کا اہم کردار ہے۔ ارشدؔ "سبعہ سیاران" اور "دائرہ ادبیہ" کے سرگرم رکن تھے۔ ان کی پیدائش "تھانہ بھون" میں ہوئی۔ ان کے والد سلطان احمد اور چچا صدیقؔ احمد تھانوی بھوپال آ گئے اور پھر ۱۹۰۵ء سے ۱۹۵۰ء تک یہیں رہائش اختیار کی۔ ارشدؔ ابتدا ہی سے اپنے ادبی ذوق کی بدولت، ادبی شخصیتوں سے متعارف تھے اور اپنے زمانے کے اچھے ادیب اور شاعر سمجھے جاتے تھے۔ مختلف رسائل و اخبارات میں ان کی نظمیں اور غزلیں شائع ہوتی تھیں۔ ان کی نظموں کے مجموعوں میں "بیاض سخن، حسن تعلیل، اور "آثار سانچی" شامل ہیں۔ تراکیب اور اسلوب بیان میں غالب کا تتبع کرتے تھے۔ ان کی ادبی سرگرمیوں کی یادگار ایک مسلسل مضمون "بھوپال کی فضائے شعری" ہے جو سولہ قسطوں میں شائع ہوا۔ ذیل میں ارشدؔ کا نمونہ کلام پیش کیا جائے گا

نمونہ غزل

مزے کی نیند محبت میں سو گیا ہوں میں

تصورات کی دنیا میں کھو گیا ہوں میں

اب اور کیسے کروں ترجمانی جذبات

وفور شوق میں دیوانہ ہو گیا ہوں میں

***

کچھ نہ کچھ گوشہ دل میں مرے پنہاں نکلا

کبھی ناوک ، کبھی نشتر ، کبھی پیکاں نکلا

جلوۂ طور کے مشتاق بہت تھے موسیٰ

وہ بھی انداز حجاب رخ جاناں نکلا

نمونہ نظم۔۔۔"درس حیات"، "مفسدوں کے نعرے'

سعی فرما ! بخت نافرجام کی پروانہ کر

مستقل بن! گردش ایام کی پروانہ کر
وسعتوں کو اس زمیں کی دعوت تغیر دے
انقلاب چرخ نیلی فام کی پروا نہ کر
عزم مستحکم کو لے کر اٹھ پئے آغاز کار
فرض کر اپنا ادا ، انجام کی پروا نہ کر
پھر سے تعمیر جہاں کی اک نئی بنیاد رکھ
اس درو دیوار و سقف و بام کی پروا نہ کر
اپنے نصب العین تک ارشد پہنچنے کے لیے
کچھ بھی ہو تکلیف کی آرام کی پروا نہ کر (۲۰۳)

ہم چھریاں مارنے والے ہیں
ہم خنجر بھونکنے والے ہیں
ہم مفسد ہیں بلوائی ہیں
ہم آتش کے پرکالے ہیں
ہم بھائی چارہ کیا جانیں
یہ باتیں ہم کو راس نہیں
کچھ دھرم کا ہم کو پاس نہیں
مذہب کا ہمیں احساس نہیں
دُکانوں کو بازاروں کو
ہم آگ لگاتے پھرتے ہیں
ہر کوچہ میں ہر برزن میں
ہم خون بہاتے پھرتے ہیں (۲۰۴)

محمد حسن محویؔ صدیقی:

محویؔ کے والد لکھنو سے بھوپال آکر مقیم ہو گئے تھے ان کی پیدائش بھوپال میں ہوئی۔ محویؔ آخر وقت تک خود کو لکھنوی لکھتے رہے تھے۔"سبعہ سیاران، دائرہ ادبیہ" کے خاص رکن تھے۔شاعری میں پہلے "رنگین" تخلص استعمال کرتے تھے اور بعد ازاں شوقؔ کے مشورہ سے تخلص "محوی" کرنے لگے۔ابتدء میں "دفتر تاریخ بھوپال" میں ملازمت کی اور اس کے بعد "انجمن ترقی اردو' میں کام کرنے لگے۔علاوہ ازیں کچھ عرصہ "رسالہ الناظر لکھنو" کے جوائنٹ ایڈیٹر بھی رہے تھے۔اورنگ آباد کالج میں بحیثیت لیکچرر کام کیا اور بالآخر مدارس یونیورسٹی کے ریسرچ انسٹیٹیوٹ میں لیکچرر ہو گئے۔ان کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ادبی خدمات کے اعتراف میں مرکزی حکومت نے سو روپیہ ماہوار وظیفہ بھی مقرر کیا۔ محویؔ کی غزلوں اور نظموں کا منتخب نمونہ درج ذیل ہے

اپنی نظر تو میری نظر سے ملایئے
زخم جگر پہ شوق سے پھر مسکرایئے
جی چاہتا ہے یوں کبھی جلوہ دکھایئے
سب تفرقے جنون و خرد کے مٹایئے

***

اب کہاں طوفان کا وہ جوش موجوں کا خروش
اک سکون مرگ گویا دامن ساحل میں ہے
اے تمنا آفریں خوابوں کی دنیا یہ بتا
کوئی دھندلی روشنی بھی میرے مستقبل میں ہے

نظم جہاں نو

آ کہ اے ہمدم کچھ ایسے نوجواں پیدا کریں
جو تن مردہ میں روح بیکراں پیدا کریں
جو نظر میں ہیچ کر دیں وسعتیں کونین کی

جو پروں میں عزم سیر لامکاں پیدا کریں
آندھیوں میں بھی نہ بجھنے دیں چراغ آرزو
بجلیوں سے اپنا اپنا آشیاں پیدا کریں
جن کے دل زندہ ہوں فکریں ہوں رسا روشن دماغ
وہ وفا پیکر وہ مخلص مہرباں پیدا کریں (۲۰۵)

مولوی محمد اسحق ماہرؔ:

ماہرؔ نواب نصر اللہ خاں بہادر ولی عہد ریاست کی ڈیوڑھی میں ریونیو سیکرٹری رہے ہیں۔ شعر گوئی کا مشغلہ بچپن سے تھا اور اردو و فارسی میں ماہر سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے قدیم رنگ شاعری کو ترک کر کے جدید تقاضوں کے مطابق شاعری کی تھی۔ غزل کی نسبت اصلاحی و مفکرانہ نظمیں زیادہ لکھیں۔ ان کا کلام جدت و ندرت اور قادرالکلامی کا عمدہ نمونہ ہے۔ ان کے کلام میں غالبؔ کی فکر اور کائناتی مسائل کے ساتھ اقبالؔ کے تصور حیات کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ ماہر کا نمونہ کلام درج ذیل ہے

حسن کی جب ہوئی نمود جلوہ گہ حیات میں
نزہت تازہ آگئی گلشن کائنات میں
جب مجھے لے کے کچھ چلا بزم شہود سے خیال
ڈوب گیا مشاہدہ بحر تحیرات میں

***

جملے وہ ناتمام محبت کے کہہ گئے
کچھ ناشگفتہ پھول سے برسا کے رہ گئے (۲۰۶)

ماہرؔ نے "مشرقی عورت" تنقید کی روشنی میں دو نظریات اور پھر آخر میں فیصلہ پیش کیا ہے مثلاً

"مشرقی عورت" تنقید کی روشنی میں (پہلا نظریہ)

منزل خار زار ہستی --- میں
مرحلہ زندگی کا ہے دشوار
اس میں عورت ہے وہ رفیق حیات

جس کا اخلاص و دلدہی ہے شعار
جس کی وہ بھولی پیار کی باتیں
محو کرتی ہے رنج کے آثار
جس کی پر کیف نغمہ اندوزی
ایسی ہوتی ہے جیسے موج بہار
جان شیریں کو لطف دیتا ہے
جس کا طرز حلاوت گفتار
جو سراپا نیاز و ہمدردی
رنج و غم میں ہر اک کی ہے غمخوار
الغرض یہ خدا کی نعمت ہے
زندگی کے لئے مسرت بار

دوسرا نظریہ:

بعض اصحاب کو ہے اس میں کلام
ان کو ان خوبیوں سے ہے انکار
ان کی نظروں میں اور ہے عورت
جس کی صورت کے ہیں یہ نقش و نگار
جس کی پوری سرشت خود غرضی
جس میں پیدا ہے خوئے اشکبار
جس کی ضرب المثل ہے بے عقلی
جس کو حاصل نہیں ہے کوئی وقار
پھول رنگیں ہے وہ گلستاں کا
جس میں بوئے وفا نہیں زنہار
جس کو اب تک سمجھ سکا نہ کوئی
وہ ہے عورت کی فطرت عیار

فیصلہ:

مختلف ہیں یہ نقطہ ہائے نظر
اور دونوں کو اس پہ ہے اصرار
ہے مناسب کہ کیجیے تنقید
فیصلے کا یہی ہے اب معیار
مشترک ہیں عناصر ترکیب
مرد عورت کا فرق ہے بے کار
ایک ہی اصل کے ہیں دو پیوند
ایک ہی شاخ کے ہیں برگ و بار
ایک دونوں کا نقطہ گردش
گو بظاہر ہیں دو پرکار
مابہ الامتیاز دونوں میں
ایک ہی چیز ہے کریں جو شمار
یعنی تعلیم و تربیت کی کمی
جو ہے اخلاق کے لئے درکار (۲۰۷)

مولانا عبدالحلیم صدیقی ذکاؔ:

ذکاؔ کا تعلق بھوپال سے ہے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ وقفیہ سے حاصل کی جو بعد میں مدرسہ احمدیہ کہلایا جانے لگا۔ اردو، عربی اور فارسی کی غیر معمولی قابلیت کی بدولت اسی مدرسہ میں معلم مقرر ہو گئے۔ بعد ازاں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ادب کے پروفیسر ہو گئے۔ آزادی ہند کی تحریکات میں عملی حصہ لیتے رہے جس کی بدولت بار بار جیل جانا پڑا۔ قید و بند میں بھی شاعری کرتے رہے اور کئی قومی نظمیں لکھیں جو "درس حیات" کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ مولانا غزل اور نظم دونوں میں مہارت رکھتے تھے۔ سیاسی نظمیں نالہ دل، آئینہ زنداں جنگ آزادی وغیرہ لکھیں نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

نالۂ دل:

سنانا ہے گرفتاری میں اپنی داستاں ہم کو
سکھا دو ہمصفیران قفس طرز بیاں ہم کو
ہمارے نالۂ دل دوز نے ظالم کو بھڑکایا
نہیں تو چھوڑ ہی دیتا سمجھ کر بے زباں ہم کو

آئینہ زنداں:

ہم اپنے خدمت مذہب کے جذبہ کے بڑھانے کو
عزیزوں سے جدا ہو کر چلے تھے قید خانے کو
خدا کی راہ میں مہمان ہو کر جیل آئے تھے
برا کس منہ سے ہم کہنے لگے مہمان خانے کو

جنگ آزادی:

جنگ آزادی کا میداں یہ سماں دکھلائے گا
ہند پر اک دن فقط قومی علم لہرائے گا
پونے دو سو سال تک سوتے رہے ذلت کی نیند
کہئے کب خواب گراں سے سر اٹھایا جائے گا
آج بھی اٹھنے میں گر حیلے حوالے ہیں تو پھر
کونسا دن ہوگا جب تم کو بلایا جائے گا
قوم کی پستی کی حد ہے ظلم سہنے کی بھی حد
جور انگلستاں نہ ہرگز اب سہارا جائے گا (۲۰۸)

سعید اللہ خاں رزمیؔ:

رزمیؔ کا تعلق بھوپال سے تھا۔ بچپن سے شعر گوئی کی طرف مائل تھے۔۱۹۲۶ء تک شعر و شاعری کرتے رہے پھر سیاست کی طرف مائل ہو گئے۔ سیاست کی طرف آنے کی وجہ سے شعر و شاعری میں دلچسپی کم ہونے لگی۔

رزمی غزل بہت اچھی کہتے تھے۔ان کا کلام "نگار" بھوپال میں ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۶ء تک مسلسل نکلتا رہا۔نمونہ کلام درج ذیل ہے

لطف حاصل تھا زندگانی کا
وہ بھی کیا دور تھا جوانی کا
توڑ دے دست شوق بند نقاب
راز کھل جائے لن ترانی کا
زندگی کیا ، نمود موج سراب
موت کیا ، داغ زندگانی کا

***

عکس جمال یار کی تاثیر دیکھنا
دل بن گیا ہے حسن کی تصویر دیکھنا
آئی ہے پھر چمن سے ہوائے جنوں نواز
شائد ہے پھر نصیب میں زنجیر دیکھنا

***

آجائے زباں پر جو مرے غم کا فسانہ
آغوش محبت میں سمٹ آئے زمانہ
بے کیف نہ ہوجائے کہیں ساز محبت
دہرائے جو رزمی کوئی رنگین فسانہ (۲۰۹)

ممتاز احمد سہا مجددی:

ممتاز احمد سہا مجددی ۹ فروری ۱۸۹۲ء میں بھوپال میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم "مدرسہ تعلیم،اور جہانگیریہ" میں حاصل کی۔علی گڑھ سے انٹر کی تعلیم حاصل کی تھی۔دوران تعلیم ہی "فن تقریر" میں اتنی مہارت پیدا کرلی کہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی شرکت کے لئے کالج کی جانب سے رنگون بھیجے گئے۔ان کی ذہانت سے متاثر ہوکر نواب وقارالملک نے تین سو روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کیا۔۱۹۲۰ء تک تصنیف وتالیف کا کام کرتے رہے۔۱۹۲۱ء میں بھوپال واپس آگئے اور اسی سال شرح دیوان غالب "مطالب الغالب " کے نام سے لکھی جو اب نایاب ہے۔۱۹۲۲ء میں

حکیم احمد شجاع کی دعوت پر لاہور گئے۔ جہاں رسالہ "ہزار داستان "میں کام کرنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد "ریاست خیر پور" میں پانچ سو روپیہ ماہوار پر نواب صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری ہو گئے۔ ۱۹۲۵ء میں پھر لاہور آکر ادبی رسائل میں کام کرنے لگے۔ ۱۹۲۹ء میں بھوپال میں ہونے والی غیر ملکی تحریکات میں حصہ لیا یوں معاشی مسائل پیدا ہونے لگے تو لکھنو کا رخ کر لیا۔

۱۹۴۱ء میں بھوپال میں آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہوا جس میں جوشؔ، فانیؔ، جگرؔ، احسان دانشؔ، سیمابؔ، یگانہ چنگیزی، سہاؔ وغیرہ شریک ہوئے۔ اس کے بعد سہاؔ بھوپال میں مقیم رہے اور ایک ہفت روزہ اخبار "تعمیر" جاری کیا جو بعض اختلافات کی بنا پر زیادہ عرصہ چل نہ سکا۔ ۱۹۴۷ء میں بیماری کے سبب انتقال فرما گئے۔ سہاؔ ہندوستان کے منجھے ہوئے شاعر اور بہت کم گو تھے، مگر جو کہتے وہ بہت باکمال کہتے تھے۔ بقول ڈاکٹر سلیم حامد رضوی

> فانیؔ، جگرؔ، اور اصغرؔ کی طرح سہاؔ کے یہاں بھی انفرادیت پائی جاتی ہے۔ انہوں نے زندگی اور کائنات پر فلسفیانہ نظریں ڈالیں اور مجاز اور حقیقت کے امتزاج سے اپنی غزل کی تعمیر کی۔ کلام میں انسانی نفسیات اور اس کی کشمکش کے مرقعے روشن نظر آتے ہیں۔ بیان میں حد درجہ ندرت ہے جو صرف غالبؔ ہی کا حصہ تھی۔ سہاؔ اپنے سانچے الگ بناتے ہیں ۔ رسمی خیالات و موضوعات انکے یہاں مشکل سے ملتے ہیں۔۔۔ ان کے کلام میں دلپذیر فارسی ترکیبوں کی کثرت ہے اور جمالیاتی حسن رمزیت اور ایمائیت کی بہتات ،زبان کی شستگی اور شیرینی ، ترکیبوں کی ہم آہنگی نے غزل کو حسین اور رنگین بنا دیا۔ (۲۱۰)

سرزمین بھوپال کے لئے یہ فخر کی بات ہے کہ اس نے ڈھائی فٹ کے قد کا ایک ایسا شاعر بھی پیدا کیا ہے جس کی فکر میں ایسا بلندی تھی جس کی راہ میں کوتاہ قامتی رکاوٹ نہیں بن سکی تھی۔ سہاؔ صاحب دیوان شاعر تھے لیکن ان کی موت نے اس قیمتی سرمائے سے محروم کر دیا تھا۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے

چلی ہی آتی ہیں شوق میں یاں زبان پہ بے اختیار باتیں
سکوت نخوت بھی مسکرا دے سنے جو دیوانہ وار باتیں
رقیب کو بزم میں بلایا کسی کو کیا اعتراض کی جا
مگر ترا التفات پیہم ، مگر تری بار بار باتیں

***

وہ حجاب ہو کے بھی رہیں گے اک حجاب میں
نظر کی خیرگی میں ہوں کہ دل کے اضطراب میں
سمجھ رہا ہوں فرصت نگاہ کامیاب میں
کہ جیسے جاگ اٹھا ہوں میں کسی حسین خواب میں

***

وہ بیباکیاں کہیں طلب گاریوں میں
کہ لطف آ گیا ان کو دل داریوں میں
مسلسل ہے احساس رنج و الم کا
کسے مہلت ہوش ہشیاریوں میں
فنائے دوعالم ہے اک مشغلہ سا
مری بے خودی کی رواداریوں میں
پھر ان کی جفاؤں کا شکوہ ہے کیسا
بہلنے لگے دل جو دشواریوں میں (۲۱۱)

سید محمود اعظم فہمی بھوپالی:

فہمیؔ ۱۹۱٦ء میں ریاست بھوپال میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے شعر گوئی کی طرف رجحان تھا۔ ابتدا میں محویؔ سے اصلاح لی بعدازاں خود شعر کہنے لگے۔ انہوں نے بھوپال میں کئی علمی وادبی ادارے قائم کیے اور ہمیشہ اجتماعی طور پر علم و ادب کی خدمت کرتے رہے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں ترک وطن کر کے پاکستان چلے آئے تھے۔ فہمیؔ کی شاعری کے بارے میں "سید سلیمان ندوی" نے ۱۹۴۹ء میں "سخن فہمی" میں لکھا بقول ڈاکٹر سلیم حامد رضوی

> بھوپال بھی ان خوش نصیب سرزمینوں میں ہے جن کو اردو شعر دسخن کی خدمت نصیب ہوئی۔ حضرت فہمی ترمذی بھی اس سرزمین سے وابستہ ہیں۔ میرے خیال میں فہمیؔ انواع کلام، موضوعات شعری اور مذاق سخن کے لحاظ سے حالیؔ مرحوم سے مناسبت رکھتے ہیں۔۔۔ فہمیؔ نہ پورے جدید شاعر ہیں اور نہ پورے قدیم۔ بلکہ وہ دونوں کا مجموعہ ہیں۔ ان کی نظموں میں سیاسی، قومی، مجلسی اور تعلیمی عنوانات کے ساتھ فطرت کی نقاشی۔۔۔(۲۱۲)

یوں مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں فہمیؔ کی شعر گوئی اور شاعرانہ مقام کے بارے میں شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے۔ فہمیؔ کی نظموں کا جوہر اعلیٰ جذبات کی درست ترجمانی اور فطرت کی مصوری ہے۔ فنی نقطہ نگاہ سے اگر دیکھا جائے تو ان کے ہاں وہ سب عناصر موجود ہیں جو ایک شاعر کے لئے ضروری ہیں۔ زور بیان، ولولہ جوش، مترنم اور موثر الفاظ کو حسین تشبیہوں، استعاروں سے اپنی شاعری کو سجاتے ہیں۔ فہمیؔ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ مفکر بھی تھے۔ وہ جو کہتے اس میں ان کے عمیق مشاہدات، اور فلسفیانہ مباحث کی تہہ میں تعمیری مقصد بھی پنہاں ہوتا ہے۔ فہمیؔ کا کلام تین مجموعوں "شعرستان"، "گلبانگ"، "مضراب" پر مشتمل ہے۔ ایک مثنوی "سفر شکار" کے عنوان سے لکھی تھی۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

جوش پہ آئی کامل رحمت
راز ہوا جو مائل شہرت
عشق نے کی نذر اپنی ودیعت
حسن نے کی تفویض امانت
فطرت لائی چند عناصر
بہر وجود خلقت شاعر

***

یہ تالاب کی سطح لہروں کا منظر
شکن در شکن جیسے شفاف بستر
چنے جا رہے ہیں دوپٹے برابر
رواں چٹکیاں سی ہیں آب رواں پر
یہ موجوں میں الجھے ہوئے ماہ و اختر
وہ اچھلے، یہ ڈوبے، وہ چمکے ابھر کر

***

اس سے گزرے ندی آئی
لیکن تہہ تک سوکھی پائی
تھوڑی سی دریا کی نشانی

دل دل ، کیچڑ ، گدلا پانی
پار ہوئے تو جنگل دیکھا
جانوروں کا دنگل دیکھا (۲۱۳)

رمزیؔ ترمذی:

محمد اسمعیل رمزیؔ ۱۸۹۹ء میں بھوپال میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۳ء سے شعر و شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ منیر بھوپالی کے شاگرد تھے۔ رمزیؔ کی غزل گوئی میں فرسودہ خیالات اور عامیانہ مضامین کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ہے۔ انداز بیان سادہ اور پر کیف ہے۔ ان کے نئی اور پرانی قدریں یکجا نظر آتی ہیں۔ تبسم نظامی نے ان کے سو اشعار کا ایک سیٹ چھاپ کر ان کا تعارف دنیائے ادب میں کرایا ہے۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

کیا ابھی اور کئے جاؤں مناجات کہ بس
کچھ ملے گا بھی مجھے قبلہ مناجات کہ بس
آپ جاتے تو ہیں لیکن یہ بتاتے جائیں
آپ سے پھر بھی کبھی ہو گی ملاقات کہ بس

***

یہ آنکھوں سے میری برس لیں تو جائیں
بہت دل پہ چھائی ہیں غم کی گھٹائیں
وہ شبنم میں مل کر وہ غنچوں میں چھپ کر
ادھر مسکرائیں ادھر مسکرائیں
منانے میں یہ بھی منانا ان کو
مناتے مناتے وہ خود روٹھ جائیں

***

تلخی زہر بھی امرت میں ملی ہے اے دل
دیکھ ان مدھ بھری آنکھوں کے اشاروں سے نہ کھیل
حق و باطل سے جو ممتاز کیا کرتا ہے

دل میں وہ کفر بھی ہم رکھتے ہیں ایماں سے قریب(۲۱۴)

مولوی عبدالمتین متینؔ:

متینؔ بھوپال میں مختلف عہدوں پر فائز رہے تھے۔ بعدازاں نواب عبیداللہ خاں کی ڈیوڑھی میں کامدار ہو گئے۔ متینؔ نے ۱۹۳۵ء میں انتقال فرمایا۔ بھوپال میں "دیوانے شاعر" کے نام سے مشہور ہوئے کیونکہ یہ صرف اصلاحی، اخلاقی فلسفیانہ اور سائنسی نظمیں لکھا کرتے تھے۔ جو اپنے موضوع کے اعتبار سے بے حد خشک ہوا کرتی تھیں مگر اس کے بوجود بندش کی چستی، عبارت کی روانی و سلاست پائی جاتی ہے۔ ان کے کلام کا زیادہ تر حصہ نواب سلطان جہاں بیگم کی امداد کے بدولت کتابی صورت میں چھپا تھا۔ ان کے شعری مجموعوں میں "موتیوں کی لڑی"، "قیمتی زیور (ہدیہ سلطانی)" ، راز کونین"، "سائنس فلسفہ"، فلسفہ و اخلاق" شامل ہیں۔ متینؔ کا نمونہ کلام درج ذیل ہے

دل وہ اچھا ہے محبت جس میں ہو
آنکھ وہ اچھی مروت جس میں ہو
جس میں کچھ غیرت نہیں انساں نہیں
آدمی وہ ہے ، حمیت جس میں ہو
شکل ہو ، کیسی ہی ، اچھی کچھ نہیں ہے
وہ اچھا ، اچھی سیرت جس میں ہو
سارے عالم کا ہے اس پر اتفاق
آدمی وہ ، آدمیت جس میں ہو
عورتوں میں سب سے اچھی ہے وہی
شرم کی پتلی ہو ، عصمت جس میں ہو
لب وہ اچھا جس سے نکلے اچھی بات
وہ نہیں رنگت ، نزاکت جس میں ہو (۲۱۵)

سید مرتضیٰ خاں شمیمؔ:

نواب صدیق حسن خاں کے نواسے اور ممتاز الدولہ صولت جنگ عبدالحیی کے بیٹے تھے۔اردو میں داغؔ دہلوی اور فارسی میں شہیرؔ سے اصلاح لیتے رہے تھے۔بھوپال میں ان کو "شاعر نازک خیال" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔برجستہ گوئی میں مہارت رکھتے اور ایک ہی نشست میں سو سو اشعار کہہ جانے میں طاق تھے۔ان کے مجموعہ کلام میں "خمخانہ جاوید" شامل ہے۔نمونہ کلام ملاحظہ ہو

ساز ہستی فریب ہستی ہے
جو بلندی ہے عین پستی ہے
دل کو حسرت ہے ان سے ملنے کی
آنکھ دیدار کو ترستی ہے
سیکڑوں میکدے بناتی ہے
جھوم کر جب گھٹا برستی ہے

***

وہ بگڑے ، بات بگڑی ، حال بگڑا ، اک جہاں بگڑا
تری گردش کا میں اے گردش تقدیر قائل ہوں(۲۱۶)

عبدالاحد خاں بسملؔ:

بسملؔ صاحب عیشؔ بھوپالی کے شاگردوں میں سے صاحب دیوان شاعر گزرے ہیں۔ان کے دو دیوان "اضطراب بسملؔ"،"خون بسملؔ" مطبع آگرہ اخبار سے شائع ہوئے۔ان کے کلام میں روزمرہ اور خیالات صاف اور سلجھے ہوئے ہیں۔نمونہ کلام درج ذیل ہے

اس شعلہ رو نے رخ سے جو پردہ اٹھا دیا
ایسی لگائی آگ کہ دل کو جلا دیا
دل بھی دیا تو ہم نے دیا دلربا تجھے
کہہ دے تو ہی کہ تجھ رقیبوں نے کیا دیا

***

کہاں منزل ہے کچھ پروا نہیں ہے مجھ کو منزل کی
ادھر ہی جا رہا ہوں میں جدھر ترغیب ہے دل کی
تمہارے وصل کا طالب ہوں تمہارے وصل کا خواہاں
کھڑا ہے کون سا سائل خبر ہے کچھ بھی سائل کی(۲۱۷)

احمد نعیمیؔ مراد آبادی:

سبعہ سیاران کے ممتاز رکن اور اپنے ہمعصران میں اعلیٰ درجہ کے شاعر اور مقالہ نگار تھے۔۱۹۱۱ء میں مراد آباد سے بھوپال آئے۔وہ مالی پریشانیوں کا شکار تھے۔بھوپال میں بے سر وسامانی کی زندگی بسر کرتے رہے تھے۔البتہ شاعرانہ صلاحیتوں کی بدولت دوستوں کے دروازے ہمیشہ ان کے لیے کھلے رہتے تھے۔انہوں نے اپنی زندگی کے متعلق ایک خط میں لکھا جو صفدرؔ مرزاپوری نے "مرقع ادب "میں شائع کیا تھا۔بقول ڈاکٹر سلیم حامد رضوی

> میں حوادث وافکار کا شکار تھا اور اب بھی ہوں اور شائد ہمیشہ رہوں گا میری قسمت میں اطمینان ومسرت نہ کبھی تھا اور نہ اب ہے۔کیا کروں اور کیا نہ کروں۔۔۔۔جب سے بھوپال آیا ہوں صحت نے بھی جواب دے دیا ہے۔شعر وسخن سے مغائرت ہوگئی ہے۔کئی کئی دن گزر جاتے ہیں ایک شعر بھی موزوں نہیں کر پاتا۔تغزل اب میرے لئے دشوار ہے اب عامیانہ رنگ سے بھی تنفر ہوں۔جذباتی شاعری کا شیدائی ہوتا جا رہا ہوں۔(۲۱۸)

نعیمیؔ کا انتقال ۱۹۲۰ء میں نہایت کسمپرسی کی حالت میں ہوا۔کلام دوسروں کے قبضے میں چلا گیا اور وہ لوگ ان کے کلام کو اپنا بنا کر مشاعروں میں سنانے لگے۔اس لئے ان کا نمونہ کلام بہت کم دستیاب ہے۔

خان بہادر سید محمد ہادی رسواؔ:

خان بہادر محمد ہادی رسواؔ(۱۸۵۷ء۔۱۹۳۱ء)مظفر نگر کے رہنے والے تھے۔تعلیم انگلستان،امریکہ اور فرانس میں حاصل کی اور زراعت کے ماہرین میں شمار ہوتا تھا۔۱۹۱۱ء میں حکومت ہند میں کلکٹر ہو گئے۔۱۹۱۹ء میں ریاست بھوپال نے ان کو بحیثیت ڈائریکٹر منتخب کر لیا تھا۔۱۹۳۱ء میں پنشن پر سبکدوش ہو کر بھوپال سے چلے گئے۔محمد ہادی رسواؔ کو ابتداء ہی سے شعر گوئی میں دلچسپی تھی۔ان کے مکاں میں وقتاً فوقتاً مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔بقول ڈاکٹر سلیم حامد رضوی

جملہ اصناف سخن پر قدرت حاصل تھی مگر قصیدہ منقبت اور مرثیہ سے زیادہ لگاؤ تھا۔ نظمیں اور قصیدے کانپور میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ کلام کی خوبی یہ ہے کہ مشکل سے مشکل اور پیچیدہ سے پیچیدہ مضامین کو سہل اور سادہ الفاظ میں ادا کر دیتے ہیں۔(۲۱۹)

رسوا نے جابجا اپنی شاعری پر تبصرہ بھی کیا ہے علاوہ ازیں نواب نصر اللہ خاں کی موت پر ایک نوحہ بھی لکھا تھا۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے

بندش ہے مگر سادہ اور طرز بیاں سادہ
وہ گل ہے نہ بلبل ہے وہ جام نہ وہ بادہ
ساقی ہے نہ شیشہ ہے زاہد کا نہ سجادہ
احسان ہے سننے پر ہو جائیں آمادہ

***

کئی دکھتے دلوں کو اک نیا دکھ دے گا برسوں
بہت سی خوں فشاں آنکھوں سے برسے گا لہو برسوں
کہاں سے لائیں گے اے نواب نصر اللہ خاں تجھ کو
یہ دو آنکھیں تجھے ڈھونڈا کریں گی چار سو برسوں
تصور کو تری صورت نہ بھولے گی نہ بھولے گی
نظر کو تیرے جلوے کی رہے گی جستجو برسوں(۲۲۰)

منشی پچھمی نرائن افسرؔ:

افسرؔ بھوپال کے کائستھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے بھتیجے کنج منوہر لال نوشؔ نواب صدیق حسن خاں کی بزم ادب کے ایک ممتاز رکن رہے ہیں۔ محکمہ مال میں ملازمت کرتے تھے۔ ۱۹۲۲ء میں آپ نے چار ماہ کے اندر عمر خیام کی رباعیات کا ترجمہ اردو میں روح الرباعی بڑی خوبی کے ساتھ کیا تھا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر حامد سلیم رضوی نے لکھا کہ

۱۹۲۲ میں بھوپال کے ایک رئیس منشی پچھمی نرائن صاحب افسرؔ نے عمر خیام کی رباعیات کا ترجمہ کیا ہے۔ جو اب تک جتنے ترجمے میری نظر سے گزرے ہیں، سب سے بہتر ہے۔ منشی صاحب کے ترجمے میں بے شمار خوبیاں ہیں۔ ایک یہ ترجمہ لفظی ہے اور اسی بحر میں ہے جو خیام نے

اختیار کی۔ دوسرے یہ کہ بجائے اردو معلی کے اس میں ہندی بھاشا کا عنصر غالب ہے۔ جس کی توسیع کی شدید ضرورت ہے۔ تیسرے ترجمہ اصل سے بہت قریب ہے اور خیام کے خیالات کی پوری ترجمانی کرتا ہے۔۔۔۔(۲۲۱)

افسرؔ کے ترجمے کی بدولت بھوپال کے تمام علماء و فضلا نے انہیں بہت سراہا ہے۔ یہ ترجمہ قلمی نسخہ کی صورت میں منشی ادے بھان صاحب کے پاس موجود تھا۔ فارسی کی رباعی کے ساتھ منظوم ترجمہ ہے اور بعض رباعیات کی اردو میں شرح بھی لکھ دی گئی تھی۔ فارسی اور اردو نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

فارسی رباعی اردو ترجمہ

چوں عہدہ نمی کند کسے فردا را
پورا نکرے کوئی بھی کل کے دن کو
حالے جوش کن تو ایں دل شیدا را
تو آج ہی رکھ خوشی میں اپنے دل کو
می نوش بنور ماہ اے ماہ کہ ماہ
چاندنی رات میں پی بیٹھ کے اے ماہ کہ ماہ
بسیار بجوئد دنیا بد مارا
چمکا کرے کہ کتنا ہی نہ پاوے تجھ کو

***

اے دل و زمانہ رسم احسان مطلب
من رسم زمانہ سے تو احسان مت چاہ
در گردش دوراں سرو ساماں مطلب
گردش سے جہاں کے سروسامان مت چاہ
درماں طلبی درد تو افزوں گردد
وارد کو جو چاہے تو بڑھے درد بہت(۲۲۲)

سمھبودیال سخنؔ:

سخنؔ عمر نواب زادہ عبید اللہ خاں صاحب کی ڈیوڑھی پر ملازم رہے تھے۔شعرائے بھوپال میں ان کا نام کافی بلند تھا۔مشاعروں میں اساتذہ کی صف میں بٹھائے جاتے تھے۔سخن کی غزل ایک قادرالکلام شاعر کی تخلیق معلوم ہوتی ہے۔زور بیان شوکت الفاظ،جدت خیال اور ندرت ادا ان کی نمایاں خصوصیات ہیں۔بقول ڈاکٹر حامد سلیم رضوی

> غزل کے علاوہ سخنؔ ہجو کے بھی بہت بڑے استاد تھے۔جنرل صاحب مرحوم ان کو "بھوپال کا سوداؔ" کہا کرتے تھے۔ ان کی ہجویات حد سے زیادہ مقبول تھیں۔ادھر ہجو کہی اور ادھر سارے بھوپال میں پھیل گئی۔ہجو میں وہ اعتدال سے آگے بڑھ جایا کرتے تھے اور عوام میں ان کی یہی بے اعتدالی بہت پسند کی جاتی تھی۔ سنجیدہ طبقہ ان کی اس روش کو پسند کرتا ہو یا نہ کرتا ہو ان کی شاعرانہ صلاحیت کا ضرور معترف تھا۔(۲۲۳)

سخنؔ کا نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

مجازی نہ سمجھیں تری بے نیازی
کدھر متقی ہیں ، کہاں ہیں نمازی
تجھے فصل گل کی خوشی کیا ہے زاہد
نہ بادہ پرستی نہ میکش نوازی
تری رفعت نقش پا کے تصدق
کہ ذرہ کو ہے عرش کی سرفرازی
سخنؔ کوئی پوچھے حسینوں کے دل سے
مری پارسائی ، تری پاکبازی

***

اس نقش قدم پر تو کوئی حرف نہیں ہے
بدنام زمانہ میں مرا نقش جبیں ہے
وہ اور وفا کیش ، مرے ذہن نشیں ہے
کمبخت یہ ایمان ہے یا حسن یقیں ہے(۲۲۴)

گوبند پرشاد آفتاب:

پرشاد آفتاب کا تعلق کائستھ خاندان سے ہے۔ لکھنو یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے۔ بچپن ہی سے علمی و ادبی ذوق تھا۔ان کے مضامین اور نظمیں ہمدم،اخوت،زمانہ اور اودھ اخبار میں شائع ہوتی رہی تھیں۔ فلسفہ اور سیاست سے خاص لگاؤ رہا اور اس سلسلے میں بدستور سیاسی خدمات انجام دیتے رہے تھے۔پرشاد آفتاب کا شمار بھوپال کے قادر الکلام شعرا میں کیا جاتا رہا ہے۔غزل، نظم اور قصیدہ بے تکلف کہتے تھے۔ان کی نظموں کا مجموعہ "نور تن" کے نام سے شائع کیا گیا تھا۔دو دیوان اور چند مثنویاں بھی لکھیں جو غیر مطبوعہ ہیں۔۱۹۶۱ء میں انتقال فرمایا۔نواب شاہجہاں بیگم نے ایک عالی شان مسجد کی تعمیر کا حکم دیا تھا جو ان کی زندگی میں مکمل نہیں ہو سکی تھی۔پرشاد نے اس مسجد سے متاثر ہو کر ایک نظم "تاج المساجد "لکھی۔

ہوتی ہے یہاں روشنی پاکیزہ نظر کی
پتھر میں چمک پاؤ گے یاں آب گہر کی
رہتی ہے دعا ڈوبی ہوئی دل کے اثر کی
ہے نقل مہ عید اسی محراب کے در کی
اس باب پہ رحمت ہے در دل سے زیادہ
فیض ان کا ہے قرآن کی منزل سے زیادہ
اس تاج مساجد کی زہے وسعت ایواں
ہیں پھول ستونوں پہ کہ پھولا ہے گلستاں
محراب پہ محراب ہے صد موج پریشاں
لاتی ہے دریچوں سے ہوا رحمت یزداں
گل بوٹے ہیں پتھر میں کہ جالی بھی تنی ہے
خود ہی کرم و لطف کی غربال بنی ہے
دالان ہیں باپردہ کشادہ بھی بکثرت
نقش بھی ہے سنگ اور ہے سادہ بھی بکثرت
منقوش ہیں آیات افادہ بھی بکثرت

جلوہ فگن عرفان کا بادہ بھی بکثرت
اور منزل بالا کی عجب رفعت و شاں ہے
اس پر فلک عالم بالا کا کماں ہے (۲۲۵)

صالحہ خانم عاجزؔ:

عاجزؔ نے اپنے والد خواجہ محمد اسمعیل سے گھریلو تعلیم حاصل کی تھی۔ یہ کیف بھوپالی کی والدہ اور ذکی وارثی کی بہن تھیں۔ شعر و شاعری کا انہیں بچپن سے ہی شوق تھا۔ اپنے بھائی ذکی کی بدولت باقاعدہ شعر گوئی کی جانب مائل ہوئیں اور سراج منیر خاں سے اصلاح لینے لگیں۔ حمد و نعت سے خاص شغف تھا۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

پلا ساقی مئے وحدت کہ دل سرشار ہو جائے
مگر سرشار ایسا ہو نہ پھر ہوشیار ہو جائے
طبیعت حب دنیا سے ابھی بیزار ہو جائے
اگر مجھ کو زیارت سید ابرار ہو جائے

***

گزرے فراخ دستی سے یا مفلسی کے ساتھ
وابستہ تیری یاد رہے گی زندگی کے ساتھ
بر آئے آرزوئے دلی یا خدائے پاک
تیری طلب میں عمر کٹے بے کلی کے ساتھ
دریائے شوق دل میں ہو ہر لحمہ موجزن
جاں اور مال تجھ پہ فدا ہو خوشی کے ساتھ (۲۲۶)

قاضی فصیح الدین قفسؔ:

بھوپال کے مشاعروں میں حد سے زیادہ بڑھتی ہوئی سنجیدگی کو معتدل بنانے کے لیے قفسؔ کو سامنے لایا جاتا تھا۔ ان کے کلام کا مجموعہ "نمکدان سخن" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کی شاعری اور مزاج کے بارے میں ڈاکٹر سلیم حامد رضوی لکھتے ہیں کہ

قفنس جن کی صورت، تقریر اور کلام ہر چیز اپنی جگہ پر قابل دید و شنید تھی۔ لمبی ڈاڑھی، ٹخنوں تک گیر و جغہ، گلے میں تسبیح اور بڑا سا ڈنڈا جب سامنے آتے تھے تو محفل صورت دیکھتے ہی قہقہہ زار بن جاتی تھی۔ پھر کلام سنانے سے پہلے اپنا تعارف کراتے تھے۔ غریب پرور دیپک نواز، موسیقار الدنیا، آفت سوز، آتش زن امیر قوالان، رئیس القلندر، سلطان المزامیر۔۔۔ مولانا طبل یار جنگ قاضی شاہ فصیح الدین قفنسؔ۔۔۔ مشکل زمین میں کہتے مگر خوب کہتے جو کہنہ مشقی اور قادر الکلامی کی دلیل تھی۔ اصل مقصد ہنسنا اور ہنسانا تھا۔(۲۲۷)

قفنسؔ کا نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

جب دیکھئے اسی پہ لگائے ہوئے ہیں آنکھ
معشوق اپنا روزن دیوار ہو گیا
فرقت میں ٹیلیفون کے قابل ہوا ہے جسم
دبلا ہوا ہوں اتنا کہ میں تار ہو گیا

***

گہرائیوں میں دل کی ستم گر پھسل پڑا
اس جھیل میں پہاڑ کا پتھر پھسل پڑا
میرا رقیب سبزہ خط پر پھسل پڑا
کافی بڑی چٹان تھی خچر پھسل پڑا
چاہ ذقن پہ دل مرا آخر کو آگیا
آب حیات میں یہ سکندر پھسل پڑا (۲۲۸)

***

حاجی قمر علی خاں ڈھینڈسؔ:

ڈھینڈسؔ غزل گو شعراء میں بہت مشہور تھے۔ فوج میں ملازمت کرتے رہے تھے۔ مذاقیہ انداز کے عامیانہ شعر کہتے لیکن کمال یہ تھا کہ بر محل اور فی البدیہہ کہتے تھے۔ حکیم معشوق علی جوہر کے شاگرد تھے۔ نواب سلطان جہاں بیگم کے عہد میں سڑک کے بائیں جانب چلنے کا رواج شروع ہوا تو ڈھینڈس نے فرمایا

آدم کی بائیں پسلی سے حوا کا ہے ظہور　　　عورت جو حکمراں ہے تو بائیں طرف چلو(۲۲۹)

جب بھوپال میں بیرونی اشخاص کو اعلیٰ عہدوں پر مقرر کیا جانے لگا تو کہتے ہیں۔

پردیسی ڈاکوؤں نے بھوپال لوٹ ڈالا آئے ہیں یہ لٹیرے جانے کہاں کہاں سے (۲۳۰)

ایک موقع پر نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی شان میں ایک طنزیہ نظم پڑھی۔ نمونہ کلام

پڑھ کے انگریزی جو کالے یہاں آجاتے ہیں
مثل گوروں کے بسر زندگی فرماتے ہیں
واقعی حضرت ڈھینڈسؔ کی ہے ڈارھی نیچی
جنکے ڈاڑھی نہیں وہ دیکھ کے شرماتے ہیں (۲۳۱)

ایک خاتون کا نام بسم اللہ تھا۔ ڈھینڈس نے اس پر نظم کہہ ڈالی۔

یاد میں سات سو چھیاسی کی
ہم نے تازہ شراب باسی کی (۲۳۲)

چھتر سال چھترؔ:

تحصیل بیرسیہ کے ٹھاکر تھے اور ایک گاؤں میں چھوٹے پیمانہ پر کاشتکاری کرتے رہے تھے۔ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے لیکن حالات حاضرہ پر ایک ہی نشست میں بیس پچیس شعر کہنا ان کے لئے معمولی بات تھی۔ اس خوبی کی بنا پر تحصیلداروں اور افسروں کی محفل کی رونق بنے رہتے تھے۔ چھتر سال چھترؔ سنجیدہ اشعار کہتے لیکن ان کی مقبولیت کا دارومدار ان کے مزاحیہ اور طنزیہ کلام پر تھا۔ بھوپال میں باہر کے لوگوں کو جب بلا کر بڑے بڑے عہدوں پر رکھ لیا گیا اور اہل بھوپال کے لئے سرکاری ملازمت کے دروازے بند ہو گئے۔ اس حالت کا نقشہ چھتر سال چھترؔ نے ایک مسدس میں پیش کیا ہے۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے

ہمیشہ وطن کا رہے ان کو پاس
وطن سے بلائیں وہ سالے اور ساس
وہاں جو سدا کاٹا کرتے تھے گھاس
یہاں ان کی تنخواہ سو اور پچاس
وطن کے دروغا و تحصیلدار

کہو ہم کریں کس جگہ روزگار
وزیر ایک آیا نئی چال کا
کیا جس نے انظام بھوپال کا
خزانہ جمع تھا کئی سال کا
نہ اس کا پتہ ہے نہ اسال کا
گریباں غریبوں کا ہے تار تار
کہو ہم کریں کس جگہ روزگار (۲۳۳)

عبدالعزیز خاں عزیزؔ:

بھوپال کے قدیم اور باعزت خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔اورینٹل کالج لاہور میں رہ کر منشی فاضل کیااور وہاں اختر شیرانی مرحوم سے دوستی ہوگئی تھی۔ بھوپال میں تحصیلدار رہے اور ملازمت کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ شعر وادب کی خدمت بھی انجام دیتے رہے ہیں۔ نظم و نثر دونوں پر بڑی قدرت حاصل تھی۔غزل کم اور نظم زیادہ کہتے تھے۔ مسدس کے انداز میں کئی اصلاحی و تنقیدی مسدس بھی لکھے ہیں۔ بعض نظمیں اکبرؔ کے رنگ میں کہی ہیں۔اکثر نظمیں اختر شیرانی (۱۹۰۵ء۔۱۹۴۸ء) کے پرچوں میں چھپ چکی ہیں۔زیادہ کلام غیر مطبوعہ ہے۔عبدالعزیز اپنی دیانت داری کی وجہ سے بدیانت افسران کی نظروں کھٹکتے تھے اس صورت حال سے تنگ آکر منظوم شکوہ لکھا ہے۔عبدالعزیز عزیز خاں عزیزؔ کا نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

ہمیں شکایت بیجا کا حوصلہ بھی نہیں
تمہارے بندے ہیں ہم خوگر گلہ بھی نہیں
بجز وفا کے ہمیں اور کچھ ملا بھی نہیں
کسی سے سعی و سفارش کا سلسلہ بھی نہیں
شمیم اپنی جگہ ہے صبا چلے نہ چلے
مہک رہے چمن میں ہوا چلے نہ چلے

***

کالوں کے زہر سے تو ہوا روسیا میں

گوروں کی کود پھاند نے بندر بنا دیا
مس کی ستم ظریفی و شوخی نہ پوچھئے
منڈھوا کے داڑھی مونچھ قلندر بنا دیا
مکر و دغا فریب و فسد ، کذب و افترا
بغض و نفاق کے مجھے لوفر بنا دیا

***

شکست بند قفس کی ہوس نہیں باقی
گری ہے برق بلا کل ہی آشیانے میں
ترانہ سنج ہوں محفل میں بربط دل پر
صدائے درد ہے پیدا ہر اک ترانے میں
سوائے نالہ بے تاب و آہ نیم شبی
کوئی بتائے ملا کیا مرے سنانے میں (۲۳۴)

حکیم سید معظم حسین عرف منومیاں فیضیؔ:

حکیم مولوی سید اعظم حسین ابن حکیم خادم حسین سندیلوی کے بیٹے تھے۔ مستقل سکونت سلوانی میں تھی۔ آپ خاندانی حکیم اور شاعر بھی تھے۔ غزل اور قصیدہ میں مہارت رکھتے ہیں۔ فیضی کا انتقال ۱۹۱۹ء میں ہوا۔ نواب حمید اللہ خاں صاحب (۱۸۹۴ء۔ ۱۹۶۰ء) کی شان میں قصیدہ لکھا، نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

درود نور کی ہے اس قدر فراوانی
کہ ذرہ ذرہ میں ہے مہر کی درخشانی
تجلیات حقیقت کی جلوہ ریزی سے
فضائے کون و مکاں ہے تمام نورانی
نگاہ اہل بصیرت کی ہو گئی خیرہ
کچھ آج برق تجلی کی ہے وہ تابانی
نظر میں وادی ایمن کا پھر گیا جلوہ

عجیب رنگ میں ہے آج صبح نورانی
نظر کو نور ملا قلب کو سرور ملا
ہوا نصیب جو دیدار ظل سبحانی
ہے عین طاقت باری اطاعت سلطان
ہے میرے قول پہ شاہد کلام ربانی
ہوا ہے باعث صد گونہ زیب آرائش
حضور کے سر اقدس پہ تاج سلطانی
یہ عہد سلطنت بندگان عالی شان
ہمارے حق میں ہے لاریب فضل ربانی (۲۳۵)

ایک مزاحیہ غزل کے چند شعر پیش ہیں جس سے ان کے انداز بیان کا بخوبی اور واضح عکس نظر آتا ہے۔ نمونہ کلام

خلوص کی رسم سو ہے جہاں سے اے مہرباں ندارد
ادھر ندارد ادھر ندارد وہاں ندارد یہاں ندارد
بڑے کبھی اپنے چھوٹوں کو رکھا کرتے نہیں گوارا
وہ زور پکڑا ہے کدؤوں نے کہ ہو گئیں ککڑیاں ندارد
پڑی جو بنیاد علم مجلس تو محفلوں میں یہ رنگ دیکھا
کسی کی ٹوپی ہے سر سے غائب کسی کی ہیں جوتیاں ندارد (۲۳۶)

حکیم احسن قادری احسنؔ:

حکیم سید عطا حسین قادری بجنوری کے بیٹے ہیں۔ ۱۸۹۲ء میں بھوپال میں پیدا ہوئے۔ آصفیہ طبیہ کالج کے سند یافتہ حکیم ہیں۔ بچپن سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ ابتداء میں شہید ٹونکی سے اصلاح لیتے رہے ان کے انتقال کے بعد مضطر خیر آبادی سے اصلاح لینے لگے۔ انہوں نے سحر بھوپالی، جوہر شاہجہاں پوری، وفا بھوپالی وغیرہ کے مشاعروں میں غزلیں پڑھی ہیں۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے

حیرت ہے اس زمانہ کی رفتار پر مجھے
ہر شخص آج تک نظر آتا ہے پر خطر
میں جس کو دیکھتا ہوں وہ مطلب کا یار ہے

آتی نہیں ہے مہر وفا کی جھلک نظر
دکھ کا شریک ہے نہ کوئی غم کا آشنا
تنہائی کا انیس نہ غربت کا چارہ گر

***

صنف نازک نے ترقی خوب کی
بڑھ گئیں مردوں سے ہر تعلیم میں
ان کے جلوؤں سے منور سینما
ان کے قدموں سے ہے رونق ٹیم میں (۲۳۷)

مندرجہ بالا شعراء کے علاوہ بھوپال میں دیگر اور بہت سے شعراء علمی و ادبی خدمات سرانجام دے رہے تھے ان میں عصمت اللہ بیگ، عبدالحیی کوثرؔ، مولانا اسلم جیراجپوری، عنایت حسین واصلؔ، ارشاد علی ارمانؔ، عبدالقیوم مہر بھوپالی، عبدالکریم اوجؔ، منولال بسملؔ وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

عہد سلطانی کا نثری ادب

نواب سلطان جہاں بیگم:

اس دور میں مغربی ادب کے صحت مند اثرات کو قبول کیا گیا تھا۔ نئی اصناف یعنی ناول نگاری، افسانہ نویسی وغیرہ کی جانب توجہ دی گئی۔ اس دور میں نثر کو جو نمایاں فروغ حاصل ہوا۔ اس میں نواب سلطان جہاں بیگم کی نجی کوششوں اور دلچسپیوں کو خصوصی داخل حاصل تھا۔ سلطان جہاں بیگم کا مطالعہ اور مشاہدہ وسیع تر ہونے کے باعث انہوں نے تعمیری اور اصلاحی موضوعات پر متعدد کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء۔۱۹۵۸ء) نے نواب سلطان جہاں بیگم کے مذاق علمی اور مشغلہ تصنیف و تالیف کے متعلق تاریخی واقعات کے ساتھ جو تبصرہ کیا ہے اس میں بہ قول محمد امین زبیری مہتمم لکھتے ہیں کہ

> الحمدللہ کہ ایک نظیر موجودہ عالم اسلامی میں ایسی موجود ہے جو ریاست اور ملک رانی کے ساتھ شوق علم اور ذوق تصنیف وتالیف کو بھی جمع کرتی ہے اور مزید برآں یہ کہ وہ صنف رجال میں سے نہیں ہے جس کو اپنے تقدم کا ہمیشہ غرور بیجا رہا ہے بلکہ اس صنف اناث میں سے ہے جس کو دماغی اور ذہنی اشغال سے ہمیشہ معذور سمجھا گیا ہے۔۔۔۔ حضور عالیہ کی ذاتی قابلیت و لیاقت، قوت وتدبیر و نظم ریاست، سیاست دانی وکافرمائی، جوش مذہبی واسلام خواہی۔۔۔ وہ بحیثیت ایک مصنفہ اور اہل قلم کے بھی جلوہ افرز ہیں اور مسلسل متعدد مفید کتابیں ان کی تالیفات میں سے چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔(۲۳۸)

مندرجہ بالااقتباس کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سرزمین ہندوستان میں ایسے حکمران شاذونادر ہی دستیاب ہوں گے جن کے ناموں کے ساتھ "مصنف" کالقب بھی ملے بالخصوص خواتین حکمرانوں میں یہ صلاحیت کمیاب رہی ہے۔ بیگمات بھوپال میں ہمیں بحیثیت مصنف جو حکمران نظر آتی ہیں ان میں باقاعدہ طور پر اگر نام لیا جاسکتا ہے تو وہ نواب سلطان جہاں بیگم کا ہے۔ ہندوستان میں جب سے تصنیف وتالیف کا مذاق پیدا ہوا۔ ایسی بہت ہی کم کتابیں لکھی گئی تھیں جو طبقہ اناث کے لیے مفید ہوں۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنی جنس میں شعور کی بیداری کے لئے متعدد ایسی تصانیف لکھیں ہیں جو خواتین کو بہتر زندگی گزارنے کے لیے کام آسکیں۔ بقول مولانا عبدالسلام ندوی

> سرکار عالیہ نے اپنی جنس کی بہبودی کے ہزاروں کام کیے وہاں اس کمی کو بھی محسوس فرمایا ۔۔۔ سرکار عالیہ نے اپنی تصانیف کو ایک طرف تو نہایت سلیس، عام فہم اور واضح عبارت میں لکھا کہ ہر عورت آسانی کے ساتھ ان سے فائدہ اٹھا سکے۔ دوسری طرف ان مقاصد کو عورت کے سامنے بالکل مذہبی حیثیت سے پیش کیا۔۔۔ سرکار عالیہ نے تصنیف وتالیف کا مشغلہ کسی ملکی یا سیاسی ضرورت سے اختیار نہیں کیا۔ بلکہ ان کو خالص علمی شوق اور سوشل اور معاشرتی اصلاح نے اس کی طرف متوجہ کیا۔ ان کی تصنیف وتالیف کا مقصد صرف علمی نہیں بلکہ زیادہ تر عملی ہیں۔۔۔ ان کی تصانیف نے سرکار عالیہ کی ذات کو اس قدر وقیع کر دیا ہے کہ تنہا ان کی ذات کو ہندوستان کی تمام تعلیم یافتہ عورتوں کے مقابل میں بہ ترجیح پیش کیا جا سکتا ہے۔(۲۳۹)

نواب سلطان جہاں بیگم کے پیش نظر مقاصد عظیم تھے جنکی تکمیل کے لئے عملی کام کرنا ان کے شوق کے ساتھ اشد ضروری بھی ہو گئے تھے۔اپنے زمانہ کی فکر و شعور کو مد نظر رکھتے ہوئے انہوں نے خاص طور سے طبقہ نسواں کو جہل کے اندھیرے سے نکالنے اور علم کے نور سے منور کرنے کی کوشش کی۔اس مقصد کے تحت انہوں نے ایسی کئی کتب خاص طور سے خواتین کے لئے تصنیف و تالیف کیں جو ان کے لئے مفید ہوں۔اوران کو خانہ داری کے کاموں اور اولاد کی تربیت میں مدد دیں۔انہوں نے اپنے مقاصد سے پورا کرنے کے لئے ان باتوں کو کہیں کہیں مذہبی حیثیت سے پیش کیا تاکہ خواتین ان کو ثواب کی نیت سے ادا کرنے میں خوشی اور کار ثواب سمجھیں۔نواب سلطان جہاں بیگم کو اس بات کا احساس تھا کہ ریاست بھوپال کے ابتدائی فرمانرواؤں کے بارے میں تاریخی اعتبار سے نہیں لکھا گیا۔جو کتابیں تاریخ کی تالیف ہوئیں ان میں بھی ابتدائی تاریخ پر کماحقہ کام نہیں ہوا۔محمد امین زبیری مضمون "بھوپال کا علمی جائزہ" میں لکھتے ہیں کہ

> بھوپال کی تاریخ کے متعلق سرکار خلد نشیں اور سرکار خلد مکاں کے زمانہ میں جو کام ہوا تھا وہ تاریخی اعتبار سے اور معیار پر پورا نہ تھا۔خصوصاً نواب سابق کے زمانہ پر کوئی روشنی نہ پڑتی تھی اور نہ بیگمات کا زمانہ مکمل تھا۔(نواب سلطان جہاں بیگم کے عہد میں)۱۹۱۷ء میں ایک مکمل تاریخ کی طرف توجہ مبذول ہوئی۔۔۔غرض سالہا سال کی سعی و جستجو سے نہایت بیش بہا مواد جمع ہو۔۔۔۔اور ۴۶۔۱۹۴۷ء میں وہ طباعت ترتیب کی نوبت سے گزر چکی تھی صرف نظر ثانی و تنقید اور طباعت کا مرحلہ باقی تھا۔(۲۴۰)

نواب سلطان جہاں بیگم نے مختلف موضوعات پر تحریر کردہ ۴۱ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔نواب سلطان جہاں بیگم اردو زبان کی ترقی میں بہت دلچسپی لیتی تھیں۔وہ صوبہ جاتی زبانوں کی ترقی بھی ضروری تصور کرتی تھیں۔ان کے ذاتی دلچسپی ہندی کی طرف زیادہ تھی چنانچہ انہوں نے اپنی کئی تصنیفات و تالیفات کے تراجم ہندی میں طبع کروائے تھے۔ان کی دو کتابیں گجراتی میں بھی ترجمہ ہو کر طبع ہوئیں۔نواب سلطان جہاں بیگم اہل زبان میں اپنی تصنیفات و تالیفات مفت تقسیم کرواتی تھیں۔نواب سلطان جہاں بیگم نے حکمرانی کی ذمہ داریوں کے ادا کرنے کے ساتھ اپنے تصنیف و تالیف کے کام کو بھی کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ایک صاحب قلم جب تک اپنے قلم سے کام نہ لے سکے اس کو چین نہیں ملتا۔ان کی اعلی خطابت بھی مجموعہ کمالات میں داخل تھی۔تقریر کرتے ہوئے معلوم ہوتا تھا کہ زبان میں

فصاحت و روانی، طرز بیاں ،جملوں کی ترتیب،الفاظ کا چناؤ، موضوع کے مطابق ہوتا تھا۔انہوں نے "انجمن ترقی اردو" کے اجلاس میں ایک تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

> اردو کی ترقی صرف ان ترجموں سے نہیں ہوسکتی جو غیر زبانوں سے اردو میں کئے جاتے ہیں اور نہ ٹھوس اور بلند پایہ کتابیں اس کی کفیل ہوسکتی ہیں کیونکہ اردو کے ساتھ ابھی تک اردو داں طبقہ میں وہ دلچسپی نہیں ہے۔ جس قدر کہ ان کی مادری اور ملکی زبان کا حق ہے۔اس کے علاوہ اگر کوئی علم کا شوقین ایسی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہے گا تو بجائے ترجمہ کہ اصل کو دیکھنا زیادہ پسند کرے گا۔ یہ ہی وجہ ہے کہ اردو میں ایسی علمی کتابوں کی اشاعت بہت کم ہوتی ہے اور بڑی مشکل سے کسی کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی نوبت آتی ہے۔۔۔۔۔نہایت سلیس اردو میں ایسا دلچسپ بنائیں کہ اسکو عورتیں اور بچے پوری دلچسپی سے مطالعہ کر سکیں۔(۲۴۱)

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو کسی فرمانروا کے ذریعہ کئے گئے کاموں کا اثر اس کے ملک و عوام اور اس کے خاندان پر پڑنا ناگزیر ہے۔یوں نواب سلطان جہاں بیگم کے عہد میں اشاعت کا سلسلہ بہت تیزی سے چلا۔اور خود ان کی کئی کتب کو مختلف ریاستوں نے انعامات دیئے تھے۔نواب سلطان جہاں بیگم نے موضوعات کا انتخاب کر کے کئی کتب کا اپنے عہد کے مستند علماء و فضلاء سے ترجمہ کروایا اور لکھوائیں۔اور اس صلہ میں ان کو انعامات و معاوضہ دیا۔ریاست بھوپال اور بیرون ریاست کئی کتب کو امداد دے کر طبع کروایا۔نواب سلطان جہاں بیگم کی ادبی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

میمونہ سلطان معروف شاہ بانو بیگم صاحبہ:

نواب سلطان جہاں کے بعد شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والی خاتون میمونہ سلطان عرف شاہ بانو (بیگم نواب حمید اللہ خاں)شاہ بانو بیگم یعنی میمونہ سلطان کی تعلیم و تربیت سلطان جہاں بیگم کی زیر نگرانی مکمل ہوئی تھی اور تصنیف و تالیف کا شوق بھی انہی کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔چنانچہ انہوں نے شبلی (۱۸۵۷ء۔۱۹۱۴ء) کے رسالہ "بدءالاسلام" کا ترجمہ فارسی سے اردو میں کیا۔۱۹۱۱ء میں سفر یورپ و استنبول وغیرہ کے تمام سفری حالات "سیاحت سلطانی" کے نام سے بطور سفر نامہ نگار کے لکھے جس کا انگریزی میں ترجمہ کیا گیا۔انہوں نے بھی کچھ اور سفر نامے تحریر کیے اور "خلافت راشدہ" ،"ذکر مبارک"،اور "سلک موارید"(حصہ اول ،دوم ،سوم ،چہارم) جیسی تاریخی اور مذہبی کتابوں کے علاوہ بچوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر کے لیے لکھی گئیں کہانیاں "گل

ریحان "کے نام شائع ہو چکی ہیں۔ بھوپال علی گڑھ، حیدر آباد مدراس میں شامل نصاب رہیں اور کئی بار ہزاروں کی تعداد میں چھپیں۔

عبدالمتین متینؔ:

متینؔ نے شاعری اور نثر نگاری دونوں میں اپنی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔ ایک اونچے درجہ کے نثر نگار اور "اودھ "اخبار کے مشہور نامہ نگار تھے۔ ایک ترک کی مدد سے انہوں نے کئی ناول لکھے ہیں جو بعد ازاں مطبع "پیسہ اخبار لاہور" میں طبع ہوئیں۔ بقول ڈاکٹر سلیم حامد رضوی

> متین کی کچھ کتابیں طبع زاد ہیں اور کچھ ترکی ناولوں کے ترجمے جو ایک ترک دوست کی مدد سے کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ علمی کتابیں بھی ان کی تصنیف سے ہیں۔ ناولو ں میں "عشاق"، جذبات"، "جوش تمنا"، "حسن بے پردہ"، "ہجر"، "ہمایوں خاتون"، سلیم بانو"، مقبول ہوئیں۔ تراجم میں "تاریخ ایمن"، سلم الادب"، محبت کا فلسفہ"، ترکی زبان سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔ ناولوں کا انداز عبدالحلیم شررؔ سے ملتا ہے۔ زبان صاف سادہ اور نقطہ نظر مذہبی و اصلاحی ہے۔(۲۴۲)

قاضی ولی محمد:

قاضی محمد ولی کا شمار بھی اس عہد کے مشہور انشاء پردازوں میں ہوتا ہے۔ ۱۹۰۵ء میں بھوپال آئے اور نواب حمید اللہ خاں کے استاد مقرر ہوئے۔ وہ نواب سلطان جہاں بیگ کے پرائیوٹ سکریٹری رہے اور ان کے ساتھ ممالک غیر کا سفر بھی کیا اور کئی سفر نامے بھی لکھے۔ ان کے سفر ناموں میں "سفرنامہ اندلس"، "سفر نامے اقصائے عرب"، "سفرنامہ مصر" وغیرہ نے خاصی شہرت حاصل کی۔ انہوں نے سفر ناموں میں ناول کی سی دلکشی پیدا کر دی ہے۔ بقول ڈاکٹر سلیم حامد رضوی

> جس ملک کا حال لکھا ہے کہ اس کے سیاسی اور سماجی پس منظر کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ عبارت میں بلا کا زور اور طنطنہ ہے اور فصاحت و بلاغت نے اسے انشاء پردازی کا اچھا نمونہ بنا دیا ہے۔ جس سے جذبات کی آمیزش نے جابجا شعریت کا جامعہ پہنا دیا ہے۔(۲۴۳)

سید عبدالباقی سہسوانی:

سہسوانی کا ذکر پہلے شعراء کی ذیل میں کیا جا چکا ہے۔ یہ اعلی درجہ کے نثر نگار بھی تھے۔ تاریخی اور تحقیقی امور سے گہری دلچسپی رہی ہے اور انہی سے متعلق ان کی دو کتابیں "تاریخ رائسین"، "حیات العلماء" ہیں۔

مفتی انوار الحق: (ضیاء العلوم)

مفتی انوار الحق نواب سلطان جہاں بیگم اور نواب حمید اللہ خاں صاحب کے عہد میں مختلف عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ روشن خیال عالم تھے اور طویل عرصہ تک مستند رسائل میں تاریخی، علمی، سائنٹفک مضامین لکھتے رہے ہیں۔ مولوی عبدالحق (۱۸۷۰ء۔۱۹۶۱ء) اور مولانا ظفر علی خاں (۱۸۷۳ء۔۱۹۵۶ء) کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ مفتی صاحب بہت سی کتابوں کے مصنف و مولف ہیں۔ "دیوان غالب" کا نسخہ حمیدیہ ان کی یادگار ہے۔ ان کی کتاب 'حیات ابو البشر "ابتدائی نسل انسانی کے نسبت سائنسی تحقیق اور فلسفیانہ استدلال اور انکشافات کا مجموعہ ہے۔ "اثبات واجب الوجود" خدا تعالی کی وحدت کا عقلی اور سائنسی ثبوت پیش کیے ہیں۔ دیگر کتب میں "قوت خیال فی تہذیب الخصال"، رالف والڈ ٹرائن کی کتاب "کیرکٹر بلڈنگ" کا ترجمہ "تذکرۃ الحبیب" کے نام سے کیا۔

> ان کی مذہبی کتابوں میں نئے نظریات اور عقلیت کا بڑا عنصر شامل ہے۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے اسی وجہ سے انہیں "ضیاء العلوم" کا خطاب دیا تھا۔ (۲۴۴)

مولوی محمد مہدی:

مولوی محمد مہدی، فدا علی فارغ کے بیٹے تھے۔ تمام عمر اسسٹنٹ مہتمم دفتر تاریخ رہے ہیں۔ دفتر تاریخ سے جو کتابیں شائع ہوئیں ان میں اکثر مولوی صاحب ہی کی لکھی ہوئی تھیں۔ انتہائی کم گو انسان اور اعلی درجہ کے مورخ اور مقالہ نگار تھے۔ ان کے علمی مضامین اردو کے مشہور علمی پرچوں میں نکلتے رہے ہیں۔ بقول ڈاکٹر سلیم حامد رضوی

> ایک شاہکار مضمون "ارتقائے رشک غالب" رسالہ اردو اپریل ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا۔ جو غالبؔ کے کلام میں رشک کے عناصر پر پہلا مضمون تھا۔۔۔۔ مولوی صاحب ہندوستان کے پہلے آدمی تھے جنہوں نے "اسپرنٹو زبان" پر عبور حاصل کیا۔ اعلی درجہ کے ترجمہ کرنے والے بھی تھے۔ جس کے نمونے رسالہ "ظل السلطان بھوپال" میں کہانیوں کی

شکل میں نظر آتے ہیں۔تاریخ ہند بھی لکھ رہے تھے جس کو علاؤالدین خلجی تک سات سو صفحات تک لکھ بھی لیا تھا کہ موت نے رشتہ منقطع کر دیااور بعد میں گھر والوں نے اس نادر کتاب کا نام ونشان بھی مٹا دیا۔(۲۴۵)

مولوی محمد مہدی کی تصانیف میں "الحجاب فی القرآن"،"پردہ نسواں"،"رموز فطرت"،علم طبعیات"،طبعی جغرافیہ"،طبقات الارض"،"بصائر القرآن"،"قصص قرآنی"،"تاریخ بھوپال"،تذکرہ نذیر احمد"،"دین و ایمان' وغیرہ شامل ہیں۔

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری:

بجنوری صاحب نواب حمید اللہ خاں صاحب کے لٹریری سکریٹری ریاست کے تعلیمی مشیر اور حمیدیہ لائبریری کے سپرٹنڈنٹ تھے۔وہ شاعر بھی تھے ان کی اکثر نظمیں الناظر میں شائع ہوتی رہی ہیں۔لیکن وہ نظمیں ڈاکٹر صاحب کی شہرت کا سبب نہیں بنیں تھیں۔غالب کا وہ دیوان جو حمیدیہ لائبریری میں موجود ہے وہ بجنوری صاحب کی شہرت کا سبب بنا ہے۔اتفاقاً ڈاکٹر صاحب کی دور اندیش نظر اس نسخہ دیوان پر پڑی تو اسے لائبریری سے اپنے گھر لے گئے۔مطالعہ کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ غالب کا دیوان گم شدہ دیوان ہے جو مطبوعہ دیوان سے بہت مختلف ہے۔بجنوری نے اس کی اشاعت کی طرف توجہ مرکوز کی اور سب سے پہلے اس دیوان پر مفصل مقدمہ تحریر کیا تھا۔اس مقدمہ نے نئے طرز تنقید سے روشناس کروایااور غالب پرستی کی بنیاد ڈالی تھی۔۱۹۱۸ء میں انتقال فرما گئے بھوپال میں تدفین ہوئی۔ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کی ادبی حیثیت کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم حامد رضوی نے کچھ اہم شخصیات کے اقوال نقل کیے ہیں جو درج ذیل ہیں مثلاً مولوی عبدالحق کے بقول

ایسے جوہر قابل کا عین شباب میں اٹھ جانا دراصل ایک قومی سانحہ ہے۔انکا دل و دماغ بہت لطیف اور نازک تھا۔وہ ایک نازک پودا تھا جو سموم زمانہ کی تاب نہ لا سکا اور وقت سے پہلے اس دنیا سے منھ موڑ کر چلا گیا۔(۲۴۶)

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور لکھتے ہیں:

۳۶ برس گزر چکے۔عبدالرحمن بجنوری کی بے وقت وفات سے اردو دنیا اب تک سوگوار ہے۔وہ اپنی وفات کے وقت باغ اردو کے ایک گل نیم شگفتہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ان کی نظم

ونثر میں ادیبانہ کمال شاعرانہ اجتہاد، عقل کی بلندی، انسانیت کی غم گساریاں بھی پورے طور پر جلوہ گرنہ ہونے پائی تھیں۔(۲۴۷)

نواب حمید اللہ خاں صاحب اپنے زمانہ طالب علمی ڈاکٹر صاحب سے متاثر تھے۔لہذاان کی اس رفاقت کے سبب بجنوری صاحب کا تیار کردہ مقدمہ دیوان غالب نسخہ حمیدیہ کے نام سے شائع کروایا تھا۔بعد ازاں نسخہ حمیدیہ کی اشاعت کے تقریباً بیس سال کے محمد فاتح فرخ جو کہ بجنوری کے بیٹے تھے انہوں نے اپنے والد کی نظم ونثر کاایک مجموعہ "باقیات بجنوری" کے نام سے شائع کرایا تھا۔

قاضی حبیب الحسن رساؔ:

رساؔ پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے۔علم وادب سے گہری دلچسپی رہی ہے شاعری بھی کرتے تھے۔ان کاایک ناول "وصل حبیب" دو جلدوں میں ۱۹۱۰ء میں مفید عام پریس آگرہ سے شائع ہوا۔ناول کاانداز تقریباً وہی ہے جو مولاناعبدالحلیم شرر کا ہے۔صوفیانہ خیالات وجذبات سے ماوراجابجااشعاراور غزلوں سے مزین ہے۔

رشید احمد ارشد تھانویؔ:

بحیثیت شاعر، نثر نگار معروف تھے۔ان کے مضامین مختلف رسائل میں نکلتے رہے ہیں۔ان کی تصانیف میں "آسمانی خزانہ"،"جھوٹا شہزادہ"،اجتماع ضدین"،مسئلہ ازدواج"،"طواف زمین"،"لالہ صحرا" ،"فضائے شعری"وغیرہ۔ان کااسلوب سادگی وسلاست کاحامل ہوتا ہے۔

سید محمد یوسف قیصرؔ:

قیصرؔ شاعر،ادیب اور صحافی تھے۔کئی رسائل اور اخبارات میں کام کر چکے تھے۔مولانا شبلی ان کی بہت قدر کرتے تھے۔انہوں نے ہی قیصرؔ کو "مسلم گزٹ لکھنو" کے اسٹاف میں رکھوایا تھا۔بھوپال سے "مالوہ ریویو" جاری کیااور رسالہ "الناظر"اور اخبار "قیصر ہند" کے ایڈیٹر بھی رہے ہیں۔بعدازاں بھوپال "دفتر تاریخ" میں ملازم ہو گئے تھے۔ان کے ہم عصر ادیبوں میں محمد امین زبیری، مولوی محمد مہدی، محمد حسین محویؔ،ارشد تھانوی وغیرہ شامل ہیں۔نواب سلطان جہاں بیگم کی تصانیف میں بھی قیصرؔ کا عمل دخل زیادہ تھا۔جس کا اعتراف انہوں نے جابجا کیا ہے۔قیصرؔ کی اپنی تصانیف میں"القاہرہ"،"ٹھنڈی گولی"،"خانہ داری"،"تصویر خیال"وغیرہ شامل ہیں۔انہوں نے "رسالہ تمدن"،رموز سائنس"،"مخزن"جاری کیے تھے۔

سہاؔ مجددی:

سہاؔ اعلی پائے کے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ انشاء پرداز بھی تھے۔نثر میں ان کی تصنیف "مطالب الغالب" کے علاوہ کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے۔ سہاؔ کی نثر نگاری کے سلسلے میں ان کے خطوط کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔اس دور کے اہم رسائل میں ان کے علمی وادبی مضامین چھپا کرتے تھے۔

حکیم عبدالحمید:

حکیم عبدالحمید صاحب بھوپال کے مستند اور مشہور و معروف حکیم تھے۔طب اور مذہب پر انہوں نے بہت مفید کتابیں لکھی ہیں مثلا "مرج البحرین"،"تکمیل طب"،"کلیات طب"،"انگزیزی ادویہ کے خواص"،"کشتہ جات"،"مخصوص ادویہ طب"،"تذکرہ آخرت" شامل ہیں۔

مولوی افتخار عالم مارہروی:

مارہروی کا تعلق بلگرام سے تھا۔نواب سلطان جہاں بیگم کے عہد میں بھوپال میں آکر ملازم ہو گئے یہیں رہ کر انہوں نے کتاب "حیات النذیر" لکھی تھی۔اس کتاب کو انہوں نے نواب سلطان جہاں بیگم اور نواب حمیداللہ کے نام سے معنون کیا تھا۔اس کتاب کی قدر و قیمت کا اعتراف مولانا حالی اور شبلیؔ نے بھی کیا ہے۔اس کتاب کے علاوہ دیگر کتب میں 'مقصورات"،"تذکرہ خواتین"،"تاریخ محمڈن کالج علی گڑھ"،"درۃ التاج خسروی" شامل ہیں۔

شاہ اسدالرحمن قدسی نظامی:

قدسیؔ شاعر ہونے کے ساتھ اعلی درجے کے نثر نگار بھی تھے۔ان کی تصانیف لاہور، لکھنو اور دہلی سے شائع ہوئیں جن میں "الحبیب"،"ستروین نامہ"،"نامہ قدسی"،"اطمینان قلب"،"کشکول قلندری"،"الکلام"،"حفظ البحر" شامل ہیں۔

محمد حسین محویؔ صدیقی لکھنوی:

بھوپال میں محویؔ بطور نثر نگار بہت معروف تھے۔ہندوستان کے کئی رسائل کے ایڈیٹر بھی رہے ہیں۔ان کی ۱۵ مطبوعہ اور تقریباً ۳۰ کتابیں غیر مطبوعہ ہیں۔مطبوعہ کتابوں میں " واقعات ظفری"،"دیوان

اظفری"،"کلیات ابجدی"،"کلمات الشعرا"،دیوان بیدار"،"اسلامی تاریخ کی سچی کہانیاں"،"روحی افلاک"،"انسانی قربانیاں"،شاعر کا دل"،"درس عمل' وغیرہ شامل ہیں۔غیر مطبوعہ کتب میں "غزلیات کا دیوان"، "نظموں کا مجموعہ"،"افسانوں کا مجموعہ"،وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ محویؔ کا اسلوب سادہ، سلیس اور آسان ہے۔

محمود اعظم فہمیؔ:

فہمی نہ صرف بلند مرتبہ شاعر بلکہ اعلی پائے کے مصنف بھی تھے۔ان کی تصانیف میں"تاریخ ملل قدیمہ"،"سیاحت زمین"،"سیاحت ہوا"،مشرقی ترکستان' وغیرہ شامل ہیں۔علاوہ ازیں مختلف پرچوں میں ان کے مضامین بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔

مولوی عبدالرزاق البرامکہ:

مولوی عبدالرزاق کانپور کے رہنے والے تھے۔۱۹۱۴ء میں بھوپال میں آکر تحصیلدار ملازم ہوئے اور پھر نواب حمید اللہ خاں صاحب کی ڈیوڑھی میں منتقل کر دیئے گئے۔جہاں رہ کر انہوں نے تاریخ جلال آباد اور نواب احتشام الملک کے حالات زندگی لکھی علاوہ ازیں نواب سکندر جہاں کا تذکرہ کئی جلدوں میں لکھا۔ان کا شمار سر سید گروپ میں کیا جاتا ہے۔انہوں نے "یاد ایام"میں سر سید، شبلیؔ،اکبرؔ،امیر علیؔ،مہدی علی خاںؔ،ذکاءاللہؔ،آزادؔ،نذیر احمدؔ،حالیؔ،وقار الملکؔ،رحمت اللہ رعدؔ،عبدالحلیم شررؔ،وحیدالدین سلیمؔ،بہادر میر ناصرؔعلی، سر راس مسعود کا تذکرہ ذاتی مشاہدات و تجربات کی بنیاد پر لکھا تھا۔اس کتاب سے تمام تاریخی اور اہم شخصیات کی زندگی کے وہ تمام پہلو سامنے آئے جو پہلے پنہاں تھے۔بقول ڈاکٹر سلیم حامد رضوی

> اٹھارویں صدی کے خاتمے اور انیسویں صدی کے آغاز میں ادبی اور تاریخی حیثیت سے مولوی عبدالرزاق کانپوری نے جو خصوصی شہرت" البرامکہ "اور "نظام الملک نظام طوسی"لکھ کر حاصل کی ہے وہ غیر فانی ہے۔کتاب کی شہرت اتنی بڑھی کہ وہ خود"مولوی البرامکہ "کے نام سے پکارے جانے لگے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مولانا کی"البرامکہ "نہ صرف ہندوستان بلکہ یورپ تک مشہور ہے۔ایسٹرن مستشرق پروفیسر ڈیمبری نے اپنی کتاب "ویسٹرن کلچر ان ایسٹرن لینڈ"میں ہندوستان میں حسب ذیل نام پیش کئے(۱)انگریزی میں سید امیر علی(۲)اردو میں مولوی عبدالرزاق(۳)شبلی نعمانی پروفیسر علی گڑھ"(۲۴۸)

نیاز فتح پوری:

بطور شاعراور انشاپرداز نیاز فتح پوری(۱۸۸۴ء۔۱۹۶۶ء) بہت معروف شخصیت ہیں۔انہیں اپنے زمانے کا مستند انشاپرداز بنانے میں سرزمین بھوپال کا بہت اہم کردار ہے۔دفتر بھوپال نے ان کو مصنفین کی صف میں لا کھڑا کر دیا تھا۔نیاز فتح پوری کو اپنی معلومات مطالعہ اور تحقیق کے لئے ایک وسیع میدان مل گیا۔دفتر تاریخ میں ملازمت کے دوران انہوں نے درج ذیل کتب لکھیں جن میں "گہوارہ تمدن"،"صحابیات"،مصطفی کمال پاشا"،"تاریخ دولتینّ"،"تاریخ اسلام ابتدا سے حملہ تیمور تک"،"نگارستان"،"شہاب کی سرگزشت"وغیرہ شامل ہیں۔جب تک بھوپال میں رہے یہاں کے ادبی ماحول سے استفادہ کیاالبتہ مشاعروں میں بہت کم شرکت کرتے رہے ہیں۔مخصوص مشاعروں میں غزلیہ و نظمیہ کلام سنایا کرتے اور ان کے حلقہ احباب انہیں خاموش فتح پوری کہا کہتے تھے۔ان کی ادبی حیثیت کے حوالے سے ڈاکٹر نعمان لکھتے ہیں کہ

> وہ مستقبل میں جتنے بڑے نثر نگار اور نقاد بننے والے تھے ماضی میں اتنے بڑے شاعر بھی تھے۔(۲۴۹)

محمد امین زبیری مارہروی:

محمد امین زبیری مارہروی ۱۹۰۳ء میں بھوپال آئے تھے۔کچھ چند دفتر تعلیمات میں ملازمت اختیار کی بعدازاں ملازمت ترک کر کے وکالت کرنے لگے۔علی گڑھ سے خصوصی تعلق رکھتے تھے۔۱۹۰۷ء میں "مہتمم تاریخ"بنادیئے گئے تھے۔نواب سلطان جہاں بیگم ان کی بڑی قدر کرتی تھیں۔انہوں نے بے شمار کتب لکھیں جن کی تعداد ۲۴ کے قریب ہے۔ماہنامہ "رسالہ ظل السلطان" کے ایڈیٹر بھی رہے ہیں۔فہرست تصانیف میں "بیگمات بھوپال"،"عصر جدید"،"حیات سلطانی"،"تنکرہ وقار"،"تنکرہ محسن"،"مولانا حالی"، "مسلمانان ہند کی سیاست وطن"،"ذکر شبلی"،"نساء اسلام کی تعلیمی تاریخ"،"خطوط شبلی مع مقدمہ ڈاکٹر عبدالحق" وغیرہ شامل ہیں۔

حکیم محمد ابراہیم:

حکیم محمد ابراہیم کی شخصیت کے حوالے سے متضاد آراء پائی جاتی ہیں وہ یہ کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ خدا اور مذہب کے منکر تھے۔فلسفیانہ مزاج عقائد اور مذہب کا غلبہ عقل پر تسلیم نہیں کرتے تھے بلکہ مذہب کو عقل کی

روشنی میں پرکھتے تھے۔ان کی دو کتابیں ہیں ایک "الکلام فی اذانتم الادیان" جسمیں ابتدائی دور زمانہ میں انسانی معاشرت، ادیان وغیرہ پر بحث ہے۔دوسری کے بارے میں معلومات نہیں مل سکیں۔

سید محمد مرتضی:

سید محمد مرتضی بھوپال میں بحیثیت مجسٹریٹ ملازم تھے۔ بھوپال کے علمی وادبی ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے لہذا کئی کتابوں کے انگریزی سے اردو میں تراجم کیے ہیں۔مرتضی کی کتابیں جن میں ڈاکٹر اسمائلس کی کتاب "کیرکٹر" کا ترجمہ "تدبیر" کے نام سے اور "تھرفٹ" کا ترجمہ "کفایت شعاری" کے نام سے چھپا ہے۔

گوبند پرشاد آفتاب:

آفتاب کی پیدائش ۱۸۹۸ء کی ہے۔زمانہ طالب علمی ہی سے مضمون نگاری کی طرف متوجہ رہے لہذا شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اعلی درجہ کے مصنف اور مقالہ نگار، افسانہ و ناول نگار اور ڈرامہ نگار بھی تھے۔آفتاب کے مضامین "ہمدم'، "اخوت"، "الناظر"، "زمانہ "اور اودھ اخبار" میں چھپتے رہے ہیں۔ان کی مطبوعہ وغیر مطبوعہ کتب میں "آفتاب حکمت"، آفتاب فلسفہ"، "شہزادی ہند"، "نور آفتاب"، "شمسوس طبعیات"، "سلیم و سیتا" ، "چندر موہن"، طلسم آئینہ" شامل ہیں۔

علامہ میاں محمد خالد:

میاں محمد خالد جاگیر دار ہونے کے ساتھ ساتھ علوم و فنون میں بھی ماہر تھے۔ان کا شمار بھوپال کے بڑے بڑے علما میں کیا جاتا ہے۔سیرت النبی پر عبور حاصل تھا اور اسی وجہ سے سیرت النبی کے تمام جلسوں کی رونق آپ کی وجہ سے تھی۔ان کی ادبی حیثیت کے حوالے سے بقول ڈاکٹر سلیم حامد رضوی

> عالم دین ہونے کے ساتھ ہی بڑے زبردست خطیب اور مقرر بھی ہیں طرز تقریر صاف سادہ اور سلجھا ہوا تھا اور جابجا موقع بہ موقع لطیف مزاحیہ اسلوب سامعین میں ہلکی شگفتگی پیدا کر دیتا ہے۔اکثر لوگ ان کو علامہ سیرت کے معزز القاب سے یاد کرتے ہیں۔جب معلوم ہوتا ہے خالد میاں تقریر کریں گے تو ہزاروں آدمی مرد عورتیں، بوڑھے بچے جوان انتہائی ذوق شوق سے آپ کی جادو بیانی سننے کو جمع ہو جاتے ہیں۔(۲۵۰)

میاں محمد خالد کی تصانیف میں "سبیل تندرستی"،"حیات ابو طالب"،"اجتہاد"،"مجربات سلف"،"سرور عالم"،"سیرت امام شافعی"،"رسالہ قصاص"،"رسالہ عروس"،رسالہ نماز"وغیرہ شامل ہیں۔۱۹۶۲ء میں میاں محمد خالد انتقال کر گئے تھے۔

محمد اسمعیل ہاتف:

گزشتہ صفحات میں ہاتف کا بحیثیت شاعر ذکر کیا گیا لیکن ان کی بطور نثر نگار بہت زیادہ اہمیت ہے۔ہاتف کو مزاحیہ مضامین لکھنے میں مہارت حاصل تھی۔ان کے مضامین "ظریف الملک" کے فرضی نام سے مزاحیہ اخباروں میں چھپتے رہے ہیں۔ہاتف نے "الصالحات" کے عنوان سے ایک کتاب چند مشاہیر خواتین کے حوالے سے لکھی جس کی نواب سلطان جہاں بیگم کی جانب سے بڑی حوصلہ افزائی کی گئی اور انعام میں سو روپیہ دیا علاوہ ازیں سرکاری مطبع خانے سے چھپوا کر سو جلدیں بھی دی تھیں۔ان کی دیگر تصانیف میں "پتن کی تصویریں"،"کشمیر کی رانیاں" وغیرہ شامل ہیں۔

پی گھوشال ایم،اے:

پی گھوشال بنگال سے تعلق رکھتے تھے۔کلکتہ سے ایم اے کرنے کے بعد بھوپال چلے گئے اور وہاں حمیدیہ لائبریری کے سپرنٹنڈنٹ اور آثار قدیمہ کے اعلیٰ افسر مقرر ہوئے اور تمام زندگی یہیں بسر کی تھی۔پی گھوشال بنگالی اور انگریزی دونوں میں شاعری اور نثر لکھتے تھے لیکن وہ اردو میں بھی مہارت رکھتے تھے۔پی گھوشال کے مضامین ظل السلطان بھوپال اور نگار بھوپال میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

نواب حمید اللہ خاں صاحب:

نواب سلطان جہاں بیگم کے صاحبزادوں میں بھی علمی ذوق پیدا ہوا۔انہوں نے کئی کتب تصنیف و تالیف کیں،مرتبہ کتب میں 'سفرنامہ قسطنطنیہ' اور "خطبات سلطانی بھی شامل ہے۔جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

سفر نامہ قسطنطنیہ:

نواب سلطان جہاں بیگم کا سفر نامہ سفرنامہ قسطنطنیہ قاسم پریس حیدر آباد دکن سے طبع ہوا۔سن اشاعت کا اندراج نہیں کیا گیا ہے۔یہ کتاب چھوٹے سائز کے ۸۶ درمیانی صفحات پر مشتمل ہے۔اس کتاب کو نواب محمد

حمید اللہ خان صاحب نے ترتیب دیا ہے۔انہوں نے اس میں اپنے بحری سفر جو سکندریہ سے قسطنطنیہ تک کا تھا اس کے سفری حالات کو درج کیا ہے۔نواب سلطان جہاں کی اس کتاب میں ڈیڈیکیشن (انتساب) بھی کی گئی ہے۔اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ

> مین اپنے اس ناچیز سفر نامہ قسطنطنیہ کو ان جانباز شہداء اور مردان راہ خدا کے ناموں ءپر جنہوں نے اپنے ملک و قوم کی عزت رکھنے کی خاطر اپنی عزیز جانیں جنگ میں قربان کی ہیں اور اسوقت جن کے غم میں اخوت اسلامی کے باعث مسلمانان روئے زمین مغموم اور اندوہگین ہیں معنون کرتاہوں۔(۲۵۱)

اس کتاب کے سات باب ہیں۔پہلا باب اسکندریہ سے سمرنا تک بحری سفر، باب دوم شہر سمرنا کے حالات اور جزیرہ میٹیلین تک کا سفر، جزیرہ میٹیلین پر ایک اجمالی نظر اور قسطنطنیہ تک بحری سفر، باب سوم میں قسطنطنیہ کے حوالے سے، باب چہارم میں مساجد کا ذکر ہے جن میں مسجد بایزید، مسجد ایوب، مسجد شاہزادہ، مسجد احمدیہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔باب پنجم میں قدیم عمارات کا ذکر ہے۔باب ششم اور باب ہفتم میں بھی قدیم عمارات، محلات، وغیرہ کا ذکر موجود ہے۔

خطبات سلطانی:

نواب سلطان جہاں بیگم کی تقاریر کے سلسلے میں لکھی جانے والی اس کتاب میں ۳۳۹ صفحات ہیں۔مطبع مفید عام آگرہ سے محمد قادر علی خاں صوفی کے زیر اہتمام طبع ہوئی۔سن اشاعت درج نہیں۔نواب سلطان جہاں بیگم کی صدر نشینی ریاست بھوپال جولائی ۱۹۰۱ء کے بعد سے اوائل ۱۹۱۳ء تک مختلف مواقع پر کی گئیں تقاریر کا مجموعہ ہے۔اس کتاب کو ان کے چھوٹے بیٹے نواب محمد حمید اللہ خاں نے ترتیب دیا ہے۔اس مجموعہ میں نواب سلطان جہاں بیگم کے ذریعہ پیش کیا گیا روسائے ہند کی اعلی تعلیم کے متعلق پمفلٹ بھی شامل ہے۔اس کے ساتھ اس پر لوگوں کی رائے بھی درج کی گئی ہے۔کتاب کا دیباچہ نواب محمد حمید اللہ صاحب کا اپنا لکھا ہوا ہے۔ان تقاریر اور مجموعہ کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے نواب محمد حمید اللہ خاں دیباچہ میں لکھتے ہیں

> یہ مجموعہ حضور ممدوحہ کی اعلی قابلیت، عزم واستقلال، بیدار مغزی، تدبیر مملکت، ہمدردی قوم و ملک کا آئینہ ہے اور میرے علم میں ایک فرمانرواخاتون کے ارشادات عالی کا یہ پہلا مجموعہ ہے جو شائع ہوا ہے۔میں نہیں کہہ سکتا کہ باعتبار لٹریچر کے ان کی تقریروں اور مضمونوں کے کیا

> مرتبہ ہے۔ لیکن ان خیالات و الفاظ میں قلوب پر اثر ڈالنے اور مفید نتائج پیدا کرنے کی ایک خاص قدرت پائی جاتی ہے۔(۲۵۲)

نواب سلطان جہاں بیگم کی وہ تقریریں اور مضامین بھی اس کتاب میں شامل ہیں جو جن سے واضح معلوم ہوتا ہے کہ وہ حکومت برطانیہ کے ہر اس فعل کی احسان مند ہیں جو انہوں نے اہل ہندوستان و رعایا بھوپال کی فلاح و بہبود کے لیے انجام دیئے ہیں۔اس تقریری مجموعے کے مطالعے سے اس بات کا بخوبی احساس ہو جاتا ہے کہ نواب سلطان جہاں بیگم ملک کے نظم و نسق، ترقی و اصلاح کے لیے کس قدر کوشاں تھیں۔

> وہ دلچسپی اور توجہ ظاہر ہوتی ہے جو قوم کے اعلیٰ مسائل تعلیم و تمدن،اور معاشرتاور بالخصوص مسئلہ تعلیم نسواں کی جانب منعطف ہے اس قسم کی تقریریں قوم کے لئے بہترین اور قابل عمل ہدایات ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ممدوحہ کے دل میں اپنی قوم کا کیسا درد، اور اس کی ترقی کی کیسی آرزو،اور اپنے ملک و قوم کی عورتوں کی تعلیم واصلاح حالت کے متعلق کیسی اعلیٰ تمنا ہے ---پھر چند تقریریں ایسی بھی نظر آئیں گی جو صرف خواتین کے مجمع میں ارشاد فرمائی ہیں اور اس موقع پر وہ مثل ایک ایسی خاتون کے تقریر کرتی ہوئی نظر آتی ہیں جو فرائض منزلی اور خانہ داری کا مکمل نمونہ ہو،اور جس نے اولاد کی اخلاقی،روحانی،اور جسمانی تربیت کے اہم امور کو نہ صرف اچھی طرح مطالعہ کیا ہو، بلکہ اس پر عمل بھی کیا ہو---اپنی ہم جنسوں کو منجمد حالت سے حرکت کرتے ہوئے دیکھتی ہیں۔(۲۵۳)

نواب سلطان جہاں بیگم عورتوں کو کسی قوم میں مثل روح تصور کرتی تھیں۔اور کوئی قوم اس وقت تک ترقی کی راہ پر گامزن بھی نہیں ہوسکتی جب تک اس قوم کی عورتوں کو کامیاب بنانے کی کوشش نہ کی جائے۔ان موضوعات پر تقاریر کے علاوہ نواب سلطان جہاں بیگم کی وہ تقریریں جو کسی دعوت کے موقعہ پر کی گئی تھیں ان کے جواب میں کی گئی تقریریں بھی درج کی گئی ہیں۔ جس سے نواب سلطان جہاں بیگم کے متعلق دوسروں کے خیالات اور ان کے کام کے مفید ہونے کے بارے میں علم ہوتا ہے۔اور یہ بھی ان کہ ان کی اعلیٰ قابلیتوں کے بہترین و مفید ترین نتیجوں کے مداح و معترف ہیں۔ علاوہ ازیں اس کتاب میں نواب سلطان جہاں بیگم کی طرف سے صاحبزادہ محمد حمید اللہ خاں اور عوام کے نام لکھے گئے خط اور دو تین اشتہار بھی شامل اشاعت ہیں۔

جنرل محمد عبید اللہ خاں نے علامہ شبلی نعمانی کی کتاب "سیرت النبی" کا انگریزی ترجمہ کروانے کے کئے علامہ سے مشورہ کرنے کے بعد خواجہ کمال الدین کا انتخاب کیا تھا۔ تمام اخراجات کی کفالت کی مگر سیرت کی تکمیل سے پہلے تینوں شبلی نعمانی، خواجہ کمال الدین اور محمد عبید اللہ خاں کا انتقال ہو گیا اور ایک بڑا کام پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا۔ جنرل عبید نے بھوپال میں ایک پریس عبیدیہ کے نام سے قائم کیا تھا جو ان کے انتقال کے بعد جامعہ اسلامیہ نئی دہلی کو دے دیا گیا۔ نواب نصر اللہ خاں نے عبدالرزاق ملیح آبادی سے خاندان جلال آباد کی تاریخ لکھوائی اور وہ مکمل ہو گئی تھی۔ لیکن نواب نصر اللہ خاں کے انتقال کر جانے کی وجہ سے اسکی اشاعت وطباعت نہیں ہو سکی ہے۔

نواب سلطان جہاں بیگم کے تعلیمی خیالات ورجحانات:

نواب سلطان جہاں بیگم نے خواتین، مصنفین اور مولفین کی ہمیشہ حوصلہ افزائی فرمائی تھی۔ خواتین کے لیے مختلف اداروں سے دلچسپی اور ان کی امداد نواب سلطان جہاں بیگم کا مدعائے زندگی تھا۔ ان کی ملاقات مشہور خطاطی منشی محمد الدین دہلوی کی بیٹی فاطمہ کبری سے ہوئی۔ وہ پہلی خاتون خطاط تھیں، جنھوں نے قرآن پاک لکھا اور خوش نویسی میں کمال حاصل کیا تھا۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے حوصلہ افزائی کی خاطر اپنی جڑاؤ پہنچیاں ان کو پہنادیں اور تاحیات وظیفہ جاری کیا تھا۔ علم کے فروغ کے سلسلہ میں نواب سلطان جہاں بیگم نے کئی کتابوں کی اشاعت کے لئے مالی امداد دی اور کتابوں پر انعامات دیئے تھے۔ انہوں نے اکثر مصنفین کی مطبوعہ کتب کے کئی نسخے خرید کر مفت تقسیم کروائے۔ مولانا شبلی نعمانی کو "سیرۃ النبی" کے کل مصارف سے بے فکر کرنے والی نواب سلطان جہاں بیگم ہی تھیں۔ علامہ شبلی نعمانی ان کی فیاضی اور جوش وحوصلہ سے بہت متاثر ہوئے۔ سیرۃ النبی کی تکمیل کے بعد دوسرے کتب کی اشاعت کی دشواریوں کے پیش نظر تین ہزار روپیہ پریس مشین خریدنے کے لیے دارالمصنفین کو دیئے۔

نواب سلطان جہاں بیگم نے انجمن ترقی اردو کی سرپرستی کی۔ انہوں نے انجمن کو یک مشت چار ہزار روپیہ کی امداد اس کے ساتھ ہی ماہانہ امداد بھی جاری کی۔ مولوی عبدالحق جو اس وقت انجمن کے سیکرٹری تھے ان کی درخواست پر انجمن کی کتاب " ہمارا املک" میں ایک باب تعلیم نسواں کے متعلق تحریر کرنے کا وعدہ کیا۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے مولوی عبدالحق کو متوجہ کیا کہ نصاب میں شامل کرنے کے لیے سائنس کی کتب کا ترجمہ کروائیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے برطانیہ اور امریکہ سے چند رسائل بطور نمونہ منگوا کر مولوی عبدالحق کو بھجوائے۔ نواب سلطان جہاں بیگم کی تمام تصنیفات وتالیفات سرکاری مطابع سے طبع ہو کر ریاست، بیرون ریاست اور بین الاقوامی سطح پر مفت

تقسیم ہوتی تھیں۔اہل علم و فن ،اہل دانش اور ناقدین فن نے نواب سلطان جہاں بیگم کے کام کو سراہااور برملااس کا اظہار کیا۔اس عہد کے موقر جرائد ورسائل میں ان پر تبصرے شائع ہوئے۔ان کی کتب پر تبصرے کرنے والوں میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولوی عبدالماجد دریا آبادی، مولوی عبدالحق ، حسن نظامی اور مولوی عبدالسلام ندوی خاص ہیں۔ان حضرات نے اپنے اپنے اخبار ورسائل میں ان کو شائع کیا۔

نواب سلطان جہاں بیگم روزنامچہ لکھتی تھیں۔۱۹۱۵ء میں انہوں نے ریاست میں ادب اور صحافت کے فروغ کے لئے اپنی سرپرستی میں ۱۹۱۵ءماہنامہ "ظل السلطان" جاری کیا تھا۔ابتداء میں محمد امین زبیری اور محمد یوسف قیصر اس کے مدیر رہےاور ان کے بعد مولوی محمد مہدی مدیر رہے ہیں۔یہ رسالہ تین سال جاری رہ کر ۱۹۱۸ء میں بند ہو گیا۔اس رسالہ کے علاوہ بھوپال میں سرور جہاں اور انور جہاں نے ۱۹۲۴ء میں خواتین کے لیے "آفتاب نسواں" جاری کیا۔ یہ رسالہ تھوڑے عرصہ بعد بند ہو گیا۔نواب سلطان جہاں بیگم کے دور حکومت میں بھوپال سے کئی اخبار جاری ہوئے۔

نواب سلطان جہاں بیگم نے دفتر تاریخ کو وسعت دی۔اس میں تصنیف و تالیف کا کام ہوتا تھا۔اسی دفتر سے مصنفین اور مولفین کو امداد دی جاتی اور کتابوں کی طباعت بھی ہوتی تھی۔اصلاحی و قومی جذبات ابھارنے کے لئے احمد علی شوق قدوائی سے فرمائش کر کے حالی کی مسدس کے انداز میں "مسدس لیل و نہار" لکھوائی۔ان سے مسلم یونیورسٹی کی امداد کی غرض سے جنرل عبیداللہ خاں نے ایک مثنوی لکھوائی۔یہ دونوں طبع ہوئیں۔یتیموں کی مدد کے لیے احمد علی شوق قدوائی نے "در یتیم" لکھی۔شوقؔ کی مثنویات "ترانہ شوق"،"عالم خیال" نے ان کی شہرت کو چار چاند لگادیے ہیں۔پروفیسر عبادت بریلوی کے شوق قدوائی کے حوالے سے کہے گئے قول کو ڈاکٹر سلیم حامد رضوی نے اپنی کتاب میں کچھ اس طرح سے لکھاہے کہ

> شوق کا زمانہ قدیم و جدید کی آمیزش و آویزش کا دور تھا۔ایک طرف ناسخی رنگ کے علمبردار، بحرؔ، جلالؔ، منیرؔ، برقؔ،اور قلقؔ دنیائے سخن پر حکومت کر رہے تھے۔دوسری طرف انیسؔ و دبیرؔ جذبات نگاری اور منظر نگاری پر زور دے رہے تھے۔شوقؔ نے ابتداء قدیم رنگ سے کی لیکن جلد ہی جدید نظم کی طرف آ گئے۔ان کی شہرت دراصل غزل سے زیادہ نظموں اور مثنویات کی مرہون منت ہے۔مولانا ارشد تھانویؔ کے قول کے مطابق "مسدس لیل و نہار" نواب سلطان جہاں بیگم کی فرمائش پر لکھا تھا۔یہ مسدس حالیؔ کے انداز میں ہے۔جس میں اصلاحی و قومی جذبات کو ابھارنے کی سعی کی گئی ہے۔(۲۵۴)

نواب سلطان جہاں بیگم نے امہات المومنین کے حالات زندگی پر کتابیں تیار کئے جانے اور ان کی اشاعت و طباعت کا منصوبہ بنایا۔اس سلسلہ کی پہلی کتاب علامہ سید سلیمان ندوی(۱۸۸۴ء۔۱۹۵۳ء)کی "سیرت عائشہ" کو شائع کروایا۔"سیرت ام سلمہ" لکھنے پر انعام مقرر کیا۔مولوی محمد طلحہ ٹونکی نے کتاب لکھی اور انعام پایا۔مگر یہ کتاب طبع نہیں ہوئی۔فریمنگر س"مینو ل آف گارڈننگ"کا اردو ترجمہ" باغبانی "کے نام سے سید محمد مصطفی سے کروایا۔نواب سلطان جہاں بیگم نے سر جان مارشل ڈائریکٹر آثار قدیمہ سے سانچی پر مستند تاریخ لکھوائی اور "رہنمائے سانچی "کے نام سے طبع کروائی۔آر گیبین آف میڈسن کا اردو ترجمہ کروانے کے مصارف بھی سلطان جہاں بیگم دیتی تھیں۔مولوی محمد حسین محوی صدیقی سے نواب سلطان جہاں بیگم نے "ازواج الانبیاء"کی تاریخی کتاب تالیف کروائی۔یہ تینوں کتابیں طبع ہوئی۔

نواب سلطان جہاں بیگم تعلیم نسواں کی سب سے بڑی حمایتی تھیں اور خواتین کو اعلیٰ تعلیمی منازل طے کرتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھیں۔وہ اس چیز کے خلاف تھیں کہ مغربی طرز پر چلنے سے ترقی ممکن ہے کیونکہ مذہبی بنیادوں کی بنا پر معاملات زندگی کا رخ بدل جاتا ہے۔نواب سلطان جہاں بیگم مغربی تقلید پرستی اور غیر معتدل آزادی کے شدید بر خلاف رہی ہیں۔وہ ہر گز نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی ہم جنس ترقی کی دوڑ میں اپنی ترجیحات کو بھول جائیں۔وہ مردوں اور خواتین کے حقوق کو تسلیم کرتیں مگر ان کے حقوق و فرائض کو ایک سطح پر لانے کے حق میں نہیں تھیں۔نواب سلطان جہاں بیگم نے اللہ تعالیٰ کے متعین کردہ حد فاصل کے مطابق زندگی بسر کرنے کو ترجیح دی ہے محمد امین زبیر مارہروی اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ

> اس نکتہ کو شاید ان سے بہتر کوئی نہیں سمجھتا تھا کہ عورتوں کا اصلی فرض زندگی خانہ داری کا انجام دینا ہے اولاد کی تربیت و تعلیم ان فرائض کے اہم الامور ہیں۔پس وہ اگر عورتوں کو ان جاہلانہ زندگی سے نکال کر تعلیم و تہذیب کی سطح پر لانا چاہتی تھیں تو اس کا مقصد یہ تھا کہ بذریعہ تعلیم و تربیت کے عورت کو اس کے فرائض منزلی کے لئے زیادہ مستعد اور تیار بنایا جائے اور قدرت کا اس کی تخلیق سے جو مقصود حقیقی ہے وہ حاصل ہو۔(۲۵۵)

نواب سلطان جہاں بیگم عورتوں کو خود اعتماد بنانا چاہتی تھیں کیونکہ عورت اگر خود اعتماد ہو گی تو آئندہ آنے والی نسلوں میں وہ تمام خوبیاں پیدا ہو جائیں جو ایک کامیاب قوم میں ہونی چاہیے۔وہ بحیثیت مصلح اپنا قومی فریضہ سمجھتی تھیں۔نواب سلطان جہاں بیگم نے اصلاح رسوم پر بھی بہت توجہ صرف کی ہے۔وہ تمام ان رسومات کے خلاف

رہیں جو معاشرتی بگاڑ کا سبب بن رہی تھیں یا اسلامی تعلیمات کے منافی تھیں۔ ۱۹۱۰ء میں پرنسس آف ویلز کلب کے جلسہ میں ایک زبردست تقریر فرمائی تھی

> مجھے ایک عرصہ سے اس امر پر یقین ہے کہ اگر مسلمانوں کی تقریبات کی رسومات میں اصلاح ہو جائے تو ایک بڑی حد تک افلاس کی مصیبت دور ہو جائے گی اور ان گناہوں، بداخلاقیوں سے جو ان رسومات کا لازمی نتیجہ ہیں نجات ملے گی۔ میں نے جہاں تک غور کیا ہے ان فضول اور غیر شرعی مراسم کا میلان عورتوں میں بہت زیادہ ہے۔۔۔(۲۵۶)

نواب سلطان جہاں بیگم کی حتی المقدور کوشش رہی کہ وہ معاشرتی اصلاح میں بھرپور حصہ لیں بالخصوص طبقہ اناث کے لیے ان کی کوششیں بہت زیادہ ہیں۔ وہ ہندوستانی خواتین کو صف اول کی خواتین میں شمار کروانے کی خواہش مند تھیں اور اس مقصد کے حصول میں ہمیں وہ کامیاب بھی نظر آتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ سلطان جہاں بیگم، نواب، تزک سلطانی تاج الاقبال (حصہ اول) (بھوپال: مطبع سلطانی حمید اللہ)، ص ۳۷

۲۔ ایضاً۔ ص ۳۶

۳۔ ایضاً۔ ص ۳۹

۴۔ ایضاً۔ ص ۵

۵۔ ایضاً۔ ص ۴۴

۶۔ ایضاً۔ ص ۴۱

۷۔ ایضاً۔ ص ۴۲

۸۔ ایضاً۔ ص ۴۳

۹۔ ایضاً۔ ص ۴۸

۱۰۔ ایضاً، ص ۴۹

۱۱۔ ایضاً۔ ص ۵۰

۱۲۔ ایضاً۔ ص ۵۵

۱۳۔ ایضاً۔ ص ۴۶

۱۴۔ ایضاً۔ ص ۵۳

۱۵۔ ایضاً۔ ص ۵۴

۱۶۔ ایضاً۔ ص ۶۹

۱۷۔ محمد امین مارہروی، بیگمات بھوپال (بھوپال: مطبع سلطانی ریاست بھوپال ۱۹۱۸ء)، ص ۳

۱۸۔ ایضاً۔ ص ۸

۱۹۔ ایضاً۔ ص ۳

۲۰۔ ایضاً۔ ص ۱۰

۲۱۔ سلطان جہاں بیگم، نواب، تزک سلطانی تاج الاقبال (حصہ اول) (بھوپال: مطبع سلطانی حمید اللہ)، ص ۱۲۲

۲۲۔ ایضاً۔ ص ۱۱۱

۲۳۔ ایضاً۔ ص ۱۲۹

۲۴۔ ایضاً۔ ص ۱۲۸

۲۵۔ ایضاً۔ ص ۱۳۵

۲۶۔ ایضاً۔ ص ۱۷۴

۲۷۔ ایضاً۔ ص ۲۰۴

۲۷۔ ایضاً۔ ص ۱۳

۲۹۔ ایضاً۔ ص ۲۳۷

۳۰۔ ایضاً۔ ص ۲۳۹

۳۱۔ ایضاً۔ ص ۲۳۹

۳۲۔ محمد امین زبیری، مارہروی، حیات سلطانی (عزیزی پریس آگرہ: ۱۹۳۹ء)، ص ۱۵

۳۳۔ ایضاً۔ ص ۱۸

۳۴۔ عبدالغنی، بیگم۔ بیگمات بھوپال (کراچی: ایلیگنٹ پرنٹرز، ۱۴۰۵ھ)، ص ۴۶

۳۵۔ محمد امین مارہروی۔ بیگمات بھوپال (بھوپال: طبع سلطانی ریاست بھوپال۔ ۱۹۱۷ء)، ص ۳۷

۳۶۔ ایضاً۔ ص ۶

۳۷۔ ایضاً۔ ص ۳۶

۳۸۔ محمد امین زبیری مارہروی، حیات سلطانی (عزیزی پریس آگرہ: ۱۹۳۹ء)، ص ۴۰

۳۹۔ محمد امین مارہروی، بیگمات بھوپال (حصہ دوم) (بھوپال: مطبع سلطانی ریاست بھوپال۔ ۱۹۱۸ء)، ص ۱۰

۴۰۔ ایضاً۔ حصہ دوم۔ ص ۱۰

۴۱۔ اطہر صدیقی، نواب سلطان جہاں بیگم حیات و خدمات (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۱۳ء)، ص ۸

۴۲۔ محمد امین مارہروی، بیگمات بھوپال (بھوپال: مطبع سلطانی ریاست بھوپال، ۱۹۱۸ء)، ص ۱۷

۴۳۔ اطہر صدیقی، نواب سلطان جہاں بیگم حیات و خدمات (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۱۳ء)، ص ۸

۴۴۔ طیبہ بی، تاریخ فرمارو ایان بھوپال (بھوپال: بھوپال پریس، ۱۹۷۷ء)، ص ۱۴۴

۴۵۔ محمد امین زبیری مارہروی، حیات سلطانی (عزیزی پریس آگرہ: ۱۹۳۹ء)، ص ۵۳

۴۶۔ ایضاً۔ ص ۶۵

۴۷۔ اطہر صدیقی،نواب سلطان جہاں بیگم حیات و خدمات(نئی دہلی:قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،۲۰۱۳)،ص۴۴

۴۸۔ محمد امین مارہروی،بیگمات بھوپال(مطبع سلطانی ریاست بھوپال،۱۹۱۸ء)،ص۵۳

۴۹۔ ایضاً۔ص۵۵

۵۰۔ ایضاً۔ص۵۵

۵۱۔ رضیہ حامد،ڈاکٹر،نواب سلطان جہاں بیگم(بھوپال: باب العلم پبلیکیشنز،۲۰۱۱ء)،ص۱۴۵

۵۲۔ محمد امین زبیری مارہروی،حیات سلطانی(عزیزی پریس آگرہ:۱۹۳۹ء)،ص۱۷۵

۵۳۔ ایضاً۔ص۷۰

۵۴۔ نواب سلطان جہاں بیگم،سلک شہوار (مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ:۱۹۱۹ء)۔ص۳۷،۳۸

۵۵۔ ایضاً۔ص۱۴۶

۵۶۔ رضیہ حامد،ڈاکٹر،نواب سلطان جہاں بیگم(بھوپال: باب العلم پبلیکیشنز،۲۰۱۱)،ص۱۴۷

۵۷۔ ایضاً۔ص۱۴۷

۵۸۔ و،اصاحبہ،بیگمات بھوپال(لاہور:دارالاشاعت پنجاب،۱۹۳۲ء)۔ص۵۰

۵۹۔ محمد امین زبیری مارہروی،حیات سلطانی(عزیزی پریس آگرہ:۱۹۳۹)،ص۱۷

۶۰۔ و۔اصاحبہ،بیگمات بھوپال(لاہور:دارالاشاعت پنجاب،۱۹۳۲ء)،ص۵۶

۶۱۔ اطہر صدیقی،نواب سلطان جہاں بیگم حیات و خدمات(نئی دہلی:قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،۲۰۱۳)،ص۹۳

۶۲۔ نواب سلطان جہاں بیگم،اختر اقبال(بھوپال:مطبع مفید آگرہ پریس،۱۹۱۴ء)،ص۲۱

۶۳۔ ایضاً۔ص۵۳

۶۴۔ ایضاً۔ص۲۲

۶۵۔ نواب سلطان جہاں بیگم،سلک شہوار (مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ:۱۹۱۹ء)،ص۱۰۷

۶۶۔ و۔اصاحبہ،بیگمات بھوپال(لاہور:دارالاشاعت پنجاب۔۱۹۳۲ء)،ص۵۹

۶۷۔ محمد امین زبیری مارہروی،حیات سلطانی(عزیزی پریس آگرہ،۱۹۳۹)،ص۶۶

۶۸۔ اطہر صدیقی،نواب سلطان جہاں بیگم حیات و خدمات۔مضمون"نواب سلطان جہاں بیگم اور تعلیم نسواں"،محمد نعمان"(نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۲۰۱۳)،ص۹۵

۶۹۔ و۔اصاحبہ،بیگمات بھوپال(لاہور: دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۳۲ء)، ص ۶۲

۷۰۔ ایضاً۔ ص ۶۵

۷۱۔ ایضاً۔ ص ۶۹

۷۲۔ ایضاً۔ ص ۷۰

۷۳۔ نواب سلطان جہاں بیگم،تندرستی(لاہور: یونین سٹیم پریس، ۱۹۱۳ء)، ص ۵

۷۴۔ محمد امین زبیری مارہروی،حیات سلطانی(عزیزی پریس آگرہ، ۱۹۳۹ء)، ص ۷۹

۷۵۔ رضیہ حامد،ڈاکٹر،نواب سلطان جہاں بیگم(بھوپال: باب العلم پبلیکیشنز، ۲۰۱۱ء)، ص ۱۵۵

۷۶۔ نواب سلطان جہاں بیگم،سلک شہوار (مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ: ۱۹۱۹ء)، ص ۱۲۲

۷۷۔ ایضاً۔ ص ۱۲۵

۷۸۔ ایضاً۔ ص ۱۲۲

۷۹۔ نواب سلطان جہاں بیگم،اختر اقبال(بھوپال: مطبع مفید آگرہ پریس ۱۹۱۴ء)، ص ۲۶

۸۰۔ ایضاً۔ ص ۲۶

۸۱۔ ایضاً۔ ص ۴۰

۸۲۔ محمد امین زبیری مارہروی،حیات سلطانی(عزیزی پریس آگرہ: ۱۹۳۹ء)، ص ۹۲

۸۳۔ ایضاً۔ ص ۹۳

۸۴۔ ایضاً۔ ص ۹۳

۸۵۔ نواب سلطان جہاں بیگم،سلک شہوار (مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ: ۱۹۱۹ء)، ص ۱۱۸۔۱۱۹

۸۶۔ محمد امین زبیری مارہروی،حیات سلطانی(عزیزی پریس آگرہ: ۱۹۳۹)، ص ۱۷۶

۸۷۔ ایضاً۔ ص ۱۸۰

۸۸۔ ایضاً۔ ص ۱۸۶

۸۹۔ ایضاً۔ ص ۱۸۸

۹۰۔ ایضاً۔ ص ۱۹۰

۹۱۔ ایضاً۔ ص ۱۹۲

۹۲۔ رضیہ حامد،ڈاکٹر،نواب سلطان جہاں بیگم(بھوپال: باب العلم پبلیکیشنز بھوپال، ۲۰۱۱ء)، ص ۲۹۶

۹۳۔ اطہر صدیقی،نواب سلطان جہاں بیگم حیات و خدمات،مضمون"علی گڑھ اور بھوپال کے روابط"،شان محمد"(نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔۲۰۱۳)،ص ۲۰۴

۹۴۔ اطہر صدیقی۔نواب سلطان جہاں بیگم حیات و خدمات۔مضمون "علی گڑھ سلطان جہاں بیگم اور تعلیم نسواں "،رضیہ حامد"(نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،۲۰۱۳)،ص ۲۶

۹۵۔ محمد امین مارہروی،بیگمات بھوپال(حصہ دوم)(بھوپال: مطبع سلطانی ریاست بھوپال،۱۹۱۷ء)،ص ۵۲

۹۶۔ ایضاً۔ص ۴۹

۹۷۔ محمد امین زبیری مارہروی،حیات سلطانی(عزیزی پریس آگرہ:۱۹۳۹ء)،ص ۱۴۱

۹۸۔ ایضاً۔ص ۱۴۱

۹۹۔ ایضاً۔ص ۱۴۱

۱۰۰۔ ایضاً۔ص ۱۴۲

۱۰۱۔ ایضاً۔ص ۱۶۰

۱۰۲۔ ایضاً۔ص ۱۶۴

۱۰۳۔ نواب سلطان جہاں بیگم،سلک شہوار (مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ:۱۹۱۹ء)،ص ۴۸

۱۰۴۔ ایضاً۔ص ۱۵۶

۱۰۵۔ ایضاً۔ص ۱۵۷

۱۰۶۔ ایضاً۔ص ۱

۱۰۷۔ ایضاً۔ص ۱۵۷

۱۰۸۔ سلیم حامد رضوی،ڈاکٹر،اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ(بھوپال: باب العلم پبلیکیشنز۔۲۰۱۴ء)،ص ۳۹

۱۰۹۔ رضیہ حامد،ڈاکٹر،نواب سلطان جہاں بیگم(بھوپال: باب العلم پبلیکیشنز،۲۰۱۱ء)،ص ۲۶۳

۱۱۰۔ نواب سلطان جہاں بیگم،سبیل الجنان(بھوپال: مطبع سلطانی پریس۔۱۹۱۷ء)،ص ج

۱۱۱۔ نواب سلطان جہاں بیگم،سیرت مصطفی(بھوپال: مطبع سلطانی پریس۔۱۹۱۹ء)،ص ۵

۱۱۲۔ ایضاً۔ص ۵

۱۱۳۔ نواب سلطان جہاں بیگم،عفت المسلمات(بھوپال: مفید عام اسٹیم پریس،۱۹۱۸ء)،ص ۶

۱۱۴۔ ایضاً۔ص ۱۳۹

۱۱۵۔ ایضاً۔ ص ۱۰۳

۱۱۶۔ نواب سلطان جہاں بیگم، ہدیتہ الزوجین (بھوپال: مطبع سلطانی پریس، ۱۹۱۵ء)، ص ۲

۱۱۷۔ ایضاً۔ ص ۴، ۵

۱۱۸۔ رضیہ حامد، ڈاکٹر، نواب سلطان جہاں بیگم (بھوپال: باب العلم پبلیکیشنز۔ ۲۰۱۱ء)، ص ۲۱۹

۱۱۹۔ نواب سلطان جہاں بیگم، ہدیتہ الزوجین (بھوپال: مطبع سلطانی پریس۔ ۱۹۱۵ء)، ص ج

۱۲۰۔ ایضاً۔ ص ۲۳۶، ۲۳۷

۱۲۱۔ نواب سلطان جہاں بیگم، خانہ داری کا تیسرا حصہ معاشرت (بھوپال: مطبع سلطانی پریس۔ ۱۹۲۱ء)، ص الف

۱۲۲۔ ایضاً۔ ص ۴۴

۱۲۳۔ ایضاً۔ ص ۸۹، ۸۸

۱۲۴۔ نواب سلطان جہاں بیگم، باغ عجیب (حصہ دوم) (حمیدیہ آرٹ پریس، بھوپال، ۱۹۱۹ء)، ص ۳

۱۲۵۔ ایضاً۔ ص ب

۱۲۶۔ نواب سلطان جہاں بیگم، مہذب زندگی (بھوپال: مطبع سلطان پریس۔ س ن)، ص د

۱۲۷۔ ایضاً۔ ص ۱۲۲

۱۲۸۔ ایضاً۔ ص ۸۴

۱۲۹۔ نواب سلطان جہاں بیگم، تربیت الاطفال (بھوپال: مطبع دار الاقبال پریس۔ ۱۹۱۴ء)، ص ب

۱۳۰۔ ایضاً۔ ص ۱۳

۱۳۱۔ ایضاً۔ ص ۱۲۳

۱۳۲۔ نواب سلطان جہاں بیگم، مقصد ازدواج (بھوپال: مطبع سلطانی پریس، ۱۹۲۰ء)، ص ۶

۱۳۳۔ نواب سلطان جہاں بیگم، خانہ داری کا دوسرا حصہ حفظ صحت (بھوپال: حمید اللہ پریس، ۱۹۱۶ء)، ص ۲

۱۳۴۔ نواب سلطان جہاں بیگم، تندرستی (بھوپال: مطبع سلطانی پریس، ۱۹۱۶ء)، ص ۲

۱۳۵۔ ایضاً۔ ص ۶۔۸

۱۳۶۔ ایضاً۔ ص ۱

۱۳۷۔ نواب سلطان جہاں بیگم، ہدایات تیمارداری (بھوپال: مطبع دار الاقبال پریس۔ ۱۹۱۴ء)، ص ۵

۱۳۸۔ نواب سلطان جہاں بیگم، بچوں کی پرورش (بھوپال: مطبع مفید آگرہ پریس)، ص الف

۱۳۹۔ ایضاً۔ ص ۱۱۴۔۱۱۸

۱۴۰۔ ایضاً۔ ص۱۹۵

۱۴۱۔ ایضاً۔ ص د

۱۴۲۔ نواب سلطان جہاں بیگم،ہندوستانی گھروں میں تیمارداری(مطبع مفید عام آگرہ:۱۹۱۳ء)،ص۳

۱۴۳۔ ایضاً۔ ص۶۰۔۶۱

۱۴۴۔ نواب سلطان جہاں بیگم،فرائض باغبانی(شمسی پریس آگرہ:۱۹۲۳ء)،ص ا

۱۴۵۔ نواب سلطان جہاں بیگم،سلک شہوار(مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ:۱۹۱۹ء)،ص ا

۱۴۶۔ ایضاً۔ ص۵۲

۱۴۷۔ ایضاً۔ ص۱۸۰

۱۴۸۔ نواب سلطان جہاں بیگم،تزک سلطانی(تاج الاقبال)(بھوپال:مطبع سلطانی پریس)،ص۴

۱۴۹۔ ایضاً۔ ص۱۰

۱۵۰۔ ایضاً۔ ص۵۹

۱۵۱۔ ایضاً۔ ص۴۲۱

۱۵۲۔ نواب سلطان جہاں بیگم،گوہر اقبال(حصہ اول)(بھوپال:مطبع سلطانی پریس۔۱۹۱۳ء)،ص ج

۱۵۳۔ نواب سلطان جہاں بیگم،گوہر اقبال(حصہ اول)(بھوپال:طبع سلطانی پریس۔۱۹۱۳ء)،ص۴

۱۵۴۔ ایضاً۔ ص۲۵۴

۱۵۵۔ نواب سلطان جہاں بیگم،حیات قدسی(بھوپال:مطبع سلطانی پریس۔۱۹۱۷ء)،ص ب

۱۵۶۔ ایضاً۔ ص۱۱۹

۱۵۷۔ ایضاً۔ ص۲۰۱

۱۵۸۔ نواب سلطان جہاں بیگم،حیات شاہجہانی(مطبع مفید عام آگرہ:۱۹۱۴ء)،ص ا

۱۵۹۔ ایضاً۔ ص۳۹

۱۶۰۔ ایضاً۔ ص۱۵۲

۱۶۱۔ نواب سلطان جہاں بیگم،آئین سکندری(شمسی پریس آگرہ:۱۹۳۰ء)،ص۲

۱۶۲۔ ایضاً۔ ص ب

۱۶۳۔ نواب سلطان جہاں بیگم،تذکرہ باقی(مطبع سلطان دارالاقبال بھوپال:۱۹۱۵ء)،ص ب

۱۶۴۔ ایضاً۔ ص۵۱

۱۶۵۔ ایضاً۔ ص۸۲

۱۶۶۔ نواب سلطان جہاں بیگم، روضتہ الروياحين کشور حجاز (بھوپال: مطبع سلطان باہتمام مولوی حمید اللہ، ۱۹۰۳ء)، ص۸۵

۱۶۷۔ ایضاً۔ ص۹۲۔۹۳

۱۶۸۔ رضیہ حامد، ڈاکٹر، نواب سلطان جہاں بیگم (باب العلم پبلیکیشنز، بھوپال: ۲۰۱۱ء)، ص۲۲۸

۱۶۹۔ ایضاً۔ ص۲۲۸

۱۷۰۔ ایضاً۔ ص۲۳۳

۱۷۱۔ نواب سلطان جہاں بیگم، ہدایات سلطانی (مطبع سلطانی ریاست بھوپال: ۱۹۱۳ء)، ص۸

۱۷۲۔ سلیم حامد رضوی، ڈاکٹر، اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ (باب العلم پبلیکشنز، بھوپال: ۲۰۱۴ء)، ص۳۰۳

۱۷۳۔ ایضاً۔ ص۳۰۴

۱۷۴۔ ایضاً۔ ص۳۰۴

۱۷۵۔ ایضاً۔ ص۳۰۵

۱۷۶۔ ایضاً۔ ص۳۰۶

۱۷۷۔ ایضاً۔ ص۳۰۷

۱۷۸۔ ایضاً۔ ص۳۰۸

۱۷۹۔ ایضاً۔ ص۳۰۹۔۳۱۰

۱۸۰۔ ایضاً۔ ص۳۱۰

۱۸۱۔ ایضاً۔ ص۳۱۲

۱۸۲۔ ایضاً۔ ص۳۱۳

۱۸۳۔ ایضاً۔ ص۳۱۴

۱۸۴۔ ایضاً۔ ص۳۱۴

۱۸۵۔ ایضاً۔ ص۳۱۵

۱۸۶۔ ایضاً۔ ص۳۱۶

۱۸۷۔ ایضاً۔ ص۳۱۷

۱۸۸۔ ایضاً۔ ص۳۱۸

۱۸۹۔ ایضاً۔ ص۳۱۸

۱۹۰۔ ایضاً۔ ص۳۱۹

۱۹۱۔ ایضاً۔ ص۳۱۹

۱۹۲۔ ایضاً۔ ص۳۲۰

۱۹۳۔ ایضاً۔ ص۳۲۱

۱۹۴۔ ایضاً۔ ص۳۲۲

۱۹۵۔ ایضاً۔ ص۳۲۴

۱۹۶۔ ایضاً۔ ص۳۲۴

۱۹۷۔ ایضاً۔ ص۳۲۵

۱۹۸۔ ایضاً۔ ص۳۲۶

۱۹۹۔ ایضاً۔ ص۳۲۷

۲۰۰۔ ایضاً۔ ص۳۲۸

۲۰۱۔ ایضاً۔ ص۳۳۰

۲۰۲۔ ایضاً۔ ص۳۳۱

۲۰۳۔ ایضاً۔ ص۳۳۱

۲۰۴۔ ایضاً۔ ص۳۳۲

۲۰۵۔ ایضاً۔ ص۳۳۳

۲۰۶۔ ایضاً۔ ص۳۳۳

۲۰۷۔ ایضاً۔ ص۳۳۵

۲۰۸ ایضاً۔ ص۳۳۶

۲۰۹۔ ایضاً۔ ص۳۳۶

۲۱۰۔ ایضاً۔ ص۳۴۰۔۳۴۱

۲۱۱۔ ایضاً۔ ص۳۴۲

۲۱۲۔ ایضاً۔ ص۳۴۰

۲۱۳۔ ایضاً۔ ص۳۳۷،۳۳۶

۲۱۴۔ ایضاً۔ ص ۳۵۱

۲۱۵۔ ایضاً۔ ص ۳۵۷

۲۱۶۔ ایضاً۔ ص ۳۵۸

۲۱۷۔ ایضاً۔ ص ۳۶۰

۲۱۸۔ ایضاً۔ ص ۳۶۱،۳۶۲

۲۱۹۔ ایضاً۔ ص ۳۶۳

۲۲۰۔ ایضاً۔ ص ۳۶۳

۲۲۱۔ ایضاً۔ ص ۲۶۵

۲۲۲۔ ایضاً۔ ص ۳۶۶

۲۲۳۔ ایضاً۔ ص ۳۶۷

۲۲۴۔ ایضاً۔ ص ۳۶۷

۲۲۵۔ ایضاً۔ ص ۳۸۱۔۳۸۲

۲۲۶۔ ایضاً۔ ص ۳۷۲

۲۲۷۔ ایضاً۔ ص ۳۷۳

۲۲۸۔ ایضاً۔ ص ۳۷۴

۲۲۹۔ ایضاً۔ ص ۳۷۵

۲۳۰۔ ایضاً۔ ص ۳۷۵

۲۳۱۔ ایضاً۔ ص ۲۷۶

۲۳۲۔ ایضاً۔ ص ۳۷۶

۲۳۳۔ ایضاً۔ ص ۳۷۸

۲۳۴۔ ایضاً۔ ص ۳۷۹

۲۳۵۔ ایضاً۔ ص ۳۸۰

۲۳۶۔ ایضاً۔ ص ۳۸۱

۲۳۷۔ ایضاً۔ ص ۳۸۲

۲۳۸۔ محمد امین زبیری مارہروی، حیات سلطانی (عزیزی پریس آگرہ: ۱۹۳۹ء)، ص ۳۱۰

۲۳۹۔ محمد امین مارہروی۔بیگمات بھوپال(حصہ دوم) (بھوپال: مطبع سلطانی ریاست بھوپال۔۱۹۱۸ء)،ص ۱۱۹

۲۴۰۔ محمد امین زبیری،بھوپال کا علمی جائزہ،مطبوعہ رسالہ اردو(کراچی۔جنوری ۱۹۵۸ء)،ص ۱۴۷تا۱۴۵

۲۴۱۔ سلیم حامد رضوی،ڈاکٹر،اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ(بھوپال: باب العلم پبلیکشنز ۔۲۰۱۴ء)،ص ۳۹۸

۲۴۲۔ ایضاً۔ص ۳۹۸

۲۴۳۔ ایضاً۔ص ۳۹۹

۲۴۴۔ ایضاً۔ص ۳۹۹

۲۴۵۔ ایضاً۔ص ۴۰۰

۲۴۶۔ ایضاً۔ص ۴۰۱

۲۴۷۔ ایضاً۔ص ۴۰۲

۲۴۸۔ ایضاً۔ص ۴۱۰

۲۴۹۔ محمد نعمان خاں،ڈاکٹر،بھوپال میں اردو انضمام کے بعد(۱۹۴۹تا۱۹۸۵)(دہلی:ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس،۲۰۰۶)،ص ۲۸۸

۲۵۰۔ ایضاً۔ص ۴۱۳

۲۵۱۔ نواب حمید اللہ خاں،سفر قسطنطنیہ(قاسم پریس حیدرآباد دکن،س ن)ص ۲

۲۵۲۔ نواب حمید اللہ خاں،خطبات سلطانی(مطبع مفید عام آگرہ:۱۹۱۳ء)،ص ۵

۲۵۳۔ ایضاً۔ص ۳

۲۵۴۔ سلیم حامد رضوی،ڈاکٹر۔اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ(بھوپال: باب العلم پبلیکشنز ۔۲۰۱۴ء)،ص ۳۸۷

۲۵۵۔ محمد امین زبیری مارہروی۔حیات سلطانی(عزیزی پریس آگرہ:۱۹۳۹ء)،ص ۲۰۰

۲۵۶۔ سلطان جہاں بیگم،نواب۔سلک شہوار (مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ:۱۹۱۹ء)،ص ۱۲۲

باب پنجم

باب پنجم

بیگمات بھوپال کی علمی وادبی خدمات کے نتیجے میں بھوپال میں علمی وادبی ترقی: تجزیاتی مطالعہ

کسی بھی معاشرے کی فلاح و بہبود اور علم وادب کی ترقی میں حکمرانوں کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ بیگمات بھوپال کے علمی وادبی کارناموں کی بدولت ریاست بھوپال میں نہ صرف علمی وادبی ترقی ہوئی بلکہ سرزمین ہندوستان میں موجود دیگر ریاستوں پر بھی خاطر خواہ اثرات مرتب ہوئے۔ ان بیگمات نے وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق بھوپال کی عوام کو ترقی یافتہ اقوام کے مدمقابل کھڑا کرنے کے لئے بے پناہ کوششیں کیں۔ نوآبادیاتی ہندوستان کی سیاسی و سماجی افراتفری، بدنظمی اور منتشر صورت حال کے سبب دانشوروں، عالموں، ادیبوں نے ریاست بھوپال کی جانب رخ کیا۔ یہ وہی دور ہے جب ریاست بھوپال کی علمی و ادبی فضا کی بدولت گھر گھر میں علم و فضل کی شمعیں روشن تھیں۔ بھوپال میں ادب کا آغاز شاعری سے ہوا اور محمد نعمان اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''قاضی محمد صالح (مثنوی اخلاق حسنہ ۱۷۰۷ء) پہلے شاعر تسلیم کیے گئے اور پہلا صاحب دیوان شاعر ہونے کا شرف، بھوپال کے آٹھویں فرمانروا نواب جہانگیر محمد خاں دولہ (دو مطبوعہ دواین، دیوان دولہ، دویوان جہانگیری) کو حاصل ہوا''(۱)۔ بیگمات بھوپال کے عہد حکومت کے تناظر میں اگر ان کی علمی وادبی خدمات اور ان کے نتیجے میں بھوپال میں ہونے والی علمی وادبی ترقی کا تجزیہ کیا جائے تو اس کی ابتداء ہم نواب قدسیہ گوہر بیگم کے عہد حکومت ۱۸۳۷ء سے کریں گے۔ نواب گوہر قدسیہ بیگم دینی ودنیاوی علم و فن اور امور سلطنت میں ماہر خاتون تھیں۔ ان کے عہد میں بھوپال نے ریلوے لائن، واٹرورکس کا نظام، مسجدوں کی تعمیرات، زرعی نظام کے حوالے سے غیر معمولی ترقی کی تھی۔ نواب گوہر قدسیہ بیگم نے بھوپال میں دینی و علمی خدمات سرانجام دیں۔ انہوں نے نئی نسل کی بہترین تعلیم و تربیت اور معاشرے کا فعال رکن ثابت کرنے کے لیے سکولوں اور مدارس کا اجرا کیا۔ نواب گوہر قدسیہ بیگم کی ادبی خدمات کے تناظر میں ڈاکٹر سلیم حامد رضوی لکھتے ہیں کہ

> نواب گوہر قدسیہ بیگم کے عہد میں تو شعرائے اردو اور مصنفین جن کو باہر سے بلا کر سرکاری سرپرستی میں لیا گیا، بہت بڑی تعداد میں مل جاتے ہیں۔ ان میں شاہ روف احمد رافت رامپوری، عبدالواحد مسکین، بدیع الدین خورد، عبدالقادر عثمانی بہت نمایاں ہیں۔''(۲)

مذکورہ بالا اقتباس کے تناظر میں اگر دیکھا جائے تو شعرا کی آمد سے بھوپال میں شعری ماحول استوار ہوا۔ نواب گوہر قدسیہ بیگم کے بعد ۱۸۴۴ء میں نواب شاہجہاں بیگم کی کم سنی کے سبب سرپرست کی حیثیت سے نواب سکندر جہاں بیگم نے حکومت کی باگ دوڑ سنبھال لی تھی۔ نواب سکندر جہاں بیگم کو اردو زبان وادب سے زیادہ دلچسپی کی بناء پر انہوں نے اردو زبان کے فروغ کے لئے مشاہیر کی تصانیف کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کروایا تھا۔ اردو زبان و ادب کو ان کو باقاعدہ طور پر پہلی مرتبہ ان کے عہد حکومت میں فروغ حاصل ہو ریاست کے قوانین کو اردو میں مرتب کروانے کے علاوہ نواب سکندر جہاں بیگم کا سب سے بڑا کارنامہ ۱۸۵۹ء میں فارسی کی جگہ اردو کو عدالتی اور سرکاری زبان قرار دینا تھا۔ اس ضمن میں نواب سکندر جہاں بیگم نے سختی سے حکم صادر کیا کہ اردو زبان میں تمام سرکاری احکامات و ہدایات دی جائیں۔ اردو زبان کی اہمیت، اسلوب بیان کے حوالے سے سلطان جہاں بیگم ''حیات سکندری'' میں لکھتی ہیں کہ

> نواب سلطان جہاں بیگم نے حکم دیا کہ عبارت کے متعلق سختی سے ہدایات جاری کر دی جائیں کہ مغلق نہ لکھی جائے۔ لغات زیادہ نہ ہوں۔ مرادف اور شاعرانہ الفاظ اور فقرات سے احتراز رہے۔ عبارت سلیس و مختصر اور بے کم وکاست ہو۔ (۳)

شعرا و ادبا کی حتی المقدور مالی مدد امداد بھی کیا کرتیں تھیں۔ نواب سکندر جہاں بیگم جب شمالی ہند کی جانب سفر پر روانہ ہوئیں تو دہلی اور لکھنو کے ادیبوں کو بھوپال آنے کی دعوتیں دیں جن میں سر فہرست مرزا غالب تھے۔ مرزا غالب نواب سکندر جہاں بیگم کی دعوت کے باوجود دہلی چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوئے تھے۔ نواب سکندر جہاں بیگم اس کے باوجود ریاست بھوپال کی جانب سے مرزا غالب کے لئے وظائف بھجوانے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں برتتی تھیں۔ اسی حسن سلوک کا نتیجہ تھا کہ غالب نے اپنے قلم سے تصحیح کر کے اپنے کلام کا اصل نسخہ نواب سکندر جہاں بیگم کی نذر کیا تھا۔ بعد ازاں وہی قلمی نسخہ "نسخہ حمیدیہ" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ علاوہ ازیں وہاں ان کی ملاقات سر سید اور رجب علی بیگ سرور کے ساتھ ہوئی۔ نواب سکندر جہاں بیگم کے عہد میں بھوپال کے ادب پر دہلویت کے اثرات نمایاں ہیں۔ اس دور کی ادب صورتحال کے متعلق ڈاکٹر سلیم حامد رضوی لکھتے ہیں

> فرماں رواؤں کی سرپرستی کی بدولت قصیدہ کی طرف بھی خصوصی توجہ کی گئی۔ اعلی اور معیاری مثنویاں بھی لکھی گئیں۔ غزل میں دہلوی متانت، سنجیدگی، پاکیزگی اور جذبات کے وفور کے ساتھ ساتھ آتش و ناسخ کا فنکارانہ شاعری کی تقلید کا رجحان بھی ملتا ہے۔ لیکن بیگمات کی فرمانروائی کے اثرات کی بدولت یہاں کی غزل میں ابتذال و عریانی کا رنگ مطلق نہیں پیدا ہو

سکا تھا۔ اس دور میں استادی و شاگردی کا سلسلہ بھی عام ہو گیا تھا اور مشاعرے بھی بکثرت
ہونے لگے تھے۔"(۴)

نواب سکندر جہاں بیگم کے دور کے شعرا زیادہ تر دہلی سے تعلق رکھتے تھے۔ان شعرا میں امجد علی اشہری، مولانا عباس رفعت شیر وانی، مولوی جمال الدین گمنام، منشی احمد یار خاں، قدرت اللہ بنارسی، جگل کشور سیر اب، امداد علی امداد، اصغر حسین اخگر، عبدالاحمید عاجز قابل ذکر نام ہیں۔ نواب سکندر جہاں بیگم نے شیخ احمد داغستانی سے قرآن پاک کا ترجمہ ترکی زبان میں کروایا۔ شاہ عبدالعزیز کے انتقال کے بعد ان کی تفسیر "فتح العزیز "کو مکمل کرنے کی خاطر پانچ سو روپے ماہوار پر مولوی حیدر علی مناظر لکھنوی کو مقرر کیا۔اس تفسیر کی چار جلدیں ندوۃ العلما میں محفوظ ہیں۔ نواب سکندر جہاں بیگم خود بھی مصنفہ تھیں۔ تصنیف وتالیف کے ذوق کی وجہ سے کئی کتابیں اردو میں تحریر کیں تھیں۔ ان کی کتابوں میں *"تاریخ سکندری، آئین سکندری، سفر حجاز، تاج الاقبال"* وغیرہ شامل ہیں۔ شہریار خاں کتاب (The Begums Of Bhopal)"دی بیگمز آف بھوپال "میں نواب سکندر جہاں بیگم کے عہد حکومت کے متعلق لکھتے ہیں کہ

> Sikandar Begum's golden rule saw Bhopal prominently placed on the map of India....if there had been any doubts about a Muslim Women's capacity to rule a state, they had first been set at rest by Qudsia's regency and emphatically answered in the affirmative by Skindar's golden reign. Begums had paved the way for succeeding Begums to govern without hindrance or stigma attached to Women's Rule.(5)

نواب سکندر جہاں بیگم کی بھوپال میں علمی و ادبی خدمات کے تناظر میں بات واضح ہو جاتی ہے کہ در حقیقت سکولوں کا اجرا اور انتظام انہی کے عہد یعنی ۱۸۴۸ء سے شروع ہوتا ہے۔انہوں نے ہندی، فارسی اور اردو کے مدارس کھولے۔ لڑکوں کے لئے بعض مقامات پر مدرسے کھولے جا چکے تھے لیکن لڑکیوں کے لئے مدارس نہیں بنائے گئے کیونکہ اس دور میں جب لڑکیوں کی تعلیم پر کوئی مناسب توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ایسے وقت میں نواب سکندر جہاں بیگم کا لڑکیوں اور لڑکوں دونوں کے لئے مدرسے کا قیام دراصل ایک زبردست مثال تھی کہ ایک فرمانروا کو کیسے اپنی رعایا کے مردوں اور عورتوں کی تعلیم پر یکساں توجہ صرف کرنی چاہیے۔ نواب سکندر جہاں بیگم نے نہ صرف مدرسے قائم کیے بلکہ ان مدرسوں کے کامیاب طلبہ و طالبات کو کامیابی پر تحفے تحائف بھی دیئے جاتے جس سے ان کی حوصلہ افزائی ہوتی اور مزید پڑھنے کی لگن پیدا ہوتی تھی۔ یتیم ولاوارث اور غریب بچیوں کے لئے کوئین وکٹوریہ کے نام سے وکٹوریہ اسکول قائم کیا جہاں پڑھائی کے علاوہ دستکاری کی طرف بھی توجہ دی جاتی تھی۔اس مدرسہ میں تیار اشیاء فروخت کی جاتیں اور پھر اس آمدنی کا نصف حصہ حوصلہ افزائی کی خاطر طالبات میں تقسیم کر دیا جاتا اور نصف کو مدرسہ کے انتظام و انصرام کے لئے مدرسہ کے خزانے میں جمع کر لیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں اس سکول کی لڑکیوں کی ہاتھ سے تیار چیزوں کو نواب سکندر جہاں بیگم یورپین خواتین کو بطور تحفہ پیش کرتی تھیں۔یوں نواب سکندر جہاں بیگم کے عہد میں ہمیں نہ صرف باقاعدہ طور پر مدرسوں کا نظام بنا کسی صنفی تخصیص کے نظر آتا ہے بلکہ تعلیمی معیار میں مثبت تبدیلیاں دکھائی دیتی ہیں۔ نواب سکندر جہاں بیگم کی علمی و ادبی خدمات کے حوالے عارف عزیز لکھتے ہیں کہ

> سکندر جہاں بیگم نے بھوپال میں دفتر تاریخ کے ساتھ ۱۸۵۱ء میں ''مطبع سکندری'' کے نام سے ایک بڑا چھاپہ خانہ قائم کیا۔ دفتر تاریخ در حقیقت علم و ادب کی اکیڈمی کی ابتداء تھی۔ جس نے مستقبل میں کئی کارہائے نمایاں انجام دیئے،اس دور میں بھوپال نے تہذیبی و ثقافتی لحاظ سے بھی اتنی ترقی کر لی تھی کہ اس پر دہلی اور لکھنو کا گمان ہونے لگا تھا۔۔۔۔۔۔(۶)

نواب سکندر جہاں بیگم نظام تعلیم کی بہتری کے لئے فرصت کے اوقات میں بذات خود سکولوں کا جائزہ لیتی تھیں۔ طلبہ و طالبات میں تعلیمی سلسلے میں باقاعدگی پیدا کرنے کی خاطر حاضری پر خصوصی توجہ صرف کرتی تھیں لہذا طلبہ و طالبات کی حاضری کے رجسٹرڈ ماہانہ بنیادوں پر نواب سکندر جہاں بیگم کے سامنے پیش کیے جاتے تھے۔ اساتذہ و طالب علموں کی حوصلہ افزائی کی خاطر مالی معاونت کی جاتی تھی تاکہ وہ مزید دل لگا کر محنت سے کام کریں۔ نواب سکندر جہاں

بیگم نے بھوپال کے ضلع ساگر کے قریب مدرسہ ساگر قائم کیااور وہاں کے کامیاب طلبہ کو ۵۰۰روپے انعام واکرام سے نوازا۔ مدرسہ سہیور کی عمارت چھوٹے ہونے کے سبب تعلیمی سلسلے میں دشواری پیدا کر رہی تھی لہذا اس کو وسعت دینے کی خاطر ۱۸۵۰ء میں از سر نو عمد تعمیر کروائی۔ ڈاکٹر رضیہ حامد ان کی تعلیمی سرگرمیوں کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ

> سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کے متعلق جب علم ہوا کہ یہ سوسائٹی قوم و ملک کو فائدہ پہنچانے، ان کی بھلائی اور تعلیم کے فروغ کے لئے کام کر رہی ہے بہت پسند کیا۔ اپنی خوشنودی مزاج کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے سرسید کو ایک بیش قیمت ہیرے کی انگوٹھی تحفہ میں بھیجی۔(۷)

مندرجہ بالا اقتباس کے تناظر میں دیکھا جائے تو سائنٹفک سوسائٹی کے قیام میں نواب شاہجہاں بیگم کا بہت اہم کردار تھا اور اس سبب انہیں اس سوسائٹی کا سرپرست مقرر کیا گیا۔ علاوہ ازیں سکول کے بچوں کی شادیوں کی ذمہ داری بھی نواب سکندر جہاں بیگم خود سرانجام دیتی، شادی کے تمام اخراجات ریاست کے سپرد ہوتے تھے۔ نواب سکندر جہاں بیگم کے اس علمی ادبی اور تعلیمی سلسلے کو آئندہ آنے والی بیگمات نے مزید تقویت بخشی۔ بیگمات بھوپال کی خدمات کی روشنی میں محمد امین زبیری لکھتے ہیں کہ

> بھوپال کی تاریخ میں یہاں کی بیگمات کے اولوالعزمانہ مساعی کا بہت کچھ حصہ شامل ہے۔ بھوپال کی ارتقائی تاریخ میں قدرتی طور پر عورتوں کی کوششوں کا حصہ غالب رہے گا۔(۸)

بھوپال کے حکمرانوں کی علمی وادبی دلچسپی اور سرپرستی کی بدولت ریاست بھوپال کو ادبی مرکز و محور کی حیثیت حاصل تھی۔ ہندوستان کا بیشتر حصہ سیاسی انتشار، افراتفری کا شکار تھا لیکن ریاست بھوپال سیاسی بنیادوں پر انگریزوں سے معاہدہ طے ہونے کی وجہ سے تمام خطرات سے محفوظ تھی۔ نواب سکندر جہاں بیگم کے عہد میں نئے دور کا آغاز ہو چکا تھا اور ریاست بھوپال ترقی کی منازل طے کر رہی تھی۔ نواب سکندر جہاں بیگم کے بعد نواب شاہجہاں بیگم (۱۸۶۸ء۔۱۹۰۱ء) اس علمی وادبی سلسلے میں متحرک دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے ۳۳سالہ دور حکومت میں بھوپال میں شعر وادب کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ انہوں نے علم دوستی اور علم پروری وراثت میں پائی تھی۔ نواب شاہجہاں بیگم نے مدرسہ سلیمانیہ (نواب سکندر جہاں بیگم کا نواب سلیمان جہاں بیگم کی یاد میں قائم کردہ مدرسہ) کو ترقی دے کر نہ صرف عربی، ہندی، فارسی اور انگریزی کے الگ الگ سیکشن بنائے بلکہ ہائی اسکول کے درجہ تک پہنچایا۔ ۱۸۹۲ء میں مدرسہ

سلیمانیہ کو کلکتہ یونیورسٹی سے ملحق کرا دیا تھا۔نواب شاہجہاں بیگم نے اپنے والد جہانگیر محمد خاں کی یاد میں ''مدرسہ جہانگیریہ'' عربی وفارسی کی تعلیم کے لئے جاری کیا جہاں دور دور سے طالب علم حصول تعلیم کی خاطر آیا کرتے تھے۔ نواب بلقیس جہاں کی یاد میں مدرسہ بلقیسیہ قائم کیا جس میں یتیم ،لاوارث بچوں کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام تھا۔علاوہ ازیں کئی ایسے مدرسے قائم کیے جہاں بچوں اور بچیوں کو صنعتی تعلیم دی جاتی تھی تاکہ وہ ہنر سیکھ کر اپنی زندگیوں کو بہتر بنائیں اور معاشرے کی ترقی اور فلاح وبہبود کے لئے اپنا فعال کردار ادا کر سکیں۔

نواب شاہجہاں بیگم نے غریب خواتین کو خود کفیل بنانے کی خاطر ایک عمارت ''پروین منزل'' کے نام تعمیر کروائی جو بعد ازاں ''پری منزل'' کہلانے لگی تھی۔اس منزل کے صحن میں خواتین کے لئے بازار بنایا گیا۔جہاں صرف عورتوں کی ضروریات کا سامان میسر ہوتا تھا۔نواب شاہجہاں بیگم ہنرمندوں کو سراہاتی تھیں ،انہیں انعام واکرام سے نوازتی تھیں۔یوں یہ بازار صرف خواتین کی امداد کے لئے ہی نہیں بلکہ انہیں پر اعتماد زندگی کا گر سکھانے کا مرکز بھی تھا۔نواب شاہجہاں بیگم کو تعمیرات کا بہت شوق تھا۔یوں تو ہر فرمانروائے ریاست بھوپال نے تعمیرات بالخصوص مساجد کی تعمیر میں ایک سے بڑھ کر ایک عمدہ نمونہ پیش کیا لیکن نواب شاہجہاں بیگم اس معاملے میں بھی سبقت لے گئیں۔انہوں نے ۱۸ مسجدیں تعمیر کروائیں جن میں تاج المساجد ۱۸۸۵ سے لے کر ۱۹۰۱ء تک کے عرصے میں مکمل کرائی۔یہ مسجد شہنشاہ شاہجہاں کی جامع مسجد کی طرز پر بنائی گئی ہے۔مسجد کے ایک ضخیم حصہ میں کتب خانہ بھی بنایا گیا جہاں ہزاروں کتابیں موجود ہیں۔کتب خانے کی عمارت سید سلیمان ندوی کے نام سے منسوب ہے۔نواب شاہجہاں بیگم کی ایک اور کاوش برطانیہ میں ۱۸۸۹ء میں پہلی باقاعدہ مسجد ''مسجد شاہجہاں ووکنگ'' کی صورت میں سامنے آتی ہے۔اس مسجد کی بحیثیت ایک عظیم اسلامی تعلیمی مرکز ہونے کے حوالے سے ڈاکٹر رضیہ حامد لکھتی ہیں کہ

> مسلمانوں کو خطہ پاکستان کے حصول سے قبل کے پرنسپل پروفیسر ڈاکٹر گوٹیلب جب برطانیہ لوٹے تو انہوں نے ووکنگ سرے میں کالج آف اورینٹل قائم کیا، جس میں برصغیر اور کچھ دوسرے اسلامی ممالک سے طلباء بھی زیر تعلیم تھے،ڈاکٹر لیتھز نے مسلمان طلبہ کی مذہبی سہولت کے لیے اپنے تعلیمی ادارے میں مسجد قائم کرنے کا ارادہ کیا۔۔۔اس مسجد کی وجہ سے برطانیہ میں پہلا مسلم قبرستان ہورزل میں بنایا گیا۔۔۔قرآن پاک کے تاریخی مترجم ماریاڈیوک پکتھال جنھوں نے اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل کیا وہ اس مسجد کے خطیب بھی رہے۔۔۔ووکنگ میں مقیم مسلمان اپنی اس مسجد کی خدمت اور اس نمازوں کی ادائیگی کو

اپنے لئے اعزاز سمجھتے ہیں۔ برطانیہ کے دوسرے تمام مسلمانوں کے تعاون سے اسے عظیم اسلامی تعلیمی مرکز کی صورت میں بدلنے کے مساعی جاری رکھے ہوئے ہیں۔" (۹)

نواب شاہجہاں بیگم کی ادبی و تعلیمی خدمات کا سلسلہ بہت طویل ہے۔ان کے عہد میں عورتوں کی فلاح و بہبود، تعلیم و تربیت کے لئے انفرادی سطح سے ہٹ کر اجتماعی سطح پر کوششیں نظر آتی ہیں۔ بحیثیت حکمران یا سربراہ ریاست کے اپنی دیگر ذمہ داریوں کی انجام دہی کے علاوہ وہ خواتین کے تعلیم و ترقی کے مسئلے کو بھی اپنے فرائض منصبی میں شمار کرتی تھیں۔ نواب شاہجہاں بیگم نے ریاست بھوپال میں تعلیم کے فروغ کی خاطر محکمہ تعلیم کا قیام عمل میں لایا جس کا نام نظارۃ العارف العمومیہ تھا۔ شہریار خاں نے نواب شاہجہاں کی تعلیمی خدمات کے تناظر میں لکھا

> Shahjehan was a committed supporter of the arts and education.... Shc supported education for girls and built dispensaries and serais for Visitors ...... None of the other Begums of Bhopal aspired,as Shahjehan did, To literary accomplishment.(10)

دور شاہجہانی علم و ادب کے فروغ کا زریں دور کہلاتا ہے ۱۸۹۱ء میں جب سر سید احمد خاں حیدرآباد دکن سفر پر روانہ ہوئے تو انہوں نے بھوپال میں بھی قیام کیا اور نواب شاہجہاں بیگم سے ملاقات کی۔ نواب شاہجہاں بیگم نے سر سید احمد خاں کی کاوشوں کو سراہا اور انہیں محمڈن کالج کی مسجد کی تعمیر کی خاطر دس ہزار از خود اور دو ہزار اپنے عزیز و اقارب کی جانب سے بطور امداد دیئے۔ نواب شاہجہاں بیگم کے عہد کی علمی و ادبی خدمات کے تناظر میں ڈاکٹر نعمان لکھتے ہیں کہ

> اس وقت بھوپال اپنے علمی و ادبی کارناموں کے لحاظ سے "بغداد الہند" کی حیثیت رکھتا تھا اور بیت الکمال اور دار الاقبال سے موسوم کیا جانے لگا تھا۔(۱۱)

نواب شاہجہاں بیگم کے شوہر نواب صدیق حسن خاں بھی ایک بلند پایہ ادیب تھے۔ان دونوں کی کوششوں کے باعث بھوپال میں نظم و نثر نے خوب ترقی کی۔ ہندوستان سے کثیر تعداد میں مشاہیر ادب نے بھوپال کی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ یوں شعر و ادب کا نہ صرف معیار بلند ہوا بلکہ مضامین میں وسعت اور اظہار کے پیرائے میں تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔

نواب شاہجہاں بیگم خود بھی شاعرہ تھیں۔ شیریںؔ اور تاجورؔ ان کا تخلص تھا۔ تاریخ ادب اردو کے مولف ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے نواب شاہجہاں بیگم کی شاعری کے اعتراف میں لکھا کہ ''نواب شاہجہاں بیگم بہت اچھی شاعرہ تھیں اور اردو شیریںؔ اور بعد کو تاجورؔ تخلص کرتی تھیں''۔(۱۲) نواب شاہجہاں بیگم کے دو دیوان ''تاج الکلام''، ''دیوان شیریں'' کے نام سے شائع ہوئے اور ایک طویل مثنوی ''صدق البیان'' بھی ان کی یادگار ہے۔ ان کا کلام دہلوی اور لکھنوی دونوں رنگ کا حسین امتزاج ہے۔ ان کے شعری ذوق کے سبب بھوپال میں خواتین بھی شعر و شاعری کی طرف نہ صرف متوجہ ہوئیں بلکہ ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوا اور محل میں باقاعدہ شعری محفلیں اور مشاعروں کا انعقاد ہونے لگا۔ ان کے عہد کی معروف شاعرات میں کلثومؔ بیگم، فرخندہؔ بیگم، حسن آرا نمکینؔ، منور جہاں بیگم مسرتؔ، حیاؔ، مشرف جہاں بیگم ثروتؔ، وغیرہ شامل ہیں۔ یہ تمام شاعرات صاحب دیوان تھیں۔ کلثومؔ نواب گوہر قدسیہ بیگم اور نواب سکندر جہاں بیگم کی ہم جلیس تھیں۔ ان کے عہد حکومت میں کم و بیش ڈیڑھ سو خواتین شعر کہتی تھیں۔ نواب شاہجہاں بیگم کی شاعری میں داغؔ کی شاعرانہ خصوصیات کا واضح اثر جھلکتا ہے۔ انہوں نے ہر میدان میں طبع آزمائی کی لیکن غزل کو ان کے ہاں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ نواب شاہجہاں بیگم نے شاعری کے علاوہ نثر میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ نثری کتب میں ''تاج الاقبال''، ''تربیت النسواں و تربیت الانسان''، ''خزینۃ اللغات'' شامل ہیں۔ ان کتب کا تفصیلی ذکر سابقہ باب میں کیا جا چکا ہے۔

نواب شاہجہاں بیگم کی ادبی و تعلیمی خدمات کو مزید وسعت نواب سلطان جہاں بیگم (۱۸۵۲ء۔۱۹۳۰ء) کے عہد میں نصیب ہوئی ہے۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے (۱۹۰۱ء۔۱۹۲۶ء) کے عرصہ تک نہایت کامیابی کے ساتھ حکمرانی کی ہے۔ ان کے عہد حکومت میں ہر شعبہ زندگی ریاستی نظم و نسق، میونسپلٹی، قوانین، پولیس اور جیل، فوج، سڑکیں، ڈاک خانے، تعمیرات، ہسپتال و شفاخانے، اسٹیٹ کونسل غرض ہر سطح پر صلاحات نافذ کی گئیں جن کے باعث ریاست بھوپال کو ایک عظیم الشان مرکز قرار پائی۔ نواب سلطان جہاں بیگم روشن خیال خاتون تھیں لہٰذا وہ ریاست بھوپال اور اس کے باسیوں کو عہد جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا چاہتی تھیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم مختلف علوم و فنون اور ادب کی دلدادہ تھیں۔ انہوں نے عوام میں علم حاصل کرنے کی دلچسپی پیدا کرنے کی اشد ضرورت محسوس کرتے ہوئے ۱۹۱۲ میں سرخ پتھر سے مزین وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی لائبریری تعمیر کروائی۔ اس لائبریری کو نواب حمید اللہ خاں کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس لائبریری میں ہر زبان کی نادر و کمیاب کتابیں رکھی گئیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم

نے علم کے فروغ کو اپنا مقصد حیات سمجھا اور ساری زندگی اس پر سختی سے عمل پیرا رہیں۔ عوام میں تعلیم شعور بیدار کرنے کی خاطر ۱۹۱۹ء میں جبریہ تعلیم کا قانون نافذ کر دیا تھا۔ یوں اس قانون کی بجاآوری کے عمل میں مدارس میں طالب علموں کی تعداد کثرت سے بڑھنے لگی تھی۔ بحیثیت خاتون نواب سلطان جہاں بیگم عورتوں کی تعلیم کی حمایت میں سرگرداں نظر آتی ہیں۔ وہ مرد اور عورت دونوں کی تعلیم کی یکساں حامی تھیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کے لئے بھی سکول قائم کیے تھے۔ انہوں نے خواتین کو باشعور اور پر اعتماد زندگی بسر کرنے کا ہنر دیا۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے رسمی و غیر رسمی تعلیمی ادارے قائم کیے تھے۔ نواب سلطان جہاں بیگم کی تعلیم نسواں کے فروغ کے سلسلے میں کی گئی کوششوں اور ان کے نظریات کے حوالے سے محمد امین زبیری لکھتے ہیں کہ

> وہ جاہل اور بے ہنر عورتیں جو وارث اور والی نہ ہونے سے اپنے اور اپنے بچوں کے گزارہ کے لئے محتاج ہو کر اپنی زندگی بے انتہا مصیبتوں میں بسر کرتی ہیں دراصل بہت زیادہ قابل رحم ہوتی ہیں۔۔۔۔ میں نے ریاست میں ایک بڑا گروہ اس قسم کی عورتوں کا پایا ہے۔۔۔۔ بھوپال میں عورتوں کے لئے ایک ایسا مدرسہ جس میں ضروریات روزمرہ میں کام آنے والی چیزوں کی صنعتی تعلیم دی جائے قائم کرنا تجویز کیا تاکہ وہ صنعت و حرفت سیکھ کر کچھ نہ کچھ اپنی مدد کر سکیں (۱۳)

یوں نواب سلطان جہاں بیگم نے لڑکیوں کے لئے خصوصی طور پر صنعتی تعلیم کا معقول بندوبست کیا تاکہ وہ اپنی مدد آپ کے اصول کے تحت زندگی گزاریں اور مشکل وقت میں کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائیں۔ نواب سلطان جہاں نے عورتوں کے لئے مینا بازار، نمائشوں کا حتی المقدور بندوبست کیا تاکہ خواتین اپنے ہنر کا بھرپور مظاہرہ کریں اور اپنی صنف کی ترقی و خوشحالی کے لئے کچھ کر سکیں۔ ۱۹۱۴ء میں صنعتی نمائش پروگرام اتنے وسیع پیمانے پر ہوا کہ پورے ہندوستان میں سے مختلف قوموں سے تعلق رکھنے والی خواتین نے مصنوعات تیار کر کے پیش کیں یوں یہ پہلی بین الاقوامی نمائش کہلائی۔ عورتوں کی اخلاقی اور صنعتی اصلاح کے لئے پرنس آف ویلز لیڈیز کلب ۱۹۰۸ء میں قائم کیا تھا۔ اس کلب کی سیکرٹری ابوالکلام آزاد کی بہن آبرو بیگم تھی۔ علاوہ ازیں نواب سلطان جہاں بیگم نے ''آل انڈیا لیڈیز ایسوسی ایشن'' کا قیام بھی عمل میں لایا تاکہ خواتین کے مسائل کے حل کے لئے عورتوں سے مدد لی جاسکے۔ اس لیڈیز ایسوسی ایشن کا پہلا اجلاس مارچ ۱۹۱۸ء میں منعقد ہوا تھا۔ اس ایسوسی ایشن میں کل اقوام ہند کی خواتین شمولیت کا اختیار رکھتی تھیں۔ نواب

سلطان جہاں بیگم نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قیام میں کثیر امداد مہیا کی اور اس کی پہلی چانسلر نامزد ہوئیں۔ محمد امین زبیری مہتمم اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ "دنیا کی یونیورسٹیوں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ صرف مسلم یونیورسٹی ایک فرماں روا جلیل القدر خاتون کی امارت جامعہ (چانسلر شپ) کے فخر سے مفتخر ہوئی جو یقیناً عالم نسواں کا سب سے گرانمایہ امتیاز رہے گا۔"(۱۴) نواب سلطان جہاں بیگم ایک ذی شعور، فہم وادراک کی حامل حکمران تھیں اور نے مسلم خواتین کی فلاح و بہبود کے ساتھ ساتھ بلا تفریق و امتیاز ہندو لڑکیوں کے لئے بھی مدارس کھولے۔ اگرچہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی تعصب کی مضبوط دیواریں حائل تھیں لیکن بحیثیت حکمران اور خاص طور پر بحیثیت انسان نواب سلطان جہاں بیگم کی شخصیت ان تعصبات سے عاری دیکھائی دیتی ہے۔ وہ اپنی رعایا کے ہر فرد کو برابری کی سطح پر اہمیت دینے کی قائل تھیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم کے اس مساویانہ رویے کی بدولت غیر مذہب بھی دل و جاں سے ان کی قدر کرتے تھے۔ شمسہ عارف نواب سلطان جہاں بیگم کے فروغ تعلیم نسواں کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ

> ہندو لڑکیوں کے لئے جداگانہ مدرسہ قائم کرنے کی مجھے ایک عرصہ سے فکر تھی کیونکہ میں اپنی رعایا کو بلا امتیاز مذہب عزیز رکھتی ہوں اور فی الواقع کسی فرمانروا کو زیب نہیں ہے۔۔۔۔ جس طرح مسلمان لڑکیوں کی تعلیم میں مجھے شغف ہے اسی طرح ہندو لڑکیوں کی تعلیم بھی میرا نصب العین ہے۔ اور اگر میں خاص مذہبی ضرورتوں سے مجبور نہ ہوتی تو جداگانہ مدرسے قائم نہ کرتی۔"(۱۵)

نواب سلطان جہاں بیگم نے عمومی تعلیم اور بالخصوص تعلیم نسواں کو فروغ دینے کی خاطر خواہ موثر اقدام اٹھائے ہیں۔ انہوں نے خواتین کو باشعور بنایا تاکہ ان کی بدولت آئندہ آنے والی نسلیں جہالت کی تاریکیوں میں نہ ڈوبیں بلکہ اپنے ملک صف اول کے ممالک کی صف میں لا کھڑا کریں۔ قرۃ العین حیدر بیگمات بھوپال کی خدمات کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ

> متواتر چار بیگمات کی حکمرانی کی بدولت بھوپال کی عورتوں میں اپنی اہمیت کا احساس اور جذبہ خودداری بیدار ہوا۔ نواب حمید اللہ خاں نے بھوپال ریاست کو انڈین یونین میں ضم کرتے وقت یہ کڑی شرط رکھی تھی کہ یہاں زنانہ تعلیم حسب سابق ہمیشہ مفت رکھی جائے۔ بھوپال میں اسلامی شریعت کی پابندی اس حد تک ہے کہ وہاں ہندوستان کے دوسرے خطوں کے برعکس طلاق یا عقد بیوگان کو برا نہیں سمجھا جاتا ہے۔"(۱۶)

نواب سلطان جہاں بیگم نے عوام میں ناخواندگی دور کرنے کی بہت تگ و دو کی تھی۔ نواب سلطان جہاں بیگم خواتین کی آزادی کی قائل تھیں وہ انہیں چھوئی موئی کی پتی نہیں بنانا چاہتی تھیں لیکن ساتھ ہی وہ عورتوں کی بے جا آزادی جو مغرب کی تقلید کی صورت میں ہو اس کے خلاف تھیں۔ مغرب سے آنے والی بے جا آزادی نے مشرقی عورت کو للکارا تو اس کے منفی اثرات مسلم معاشرے پر بھی نمودار ہونے لگے تھے۔ وہ عورت کو اپنی حدود جو مذہب اسلام نے ان کے لئے مخصوص کی ہیں ان کے دائرہ کار میں رہ کر ترقی کی منازل طے کرتا دیکھنا چاہتی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ عورت مذہب اسلام کی عطا کردہ آزادی پر کاربند رہے کیونکہ یہ وہ آزادی ہے جس سے عورت اپنے حقوق سے زیادہ مستفید ہونے اور دیگر خرابیوں سے محفوظ رہنے کا ذریعہ ہے۔ وہ عورت کی حیثیت واہمیت پر تقریر کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ

> اس تعلیم کے ساتھ اس آزادی کو پسند نہیں کرتی جو اعتدال سے متجاوز ہو چکی ہے اور ہمارے یہاں کی پردہ نشین ناخواندہ بلکہ خواندہ عورتوں کو کبھی اس کا خیال نہیں گزر سکتا۔ ممکن ہے یہ آزادی جو سرزمین یورپ میں ہے وہاں کے مناسب ہو۔۔۔۔ مگر ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں کے لئے کسی طرح اور کسی زمانہ میں میرے خیال میں نہ موزوں ہوگی۔۔۔۔ تاریخ ہم کو جتا رہی ہے کہ عورتوں نے اسلام اور شعائر اسلام کا پابند رہ کر دنیا میں کیسے کیسے کارہائے نمایاں کئے کئے علوم و فنون میں دستگاہ حاصل کی۔۔۔۔" (۱۷)

ان رفاہی کاموں کے علاوہ نواب سلطان جہاں بیگم کو تصنیف و تالیف کا بھی بہت شوق تھا۔ نواب سلطان جہاں بیگم کی ادبی خدمات کے حوالے سے محمد امین زبیری مہتمم لکھتے ہیں کہ

> انہوں نے ساٹھ سے زیادہ کتابوں کے ترجمے کرائے جن کا تعلق عورتوں کی زندگی کے مختلف شعبوں سے تھا اور جن کے ۱۰۷۴۶ مختلف سائز کے صفحات تھے۔ (۱۸)

ریاستی امور کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ ادبی سلسلہ بھی جاری و ساری رکھا تھا۔ جب بھی کوئی کتاب لکھتیں تو مکمل کرنے کے بعد موضوع سے مناسبت رکھنے والے کسی ماہر ادیب کو مقصد تنقید کے لئے بھجوا دیتی تھیں تاکہ متعلقہ کتاب کے حوالے سے پیش کی گئی تجاویز پر عمل درآمد کر کے اسے اسقام سے پاک کیا جا سکے۔ نواب سلطان جہاں بیگم میں قومی و ملکی ترقی، انسانی ہمدردی کے ساتھ انسانیت کے فروغ کا مقصد اور جذبہ کارفرما تھا۔ ان کی تالیفات و تصنیفات مقصدیت پر مبنی کتابیں ہیں۔ سب تصانیف اپنے عہد کی ضروریات کو مد نظر رکھ کر لکھی گئی تھیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم کی کتب کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ ان کا طرز بیان مدلل، پرزور اور پراثر ہے۔ ان کی اکثر کتب کی ابتدا میں

سرورق کی پیشانی پر اس موضوع سے مطابقت رکھتی ہوئی کوئی قرآنی آیت لکھی ہوئی ہے۔ نواب سلطان جہاں بیگم کی ادبی خدمات کے تناظر میں محمد نعمان لکھتے ہیں کہ

> ان کی علمی و سیاسی زندگی مساوی حیثیت کی حامل تھی۔ تصنیف و تالیف کے کام ان کے ان کے لئے ایک لازمی جزو کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ اپنے عہد کی مشہور مصنفہ، اردو زبان کی شیدائی اور مداح تھیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے ۴۱ تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ انکی سب سے پہلی تصنیف ''روضۃ الریاحین'' (سفر نامہ حجاز) ہے۔ بیگم سلطان جہاں بیگم کی تصانیف پر اس دور کے موقر ادبی رسائل اور اہم اخبارات میں تبصرے شائع ہوتے تھے ان کی تصانیف سے اردو ادب میں خواتین کے لئے مفید و اصلاحی ادب کا آغاز ہوتا ہے۔''(۱۹)

نواب سلطان جہاں بیگم کیونکہ خود مصنفہ تھیں اس لیے دیگر مصنفین و مولفین کی بھی مدد امداد کیا کرتیں تھیں۔ انہوں نے دفتر تاریخ قائم کر کے بڑے پیمانے پر کتابیں لکھوائیں۔ اس ضمن میں ان کا اہم ادبی کاوش مولانا شبلی نعمانی کی ''سیرت النبی''، سلیمان ندوی ''سیرت عائشہ'' کی اشاعت بھی شامل ہے۔ نواب سلطان جہاں کی اس خدمت کے اعتراف میں مولانا شبلی نے ایک قطعہ لکھا کہ

مصارف کی طرف سے مطمئن ہو میں بہر صورت
کہ ابر فیض سلطان جہاں بیگم زر افشاں ہے
رہی تنقید و تحقیق روایت ہائے تاریخی
سو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے
غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل
کہ اس میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطاں ہے (۲۰)

نواب سلطان جہاں بیگم کی خصوصی توجہ اور سرپرستی کی بدولت بھوپال علم و ادب کا مضبوط مرکز کہلانے لگا۔ ان کے عہد میں ایسے شاعروں کو جو درباری مداح سرائی کے بدلے معاوضہ حاصل کرتے تھے انہیں خصوصی ترغیب دی گئی کہ اپنے کلام کو اصلاحی و مقصدی بنیادوں کا حامل بنائیں اور معاشرے کی فلاح و بہبود میں اپنا کردار ادا کریں۔ یوں نثری و شعری سطح پر اس عہد میں شعراء و ادبا کے کلام میں فکری و فنی سطح پر نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے۔ نواب سلطان جہاں کے دور میں اردو زبان و ادب کو جو فروغ نصیب ہوا اس میں ان کی نجی کوششوں اور دلچسپیوں کا بہت بڑا عمل دخل ہے۔

نواب سلطان جہاں کے بعد ان کے بیٹے اور آخری فرمانروا بھوپال نواب حمید اللہ خاں نے علمی و ادبی سلسلے کو حتی المقدور وسعت دی اور گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ بھوپال کی علمی و ادبی خدمات کی قدامت کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم حامد رضوی، ڈاکٹر گیان چند جین کی تحقیق کو پیش کرتے لکھتے ہیں کہ

> اتنے ابتدائی زمانہ میں جب میر کی عمر صرف سولہ سال تھی بھوپال میں ولی کا ہم عصر ۳۴۰ شعر کی ایک مکمل مثنوی لکھ رہا تھا۔(۲۱)

بھوپال کی ادبی فضا اور علم دوستی کی وجہ سے کئی معروف ادیب و شاعر، محقق، نقادوں نے بھوپال کا رخ کیا تھا۔ نیاز فتح پوری کو ادبی شہرت بھوپال سے حاصل ہوئی۔ بھوپال میں قائم دفتر تاریخ کی وجہ سے ان کی معروف کتابیں منظر عام پر آئیں مثلاً ''گہوارہ تمدن''، صحابیات، نگارستان، شہاب کی سرگزشت، تاریخ اسلام، تاریخ دولتیں، مصطفی کمال پاشا وغیرہ بہت اہم ہیں۔ ان کی ادبی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد نعمان لکھتے ہیں کہ

> یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مولانا کو اپنے زمانہ کا زبردست انشاء پرداز اور نقاد بنانے میں بھوپال کا ہاتھ بہت زیادہ ہے اور یہ دفتر تاریخ اور بھوپال کا علمی اور ادبی ماحول ہی تھا جس نے ان کی فطری صلاحیتوں کو ابھارا تھا۔(۲۲)

نیاز فتح پوری کے علاوہ دیگر نامور شخصیات میں سر راس مسعود، علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی، حفیظ جالندھری، شوق قدوائی، جاں نثار اختر، جگر مراد آبادی، عبدالرحمن بجنوری اور ڈاکٹر گیان چند جین کے نام نمایاں اہمیت کے حامل ہیں۔ علامہ اقبال کے شعری مجموعہ ''ضرب کلیم ''کی نظمیں رومی، مقصود، حکومت، تصوف، صبح، مومن، ابلیس کا فرمان اپنے فرزندوں کے نام، مسولینی، امرائے عرب سے'' یہ سب بھوپال کے شیش محل کے قیام کے دوران لکھی تھیں۔ علاوہ ازیں بعض ایسے نامور شاعر و ادیب ہیں جن کی جنم بھومی بھوپال تھی اور یہاں سے تربیت و نشوونما پاکر قومی و بین الاقوامی سطح پر بھوپال کی نمائندگی کا فریضہ سرانجام دیا مثلاً ڈاکٹر عابد حسین، محمد احمد سبزواری، صہبا لکھنوی، محسن بھوپالی، ڈاکٹر حنیف کیفی، ڈاکٹر مظفر حنفی، اسد محمد خاں، ڈاکٹر حنیف نقوی، زہرہ جمال، ڈاکٹر صغرا صدف وغیرہ شامل ہیں۔ ریاست بھوپال کے آغاز سے لے کر تقسیم ہندوستان تک ہر دور میں بیگمات بھوپال نے عقل و دانش کے بل بوتے پر زریں کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ ان کی بے لوث خدمات اور کاوشیں صرف اہلیان بھوپال کے لئے نہیں تھیں بلکہ پورے ہندوستان میں علم و ادب کی اشاعت و ترویج میں بہت ٹھوس کردار ادا کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد نعمان خاں، ڈاکٹر، بھوپال میں اردو انضمام کے بعد(۱۹۴۹تا۱۹۸۵)(دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس ،۲۰۰۶)، ص ۱۳

۲۔ سلیم حامد رضوی، ڈاکٹر۔ اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ(بھوپال: باب العلم پبلیکشنز۔۲۰۱۴ء)، ص ۹۳

۳۔ سلطان جہاں بیگم، نواب، حیات سکندری(آگرہ: مطبع بھوپال پریس۔۱۹۳۰ء)، ص ۲۱۳

۴۔ سلیم حامد رضوی، ڈاکٹر۔ اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ(بھوپال: باب العلم پبلیکشنز۔۲۰۱۴ء)، ص ۷۶

۵۔ Shaharyar M.khan .(2002).Begums of Bhopal:ADynasty of women Rulers in Raj india .i.B.tauris P.118

۶۔ اطہر صدیقی، نواب سلطان جہاں بیگم حیات و خدمات، مضمون ''بیگمات والیان ریاست بھوپال کی علمی و ادبی خدمات، عارف عزیز(نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۱۳ء)، ص ۱۷

۷۔ رضیہ حامد، ڈاکٹر، نواب سلطان جہاں بیگم(بھوپال: باب العلم پبلیکیشنز، ۲۰۱۱)، ص ۶

۸۔ محمد امین مارہروی۔ بیگمات بھوپال(حصہ دوم)(بھوپال: مطبع سلطانی ریاست بھوپال۔۱۹۱۸ء)، ص ۱

۹۔ رضیہ حامد، ڈاکٹر، نواب سلطان جہاں بیگم(بھوپال: باب العلم پبلیکیشنز، ۲۰۱۱)، ص ۱۸۹

۱۰۔ Shaharyar M.khan .(2002).Begums of Bhopal:ADynasty of women Rulers in Raj india .i.B.tauris P.152

۱۱۔ محمد نعمان خاں، ڈاکٹر، بھوپال میں اردو انضمام کے بعد(۱۹۴۹تا۱۹۸۵)(دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، ۲۰۰۶)، ص ۶۵

۱۲۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو(کراچی: غضنفر اکیڈمی، ۲۰۰۳ء)، ص ۴۱۰

۱۳۔ محمد امین زبیری مارہروی، حیات سلطانی(عزیزی پریس آگرہ: ۱۹۳۹)، ص ۷۶

۱۴۔ محمد امین مارہروی۔ بیگمات بھوپال(حصہ دوم)(بھوپال: مطبع سلطانی ریاست بھوپال۔۱۹۱۸ء)، ص ۱۵

۱۵۔ اطہر صدیقی،نواب سلطان جہاں بیگم حیات و خدمات،مضمون ''نواب سلطان جہاں بیگم اور تعلیم نسواں، شمسہ عارف (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،۲۰۱۳ء)،ص۲۹۱

۱۶۔ قرۃ العین حیدر، شاہراہ حریر (دہلی: ایجوکیشنل بک ہاؤس، س ن)، ص۱۶۰

۱۷۔ نواب سلطان جہاں بیگم،سلک شہوار (مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ:۱۹۱۹ء)،ص۵۱

۱۸۔ محمد امین زبیری مارہروی،حیات سلطانی(عزیزی پریس آگرہ:۱۹۳۹)،ص۳۰۳

۱۹۔ محمد نعمان خاں،ڈاکٹر،بھوپال میں اردو انضمام کے بعد(۱۹۴۹تا۱۹۸۵)(دہلی:ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس،۲۰۰۶)،ص۴۰

۲۰۔ رضیہ حامد،ڈاکٹر،نواب سلطان جہاں بیگم(بھوپال: باب العلم پبلیکیشنز،۲۰۱۱)،ص۴۲

۲۱۔ سلیم حامد رضوی،ڈاکٹر۔اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ(بھوپال: باب العلم پبلیکیشنز۔۲۰۱۴ء)،ص۵۴۷

۲۲۔ محمد نعمان خاں،ڈاکٹر،بھوپال میں اردو انضمام کے بعد(۱۹۴۹تا۱۹۸۵)(دہلی:ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس،۲۰۰۶)،ص۷۸

مجموعی جائزہ

مجموعی جائزہ

برصغیر پاک و ہند میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد افراتفری انتشار، بدامنی، ظلم و ستم اور جنگ و قتال کا بازار گرم ہوا تو مخالف قوتوں نے زور پکڑ لیا۔ ہندوستان ایک ایسا خطہ زمین تھا جہاں مختلف قبیلوں اور ذاتوں میں منقسم اور بٹے ہوئے افراد کے درمیان باہمی تنفر اور مغائرت پائی جاتی تھی۔ ایسے میں برطانوی راج یا حکومت قائم ہونا کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر نے ہمارے تاریخی شعور، سوچ اور نظریات کو یکسر بدل دیا ہے۔ اگر تاریخ پر طائرانہ نظر دوڑائی جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ جب بھی کوئی خطہ، ملک یا سرزمین نوآبادیات کا شکار ہوتی ہے تو اس کی وجہ سے نہ صرف وہاں سیاسی و معاشی طور پر استحصال ہوتا ہے بلکہ اس کی تاریخ، تہذیب اور سماجی نظام منتشر ہو جاتا ہے۔ نوآبادیات کی اصطلاح کو غیر ملکی تسلط، قبضہ یا اقتدار کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ نوآبادکار، نوآبادیاتی دنیا کو تشکیل دے کر اپنے اغراض و مقاصد کے تحت مقامیوں کو شناخت مہیا کرتا ہے۔ اس صورتحال کے سبب معاشرے میں بغاوت، افراتفری اور انتشار پیدا ہوتا ہے جس کے زندگی کے مختلف شعبوں مثلاً سیاسی و سماجی، معاشی و تعلیمی سطح پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ تہذیبی و تمدنی حالات اور معاشرتی و اخلاقی اقدار کے اعتبار سے پوری قوم زوال کا شکار ہونے لگتی ہے۔ برطانوی راج کے زیر اثر ہندوستانی معاشرہ بھی اس حقیقت کی زندہ مثال رہا ہے۔ ہندوستانی معاشرے میں نوآبادیاتی صورتحال کے سبب علم و عمل کا فقدان نظر آتا ہے اور طبقہ اناث میں یہ کمزوری زیادہ ابھر کر سامنے آنے لگتی ہے۔ اس طبقے کو زندگی کے دیگر شعبوں کے ساتھ ساتھ علمی سرگرمیوں سے ناآشنا کر دیا گیا۔

تعلیم کی کمی سے پیدا ہونے والی کوتاہیوں اور خامیوں کو دور کرنے کے لئے اور اسلامی تشخص کی بحالی کے لئے اول اول شاہ ولی اللہ (۱۷۰۲ء۔ ۱۷۶۲ء) اور ان کے بیٹوں، شاہ اسماعیل شہید وغیرہ نے ایسی کتابیں لکھیں جو نہ صرف اصلاح معاشرہ بلکہ تحریک اصلاح تعلیم نسواں کے سلسلے میں بھی پہلا قدم ثابت ہوئیں۔ تعلیم کسی بھی معاشرے کی بقاء فلاح و ترقی کی ضامن ثابت ہوتی ہے۔ ادیبوں میں اصلاح نسواں کے حوالے سے مولوی وزیر علی اور ڈپٹی نذیر احمد کے نام قابل ذکر ہیں۔ اٹھارویں صدی کے اواخر تک انگریز ہندوستان پر مکمل طور پر قابض ہو چکے تھے۔ انہوں نے ہندوستان کے تعلیمی نظام میں دلچسپی کا اظہار کیا بالخصوص خواتین کی تعلیم کے لیے اہم اقدامات کیے۔ ہندوستانی

معاشرے میں انگریز حکومت کے سبب مسلمان مرد اپنی سیاسی طاقت تو کھو چکا تھا مگر گھر کے اندر اسی کی حکومت تھی اور وہ ہر گز اس چیز کا متمنی نہیں تھا کہ سماجی تبدیلیوں کے اثرات گھر میں موجود افراد بالخصوص عورت پر مرتب ہوں اور اسکا شعور بیدار ہو۔

ہندوستانی معاشرے کی اس بدترین صورتحال میں سرسید احمد خاں جیسی شخصیت کا ظہور کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ سرسید احمد خاں کو اس بات کا احساس تھا کہ جب تک مرد تعلیم یافتہ نہیں ہوں گے، عورتوں کی تعلیم کی طرف توجہ دینا بے کار ثابت ہوگا۔ تاریخ میں ہمیں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ مرد تعلیم یافتہ نہ ہوں اور عورتیں تعلیم حاصل کر لیں۔ تعلیم کے ذریعے مردوں کی سوچ میں تبدیلی عورتوں کی زندگی کو ہموار کرنے میں مددگار ثابت ہوگی۔ اسی تناظر میں سرسید اور ان کے رفقا نے جدوجہد شروع کی۔ حالی نے "مناجات بیوہ"، "چپ کی داد" جیسی منظومات میں عورت کی مظلومیت کی تصویر کشی پیش کی۔ "مجالس النسا" میں خواتین کے معاشرتی مقام کے تعین اور ان کی تعلیمی ضروریات کی تکمیل کے حوالے سے نہایت موثر کردار ادا کیا۔ علی گڑھ تحریک سے قبل خواتین کے لئے تذکرے بھی لکھے گئے جن میں فصیح الدین رنج کا تذکرہ ''بہارستان ناز '' اولیت کا حامل ہیں۔ ان کے تذکرے کے علاوہ دو اور تذکرے بھی لکھے گئے تھے اور ان تمام تذکروں نگاروں نے تعلیم نسواں کے فروغ کو اپنا مقصد تالیفات بتایا ہے۔ صحافت نسواں کا اولین علمبردار ۱۸۸۰ء میں لکھنو سے پہلا رسالہ جاری ہوا اور اس کے یکے بعد دیگرے کئی رسائل و اخبارات مثلا "اخبار النسا، شریف بیبیاں، رفیق نسواں، پردہ عصمت، تہذیب نسواں، خاتون، پردہ نشین، سہیلی، النسا، امہات، نسائی، زیب النسا" وغیرہ وغیرہ چھپنے لگے۔ بیسویں صدی میں شیخ عبداللہ تحریک نسواں کے علمبردار تھے۔ علمی وادبی، صحافتی سطح پر شیخ عبداللہ اور ان کی بیگم نے بہت زیادہ خدمات پیش کی تھیں۔ انہوں نے لڑکیوں کے لئے سکول قائم کیا۔ اس سکول کے قیام کے لئے بیگم بھوپال نے ان کی مالی اعانت کی۔

ریاست بھوپال کی تاریخ اپنے آپ میں امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ اس ریاست کی بنیاد سردار دوست محمد خاں (۱۶۷۲ء۔۱۷۲۸ء) نے رکھی تھی۔ بھوپال کی ابتدائی تاریخ جنگجویانہ واقعات سے شروع ہوئی لیکن اس کی تاریخ کو نمایاں کرنے میں یہاں کی بیگمات کا بڑا حصہ ہے۔ بھوپال کی تاریخی ترقی میں یہاں کی خواتین کی شاندار کاوشوں کا بڑا عمل دخل ہے اور ان کی مساعی فتح بی بی کی نہایت سادہ زندگی کے واقعات سے شروع ہو کر نواب سلطان جہاں بیگم کے

زریں کاموں پر ختم ہوتی ہے۔ ریاست بھوپال کا سنگ بنیاد فتح بی بی نے رکھا تھا۔اس سے پہلے تک بھوپال صرف ایک قصبہ تھا لیکن انہوں نے یہاں قلعے کی بنیاد رکھی اور اس کو شہر کی صورت میں نہ صرف آباد کرایا بلکہ بھوپال کی ترقی کا ابتدائی لائحہ عمل ایک خاتون کے ہاتھ سے تیار ہوا تھا۔ مستقبل میں جن بیگمات نے اس کی ترقی، خوش حالی اور فلاح و بہبود کے کارنامے سرانجام دیئے ان میں کچھ غیر فرمانروا بیگمات اور کچھ فرمانروا بیگمات تھیں جن میں قدسیہ بیگم، نواب سکندر بیگم، نواب شاہجہاں بیگم، نواب سلطان جہاں شامل ہیں۔ان چاروں بیگمات نے تقریباً ڈیڑھ سال تک ریاست بھوپال پر حکومت کی اور حیرت انگیز طریقے سے اپنے تدبر اور سیاست کے جوہر دکھائے۔

تاریخ کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان تعلیم نسواں سے کبھی بیگانہ نہیں رہا ہے۔ہر زمانہ میں کوئی نہ کوئی ایسی قابل اور مایہ ناز خواتین یہاں پیدا ہوئی ہیں جن کا نام رہتی دنیا تک زندہ رہے گا۔ان معروف خواتین میں رضیہ سلطان، زیب النساء، نور جہاں وغیرہ کے نام شامل ہیں۔لیکن یہ ضرور تھا کہ اس دور میں تعلیم عام نہ تھی البتہ شاہی خاندانوں اور خواص میں علمی رجحان تھا۔اسی طرح بیگمات بھوپال تقریباً سب زیور تعلیم سے آراستہ تھیں اور جہاں تک ان بیگمات والیان ریاست بھوپال کی علمی و ادبی خدمات کا تعلق ہے تو پہلی فرمانروا خاتون نواب گوہر قدسیہ بیگم (۱۸۱۹ء۔۱۸۳۷ء) کے ہاتھ میں جب ریاست آئی تو وہ دینی و دنیاوی علوم و فنون سے آراستہ اور امور سلطنت میں ماہر خاتون تھیں۔انہوں نے تعلیم و تربیت کے لیے مدارس کھولے اور ریاست بھوپال میں باہر سے آنے والے علما و ادبا کو معقول وظائف سے نواز کر بھوپال میں آباد کیا۔قدسیہ بیگم کے عہد میں شمالی اور دکن کے کئی شعرا نے بھوپال میں قدم رکھا، جن میں حضرت شاہ روف احمد یافت رامپوری، عبدالواحد مسکین، بدیع الزماں، عبدالقادر عثمانی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔مذکورہ بالا شعرا کی آمد سے بھوپال میں شعری ماحول استوار ہوا۔

نواب گوہر قدسیہ بیگم کے بعد نواب سکندر بیگم (۱۸۴۷ء۔۱۸۶۸ء) حکمران مقرر ہوئیں۔نواب شاہجہاں بیگم کم عمر تھیں اس لیے سرپرست کی حیثیت نواب سکندر جہاں بیگم نے حکومت کی باگ دوڑ سنبھال لی تھی۔نواب سکندر جہاں بیگم کو نواب جہانگیر محمد خاں کی طرح اردو زبان سے بہت زیادہ دلچسپی تھی اس کا عملی مظاہرہ ہمیں ان کا شعرا و ادبا کی دل کھول کر مدد امداد کرنے سے پتہ چلتا ہے۔جب نواب سکندر جہاں بیگم شمالی ہند کے سفر پر گئیں تو دہلی اور لکھنو کے ادیبوں سے ملاقات کر کے انہیں بھوپال آنے کی دعوت دی جن میں مرزا غالب بھی شامل تھے۔لیکن غالب دہلی چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوئے لیکن نواب سکندر جہاں بیگم پھر بھی وقتاً فوقتاً ان کی مدد امداد کرتی رہتی

تھیں۔اسی حسن سلوک کا نتیجہ تھا کہ غالب نے اپنے قلم سے تصحیح کر کے اصل نسخہ نواب سکندر جہاں بیگم کی نذر کیا جو بعد ازاں کتب خانہ کی زینت بنا اور پھر وہی نسخہ "نسخہ حمیدیہ" کے نام سے شائع ہوا تھا۔

سکندر جہاں بیگم نے مشاہیر کی تصانیف کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کروایا تھا۔ریاست کے قوانین کو اردو میں مرتب کروائے۔اور سب سے بڑا کارنامہ ۱۸۵۹ء میں فارسی کی جگہ اردو کو عدالتی اور سرکاری زبان بنایا۔نواب سکندر جہاں بیگم نے سخت تنبیہ کی کہ اردو زبان میں تمام سرکاری احکامات وہدایات دی جائیں۔ہندی،فارسی،اردو کے مدارس کھولے،خود بھی تصنیف وتالیف کا ذوق رکھتی تھیں،لہذا کئی کتابیں اردو میں تحریر کیں تھیں۔ان کے دور کے اہم شعرا میں امجد علی اشہری،مولانا عباس رفعت شیروانی،مولوی جمال الدین گمنام،منشی احمد یار خاں،قدرت اللہ بنارسی،جگل کشور سیراب،امداد علی امداد،اصغر حسین اخگر،عبدلاحمید عاجز قابل ذکر نام ہیں۔۱۸۵۷ء میں نواب سکندر جہاں بیگم نے "مطبع سکندر" کے نام سے ایک بہت بڑا چھاپا خانہ قائم کیا۔

نواب سکندر جہاں بیگم کے عہد میں بھوپال کے ادب پر دہلویت کے اثرات نمایاں ہیں۔فرمانرواں کی سرپرستی میں قصیدے بلکہ اعلی معیار کی مثنویاں بھی لکھی گئیں تھیں۔اس دور میں استادی وشاگردی کا بھی بڑے پیمانے پر سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔غزل میں دہلوی عناصر کا بھرپور اظہار کیا گیا اور ساتھ ہی جذباتی سطح پر آتش وناسخ کے رنگ کی بھی کورانہ تقلید موجود ہے۔بھوپال میں خواتین کی حکمرانی کے باعث یہاں کی شاعری میں ابتذال نہیں پیدا ہو سکا تھا۔ نواب سکندر جہاں بیگم خود بھی مصنفہ تھیں ان کی کتابوں میں "تاریخ سکندری،آئین سکندری،سفر حجاز،تاج الاقبال" وغیرہ شامل ہیں۔

نواب سکندر جہاں بیگم کی اگر علمی وادبی خدمات کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ درحقیقت سکولوں کا اجرا اور ان کا انتظام انہی کے عہد یعنی ۱۸۴۸ء سے شروع ہوتا ہے۔یہ وہ دور ہے جب لڑکیوں کی تعلیم پر کوئی مناسب توجہ نہیں دی جاتی تھی۔لڑکیوں کے لئے کوئی مدرسہ نہیں بنایا گیا جبکہ لڑکوں کے لئے بعض مقامات پر مدرسے کھولے جا چکے تھے۔ایسے وقت میں نواب سکندر جہاں بیگم کا لڑکیوں اور لڑکوں دونوں کے لئے مدرسے کا قیام دراصل ایک زبردست مثال تھا کہ ایک فرمانروا کو کیسے اپنی رعایا کے مرد وعورتوں کی تعلیم پر یکساں توجہ صرف کرنی چاہیے۔نواب سکندر جہاں بیگم نے نہ صرف مدرسے قائم کیے بلکہ ان مدرسوں کے کامیاب طلبہ وطالبات کو کامیابی پر تحفے تحائف بھی دیئے جاتے جس سے ان کی حوصلہ افزائی ہوتی اور مزید پڑھنے کی لگن پیدا ہوتی تھی۔یتیم و

لاوارث اور غریب بچیوں کے لئے کوئین وکٹوریہ کے نام سے وکٹوریہ اسکول قائم کیا تھا۔ جس میں پڑھائی کے علاوہ دستکاری کی طرف بھی توجہ دی جاتی تھی۔ اس سکول کی لڑکیوں کی ہاتھ سے تیار چیزوں کو نواب سکندر جہاں بیگم یورپین خواتین کو بطور تحفتہ پیش کرتیں۔ نواب سکندر جہاں بیگم فرصت کے اوقات میں بذات خود سکولوں کا معائنہ کرتیں، حاضری پر خصوصی توجہ صرف کی جاتی تھی۔ طلبہ وطالبات کی حاضری کے رجسٹرڈ ماہانہ بنیادوں پر نواب سکندر جہاں بیگم کے سامنے پیش کیے جاتے تھے۔ اساتذہ وطالبعلموں کی حوصلہ افزائی کی خاطر مالی معاونت کی جاتی تھی تاکہ وہ مزید دل لگا کر محنت سے کام کریں۔ ضلع ساگر کے قریب مدرسہ ساگر قائم کیا اور پھر وہاں کے کامیاب طلبہ کو ۵۰۰ روپے انعام واکرام سے نوازا۔ مدرسہ سہیور کی عمارت بہت چھوٹی تھی اس کو وسعت دینے کی خاطر ۱۸۵۰ء میں از سر نو عمد تعمیر کروائی۔ علاوہ ازیں سکول کے بچوں کی شادیوں کی زمہ داری بھی نواب سکندر جہاں بیگم خود سرانجام دیتی، شادی کے تمام اخراجات ریاست کے سپرد ہوتے تھے۔ نواب سکندر جہاں بیگم کو اس معاملے میں بھی اولیت حاصل ہے کہ وہ ہندوستان کی پہلی خاتون ہیں جنہوں نے مجمع عام میں تقریریں کیں۔ ہندوستانی معاشرے میں ایسا ہونا اگرچہ ایسا ناممکن تھا لیکن نواب سکندر جہاں بیگم نے اسے ممکن بنایا۔ نواب سکندر جہاں بیگم فرمانروائے بھوپال میں وہ فرمانروا ہیں جن کی زندگی طبقہ نسواں کے لیے کامل نمونہ ہے۔

ریاست بھوپال کی تیسری حکمران نواب شاہجہاں بیگم (۱۸۶۸ء۔۱۹۰۱) اعلی انسانی صفات کی حامل خاتون تھیں۔ حکومتوں اور سلطنتوں کی تاریخ میں ایسی مثالیں شاذونادر ہی دیکھنے میں ملتی ہیں جب کسی ولی ریاست نے اپنی فرمانروائی کے حق کو اپنے کسی قریبی یا عزیز کی محبت میں دستبرداری اختیار کی ہو۔ نواب شاہجہاں بیگم نے اپنی والدہ نواب سکندر جہاں بیگم کے حق میں دستبرداری ریاست کی۔ لیکن نواب سکندر جہاں بیگم کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ۱۶ نومبر ۱۸۶۷ء میں مسند ریاست ہوئیں۔ نواب شاہجہاں بیگم کے عہد حکومت میں تین بار قحط پڑا لیکن ان کی فہم وفراست نے عوام کو مشکلات سے نہ صرف بچایا بلکہ دیگر قحط زدگان ریاستوں کی بھی ہر طرح سے مدد امداد کی تھی۔

نواب شاہجہاں بیگم نے ریاست کی ترقی اور فلاح وبہبود کی خاطر اہم اقدامت کیے جن میں جرائم کی روک تھام کے لیے قانون بنائے۔ قیدیوں کو کام سکھانے کا بندوبست کیا تاکہ وہ قید سے رہائی پانے کے بعد کوئی پیشہ اختیار کر کے پرامن شہری بنیں اور سکون سے زندگی گزاریں۔ علاوہ ازیں نواب شاہجہاں بیگم نے فرمانروائی کے فورا بعد ریاست کی از سر نو پیمائش کروائی اور دورے کیے تھے۔ انہوں نے ہم وزن جدید قسم کا سکہ جاری کیا جس پر ان کے نام کا پہلا

حرف 'ش' اور سن ہجری کا اندراج تھا۔ ریاست کی بہبود کے لیے تالاب اور کنوئیں بنوائے۔ اپنی والدہ کی یاد میں ایک سرائے "سرائے سکندری" کے نام سے بنوائی تھی۔ نواب شاہجہاں بیگم نے برطانیہ میں پہلی مسجد بنوائی جو ووکنگ میں واقع ہے اور شاہجہانی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے ساتھ ایک لائبریری اور اور مدرسہ بھی ہے۔ سلطان ترکی نے نواب شاہجہاں بیگم کو تمغہ مجیدی درجہ اول سے نوازا تھا۔ حکومت برطانیہ نے انہیں ۱۸۷۲ء میں خطاب جی۔ سی۔ ایس، آئی اور ۱۸۷۲ء میں ہی تمغہ "قیصر ہند" اور میں کراون آف انڈیا' کے خطابات دیئے۔ نواب شاہجہاں بیگم نے اپنی رعایا کی بہبودی کے لئے بھوپال میں ایک اسپتال پرنس آف ویلز اور دوسرا زنانہ اسپتال لیڈی لینڈنس ڈاون کے نام سے قائم کیے۔ بھوپال کے قریب ضلع سہیور میں جذام کے مریضوں کے علاج کے لئے ایک جذام خانہ قائم کیا۔ نواب شاہجہاں بیگم نے ریاست بھوپال میں تعلیم کے فروغ کے لئے محکمہ تعلیم قائم کیا جس کا نام نظارۃ المعارف العمومیہ تھا۔ انہوں نے کئی مدرسے قائم کیے۔ اپنے والد نواب جہانگیر محمد خاں کی یادگار کے طور پر مدرسہ جہانگیریہ قائم کیا۔ جہاں تعلیم حاصل کرنے کے لیے دور دور سے طالب علم آتے تھے اور ان کو وظیفے دیئے جاتے تھے۔ صنعتی تعلیم کے لئے پرنس آف ویلز اسکول قائم کیا۔ وہاں غریب و نادار طالبعلوں کے لئے لباس اور کھانے کا بھی انتظام کیا۔ نواب شاہجہاں بیگم کو تعلیم و تعلم سے شغف تھا انہوں نے نواب سکندر جہاں بیگم کے قائم کردہ مدرسہ سلطانیہ کو ترقی دی اور ۱۸۹۲ء میں اس کا الحاق کلکتہ یونیورسٹی سے کیا۔ اس مدرسہ میں اردو، عربی اور فارسی کے ساتھ انگریزی تعلیم کا بھی انتظام کیا۔ مدرسوں کے لئے باقاعدہ نصاب جاری کئے تھے۔ مدرسوں کی ملازمت کے لئے سرٹیفیکٹ اور سند کو ضروری قرار دیا۔ نواب شاہجہاں بیگم علی گڑھ سائنٹفک سوسائٹی کی سرپرست بھی تھیں۔ ۱۸۹۱ء میں جب سرسید دکن میں جاتے ہوئے بھوپال مقیم ہوئے تو نواب شاہجہاں بیگم نے محمڈن کالج کی مسجد کی تعمیر کے لئے دس ہزار روپیہ اور دو ہزار روپیہ باقی عزیزوں کی جانب سے بھجوائے۔ سرسید نے شکریہ کے طور پر ان کے لئے فارسی میں نظم لکھی تھی۔

نواب شاہجہاں بیگم کے دور حکومت میں اعلی فنکاروں، ادیبوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ اپنے والد جہانگیر محمد خاں کی طرح خود بھی صاحب دیوان شاعرہ تھیں۔ پہلے شیریں بعدازاں تاجور تخلص کرتی تھیں۔ ان کا پہلا دیوان "دیوان شیریں" اور دوسرا "تاج الکلام" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ فن شاعری میں ان کا ایک اور شاہکار نمونہ مثنوی "صدق البیان" ہے جس میں سلاست و روانی پائی جاتی ہے۔ نثری کتب میں

''خزینۃ اللغات''، اور ''نادر اللغات'' ان کی بہترین یادگار ہیں۔ اردو اور فارسی کے علاوہ نواب شاہجہاں بیگم ہندی میں بھی روپ رتن کے تخلص سے شعر کہتی تھیں۔ ہندی کے معروف ادیب بھارتیندو نے ''آریہ ورت'' رسالہ میں ان کا خاص طور پر ذکر کیا ہے کہ بیگم صاحبہ کی علمی و ادبی حیثیت اور فنون لطیفہ سے نسبت کے بارے میں بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان سے پہلے اردو زبان و ادب کی تاریخ میں کوئی خاتون ان کے ہم پلہ نظر نہیں آتی ہے۔ وہ صاحب طرز نثر نگار، ماہر لسانیات اور دانشور ہونے کے ساتھ ساتھ ایک معیاری شاعرہ بھی تھیں۔ شاہجہاں بیگم کے شوہر نواب صدیق حسن خاں بھی بڑے عالم، شاعر اور ادب نواز تھے۔ بیگم صاحبہ خود بھی محل میں مشاعروں کا اہتمام کرواتی تھیں۔ ''تاریخ ادب اردو'' کے مولف رام بابو سکسینہ نے ان کی شاعرانہ صلاحیت کا اعتراف کیا ہے، ان کے زمانے میں کم و بیش ڈیڑھ سو خواتین کے مشاعروں میں شرکت کرتی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دور شاہجہانی میں بھوپال علم و ادب کا مرکز بن گیا تھا، اپنے شوہر کے تعاون سے شاہجہاں بیگم نے علما و فضلا کی سرپرستی ہی نہیں کی، سینکڑوں ایسی نایاب کتابیں شائع کرنے کے لئے وسائل فراہم کئے، جن کے چھپنے سے اس ریاست کا نام دنیا بھر میں مشہور ہو گیا۔ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی کی تحقیق کے مطابق، دور شاہجہانی میں چودہ تذکرے لکھے گئے۔ انہوں نے عصری تعلیم کے جگہ جگہ مدارس کھولے اور اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے مطبع ''شاہجہانی'' قائم کیا۔ اس مطبع سے ۱۸۷۱ء میں اردو کا پہلا اخبار ''عمدۃ اخبار'' شائع ہوا، امجد علی اشہری کا نیم سرکاری اخبار ''دبیر الملک'' بھی اسی دور کی یادگار ہے۔

ریاست بھوپال کی چوتھی اور آخری بیگم نواب سلطان جہاں بیگم (۱۹۰۱۔۱۹۲۶ء) بالغ نظر، زمانہ شناس اور روشن خیال خاتون تھیں۔ انہوں نے وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق بھوپال کی عوام کو ترقی دینے اور دیگر ترقی یافتہ اقوام کے روبرو کھڑا کرنے کی بہت کوشش کی۔ علمی و ادبی سطح پر دیکھا جائے تو ان کے عہد میں اردو زبان و ادب میں بہت ترقی ہوئی۔ نواب سلطان جہاں بیگم خود بھی مصنفہ تھیں اور وقتاً فوقتاً کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے بیشتر کتب تعلیم اور اس کے مسائل سے متعلق ہیں اور اتنی معیاری کتب ہیں کہ اس موضوع کی اہم کتابوں کے مقابلے میں رکھی جا سکتی ہیں۔ ان کی تصانیف معمولی قصے کہانیوں پر مشتمل نہیں ہیں بلکہ تمام مختلف مضامین سے بھری پڑی ہیں مثلاً کوئی خانہ داری پر ہے تو کوئی باغبانی پر، کسی میں سائنس کا بیان ہے تو کسی میں تیمارداری کا ذکر ہے۔ کہیں مستورات کے حقوق و فرائض کا ذکر ہے تو کہیں انہیں مذہب کی پابندی پر متوجہ کیا ہے۔ غرض جس کتاب کو لیں وہ کسی نہ کسی مفید موضوع پر لکھی گئی ہے۔ بچوں کے لیے بھی کتب تحریر کیں۔ عورتوں کے متعلق کتابوں میں دلچسپ

معلومات کا خزانہ ہے۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے ریاست بھوپال کے قوانین وضع کیے اور ان کو کتابی شکل میں طبع کروایا۔

نواب سلطان جہاں بیگم کے عہد کے دیگر مصنفین شعرا و ادبا میں شاگرد داغ امداد علی عیش، منشی انور علی، عبدالوسع صفا، ذکی وارثی، منیر الدین منیر، حافظ سلیمان، مفتی فضل، حامد حسین ترمذی وغیرہ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں نواب سلطان جہاں بیگم نے دفتر تاریخ قائم کر کے بڑے پیمانے پر علمی کتابیں لکھوائیں تھیں۔ ان لکھنے والے ادیبوں میں محمد امین زبیری، نیاز فتح پوری، علامہ محوی صدیقی، محمد یوسف قیصر وغیرہ معروف نام ہیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے علامہ شبلی نعمانی کی شہرہ آفاق "سیرت النبی" اور علامہ سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴ء۔۱۹۵۳ء) کی "سیرت عائشہ" لکھوائی تھیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے شعرا کو قصائد و غزلیات سے اجتناب کرنے کا کہا اور تنبیہ کی کہ اپنی توجہ ایسی اصلاحی شاعری کی طرف مبذول کرنے کا مشورہ دیا جو قوم کی صحیح تربیت و اصلاح کا باعث ہو، گویا آج کی اصطلاح میں نواب سلطان جہاں بیگم نے "ادب برائے زندگی" کے نظریہ کی تخلیق و اشاعت پر زور دیا۔ جس کی وجہ سے اصلاحی ادب کے ساتھ ساتھ سادگی، حقیقت نگاری اور معنی خیز رمزیت شعرا کے کلام میں در آئی تھی۔

نواب سلطان جہاں بیگم ایک اعلی دینی، علمی و ادبی مزاج رکھتی تھیں۔ وہ بیدار مغز اور روشن خیال فرمانروا تھیں۔ تعلیم کے فوائد سے بخوبی آگاہی رکھتی تھیں یہی وجہ ہے کہ نواب سلطان جہاں بیگم کا مشن تعلیمی بیداری اور تعلیم کا فروغ تھا۔ ہندوستان میں تعلیم نسواں جیسے اہم اور دقیع مسئلہ پر جس تساہل اور تغافل سے قدم اٹھایا گیا ہے وہ سب پر روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ ایک مدت تک تو یہی نہ طے ہو پایا کہ طبقہ اناث پر تعلیم کا بوجھ ڈالنا مناسب ہوگا یا کہ نہیں، آخر کار جب تعلیم نسواں کو لازم و ملزوم شے سمجھا گیا اس وقت یہ مسلہ در پیش آیا کہ تعلیم نسواں کن بنیادوں پر مہیا کی جائے۔ ایسے وقت میں دیگر شخصیات کی طرح ایک نہایت سر گرم شخصیت جو اس مسئلے سے نبرد آزما ہونے کے لیے سامنے آئی وہ نواب سلطان جہاں بیگم کی تھی۔ نواب سلطان جہاں بیگم مردوں کی تعلیم کے ساتھ عورتوں کی تعلیم کو بھی ضروری سمجھتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ زندگی میں کامیابی اسی وقت قدم رکھتی ہے جب مرد اور عورت دونوں تعلیم یافتہ ہوں۔ بیوی کے پاس اتنی تعلیم ہونا ضروری ہے کہ شوہر کے ارادوں اور کاموں میں مددگار ہو۔ ان کے خیال میں مردوں کی تعلیم کی بہ نسبت عورتوں کی تعلیم سے بنی نوع انسان کی ترقی کو بہت زیادہ امداد ملتی ہے۔ اگر ان کی تربیت

ناقص رہ گئی تو مردوں کی خاطر خواہ ترقی ممکن نہیں۔ماں کی گود بچے کی پہلی درسگاہ ہوتی ہے لہذاماں کی شخصیت کے اثرات بچے پر مرتب ہوتے ہیں۔نواب سلطان جہاں بیگم نے ایسی مقصد کی خاطر بھوپال میں ایسے متعدد انسٹی ٹیوٹ قائم کیے جو عورتوں کی تعلیم و تربیت، تہذیب و تمدن کے سلسلے میں مفید ثابت ہوں۔سلطانیہ اسکول میں ٹیچرز کی ٹریننگ کے لیے ایک شاخ کھولی تاکہ معمولی لکھناپڑھنا جاننے والی خواتین کو بھی مکتبوں اور مدرسوں کے قابل بنایا جائے۔

نواب سلطان جہاں بیگم خاتون پہلے تھیں حکمران بعد میں،اسی لیے انہوں نے عوام کے مسائل اور بالخصوص محکوم اور مظلوم عورتوں کے حالات زندگی کا بہت قریب سے مطالعہ کیا تھا۔انہوں نے ہر مقام پر برملا اظہار کیا کہ عورتوں کی تعلیمی ترقی کی راہ میں روکاوٹ مردوں کی بے توجہی کے سبب ہے۔نواب سلطان جہاں بیگم نے ایک ایسی انجمن بنانے کی تجویز کی جس میں تمام اقوام ہند کی عورتیں شریک ہوکر اپنی ترقی و تعلیم ودیگر مسائل پر تبادلہ خیال اور غور وفکر کرسکیں۔اس تجویز کو شائع کرکے ملک کی تعلیم یافتہ ورؤساء کی بیگمات کو طلب رائے کے لئے بھیجاگیااور سب کی منظوری سے آل انڈیالیڈیز ایسوسی ایشن کے نام سے اجلاس ہوتے رہے تھے۔نواب سلطان جہاں بیگم کا صدارتی خطبہ مسائل نسواں پرایک اہم مرتبہ رکھتاہے۔انہوں نے عورتوں کی اصلاح و بہبود کے لیے جوش و خروش کے ساتھ کوشش کی اس کی ایک مثال بھوپال کے متعدد زنانہ اداروں بالخصوص پرنسس آف ویلز کلب ہے۔یہ ادارے عورتوں کی تعلیم اور تہذیب و تمدن کا سرچشمہ تھے۔نواب سلطان جہاں بیگم کو ایک امتیاز یہ بھی حاصل ہے کہ وہ دنیا کی یونیورسٹیوں میں پہلی خاتون چانسلر ہیں۔ مسلمانان ہند کی پہلی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قیام پراس کی پہلی چانسلر ۱۹۲۰ءمیں نواب سلطان جہاں بیگم مقرر ہوئیں جو متواتر دس سال تک اس عہدہ پر فائز رہیں تھیں۔اوراس کے بعدان کے بیٹے نواب حمیداللہ خاں پانچ سال چانسلر رہے۔نواب سلطان جہاں بیگم ایک علم دوست،ذہین خاتون تھیں۔انہوں نے علم وادب کے فروغ بالخصوص تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے نمایاں خدمات سرانجام دیں جنھیں فراموش نہیں کیا جاسکتاہے۔ بیگمات بھوپال کی منظم خدمات خواتین کو معاشرے کافعال عنصر بنانے اورانہیں طاقت مہیاکرنے کی ایک اہم اور تاریخ ساز کوششوں کا حصہ ہیں۔بیگمات بھوپال کی تعلیمی وادبی خدمات صرف ریاست بھوپال تک محدود نہیں تھیں بلکہ ان کے اثرات ہندوستان کے دیگر شہروں تک بھی پہنچے۔ان بیگمات کے کام کا اصل مقصد اگرچہ ادب اور تعلیم نسواں کافروغ تھامگر اس سے خواتین کی سماجی، ثقافتی، سیاسی بیداری اور شعور کے ساتھ ساتھ عمومی بہبود کے بھی

بہت سے فوائد حاصل ہوئے۔ بیگمات بھوپال نے فروغ تعلیم وادب کے لیے انتہائی اہم اور مشعل راہ بننے کے قابل کردار ادا کیا مگر افسوس کہ خواتین کے حوالے سے بعد کی تاریخ میں بیگمات کے اس کردار کا کماحقہ اعتراف کم کیا گیا ہے۔

کتابیات

کتابیات

بنیادی ماخذ:

☆ امین ماہروری، محمد۔بیگمات بھوپال۔بھوپال: مطبع سلطانی،۱۹۱۷ء

☆ اسداللہ، خاں۔سپاہی بہادر(۱۸۵۷ کی پہلی جنگ آزادی میں بھوپال کا حصہ)۔دہلی: نائس پرنٹنگ،۱۹۹۴ء

☆ اطہر صدیقی۔نواب سلطان جہاں بیگم حیات و خدمات۔نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،۲۰۰۳ء

☆ افتخار احمد صدیقی،ڈاکٹر۔مولوی نذیر احمد احوال و آثار۔لاہور: مجلس ترقی اردو،۱۹۷۱ء

☆ انیس ناگی۔ڈپٹی نذیر احمد کی ناول نگاری۔لاہور: فیروز سنز،۱۹۸۸ء

☆ اطہر صدیقی۔مشاہدات و تاثرات۔نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،۲۰۱۵ء

☆ چشتی، وھاج الدین۔بیگمات بھوپال۔کراچی: مکتبہ جدید پرنٹرز،۱۹۸۱ء

☆ حمیداللہ خاں، نواب۔خطبات سلطانی۔آگرہ: مطبع مفید عام آگرہ،۱۹۱۳ء

☆ حمیداللہ خاں، نواب۔سفر قسطنطنیہ۔قاسم پریس حیدرآباد دکن، س ن

☆ رضیہ حامد، ڈاکٹر۔سلطان جہاں بیگم۔بھوپال۔راشد پبلی کیشنز،۲۰۰۳ء

☆ رضیہ حامد، ڈاکٹر۔نواب شاہجہاں بیگم۔نئی دہلی: فائن آفیسٹ پریس اردو بازار،۲۰۱۵ء

☆ راحت ابرار، ڈاکٹر۔مسلم تعلیم نسواں کے سو سال(چلمن سے چاند تک)۔دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۱۰ء

☆ سلطان، جہاں بیگم۔حیات سلطانی۔آگرہ: عزیزی پریس،۱۹۳۹ء

☆ سلطان جہاں، بیگم۔باغ عجیب(حصہ دوم)۔آگرہ: شمسی مشین پریس،۱۹۲۴ء

☆ سلطان جہاں، بیگم۔باغ عجیب(حصہ سوم)۔آگرہ: شمسی پریس،۱۹۲۴ء

☆ سلطان جہاں بیگم، نواب۔حیات شاہجہانی۔مطبع مفید عام آگرہ،۱۹۱۴ء

☆ سلطان جہاں بیگم،نواب۔فرائض باغبانی۔شمسی پریس آگرہ،۱۹۲۳ء

☆ سلطان جہاں بیگم،نواب۔سلک شہوار۔طبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ،۱۹۱۹ء

☆ سلطان جہاں بیگم،نواب۔روضتہ الریاحین کشور حجاز۔بھوپال:مطبع سلطان باہتمام مولوی حمید اللہ،۱۹۰۳ء

☆ سلطان جہاں بیگم،نواب۔گوہر اقبال(حصہ اول)۔بھوپال:مطبع سلطانی پریس،۱۹۱۳ء

☆ سلطان جہاں بیگم،نواب۔گوہر اقبال(حصہ دوم)۔بھوپال:مطبع سلطانی پریس،۱۹۱۳ء

☆ سلطان جہاں بیگم،نواب۔ہدایات سلطانی۔بھوپال:مطبع سلطانی ریاست بھوپال،۱۹۱۳ء

☆ سلطان جہاں بیگم،نواب۔تذکرہ باقی۔بھوپال:مطبع سلطان دارالاقبال بھوپال،۱۹۱۵ء

☆ سلطان جہاں بیگم،نواب۔تزک سلطانی(تاج الاقبال)۔بھوپال:مطبع سلطانی پریس،س ن

☆ سلطان جہاں بیگم،نواب۔بچوں کی پرورش۔بھوپال:مطبع مفید آگرہ پریس،س ن

☆ سلطان جہاں بیگم،نواب۔ہندوستانی گھروں میں تیمارداری۔آگرہ:مطبع مفید عام آگرہ،۱۹۱۳ء

☆ سلطان جہاں بیگم،نواب۔آئین سکندری۔آگرہ:شمسی پریس آگرہ،۱۹۳۰ء

☆ سلطان جہاں بیگم،نواب۔مقصد ازدواج۔بھوپال:طبع سلطانی پریس،۱۹۲۰ء

☆ سلطان جہاں بیگم،نواب۔خانہ داری کا دوسرا حصہ حفظ صحت۔بھوپال:حمید اللہ پریس،بھوپال،۱۹۱۶ء

☆ سلطان جہاں بیگم،نواب۔تندرستی۔بھوپال:مطبع سلطانی پریس،۱۹۱۳ء

☆ سلطان جہاں بیگم،نواب۔مقصد ازدواج۔بھوپال:مطبع سلطانی پریس،۱۹۲۰ء

☆ سلطان جہاں بیگم،نواب۔تربیت الاطفال۔بھوپال:مطبع دارالاقبال پریس،۱۹۱۴ء

☆ سلطان جہاں بیگم،نواب۔مہذب زندگی۔بھوپال:مطبع سلطان پریس،س ن

☆ سلطان جہاں بیگم،نواب۔خانہ داری کا تیسرا حصہ معاشرت۔بھوپال:طبع سلطانی پریس،۱۹۱۶ء

☆ سلطان جہاں بیگم،نواب۔ہدیتہ الزوجین۔مطبع سلطانی پریس،۱۹۱۵ء

☆ سلطان جہاں بیگم،نواب۔حیات قدسی۔بھوپال:مطبع سلطانی پریس،۱۹۱۷ء

☆ سلطان جہاں بیگم، نواب۔سبیل الجنان۔ بھوپال: مطبع سلطانی پریس، ۱۹۱۶ء

☆ سلطان جہاں بیگم، نواب۔سیرت مصطفی۔ بھوپال: مطبع سلطانی پریس، ۱۹۱۹ء

☆ سلطان جہاں بیگم، نواب۔عفت المسلمات۔ بھوپال: مفید عام اسٹیم پریس، ۱۹۱۸ء

☆ سلطان جہاں بیگم، نواب۔سبیل الجنان۔ بھوپال: مطبع سلطانی پریس، ۱۹۱۷ء

☆ سلطان جہاں بیگم، نواب۔سیرت مصطفی۔ مطبع سلطانی پریس، ۱۹۱۹ء

☆ سلطان جہاں بیگم، نواب۔اختر اقبال۔ بھوپال: مطبع مفید آگرہ پریس، ۱۹۱۴ء

☆ سید تقی عابدی، ڈاکٹر۔حالی فہمی۔ بک کارنر جہلم: س ن

☆ سعید الحق جدون۔ہماری تعلیمی زبوں حالی، اسباب و تدارک۔ صوابی: جدون پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء

☆ سربلند جنگ بہادر، بیگم۔دنیا عورت کی نظر میں۔ دہلی: خواجہ برقی پریس، ۱۹۰۹ء

☆ سلیم حامد رضوی، ڈاکٹر۔اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ۔ بھوپال: باب العلم پبلیکشنز

۲۰۱۴ء

☆ شبلی احمد، ڈاکٹر۔مسلمانوں کانظام تعلیم۔ بک ہوم لاہور، ۲۰۰۴ء

☆ طیبہ بی۔تاریخ فرمارو ایان بھوپال۔ بھوپال: بھوپال پریس، ۱۹۷۷ء

☆ عصمت جمیل، ڈاکٹر۔نسائی شعور کی تاریخ۔اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء

☆ عبدالغنی، بیگم۔بیگمات بھوپال۔ کراچی: کارواں پبلیشرز، ۱۴۰۵ھ

☆ فرانز فینن۔افتادگان خاک۔مترجم محمد پرویز۔ سجاد باقر رضوی: نگارشات لاہور، ۱۹۶۹ء

☆ کارل مارکس، فریڈرک اینگلز۔ہندوستان کا تاریخی خاکہ۔مترجم احمد سلیم۔ تخلیقات لاہور، ۲۰۰۲ء

☆ محمد حسین زبیری۔مشاہیر کے تعلیمی نظریے۔ دہلی: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۵۸ء

☆ محمد حسن جان۔شریعت محمدی اور مسلمان عورت۔اسلام آباد: مدرسہ محمودیہ تحفیظ القرآن، ۲۰۰۰ء

☆ مناظر احسن گیلانی، سید۔پاک و ہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت۔ حصہ اول۔ دکن: ندوۃ

المصنفین، ۱۹۴۷ء

☆ محمد نعمان، خاں، ڈاکٹر۔بھوپال میں اردو انضمام کے بعد(۱۹۴۹ء۔۱۹۸۵ء)۔دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۶ء

☆ محمد امین زبیری، مارہروی۔حیات سلطانی۔عزیزی پریس آگرہ،۱۹۳۹ء

☆ مولانا الطاف حسین حالی۔حیات جاوید۔لاہور؛سیونتھ سکائی پبلیشرز،۲۰۱۵ء

☆ محمدی بیگم۔رفیق عروس۔لاہور:دارالاشاعت پنجاب،۱۹۳۶ء

☆ محمدی بیگم۔آداب ملاقات۔لاہور:دارالاشاعت پنجاب،۱۹۲۷ء

☆ صادق الخیری،دل ہمنشین۔دہلی:مطبوعہ محبوب المطابع برقی پریس،جون ۱۹۲۹ء

☆ ناصر عباس نیر۔لسانیات اور تنقید۔اسلام آباد:پورب اکادمی،۲۰۰۷ء

☆ و۔اصاحبہ۔تذکرۃ بیگمات بھوپال۔لاہور:دارالاشاعت پنجاب،۱۹۳۳ء

ثانوی ماخذات:

☆ اقبال، رابعہ۔اردو ادب میں طبقہ نسواں۔حیدرآباد:ادارہ اردو،۱۹۹۰ء

☆ اقبال، جاوید۔آزادی نسواں زوال نسواں۔لاہور:علم و عرفان پبلی شرز،۲۰۰۷ء

☆ اختر، سلیم۔عورت جنس کے آئینے میں۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۶ء

☆ آرا، نسیم۔اردو صحافت کے ارتقا میں خواتین کا حصہ۔کراچی:انجمن ترقی اردو،۲۰۰۸ء

☆ اعظمی، نجم السحر۔علامہ راشدالخیری:شخصیت اور ادبی خدمات۔دہلی:جامعہ نگر،۲۰۰۰ء

☆ ایچ۔جی ویلز۔مختصر تاریخ عالم۔لاہور:تخلیقات،۲۰۱۴ء

☆ انور سدید، ڈاکٹر۔اردو ادب کی تحریکیں۔کراچی:انجمن ترقی اردو،۲۰۰۶ء

☆ ارحمان، عطا۔سرسید اور اردو کے نثری زاویے۔لاہور:گوہر پبلی کیشنز،۱۹۹۸ء

☆ بنیرجی، پاولا۔امن کی سیاست میں خواتین کا کردار۔مترجم اعزاز باقر۔لاہور:مشعل بکس،۲۰۱۳ء

☆ تاراچند۔تمدن ہند پر اسلامی اثرات(ترجمہ:از محمد مسعود احمد)۔لاہور:مجلس ترقی ادب،۱۹۶۴ء

☆ جمیل جالبی، ڈاکٹر۔تنقید اور تجزیہ۔لاہور:یونیورسل بکس،۱۹۸۸ء

☆ جین، جسبیر۔تحریک نسواں :ثقافت ،موضوعیت اور نمائندگی۔مترجم اعزاز باقر۔لاہور:مشعل بکس،۲۰۱۴ء

☆ حالی، الطاف حسین۔مجالس النساء۔مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی۔پانی پت:حالی پریس،۱۹۶۴ء

☆ حالی، الطاف حسین حالی۔ہماری معاشرت کی اصلاح کیوں کر ہو سکتی ہے۔کلیات نثر حالی۔ج 1۔مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی۔لاہور:مجلس ترقی ادب،۱۹۶۷ء

☆ حنا، زاہدہ۔عورت زندگی کا زنداں۔کراچی:سٹی بک پوائنٹ،۲۰۱۰ء

☆ حنا، زاہدہ۔نسائی ادب:ایک سرسری جائزہ۔ادبیات۔ج۱۸،ش۷۵۱(جنوری تا جون ۲۰۰۷ء)

☆ خان، سرسید احمد۔عورتوں کے حقوق۔مقالات سرسید۔مولانا محمد اسماعیل۔لاہور:مجلس ترقی ادب،۱۹۹۰ء

☆ خان، سرسید احمد۔کیا سبب ہوا ہندوستان کی سرکشی کی۔مقالات سرسید۔مرتبہ مولانا اسماعیل۔لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۲ء

☆ خان، سرسید احمد۔ہندوستان کی عورتوں کی حالت۔مقالات سرسید۔مرتبہ مولانا محمد اسماعیل۔لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۰ء

☆ خان، وحید الدین۔خاتون اسلام(اسلامی شریعت میں عورت کا مقام اور جدید تہذیب کا تقابل)۔نئی دہلی: مکتبہ الرسالہ، ۱۹۸۷ء

☆ ذکی، صادقہ۔ادب خواتین اور سماج۔نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۱۹۹۰ء

☆ رحمان، خالد۔سلیم منصور، خالد۔خواتین معاشی اختیار اور تعلیم۔اسلام آباد: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز، ۲۰۰۷ء

☆ رزمی، ثاقب۔آزادی نسواں کا نیا سویرا۔کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۸۲ء

☆ سمیع الدین، عابدہ۔ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ۔پٹنہ: ادارہ تحقیقات اردو، ۱۹۹۰ء

☆ سرتاج، بانو۔ہندوستان کی اکیاون اول خواتین(مختلف شعبہ جات میں)۔نئی دہلی: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۰ء

☆ عباس، اصغر۔علی گڑھ تحریک اور خواتین۔اردو ادب کو خواتین کی دین۔دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۹۴ء

☆ کیمسن، ایم۔داستان جمیلہ خاتون۔کانپور: مطبع نظامی، س ن

☆ خان بہادر۔مولوی ذکاءاللہ۔تاریخ ہندوستان۔علی گڑھ: مطبع انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۱۹ء

☆ ڈبلیو ہنٹر۔ہمارے ہندوستانی مسلمان۔مترجم صادق حسین۔لاہور: اقبال اکادمی، ۱۹۶۴ء

☆ سیمیں ثمر فضل، ڈاکٹر۔ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی ناولوں کا حصہ۔دہلی: اے ون فوٹو سٹیٹ

☆ فصیح الدین۔تذکرہ نسواں ہند۔دہلی: الامین پرنٹنگ پریس، ۱۹۵۱ء

☆ قدوائی، مشیر حسین، شیخ۔تعلیم نسواں۔ لکھنو: مطبع نول کشور،۱۹۰۱ء

☆ مسعود طاہر۔اردو صحافت انیسویں صدی میں۔ کراچی: فضلی سنز لمیٹڈ،۲۰۰۲ء

☆ مبارک علی،ڈاکٹر۔برطانوی ہندوستان۔لاہور: فکشن ہاؤس،۲۰۱۰ء

☆ مہدی، صغرا۔تحریک نسواں کے علمبردار۔فیمنزم اور ہم۔مرتب فاطمہ حسن۔ کراچی: وعدہ کتاب گھر،۱۹۹۹ء

☆ نظامی، خواجہ حسن۔عورت کے نام کا پردہ: تبلیغ نسواں۔ج۔ا۔ش،۱۹۶۲ء

☆ وشکاسید،ڈاکٹر۔برطانوی پنجاب کی مسلمان خواتین(چار دیواری سے میدان سیاست)۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۳ء

رسائل:

☆ عتیق احمد صدیقی۔سرسید اور تعلیم نسواں۔سہ ماہی فکر وآگاہی۔ علی گڑھ نمبر(۲۰۰۰)

☆ صفورا خیری۔ماہنامہ عصمت۔ کراچی: جون، جولائی۲۰۱۴ء

☆ اردو رسائل۔پٹنہ: خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری۔(۱۹۹۲ء۔۱۹۹۵ء)

☆ صغیر افراہیم۔تہذیب الاخلاق۔ علی گڑھ: ادارہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،۲۰۱۶ء

☆ شیخ عبداللہ۔ خاتون۔ علی گڑھ: مطبع فیض عام،(۱۹۰۶ء۔۱۹۱۵ء)

☆ شگفتہ فرحت۔ مجلہ عکس بھوپال۔تذکرہ شخصیات بھوپال۔ کراچی: گلشن اقبال، س ن

☆ محمد امین زبیری۔بھوپال کا علمی جائزہ۔ کراچی: مطبوعہ رسالہ اردو، جنوری۱۹۵۸ء

انگریزی کتب:

- Claudia Preckel.(2000).Begums of Bhopal .New Dheli:Lotus collections.
- Shaharyar M.khan .(2002).Begums of Bhopal:ADynasty of women Rulers in Raj india .i.B.tauris.
- Shah jahan ,Begum.(1976).The Taj.ul Iqbal Tarikh Bhopal,or The History of Bhopal ,translated by H.C.Barstow .calcuta Thacker spimk.http: //en. wikipedia .org/wiki/Nawab of Bhopal.

ضمیمہ جات

ضمیمہ نمبر (۱)

فرمانروایان ریاست بھوپال اور برطانوی سرکاری حکام

فرمانروا ریاست	گورنر جنرل	ایجنٹ گورنر جنرل	پولیٹیکل ایجنٹ
نواب فیض محمد خان (۱۷۴۴۔۱۷۷۷ء)	گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز (Warren Hastings) (۱۷۷۲ء)		
نواب حیات محمد خان (۱۷۷۷۔۱۸۰۷ء)	۱۔ گورنر جنرل مارکیوس کورنوالس (Marquees Cornwallis) (۱۷۸۶ء) ۲۔ گورنر جنرل سرجان شور (Sir John Shore) (۱۷۹۳ء) ۳۔ گورنر جنرل مارکیوس کورنوالس (Marquees Cornwallis) (۱۸۰۵ء)		
نواب غوث محمد	گورنر جنرل منٹو (Minto) (۱۸۰۷ء)		

فرمانروایان ریاست بھوپال اور برطانوی سرکاری حکام

فرمانروا ریاست	گورنر جنرل	ایجنٹ گورنر جنرل	پولیٹیکل ایجنٹ
خاں(۱۸۰۷ء)			
نواب وزیر محمد خاں(۱۸۰۷۔۱۸۱۶ء)	گورنر جنرل مور ہیسٹنگز (More Hastings)(۱۸۱۴ء)		
نواب نذر محمد خاں(۱۸۱۶۔۱۸۱۹ء)			پولیٹیکل ایجنٹ ڈبلیو۔ ہینلے(W.Henley)(۱۸۱۸ء)
نواب قدسیہ بیگم (۱۸۱۹۔۱۸۳۷ء)	۱۔ گورنر جنرل ایمہرسٹ (Amherst)(۱۸۲۳ء) ۲۔ گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹک (Lord William Bentinck)(۱۸۲۸ء) ۳۔ گورنر جنرل آوک لینڈ(Auckland)(۱۸۳۵ء)	مسٹر میڈ (Mr.Meade)(۱۸۲۳ء)	۱۔ ٹی۔ ایچ میڈوکز(T.H.Maddocks)(۱۸۲۴ء) ۲۔ کیپٹن۔ این۔ آلیوس(Capt.N.Aloes)(۱۸۲۸ء) ۳۔ ایل۔ ولکنسن(L.Wilkinson)(۱۸۳۴ء)

فرمانروایان ریاست بھوپال اور برطانوی سرکاری حکام

فرمانروا ریاست	گورنر جنرل	ایجنٹ گورنر جنرل	پولیٹیکل ایجنٹ
جہانگیر محمد خان (۱۸۳۷ـ۱۸۴۴ء)	گورنر جنرل ایلن بوروگ (Ellenborough) (۱۸۴۲ء)		ایچ۔ڈبلیو۔ٹریولین (H.W.Trevelyan) (۱۸۴۲ء)
نواب سکندر بیگم (۱۸۴۴ـ۱۸۶۸ء)	۱۔ گورنر جنرل وسکونٹ ہارڈنگ (Viscount Hardinge) (۱۸۴۴ء) ۲۔ گورنر جنرل ڈلہوزی (Dalhousie) (۱۸۴۸ء) ۳۔ گورنر جنرل کیننگ (Canning) (۱۸۵۶ء) ۴۔ گورنر جنرل ایلگن (Elgin) (۱۸۶۲ء) ۵۔ گورنر جنرل لارڈ لارنس (Lord	۱۔ سر رابرٹ ہملٹن (Sir Robert Himilton) (۱۸۵۴ء) ۲۔ سر رچمونڈ شیکسپیئر (Sir Richmond Shakespear) (۱۸۵۹ء) ۳۔ سر رچرڈ میڈ (Sir Richard Meade) (۱۸۶۱ء)	۱۔ جے۔ڈی۔ کننگھم (J.D.Cunningham) (۱۸۴۷ء) ۲۔ میجر ایچ۔ایم۔ڈورینڈ (Maj.H.M.Durand) (۱۸۵۰ء) ۳۔ ڈبلیو۔ایف۔ایڈن (W.F.Eden) (۱۸۵۴ء) ۴۔ میجر مکمولین (Maj.Mumillin) (۱۸۵۹ء) ۵۔ اے۔آر۔ای ہیچنسن (A.R.E.Hutchinson) (۱۸۶۱ء) ۶۔ جے۔ڈبلیو۔آسبرون (J.W.Osborne) (۱۸۶۳ء)

فرمانروایان ریاست بھوپال اور برطانوی سرکاری حکام

فرمانروا ریاست	گورنر جنرل	ایجنٹ گورنر جنرل	پولیٹیکل ایجنٹ
	(Lawrence)(۱۸۶۳ء)		
نواب شاہجہاں بیگم (۱۸۶۸۔۱۹۰۱)	۱۔ گورنر جنرل میو (Mayo)(۱۸۶۹ء)	۱۔ سر ہنری ڈیلی (Sir Henry Daly)(۱۸۶۹ء) ۲۔ سر لیپل گریفن (Sir Lepel Griffin)(۱۸۸۱ء)	۱۔ کرنل۔ای۔تھامسن (Col. E.Thomson)(۱۸۶۹ء) ۲۔ کرنل۔ڈبلیو۔کنکیڈ (Col.W.Kincaid)(۱۸۷۴ء)

فرمانروایان ریاست بھوپال اور برطانوی سرکاری حکام

فرمانروا ریاست	گورنر جنرل	ایجنٹ گورنر جنرل	پولیٹیکل ایجنٹ
	۲۔ گورنر جنرل نارتھ بروک (Northbrook) (۱۸۷۲ء) ۳۔ گورنر جنرل لیٹن (Lytton) (۱۸۷۶ء) ۴۔ گورنر جنرل ریپن (Ripon) (۱۸۸۰ء) ۵۔ گورنر جنرل ڈفرین (Dufferin) (۱۸۸۴ء) ۶۔ گورنر جنرل ایلگن (Elgin) (۱۸۹۴ء) ۷۔ گورنر جنرل لارڈ کرزن (Lord.Curzon) (۱۸۹۹ء)	۳۔ مسٹر ایف۔ ہنوے (Mr.F.Henvey) (۱۸۸۸ء) ۴۔ سر ڈیوڈ بار (Sir.David Barr) (۱۸۹۴ء) ۵۔ مسٹر سی۔ ایس۔ بیلی (Mr C.S.Bayley) (۱۹۰۰ء)	۳۔ کرنل ۔ جے۔ میڈ (Col.J.Meade) (۱۸۹۱ء) ۴۔ کرنل ۔ جے۔ نیمرچ (Col.J.Newmarch) (۱۸۹۶ء) ۵۔ جے ۔ لینگ (J.Lang) (۱۹۰۰ء)

فرمانروایان ریاست بھوپال اور برطانوی سرکاری حکام

فرمانروا ریاست	گورنر جنرل	ایجنٹ گورنر جنرل	پولیٹیکل ایجنٹ
نواب سلطان جہاں بیگم (۱۹۰۱ـ۱۹۲۶ء)	۱ـ گورنر جنرل منٹو(Minto)(۱۹۰۵ء) ۲ـ لارڈ ہارڈنگ (Lord Hardinge)(۱۹۰۱ء) ۳ـ وسکونٹ چیمسفورڈ (Viscount Chemlosford)(۱۹۱۶ء) ۴ـ گورنر جنرل لارڈ ہیلفکس (Halifax)(۱۹۲۶ء)	۱ـ کرنل ـ ہگ ڈیلی (Col.Hugh Daly)(۱۹۰۵ء) ۲ـ مسٹر ایم ـ ایف ـ ڈیر (Mr.M.F.Dwyer)(۱۹۱۰ء) ۳ـ مسٹر آر ـ آر ـ گلینسی (Mr.R.R. Glancy)(۱۹۱۴ء)	۱ـ میجر ـ ایل اپمی(Maj.L.Impey)(۱۹۰۳ء) ۲ـ میجر سمتھ(Maj.smith)(۱۹۰۴ء) ۳ـ میجر ـ ایس ـ ایف بیلی(Maj.S.F.Bayley)(۱۹۰۸ء) ۴ـ ڈبلیو ـ ایس ـ ڈیوس (W.S.Davis)(۱۹۱۳ء) ۵ـ اے ـ آر ـ جیلف(A.R.Jelf)(۱۹۲۵ء)

ضمیمہ نمبر (۲)

عہدِ حکومت فرمانروایانِ ریاستِ بھوپال

۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲	۱۳
سردار دوست محمد خان (بانیٔ ریاست بھوپال)	نواب یار محمد خان	نواب فیض محمد خان	نواب حیات محمد خان	نواب غوث محمد خان	نواب وزیر محمد خان	نواب نذر محمد خان	نواب قدسیہ بیگم	نواب جہانگیر محمد خان	نواب سکندر جہاں بیگم	نواب شاہجہان بیگم	نواب سلطان جہاں بیگم	نواب حمید اللہ خان

ضمیمہ نمبر (۳)

VIEW IN CITY OF BHOPAL

[illegible]

بھوپال شہر

اورنگزیب عالمگیر

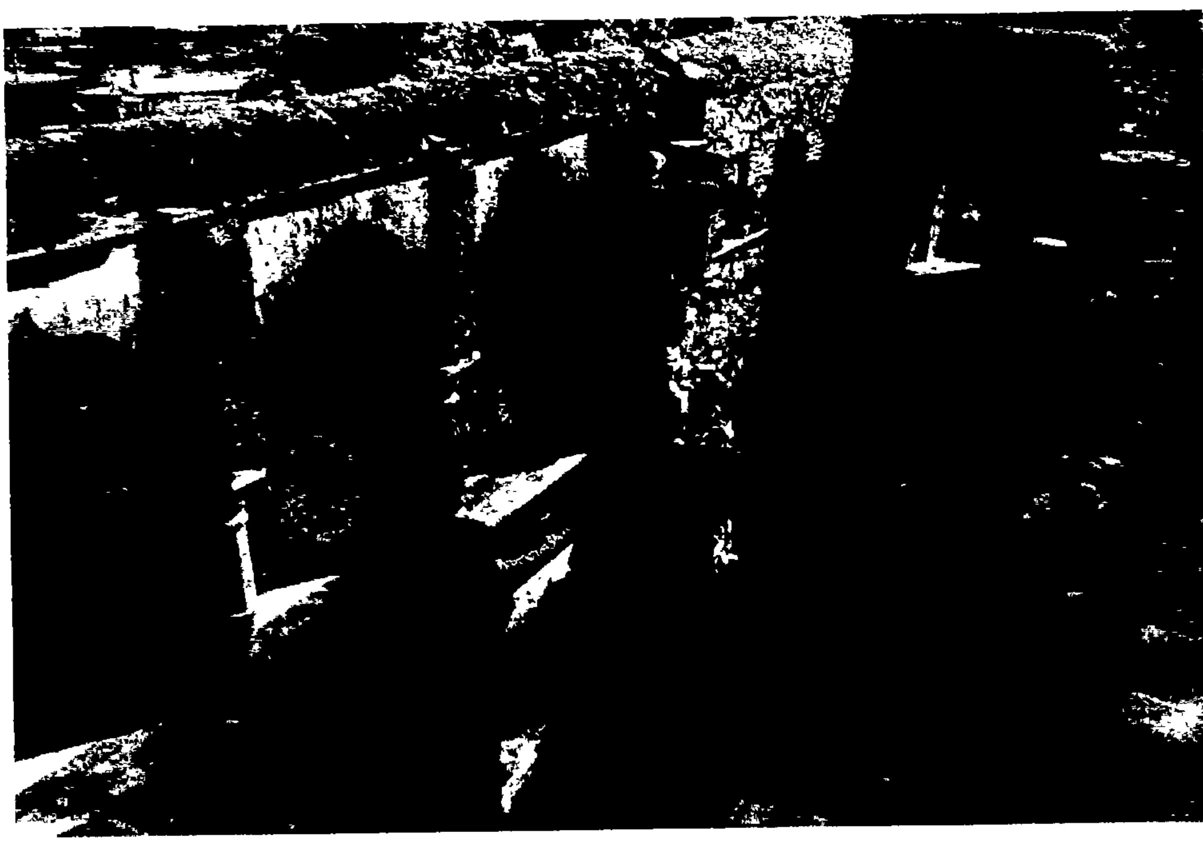

کملاپرپتی محل

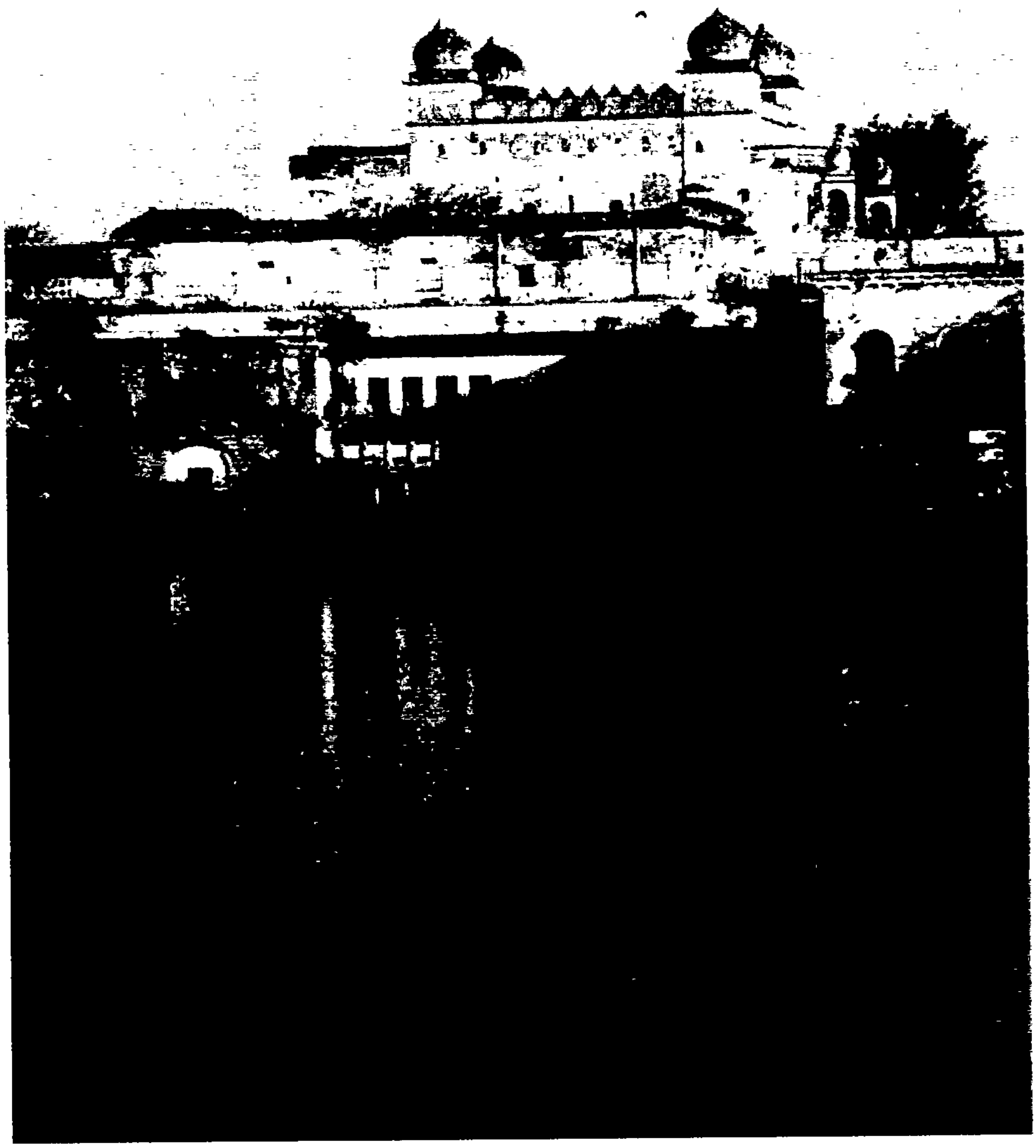

تاج محل، بھوپال

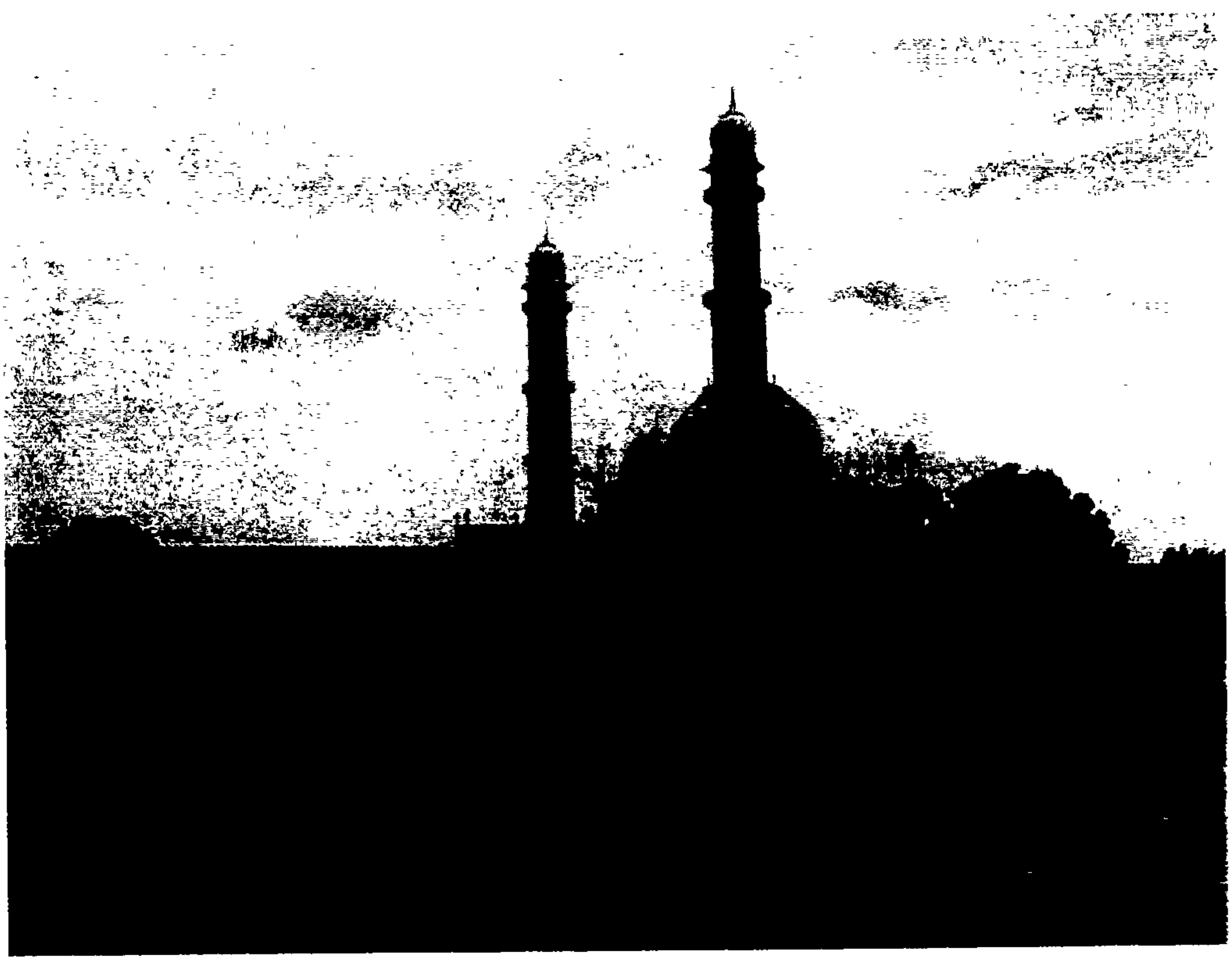

تاج المساجد

نواب سکندر جہاں بیگم

Entrance to the Taj Mahal Palace

دروازہ، تاج محل

4 6

نواب سلطان شاہ جہاں بیگم

Nishat-Afzah Garden

Rewma Foundation

باغ نشاط افزا

مسجد شاہجہاں، انگلینڈ

Shaukat Mahal
Rekhta Foundation

شوکت محل

THE SULTAN JEHAN BEGUM. THE SHAH JEHAN BEGUM.

نواب سلطان جہاں بیگم اور نواب شاہجہاں بیگم

Taj Mahal and Benazir Palaces

تاج محل اور بے نظیر محل

نواب سلطان جہاں بیگم، المعروف سلطان کیخسرو جہاں بیگم